جلد 44 • شمارہ 12 • دسمبر 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول
جوابی چال
ایک اداکار اور اداکارہ کی
مڈبھیڑ...... دونوں ہی بڑے فنکار تھے
امجد رئیس
145
جواری
زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے
والے کھلاڑی کی ہوش رُبا داستان
احمد اقبال
150
تکمیلِ آرزو
عمدہ منصوبہ بندی کی حامل
کہانی کا غیر متوقع انجام
سلیم انور
195
خون آشام
دو دوستوں کی طویل رفاقت
میں ڈرامائی انداز ہونے والے
ناقابلِ یقین معاملات
کاشف زبیر
206
چوک
مغرب سے
برآمد مختصر سی
کڑوی کسیلی تحریر
222
دھوکے باز
ایک سراغ رساں کی تفتیشی کارروائیاں...
کوئی اس پر اعتماد کرنے کو تیار نہ تھا
224
سنگ زن
وجودِ زن سے رونما ہونے والے
فتنے کا خونی شاخسانہ
237
شر فروش
لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتا سرورق......
ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر تھی
سلیم فاروقی
264
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
WWW.PAKSOCIETY.COM

عزیزانِ من... السلام علیکم!

سال کا آخری شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ نیا سال نئے سورج کے ساتھ طلوع ہونے کو ہے۔ ان لمحات میں ہم ذرا یہ دیکھ لیں کہ گزرے ہوئے سال میں ہم نے کیا کمایا اور کیا گنوایا ہے۔ معاشرت کے لگے بندھے اصول آج شکستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ برداشت کا عنصر دھیرے دھیرے نہیں بلکہ تیزی سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ گلی محلوں سے ریاست و سیاست تک، افراد، جماعتیں اور گروہ اشتعال کا شکار نظر آتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے اور قتل و خون کی نوبت آ جاتی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ سب مایوسی کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ لوگوں کو توقع نہیں رہی کہ انہیں کسی مسند سے انصاف مل سکے گا۔ سڑک پر دو گاڑیاں ٹکرا جاتی ہیں تو براہِ راست گالم گلوچ اور تو تکار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں فریق جانتے ہیں کہ پولیس سے انصاف نہیں ملے گا۔ وہ دونوں کو الگ الگ بھاری دفعات سے ڈرا کر اپنا محنتانہ وصول کریں گے۔ جی ہاں، محنتانہ کیونکہ رشوت اب عیب نہیں رہی۔ لوگ فخریہ بتاتے ہیں کہ اوپر کی آمدنی خوب ہو رہی ہے۔ دوسری طرف بڑھتا ہوا طبقاتی فرق ہے۔ ایک طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور ان ہی کے آس پاس متمول لوگوں کے پُرشکوہ قافلے فاقہ زدوں کے دل رنج و غم میں ڈوب کر پُرتکلف ظہرانے اور عصرانے اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ برائی اوپر سے نیچے چلتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آج ابلاغِ عامہ کی شہنشاہی کے دور میں ہمارے حکمراں اپنے رنگ ڈھنگ بدل لیں تاکہ معاشرے میں بھی توازن پیدا ہو سکے۔ یاد رکھیں کہ آج کیمرے جو کچھ دکھا رہے ہیں، وہ بے نیاز اشرافیہ کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ طاقت و اقتدار کے نشے میں آسمانوں میں پرواز کرنے کے بجائے زمین پر بسے محروموں اور مجبوروں کی خبر گیری کریں کہ انہوں نے ہی آپ کو عزت و اقتدار سے سرفراز کیا ہے۔ ہم زمین کے بسنے والے ہیں۔ آئیں، زمین پر بجی اپنی محفل میں چلتے ہیں جہاں کے رنگ ڈھنگ نرالے اور دلکش ہیں۔

کراچی سے محمد اقبال کی آمد ”پچھلے ماہ کا شمارہ ختم ہوتے ہی نئے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے کیونکہ قسط وار سلسلے اس طرح ختم ہوتے ہیں کہ بے چینی سی رہتی ہے لیکن مصروفیت کے باعث اس بار جاسوسی ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے یعنی 4 نومبر کو خرید سکا۔ ٹائٹل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے فہرست دیکھی جہاں پر جاسوسی کے نامور رائٹرز کے نام اپنی کہانیوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے جن میں احمد اقبال، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، مختار آزاد، منظر امام، کاشف زبیر کے ساتھ اسما قادری کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہانیاں شروع کرنے سے پہلے حسبِ معمول یہ جاننے کے لیے چینی نکتہ چینی میں گئے کہ پہلے نمبر پر آنے والے خوش نصیب کا نام دیکھ کر مبارک باد دینے کا فریضہ انجام دے کر باقی دوستوں کی نوک جھوک اور تبصروں سے محظوظ ہو سکیں، سو محمد خواجہ صاحب کو بہت مبارکاں، دو بار ہی، دو بار اس لیے کہ یہ ہماری کورنگی کے جو ہیں۔ روشنی روز، محمد قاسم رحمان کو خوش آمدید! کبیر عباسی بھائی، انکل سیانے کا تعارف ذرا تفصیل سے کرواؤ۔ حاجرہ ہاشمی اینڈ مہرین ناز اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ احسان سحر کو سالگرہ کی بہت مبارک باد۔ سید شکیل حسین کاظمی اور راقم ریاض کا تبصرہ اچھا تھا۔ کہانیوں میں پہلے آوارہ گرد شروع کی جس کا ٹیمپو تیز جا رہا ہے۔ اس قسط میں آسیہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ عابد اور شہزی کے بیچ جدائی کب ختم ہو گی؟ احمد اقبال صاحب نے جواری میں مراد کا کردار ختم کر کے روزینہ کی زندگی ویران کر دی۔ خاور عرف سلیم نورین کو ڈھونڈ سکے گا یا روزینہ میں نورین کو ڈھونڈے گا۔ سرورق کی ابتدائی کہانی اچھی تھی۔ کوکب کو ماروی سے شادی کرنی چاہیے تھی، کاشف زبیر کی کہانی ٹھیک رہی۔ پہلا رنگ اسما قادری کے قلم سے تھا۔ بہت اچھا لگا۔ ضمیر کے ساتھ اچھا ہوا۔ رافعہ کے علاوہ دوسری لڑکیوں کو برباد کرنے والا انجام کو پہنچا۔ انسپکٹر شاہد سلیم کو اپنی پسند کی لڑکی مل گئی۔ مجموعی طور پر شمارہ عمدہ رہا۔“

میانوالی سے نادر سیال کی دریا دلی ”10 تاریخ کو جاسوسی سج دھج کے ساتھ ہنستا مسکراتا اپنی اداؤں کے ساتھ مجھے آ ملا۔ نومبر کے سرورق میں بکھری زلفوں والی خوب صورت سی دلنشیں کے لیے آپ کی خدمت میں عرض کروں گا:

اِک قیامت ہے کہ شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا

میں نے ڈائجسٹ میں شامل ہونے کی پہلے بھی کوشش کی لیکن کیا کریں جناب وی آئی پی کلچر ہونے کی وجہ سے مجھے انٹری نہیں ملی لیکن اب کی بار میں وی آئی پی کلچر کو سرتوڑ کوشش کر کے انٹری دوں گا، دیکھتے ہیں کس کی ہمت ہوتی ہے اور کون روکتا ہے مجھے۔ ڈائجسٹ میں پانچ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ یعنی 18 سال کی عمر سے اور میرا پہلے بھی دل کہتا تھا کہ میں محفل میں شرکت کروں اور دوستوں کے میٹھے میٹھے الفاظ پڑھ کر خوش ہوتا تھا اور اب میں نے ہمت کر کے خط لکھ ہی دیا اور دوستوں کے الفاظ کا جواب دینے کے لیے قلم اٹھا لیا۔ سب سے پہلے خطوط کی طرف جاتے ہیں۔ سب کے خطوط پڑھے، بہت ہی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں نوک جھوک۔ پتا نہیں کیا کیا، بہرحال دل خوش ہو گیا۔ ہمایوں فاروق ساحلی واہ کیا نام ہے، ساحلی! باتیں واقعی آپ ساحلی ہی کرتے ہو؟ اکیلی کراچی جی آپ کہاں گم ہو، ناراض تو نہیں ہو، ڈائجسٹ سے میری طرح؟ کیا کریں ڈائجسٹ کے بغیر مزہ جو نہیں آتا۔ چلتے ہیں آوارہ گرد کہانی کی طرف۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ہی سوچا تھا للکار کے بعد شاید ہی ہمیں ایسی کوئی کہانی پڑھنے کو ملے لیکن جناب آپ کے ہم مشکور ہیں۔ آپ نے ہمیں اتنی زبردست تحریر پڑھنے کو دی۔ جواری کا پتا نہیں چل رہا ابھی تو۔ کبھی ہم پڑھ کر تھک جاتے ہیں اور کبھی ہم پڑھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ کہانیاں اور بھی بہت اچھی تھیں اگر اس

بار مجھے محفل میں جگہ مل گئی تو میں اگلی بار دوسرے اسٹائل میں حاضر ہوں گا۔ آپ سب مجھے دیکھتے رہ جائیں گے۔ دعا کرنا تھر کے باسیوں کے لیے۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کا استفسار "اس دفعہ معمول سے ذرا ہٹ کر جاسوسی 7 تاریخ کو ڈھلتی شام کے وقت خریدا۔ دو ماہ کی غیر حاضری پر کسی دوست نے نوٹس ہی نہیں لیا، تو سوچا خود ہی انٹری دیں۔ (یہ زیادہ اچھا سوچا اور عمل کیا) ارے واہ سرورق پر اس دفعہ ہنستی مسکراتی حسینہ کو دیکھ کر دل کی کلیاں کھل گئیں۔ پیچھے ہمایوں سعید بھی وکٹری کا نشان بنا رہے تھے، نہ جانے کیا چکر ہے۔ خیر تبصروں کی محفل میں شامل ہوئے تو ابتدائی تبصرہ محمد خواجہ کا تھا۔ تبصرہ جاندار تھا۔ فیصل آباد سے روشی روز کو جاسوسی میں خوش آمدید۔ ہمایوں سعید ہمیشہ کی طرح الجھتے نظر آئے۔ ماہ تاب رانا گل آپ کی غیر حاضری کو بہت نوٹ کیا۔ زینب کو ہماری طرف سے ڈھیروں پیار۔ سید شکیل کاظمی اس دفعہ پڑوسن کا ذکر نہیں کیا آپ نے، کہیں جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟ محمد قاسم رحمان خوش آمدید۔ عائشہ رانی، ماہا ایمان، محی الدین اشفاق! یار جلد انٹری دو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ آسیہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ عابدہ اور شہزی کے بیچ جدائی نظر آ رہی ہے مجھے۔ خیر جواری نے تیو ٹرن لیا۔ مراد بے چارہ روزینہ کی زندگی ویران کر گیا۔ خاور عرف سلیم نورین کو کب ڈھونڈے گا۔ سرورق کی ابتدائی کہانی، ازل سے ماروی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوکب کو ماروی سے شادی کرنی چاہیے تھی، ٹریجڈی اینڈ۔ اسما قادری اور کاشف زبیر کی کہانیاں بھی ٹھیک ٹھاک رہیں۔ کاشف زبیر شامی اور تیمور کہاں ہیں؟"

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی باتیں "جاسوسی لیٹ ملا۔ لڑکی کی مسکان، روشن آنکھیں، بہت خوش دکھائی دے رہی ہے۔ واہ جی واہ، صنفِ نازک درمیان میں اور سائڈوں پر صنفِ مخالف۔ اب تو خوش ہیں کہ انکل آپ کو ٹائٹل کی زینت بناتے ہیں لیکن خطرناکی بھی نظر آ رہی ہے، دیکھیں دونوں میں سے کون نمبر لے جاتا ہے۔ اپنی محفل میں پہنچے، انکل کی باتیں اگر ہمارے حکمران پڑھ لیں تو شاید راہِ راست پر آ جائیں۔ محمد خواجہ کا تبصرہ اچھا تھا۔ روشی روز ویلکم! خوش آمدید، آپ کی آمد کی خوشی ہوئی۔ لاحاصل، آخر مائیکل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اپنے بزنس کو چلانے کا مائیکل نے انوکھا طریقہ استعمال کیا۔ چارا میں رالف نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جم کو واقعی چارے کے طور پر استعمال کر کے شارک کے حوالے کر دیا۔ منظر امام کی باکمال تخیل نے تو دل موہ لیا۔ مصور اتنے سفاک ہو سکتے ہیں کیا؟ ضروری تو نہیں کہ اپنے کام کو اجاگر کرنے کے لیے دوسروں کو موت کے گھاٹ ہی اتار دو۔"

کراچی سے ایم کے احساسات "تمام یارانِ محفل کو السلام علیکم، یکم محرم کا دن دینِ اسلام میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ دوم حضرت عمر فاروقؓ کا یومِ شہادت ہے۔ پچھلے مہینے میرے خط نہ لکھنے کی وجہ تو میرے دوستوں کو معلوم ہی ہو گی اور جن کو نہیں معلوم انہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہ اکتوبر میں میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے میں اسپتال میں رہا، بالآخر آپ دوستوں کی دعاؤں اور اللہ کے حکم سے میں بالکل صحت یاب ہو چکا ہوں۔ میں آپ تمام دوستوں کے ساتھ ساتھ بالخصوص ماہنامہ سرگزشت کے تبصرہ نگار عمران جونانی، طاہر گلزار، رضوان سلطان تنولی، زبیر شیخ، ملک رحمت، قدرت اللہ نیازی، عامر ملک اور فاطمہ چوہدری کا شکر گزار ہوں جن لوگوں نے اس اذیت بھرے وقت میں مجھے حوصلہ دیا اور میری خیریت دریافت کرتے رہے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو جلد بالکل چاق و چوبند کر دے) سوچا تھا کہ مختصر خط لکھوں گا مگر وہ کہتے ہیں نہ کہ بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی۔ سب سے پہلے بات کی جائے جواری اور آوارہ گرد کی۔ دونوں کہانیوں میں کچھ مماثلت نظر آ رہی ہے۔ جواری تو مجھے اناڑی کا پارٹ ٹو لگتا ہے مجھے۔ آوارہ گرد اس بار پہلے سے کافی بہتر اور تیز رہی۔ آسیہ کی موت نے رنجیدہ کر دیا۔ ایچ اقبال کی جزوی گمشدگی بہترین اسٹوری تھی اگر اسے اسٹوری آف دی منتھ کا ٹائٹل دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کوکب کا کردار واقعی ایک مثالی کردار نظر آیا اس پر حکیم صاحب کی حکمت بھی بہت بھلی لگی اور کوکب کے لیے ان کی فکر انگیزی بہت مثالی تھی۔ نذیرو کا کردار بھی اپنی جگہ بہت ہی مناسب تھا۔ گاؤں دیہات میں آج بھی لوگ اپنے بزرگوں کی بات مانتے ہیں جس طرح نذیرو نے حکیم صاحب کی بات مانی اور شہر میں کوکب کے ساتھ رہا۔ مگر ماروی کے ساتھ بہت برا ہوا۔ میرے حساب سے یہاں ایچ اقبال صاحب کو ماروی کا انجام کچھ مختلف کرنا چاہیے تھے۔ اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کا اس قدر دردناک انجام دل کو کافی رنجیدہ کر گیا۔ اس کے علاوہ چھوٹی کہانیاں بھی مناسب تھیں۔"

سرگودھا سے اسد عباس کی رائے "خلافِ توقع اس بار جاسوسی یکم نومبر کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے دوستوں کی محفل میں حاضری دی۔ محمد خواجہ سرفہرست تھے، مبارکاں۔ ہمایوں سعید خان، کبیر عباس، افتخار اعوان اور طاہر چوہدری کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جزوی گمشدگی پڑھی۔ کہانی ایچ اقبال صاحب کی روایت کے برعکس کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ جواری تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ بے ضمیر پڑھ کر ضمیر شاہ کی سوچ اور گمراہی پر بہت افسوس ہوا۔ بہرحال وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔ رافعہ نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ قسمت آزما، کاشف زبیر صاحب کی نئے موضوع پر اچھی کاوش تھی۔ لیکن کہانی کا اختتام میری توقع کے مطابق نہیں ہوا۔ بہرحال یہ تو مصنف کا حق ہوتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں چارا، قیام گاہ، نقشِ اول، لاحاصل اور سازش اچھی تھیں۔ معاوضہ اس شمارے کی بلاشبہ ایک بہترین کہانی تھی۔ سرمایہ دار پھر غریب طبقے کا استحصال کرتا نظر آیا۔ پتا نہیں لوگ اتنا پیسا کس لیے جمع کرتے ہیں۔ بقول شاعر

تجوریاں بھرتے ہیں لوگ عمر بھر کے لیے
موت کا فرشتہ رشوت نہیں لیتا

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی آمد "ٹائٹل گرل کے فیس کٹ اور مسکراہٹ کو بہترین فنشنگ دے کر ڈاکر انکل داد کے حق دار ٹھہرے۔ ساتھ میں اپنی اور ہماری صنف کو ویسے ہی پینٹ کیا جیسے ہمیشہ کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت سارے لوگوں نے احتجاجاً خود کو بطور فری لانسر ماڈل بھی پیش کیا ہے مگر تا حال کوئی شنوائی نہیں ہو سکی۔ اداریے میں آئرن مین یونس خان کو پیش کیا گیا خراجِ تحسین دل خوش کر گیا۔ جس کی مشکل سے مشکل وقت میں بھی چہرے پر بجی بے ریا مسکراہٹ اور لازوال حوصلہ اک انسپریشن ہے سب کے لیے۔ خواجہ صاحب آزاد و عشق پر آپ کے تبصرے نے بے اختیار ڈی ایس کے اسماعیل کی یاد دلا

دی۔ اور پھر یوں ہوا کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ نہ جانے کہاں ہو گا وہ۔ روشی روز صاحبہ اشتہارات کی نظر اندازی کا اظہار سرِ عام مت کریں۔ ہمارے ڈائجسٹ کے فنانشل سپورٹر ہوتے ہیں یہ۔ (بجا فرمایا) ابن نیاز ات ہم مشکور ہیں آپ کی محبت کے۔ کبیر عباسی، انکل سیانے کے ساتھ مشترکہ دھمال میں کافی بھلے لگ رہے تھے۔ مہرین ناز آپ لاہور کب سے شفٹ ہوئیں؟ خیر تصدیق کس نے کرنی ہے، بندہ نیو یارک بھی لکھ سکتا ہے۔ کاشف علی برادر آپ سے کس نے کہا کہ ہماری کوئی ناراضی ہے۔ بس گوناگوں وجوہات آڑے آتی رہیں۔ دو دفعہ گوگو لکھتے ہوئے مکمل دھیان رکھا کہ کہیں کوئی نعرہ نہ لگ جائے۔ احسان سحر آپ کے جوان ہونے یا ہینڈسم جوان ہونے کی ہم تردید نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے لیکن 22 سال پر ہمیں شدید اعتراض ہے۔ ماہتاب گل صاحبہ آپ نے لاڈلی بھتیجی کو مکھن لگانے کی اچھی کوشش کی جو کہ ناکام رہی۔ اینڈ مجھے اتنی شدت سے یاد کرنے پر ہم مشکور ہیں۔ انور برادر! آپ کا مطلب کہ پٹھانوں میں اپنی بیوی کو پیارے ہونے کی روایت نہیں؟ آپ سے پہلی بار سنا۔ ورنہ پٹھان ہونے کے دعویدار تو ہم بھی بچپن سے ہیں۔ ماریہ خان دھرنا زدہ شہر کے باسی ہونے کی وجہ سے آپ نظر انداز نہیں کی گئیں۔ بلکہ بنا ٹکٹ خط بھیج کر پاکستان پوسٹ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش وجہ ہو سکتی ہے۔ طاہر میاں سرورق کو دیکھتے ہی آپ کو کس سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اس کی وضاحت نہیں کی آپ نے۔ ابتدائی صفحات پر بھی ایچ اقبال کی جزوی گمشدگی مکمل طور پر غیر متاثر رہی۔ یا شاید اتنے بڑے نام کا ٹیگ توقعات بڑھا دیتا ہے۔ منظر امام کی تکمیل بھی ان کی حالیہ حقائق کو منظرِ عام پر لانے والی کہانیوں سے کافی ہٹ کر اور غیر حقیقی سی کہانی تھی۔ امجد صاحب کی نقشِ اول عام مغربی کہانیوں سے کافی ہٹ کر اور دلچسپ کہانی تھی۔ اپنے دام میں صیاد آ گیا شاید اسی موقع پر کہا جاتا ہے۔ جرم سے قطعہ نظر گلبرٹ کی پلاننگ متاثر کن تھی۔ سلیم فاروقی کی گردشِ ایام ان کی روایتی مار دھاڑ کے برعکس جاسوسی کی تعریف پر پوری اترتی لاجواب تحریر ثابت ہوئی۔ نادر جیسے قابل اور ایماندار کو اپنے محسن کا اعتبار توڑتے دیکھ کر افسوس ہوا۔ نکتہ گر ایک مصنف کی ذہنی اپروچ کو اجاگر کرتی بہترین کہانی تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی اسما قادری کی بے ضمیر لاجواب رہی۔ انسپکٹر شاہد کا ایک بے ضمیر کے قتل پر پردہ ڈال کر ایک ہنستے بستے گھر کو آباد رکھنے کا فیصلہ گو کہ غیر قانونی مگر انسانیت پر مبنی تھا۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی قسمت آزما بھی خوب رہی۔ لیکن اک الجھن رہی کہ ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے اے ٹی ایم سے رقم نکالنے کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ پھر وہ لوگ کیسے ایک ایک اکاؤنٹ سے لاکھوں روپے نکالتے رہے؟"

نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی سے انعم ریاض کی یادیں "گزشتہ چار سالوں سے جاسوسی ڈائجسٹ کی قاری ہوں لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ جاسوسی کیمپ کو ہی دیکھنا نصیب ہو گیا۔ سرورق پر ایک حسینہ کو ہلکا سا تبسم چہرے پر سجائے دو غنڈوں کے درمیان کھڑا دیکھ کر ہم نے اس کے اعتماد کو خوب سراہا۔ چٹکی نکتہ چینی میں محمد خواجہ نے ہمارا استقبال کیا اور ہم سر جھکائے آگے نکل گئے۔ روشی روز کو ہماری طرف سے بھی خوش آمدید۔ احسان سحر کا تبصرہ پڑھ کر ہمیں ان کی زور آوری پر بہت ہنسی آئی۔ افتخار حسین صاحب آپ نے اپنے علاقے کی ایسی منظر کشی کی کہ ہمارا جی کرنے لگا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پر جا کر یہ نظارے دیکھیں۔ ماہتاب گل آپ نے کیا خوب صورت انداز میں غیر حاضر تبصرہ نگاروں کو منظرِ عام پر لا کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی آپ نے کراچی کی سوہنی کڑیوں کو ویلکم کیا اس بات پر شکریہ جی۔ انور یوسف صاحب اگر ہمایوں سعید اپنی بیگم کو پیارے ہو گئے تو کیا ہوا؟ شکر ہے آپ کی روایات پر نہیں گئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی جزوی گمشدگی پڑھی۔ کہانی کا اسٹارٹ اچھا تھا مگر اختتام بہت جلدی میں کیا گیا تھا۔ سرورق کی پہلی کہانی اسما قادری کی بے ضمیر میں ضمیر واقعی بے ضمیر نکلا۔ دسمبر سے میری بے انتہا دکھی یادیں گزری ہیں اور زندگی کے دو حادثات بھی اسی ماہ میں ہوئے۔ لہٰذا دسمبر کے آغاز پر یہ کہوں گی کہ

دسمبر آ کر دریچوں میں ٹھہر جائے تو...
دیواروں پہ کیلنڈر بدلنے سے یادیں تو نہیں جاتیں

مظہر سلیم خان رحیم یار خان سے لکھتے ہیں "جب دھوپ کی راجدھانی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی اور افق پر گلابی رنگ پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا، تب ہم نے کاغذ قلم سنبھالا اور چٹھی ذرا 'سیاں جی' یعنی جاسوسی کے نام لکھنے لگے۔ جاسوسی ڈائجسٹ اس بار چار تاریخ کو ہمارے غریب خانے پر ہاکر کے ہمراہ یوں آیا، جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جاتی ہے۔ جاسوسی کو دیکھ کر ہمیں اتنی خوشی ہوئی جتنی اپنی پڑوسن کو دیکھ کر کاظمی صاحب کو ہوتی ہوگی۔ سرورق کی حسینہ پستول بردار اور زخم خوردہ مسکراہٹ کے حامل افراد کے بیچ میں بے خوف کھلکھلاتی نظر آئی۔ اداریہ حسبِ سابق اچھا لگا، بالخصوص آسٹریلیا کا غرور کرکٹ کے حوالے سے زمیں بوس ہونے کی خبر نے سر فخر سے بلند کر دیا۔ اس بار تو اوپی ماموں اور انکل سیانے، دندناتے ہوئے آئے اور محفل پر چھا گئے۔ ویلڈن کبیر لالہ اور طاہر بھائی۔ سید شکیل حسین کاظمی اور افتخار اعوان تو محفل کا سنگھار ہیں، ان کے تبصرے انفرادیت کے باعث لائقِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ انعم ریاض آپ کو محفل میں خوش آمدید، ہم اور کاظمی صاحب اتنی بھی گاڑھی اردو نہیں لکھتے کہ آپ لغت کھنگالتی پھرتی ہیں۔ باقی تبصرہ نگاروں میں مہتاب گل رانا اور ہمایوں سعید نے اچھا لکھا۔ کہانیوں کی ابتدا اجواری سے کی۔ واہ احمد اقبال صاحب آپ کے اسلوب کے کیا کہنے۔ کہانی کے حالات و واقعات کو لفظوں کا وہ پیرہن دیتے ہیں کہ ہم سحر زدہ ہو جاتے ہیں۔ بس صاحبِ تحریر سے اتنی گزارش ہے کہ نورین کی جلد انٹری کروائیں۔ چوہدری انور کی زندگی میں تبدیلی اچھی لگی۔ آوارہ گرد کی حالیہ قسط میں آسیہ کی موت غم سے ہمکنار کر گئی۔ شہزی، چوہدری ممتاز خان کا گھیرا توڑنے میں کامیاب، اب دیکھنا یہ ہے کہ شہزی اور خانم شاہ کیا پیش رفت کرتے ہیں۔ استحصالی قوتوں کے سیاہ کارناموں کو اجاگر کرتی معاوضہ، عکس فاطمہ کی ایک دل گداز تحریر تھی۔ سچ یہ ہے کہ معاشی بدحالی انسان سے زندگی کی ہر خوشی اور مسرت چھین لیتی ہے۔ فراڈ کی دبیز تہوں میں دوڑتی بھاگتی کہانی سلیم فاروقی کی گردشِ ایام بہترین کہانی تھی۔ نادر کی آنکھیں دولت کی چکاچوند نے دھندلا دی تھیں۔ اب بات کرتے ہیں سرورق کے رنگوں کی۔ بے ضمیری، بے صداقت اور احساسات سے عاری نہ ختم ہونے والی جھوٹ کی سنگین فریب کاریوں سے لبریز، اسما قادری کی تحریر بے ضمیر عمدہ کہانی تھی۔ کاشف زبیر کا تحریر کردہ رنگ قسمت سے نبرد آزما کھلاڑیوں کا جان لیوا کھیل "قسمت آزما" کی تعریف کے لیے لفظ بہت چھوٹے ہیں۔ ابتدائی صفحات کی سوغات جزوی گمشدگی انسانی زندگی کے مختلف رویوں کی نشاندہی کرتی، سود و زیاں کی کشمکش کا احاطہ کرتی، زندگی کی حرارت سے بھرپور نوجوان کی داستانِ حیات پڑھ کر تا دیر تحریر کے سحر میں ڈوبے رہے۔ کوکب اور درخشاں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ لیکن ماروی یادداشت کھونے کے بعد جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔"

کبیر عباسی عرف شہزادہ کو حصار کے مری سے مشورے" انکل سیانے کے سنگ تازہ تبصرہ لیے ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ٹائٹل گرل کو دیکھتے ہی انکل سیانے کے منہ سے سیٹی نکل گئی، ہمارے گھورنے پر موصوف شرمندہ سے انداز میں بغلیں جھانکنے لگے۔ یہ شاہ رخ خان کا ہمشکل پستول کے ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ (اب ملائیں ناں انہیں ہمارے ساتھ) ساتھ میں موجود دوسرا بندہ اتفاق سے ہمارے دوست کا ہمشکل تھا۔ انگلی اٹھائے غالباً انکل سیانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اچھا تو یہ ہیں سیانے انکل۔ مجموعی طور پر سرورق اس دفعہ بہت پسند آیا۔ اداریہ اس دفعہ خلاف معمول خوش خبری لیے ہوئے تھا۔ ابن ندامت اگر آپ نادان ہیں تو آپ بھی کسی انکل سیانے کی صحبت اختیار کر لیں ناں۔ مدیرہ صاحبہ! آپ نے بھوت نما بندے کو انکل سیانے سے ملا کر دل توڑ دیا ناں مگر بھوت نما بندے کا، ہاہاہا۔۔۔ اور آپ جانتی تو ہیں کہ جو ہمارا ہوا ہی برآمد ہوتا ہے۔ پھر اسے کیسے پالیں ہم؟ عبدالجبار سیانے انکل باتونی تو ہیں مگر باتیں بڑی کام کی کرتے ہیں۔ آئی کچھ سمجھ؟ (آپ کے کب آئیں گی؟) ادریس احمد کے تبصرے پر غالباً اس بار قینچی زیادہ ہی چل گئی۔ حاجرہ اینڈ مہرین انکل سیانے کو ہماری سفارش سے محفل میں داخلہ ملا نہ کہ ہمیں ان کی سفارش سے۔ کاشف علی آپ کی طرح ولی بھی ابن کبیر دیکھ کر چونک گیا تھا کہ ابھی تو میں نے کہانی بھیجی ہی نہیں تو رائٹر کیسے بن گیا۔ افکار حسین اپنے علاقے کی منظر نگاری کر کے لوگوں کو جلانے میں مصروف نظر آئے۔ ماہ تاب گل، احسان سحر، کاشف علی وغیرہ کو دیکھ کر انکل سیانے بولے۔ "خیر سے لوٹ کے بدھو محفل کو آگئے ہیں۔" ماریہ خان، انجم ریاض اور روشی روز خوش آمدید۔ کاظمی صاحب یہ محفل ہے کوئی دشمن دیس تو نہیں کہ ماموں زاد کو دیکھ کر تقویت ہوئی۔ طاہر چوہدری کا تبصرہ پڑھ کر انکل سیانے بولے۔ "اے منڈا ابڑا ٹیلنٹڈ اے۔" مدیرہ صاحبہ! آپ نے تو رائٹرز کے انٹرویوز شائع کرنے کے مشورے پر کان نہیں دھرے تو ہم نے فیس بک میں جاسوسی، سسپنس اینڈ سرگزشت آفیشل فین کلب میں یہ سلسلہ شروع کیا ہے اور اس سلسلے میں ناصر ملک، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، کاشف زبیر اور طاہر جاوید مغل کے انٹرویوز پوسٹ کیے جا چکے ہیں۔ اگر آپ نے کسی جریدے میں شائع کرنے ہوں تو آپ کو بھی یہ میل کیے جا سکتے ہیں۔ امید ہے یہ لائنیں آپ حذف نہیں کریں گے اینڈ جواب بھی ضرور دیں گے۔ (آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔۔۔ مگر ہم اپنا کام خود کرنا پسند کرتے ہیں۔۔۔) آوارہ گرد پڑھ کر انکل سیانے بولے۔ "چترے شہزی بہت بھگاتا ہے اور دل بھی بہت دھڑکاتا ہے۔" اسما قادری نے آج کے معاشرے کے ایک ٹپیکل کیریکٹر کی خوب تصویر کشی کی۔ بہت پسند آئی یہ تحریر۔ کاشف زبیر نے ہمیں محتاط کر دیا کہ ہم تو کبھی ڈیبٹ کارڈ سے پے منٹ کرتے ہوئے اس چیز پر توجہ نہیں رکھتے تھے کہ ہمارے کارڈ کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ بس ایک چیز کی وضاحت نہیں کی گئی کہ ڈیبٹ کارڈ سے رقم نکلوانے کی لمٹ ہوتی ہے تو ساری رقم اکٹھی کیسے نکلوائی گئی۔ اس کے علاوہ بہت ہی شاندار تحریر تھی یہ۔ ایچ اقبال نے موضوع تو عام سا چنا مگر منفرد اختتام کے باعث یہ تحریر بھی اپنا اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ سلیم انور کی قیام گاہ بس ٹھیک ہی رہی۔ منظر امام کی تخیل میں ایک فنکار کی مختلف سوچ کو خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا، پسند آئی۔ سلیم فاروقی کی گردش ایام بہت دلچسپ اسٹوری تھی۔ احمد ریکس کی تلاش اول عمدہ پلاٹ کے ساتھ دل کی پسندیدگی والے گوشے تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ جمال دستی کی چارا کا پہلا پیراگراف پڑھ کر ہی آگے کا اندازہ ہو گیا تھا جو درست نکلنے پر منہ بن گیا کہ کوئی بات خلاف توقع نہ ہو تو مزہ تو نہیں آتا ناں کہانی کا۔ بابر نعیم نے لاحاصل میں جرم کا نیا طریقہ متعارف کرایا۔ متعارف ہو کے مزہ آیا۔ (کیوں کیا ارادہ باندھا ہوا تھا) کترنیں کافی بہتر تھیں مگر اسکیچز نے شاہد صاحب کی یاد شدت سے دلائی۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔"

اسلام آباد سے ماریہ خان کی تعریفیں "کائنات کے بے شمار رنگوں میں سب سے حسین اور دلکش رنگ عورت کا ہے۔ اگر اس ایک رنگ کو کائنات سے نکال دیا جائے تو باقی سب رنگ بے معنی ہو جائیں گے۔ سرورق کی حسینہ پستول بردار اور خون آلود مردانہ چہروں کے درمیان کائنات کے رنگوں کی نمائندگی کرتی بڑی حکمت کے ساتھ موجود تھی۔ سرورق کی حسینۂ دلنواز کو مسکراتا ہوا چھوڑ کر چٹپٹی نکتہ چینی میں پہنچے جہاں تبصرہ نگار قسم قسم کے پنچھیوں کی طرح اپنی اپنی بولی بول رہے تھے۔ تاہم پہلے ہم آپ کے اداریے سے مستفیض ہوئے اور یہ پڑھ کر تو بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ طویل عرصے بعد پاکستان کرکٹ ٹیم نے آسٹریلیا کا غرور خاک میں ملا دیا۔ تبصروں میں ایم خواجہ کا تبصرہ اچھا تھا۔ باقی تبصرہ نگاروں میں انکل سیانے، سید شکیل حسین کاظمی (وڈے شاہ جی) اور ادبی ماموں کی بیٹھک اچھی لگی۔ مہرین ناز اور حاجرہ ہاشمی کا تبصرہ بھی سراہے جانے کے قابل تھا۔ ویسے یہ تفسیر عباس بابر، زویا اعجاز اور منظر سلیم محفل سے کہاں غائب ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور قسط میں آسیہ کو انسان نما درندوں نے پامال کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم کافی دیر افسردہ رہے۔ جواری میں ملک سلیم دوسروں کے معاملات سلجھاتا رہتا ہے۔ نورین کی تلاش تاحال تاخیر کا شکار، سکندر شاہ کے جواں سال بیٹے کی ناگہانی موت دکھی کر گئی۔ ابتدائی صفحات کی سوغات جزوی گمشدگی گمشدہ لمحوں کی کھوج و جستجو میں پل پل رنگ بدلتی کہانی کے پیچیدہ مضمون کو ایچ اقبال نے زور قلم سے بڑی چابک دستی سے سلجھایا، درافشاں اور کوکب کا ملاپ اچھا لگا۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر کی تحریر قسمت آزما، اسما قادری کی کاوش پر بازی لے گئی۔ کاشف زبیر نے نہایت عمدگی کے ساتھ کہانی کے تانے بانے بنے۔ مجموعی طور پر تمام شمارہ اچھا رہا۔"

سینٹرل جیل لاہور سے رانا حبیب الرحمن کی روداد "سب سے پہلے محفل میں پہنچے تو خواجہ صاحب تشریف فرما تھے۔ مبارک ہو جی۔ قاسم رحمن جناب آنکھوں کا علاج کرائیں۔ پہلے آپ حسینہ کہتے ہیں پھر بدصورت کہتے ہیں، کیوں؟ کبیر عباسی صاحب جب چوپا پالو گے تو وہ خرگوش بلکہ بکری بن جائے گا اب تو خوش ہو جاؤ۔ گورچانی صاحب میرے حساب سے تو ٹھیک لکھا تھا کیونکہ راجن پور سے ماہتاب گل کی آمد اچھی لگتی ہے۔ کاشف عبید صاحب ادارے کو خطوط کے صفحات نہیں بلکہ قیمت بڑھ جانے کا کہیں تو شاید ان کے کان پر جوں رینگنے لگے۔ حاجرہ اینڈ مہرین صاحبہ! طاہرہ گلزار اب اس عمر تک جا پہنچی ہیں کہ جس میں صرف گلے شکوے اور بے یقینی ہوتی ہے اور آپ کا تبصرہ ہمیں پسند آیا۔ ہمایوں سعید صاحب مرد ہمت نہیں ہارتے اور آپ کیسے ہار گئے۔ ماہتاب گل مبارک ہو اچھی اچھی باتیں لکھنے کی اور، باقی بعد میں جب پھول کھلے گا آنگن میں۔۔۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی ٹھیک تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے جواری پڑھی لیکن خاور اللہ وارث ہے یعنی ماں باپ بہن بھائی جب کہ کوئی رشتے دار نہیں پھر یہ بھاگنے کے چکر میں کیوں ہوتا

ہے۔ اگر وہ محبت یعنی نورین کی تلاش میں ہے تو اسے مفت ملتی جائداد سے کچھ تو ذاتی مکان رہنے کے لیے اور اپنا کاروبار بنانا چاہیے، کچھ تو ہو اس کے پاس کہ اگر نورین مل جاتی ہے تو کیا سڑک پر بیٹھ کر بھیک منگوانے کا ارادہ ہے اس کا۔ اب تو لگتا ہے اس کی شریکِ حیات روزینہ ہی بنے گی۔ آوارہ گرد، سازش اور قسمت آزما پسند آئی۔ بے ضمیر پڑھ رہا ہوں اور گردشِ ایام میرے سامنے ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جاسوسی لیٹ ملا اور باقی زیرِ مطالعہ ہے۔ گزارش ہے کہ میں دوسرے لفافے میں ایک کہانی جو بالکل سچ ہے جس کا نام مقدر کا سکندر ہے بھیج رہا ہوں، اسے شمارے میں جگہ دیں۔ امید ہے پسند آئے گی۔"
(دیکھ لیں گے کہ قابلِ اشاعت ہے)

احسان سحر کی میانوالی سے تنقید و شاعری "جاسوسی ایک ٹھنڈی صبح اور میٹھی سی دھوپ میں ملا۔ بے چین آنکھوں اور بے لگام ہاتھوں کو قرار نہ آیا تو آنکھوں کی بے چینی ٹائٹل سے ٹھنڈی کی اور ان میں کچھ ٹھنڈک صنفِ نازک کے خوب صورت سراپا کو دیکھ کر بڑھ گئی۔ کیا نازنین کے نازتھے بھی جیسے پھول پر شبنم پڑی ہو جیسے آسمان پر دھنک نکلی ہو، جیسے سات رنگوں کی تتلی ہو، پستول بردار بھی اچھے اسٹائل کے ساتھ اچھے لگے۔ بے لگام ہاتھوں کو ڈھیل دی جنھوں نے شمارہ کھولتے ہی سکون کا سانس لیا، خوب صورت دنیا کے سارے لوگوں کے درمیان خود کو پا کر اتنی خوش گواریت محسوس ہوئی جتنی سردیوں میں میٹھی دھوپ میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ پیارے ساتھیوں میں سب سے پہلے ملاقات محمد خواجہ سے ہوئی جنھوں نے اپنے دلی احساس اور جذبات سے ہمیں آگاہ کیا اور مبارک ہو جناب آپ کے یہ احساسات بڑوں کو پسند آئے تبھی تو سب سے آگے آپ کو کر دیا۔ کبیر عباسی انکل سیانے کے ساتھ آئے جو اس دفعہ کافی سست رہے انکل سیانے! کہیں زکام کی شکایت تو نہیں ہے؟ ہمایوں سعید بھی کافی عرصہ بعد نظر آئے جو کافی کھلے کھلے سے تھے۔ لگتا ہے امید ہو چلی ہے ماضی قریب میں شادی کی، باقی سب لوگوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ پہلی کاوش جزوی گمشدگی سے آغاز کیا اور جب آغاز ہی پھیکا اور بے رنگ رہے تو آگے بڑھنے میں مزہ نہیں آیا، یہاں بھی ایچ اقبال نے انڈین ڈرامے کی نقل اتار کر بے رونقی اور حقیقت سے کافی دور دھکیلے رکھا، معاف کرنا جناب ہمیں تو کوئی مزہ نہیں آیا۔ یادداشت کم ہونا کوئی مذاق نہیں کہ کثافت چیزیں دیکھ کر آدمی کا دماغ روشن ہوتا جائے۔ انجام بھی بیکار تھا۔ سازش اچھی کاوش تھی۔ یہ مصنوعی اور فریبی دنیا ہے ہی ایسی جہاں ایک دوسرے کو فریب اور دھوکے سے مار کر آگے بڑھنا فن ہی ہے۔ جہاں صرف جھوٹ ہی چلتا ہو وہاں مخلص لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ سلیم فاروقی عرصے بعد نظر آئے اور ویسا ہی دولت کا کھیل دکھا گئے جو بہت سے لوگوں کے لیے پھندا ہی ثابت ہوتی ہے۔ جو اوپر سے تو خوب صورت ہی نظر آتی ہے پر اندر سے اس کی خطرناکی اور زہر جب باہر نکلتا ہے... ظاہر ہوتا ہے تو ہنستے بستے لوگ اور بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ تشکیل، ایسی خوب صورت کہانی رہی جسے اس ماہ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھا۔ سرورق کا پہلا شاہکار بے ضمیر، کافی تلخ ثابت ہوا۔ بے ضمیر کی بے ضمیریاں آخر جب کھلیں تو محبت کے بجائے نفرت ہی نفرت نظر آئی۔ کاشف زبیر کی قسمت آزما بھی اچھی کاوش رہی۔ خواہشیں ہی انسان کو غلام اور مجرم بناتی ہیں خاص کر پیسے کی خواہش تو انسان کو غلط اور صحیح کا فرق بھی بھلا دیتی ہے۔ عدیل بھی خواہشوں کا پیاسا نکلا، پر افسوس نہ پیاس بجھی نہ دنیا ہاتھ آئی۔ سلسلہ وار آوارہ گرد ایکشن میں ابھرتے ڈوبتے کردار نئے موڑ پر گامزن ہو رہے ہیں روشن خان کو بے روشن اور چوہدری ممتاز کی قید سے فرار کے بعد شہزی نئی سچویشن میں گرفتار ہو چکا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔"

عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سے نصیحت "دو تاریخ کو شمارہ ملا۔ دل باغ باغ ہو گیا دیکھ کر لیکن ایک دھڑکا سا بھی لگا ہوا تھا کہ عید اور پھر بھائی کی شادی کی وجہ سے خط خاصا لیٹ ہو گیا تھا، جانے اب شائع بھی ہو کہ نا، مگر ساتویں نمبر پر ہی اپنا خط دیکھا تو سچ میں بے انتہا خوشی ہوئی۔ سرورق کی خوب صورت سی حسینہ تو اس دفعہ پُرسکون مسکراہٹ کے ساتھ دکھائی دی جیسے کہہ رہی ہو اب کوئی مسئلہ نہیں ہے اور پیچھے مردانہ مسکراہٹ بھی اس کی تائید کر رہی تھی۔ البتہ بیچ چشم میں تو ہالی وڈ فلموں کے ولن کی طرح دھمکی کے موڈ میں تھا۔ حیرت کا ایک اور جھٹکا، مدیرِ اعلیٰ کا کرکٹ پر تبصرہ، واہ کمال کر دیا۔ تین، چار دن پہلے ہی تو یونس خان کی بلے بازی دیکھی اور آج اسی کا تذکرہ جاسوسی میں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی ٹی وی پر دیکھ رہے ہوں۔ بعد میں مصباح الحق کے چھکوں نے بھی کمال کر دیا۔ پاک ٹیم اتنا اچھا کھیل رہی ہے تو اچھا لگ رہا تھا۔ ساتھ میں دل سے سرگوشی ابھری کہ کاش کوئی پاکستان میں کرپشن اور لوٹ مار کرنے والوں کے بھی چھکے چھڑا دے تو کتنا اچھا ہو۔ اب ذرا خطوط پر نظر دوڑائیں۔ روشی روز کو ویلکم کرتے ہیں۔ مختصر مگر بہت اچھا لکھا اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ابن ندامت بھی حیران نظر آئے، اچھی بیان بازی کی ہے۔ حاجرہ ہاشمی اور مہرین ناز آپ نے بجا فرمایا لیکن اصل بات یہ کہ میں پرانا قاری ہوں البتہ اب لکھنا شروع کیا ہے تو وہی پڑھنے والا نکھار سامنے آ رہا ہے۔ باقی آپ کا تبصرہ بھی جاندار ہے، بہت اچھا لگا آپ کی تحریر پڑھ کر۔ طاہر چوہدری بھی رومینٹک انداز میں نظر آئے، سبھی نے بہت اچھے تبصرے کیے، دل خوش ہو گیا۔ آوارہ گرد نے آسیہ کی موت پر سوگوار کر دیا۔ اینڈ میں شہزی کی گرفتاری نے سوچ میں ڈال دیا۔ اب اگلی بار دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ارسطو، سقراط، گراہم بیل اور آئن اسٹائن مجھے یاد ہیں لیکن میں اپنا نام بھول چکا ہوں۔ الف کو کب کی ماروی بھی اینڈ پر چل بسی۔ سندھ دھرتی کی جزوی گمشدگی بھی زبردست رہی، جواری کی سواری کیوں آہستہ آہستہ چل رہی ہے؟ یہ بھی ہر ماہ کی طرح ایک نیا معما دے جاتی ہے پھر بھی اچھی جا رہی ہے۔ ناول لکھتے وقت ایسا ابہام پیدا نہ ہو جس سے قاری کے ذہن میں الجھنیں جنم لیں۔ نکتہ گر ادبی میدان کی اچھی کاوش تھی۔ میرا کام ختم ہو گیا، انجم پر مصوراتی تخلیق کی تشکیل بھی خوف کے سائے میں ڈراؤنا تاثر دے گئی۔ تشکیل اچھی ہوئی برکت کی۔ مگر خود جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ انسان اگر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے تو اس کے دل پر سے بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر شاہد نے بے ضمیر کا کیس اچھے طریقے سے حل کرتے ہوئے اپنی زندگی کا کیس نوشین کی صورت میں حل کر لیا، بہت اچھی کہانی تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔ شارک کو حرکت کرتے ہوئے عدف سے عشق ہوتا ہے، رالف نے بڑی چالاکی سے جم کو چارا بنایا۔ دو سکے کی کہانی بھی سبق خیز تھی۔ کاش اسے یاد رہتا کہ لیپ کے سال میں فروری 29 دنوں کا ہوتا ہے تو یوں گردشِ ایام سے اس کے چودہ طبق نہ روشن ہوتے۔ لالچ کی منصوبہ بندی تو انجام بھی برا ہی ہوگا۔ ہر کہانی اپنے اندر منطقی انجام کا بہترین سبق لیے ہوئے ہے، سو دیکھیں ہمارے اندر ان کرداروں کی کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں، پس اپنی شخصیت کو پرکھیں اور سنواریں۔"

فتح پور سے سید محی الدین اشفاق کی تیز رفتاری "چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں۔ اس بار جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر کبیر

عباسی، ہمایوں سعید دونوں ٹائٹل گرل کو متاثر کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد خواجہ پہلے ہی صفحے پر براجمان تھے۔ روشی روز، محمد قاسم رحمان ویلکم۔ کبیر عباسی! یار انکل سیانے کا تعارف ذرا تفصیل سے کرواؤ۔ حاجرہ ہاشمی اینڈ مہرین ناز دونوں اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ احسان سحر سالگرہ کی مبارک باد۔ یار آپس کی بات ہے، آپ تو لڑکیوں کی طرح عمر چھپا رہے تھے۔ ہمایوں سعید فیض احمد فیض کی محبت بچ میں محفل میں آپ سے کی جاتی ہے۔ سید شکیل حسین کاظمی اور انعم ریاض کا تبصرہ اچھا تھا۔ کہانیوں میں جواری سے آغاز کیا۔ خاور کی زندگی میں مشکلات کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم وہ سکندر شاہ کے معاملات کو ویسے ہی حل کرتا جا رہا ہے۔ پلیز کہانی میں ہیروئن کو لے کر آئیں انکل۔ کہانی کا اینڈ ابھی نہ کریں۔ آوارہ گرد میں شہزی کو ایکشن میں دیکھ کر اچھا لگا۔ مگر اس میں رکاوٹیں بھی ہیں۔ آسیہ نے اپنی جان بچ کے لیے نچھاور کر دی۔ بیگم صاحبہ پر آئی ہوئی مشکلات کو شہزی کیسے کم کرتا ہے اور کیا وہ خانم کے مشورے پر جیل چلا جائے گا؟ قسمت آزما میں کاشف زبیر صاحب ہمیشہ کی طرح ایک زبردست تحریر کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔ عدیل محبت میں ناکام ہوا مگر آخر میں اس نے ایک سچی محبت پالی اور اپنی سابقہ محبت کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجموعی طور پر جاسوسی شاندار تھا۔“

سندھلیانوالی سے علی رحمان کی بے قراری ”ماہ شمارہ نومبر معمول سے کافی ہٹ کر بڑی جلدی 2 تاریخ کو ملا۔ پہلی بار جاسوسی کا سرورق انتہائی خوب صورت سا لگا۔ خوشی سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جو سرورق کی صنف نازک نے پونچھ لیے۔ سرورق کی لڑکی ہنس کر کہہ رہی تھی میں روؤں یا ہنسوں اور تم سے کیا کہوں۔ سرورق کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ محفل میں جا پہنچے تو محمد ہمایوں سعید آئے مگر لگتا ہے گوشت زیادہ کھا لیا تھا اس بار سنجیدہ ہو کر آئے۔ عرفان راجہ بلیک لسٹ میں نظر آئے، میں محفل میں مصروفیت کے سبب نہ آسکا۔ پتا نہیں انکل کو ہم سے کیا دشمنی ہے جو کہانی لکھتے ہیں بتاتے نہیں ہیں کہ وہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں۔ ماریہ خان اب تو تبصرہ شائع ہو گیا خوش ہیں۔ سالگرہ مبارک احسان سحر کو۔ کبیر عباسی! مری کا موسم کیسا ہے؟ محمد خواجہ کو کرسیِ صدارت مبارک۔ روشی روز کیسا نام ہے مگر خوش آمدید۔ ماہا ایمان کی کمی محسوس ہوئی۔ انور یوسف زئی، شکیل کاظمی، مہتاب گل رانا، انعم ریاض، کاشف علی میراں، احسن اوہ سوری احسان سحر اور ہمایوں سعید کے تبصرے بہترین تھے۔ کہانیوں کی ابتدا ایچ اقبال کی کہانی سے کی۔ ماشاء اللہ اچھا لکھتے ہیں۔ ایچ اقبال سے کوئی ناول لکھوائیں۔ کوکب کے بھائی جمیل نے اچھا نہ کیا۔ کوکب کو درفشاں تو مل گئی مگر ماروی بھی تو محبت کرتی تھی مگر آخر میں مر گئی، کہانی دکھی کر گئی۔ اس کے بعد تیز ترین سلسلہ آوارہ گرد پڑھا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آسیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، بے موت ماری گئی۔ بیگم صاحبہ غائب ہیں۔ روشن خان نے شہزی کو جیل میں ڈالا مگر شہزی کو زبیر خان کے آدمی نکال لے گئے۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا شہزی اتنا خوب صورت ہے کہ عابدہ، شکیلہ، زبیر خان کی بیوی اور آسیہ جیسی خاتون اس پر مرمٹیں۔ (شک کیوں ہے... کیا مردوں میں خوب صورتی مفقود ہوتی ہے؟) اس کے بعد جواری پڑھی، یہ قسط بہترین تھی۔ مراد کی موت دکھی کر گئی مگر سکندر کی دیوانگی سے مزہ آیا۔ گردشِ ایام سلیم فاروقی کی بہترین کہانی تھی۔ نادر کو ضمیر نے مزہ چکھا دیا۔ نادر بے چارہ لیپ سال کو بھول گیا تھا۔ پہلا رنگ اسما قادری کے قلم سے تھا۔ بڑا اچھا تھا۔ ضمیر کے ساتھ اچھا ہوا۔ رافعہ کے علاوہ دوسری لڑکیوں کو برباد کرنے والا انجام کو پہنچا۔ انسپکٹر شاہد سلیم کی شادی ہو گئی۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کے بہترین قلم سے تھا۔ کاشف زبیر اگر ترجے نہ کریں تو اچھے لگتے ہیں۔ عدیل کو دولت تو مل گئی مگر محبت نہیں۔ تصویر کا معیار اور ڈیزائننگ اچھی تھی۔“

پشاور سے طاہرہ گلزار کی داستانِ امیر حمزہ ”اپنا خط نہ پا کے دل بہت دکھی ہوا۔ اتنی مصروفیت میں بھی اپنے سویٹ سویٹ جاسوسی کو پڑھنا اور خط لکھنا اور ستم اس پہ یہ کہ شائع بھی نہ ہو تو محبت بھرا دل ٹوٹنے کا نہیں تو اور کیا ہوگا؟ اے ردی کی ٹوکری اور ڈاک خانے کے کالے بکس اللہ کرے میرا خط آپ دونوں کو ہضم نہ ہو۔ سرورق گزارے لائق تھا۔ ایک صنف کرخت انگوٹھا دکھا کر مسکراتا نظر آیا تو دوسرا اس کو طمانچہ دکھا کے ڈرا رہا ہے کہ خبردار میری باجی کو کچھ مت کہنا۔ رائٹرز میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور احمد اقبال کے علاوہ جمال دستی، عمار آزاد، منظر امام، اسما قادری اور کاشف زبیر جیسے بڑے نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ اب دیکھتے ہیں کچھ دوستوں کے خطوط شاید کوئی نئی بات کا علم ہم جیسے کم علموں کو ہو جائے۔ کورنگی کے محمد خواجہ اپنے احساسات کے ساتھ حاضر تھے، مبارکاں خواجہ صاحب۔ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ، واقعی خواجہ جی اس بار آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ محمد قاسم رحمان! شکریہ بھائی یاد کرنے کا، آپ آتے رہیں۔ کبیر عباسی بھائی! جواب ادارے نے خوب دیا اور یہ آپ انکل سیانے مستانے کو رکھ کر ہر وقت مری کی گلیوں میں کیا ہو ہا ہو ہا کر رہے ہوتے ہیں اور بھائی کیا یوفون والوں نے رشوت میں فری منٹ دیے ہیں کیا؟ ڈاکم علی گورچانی کا خط بھی زبردست رہا۔ ڈاکم صاحب HEART CATCHER کو ذرا پہچان کے تو بتائیں کہ یہ کون صاحب ہیں۔ رومی انصاری صاحب ایک نہ دو، ہی غلام ذہن والی بات، شرلاک ہومز بھی انسان ہے اور اول خیر بھی انسان ہے۔ ویسے تبصرہ اچھا کرتے ہو۔ ادریس احمد خان بھائی! یہ کیا، اتنا مختصر خط لکھا۔ قصور کے کاشف علی کا طویل خط۔ ادارے والے چند من پسند لوگوں کے تبصرے بہت طویل چھاپتے ہیں لیکن کچھ کہیں تو شکایات کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارا تو دل بہت دکھی ہو جاتا ہے۔ ہمایوں سعید آپ اور ادارے والے بادام اور ماجون کھایا کریں اور دل و نظر سے نفرت کا پردہ ہٹا کر دیکھیں تو میرے خط کا ایک ایک لفظ ہیرے کی طرح جگمگاتا نظر آئے گا۔ تعصب ختم کریں اور خوش رہیے۔ ہمایوں صاحب ہر بات کے لیے مغرب کو کیوں الزام دیتے ہو، کبھی اپنے معاشرے کی منافقت ملاحظہ کی ہے۔ آزاد کشمیر کے افتخار حسین اعوان کا طویل اور دلچسپ خط اچھا لگا، بھائی یہ جادو مجھے بھی سکھائیں۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے میرے الفاظ ان کو کاٹنے لگتے ہیں۔ (یہ کیا بات کی ہے... ہمارے لیے سب بے حد محترم ہیں... اور اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟) اپنے طویل تبصرے کے ساتھ مہتاب گل رانا حاضرِ محفل تھیں۔ زینب نور کو بہت پیار اور دعا میری طرف سے۔ آتی رہا کریں۔ انور یوسف زئی بھی ہمایوں سعید کی قصیدہ گوئی کرتے نظر آئے، خیر تو ہے۔ بھائی ہم پٹھان ہزاروں قوموں سے اچھے ہیں۔ سید شکیل حسین کاظمی کا خط بھی کافی دلچسپ لگا۔ طاہر چوہدری آخری مرحلے میں نظر آئے۔ آغا فرید، تفسیر عباس، بابر عباس، قدرت اللہ اینڈ ماہا ایمان! پلیز حاضر ہوں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر آوارہ گرد جو جاسوسی کی جان ہے۔ زبردست ایکشن سے بھرپور قسط، چوہدری ممتاز کی بدخصلت

کے ہاتھوں آسیہ مرگئی اور شہزی کی مثال آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ احمد اقبال کی تحریر جواری اس بار تو سب اچھا ہی اچھا ہونے کا فلمی سین تھا۔ مراد مرگیا، باقی سب ٹھیک ہوگئے۔ سرورق کی دوسری کہانی پہلے پڑھی کیونکہ ایکشن کہانیوں کے رائٹرز میں کاشف زبیر میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ کاشف زبیر کی یہ شاہکار تحریر قسمت آزما، ایک معاشرتی کہانی جو آج کل کمپیوٹر اور موبائلز کے استعمال کی وجہ سے جو غیر اخلاقی اور مجرمانہ سرگرمیاں نوجوان کررہے ہیں اور شارٹ کٹ کو اپنا رہے ہیں۔ کہانی کا ایک ایک لفظ شاندار۔ ویلڈن کاشف زبیر۔ اسما قادری ایک بڑی رائٹر جو معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ ان کی شاہکار تحریر بے ضمیر واقعی ایک شاندار تحریر تھی۔ دونوں سرورق کے رنگ شاندار تھے۔ بہت عرصہ ہوگیا شامی اینڈ تیمور کا کوئی نیا کارنامہ سامنے نہیں آیا۔ ادارے والوں سے درخواست ہے کہ جاسوسی کے لیے ناصر ملک صاحب اور ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب سے کچھ شاہکار تحریر لکھوائیں۔ مجھے یقین ہے میرے باقی تبصرہ نگار دوست بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔“

اعجاز سرور کالونی سے عثمان راشد کی درخواست ”میں نے آپ کے جاسوسی ڈائجسٹ کو بہت بار پڑھا ہے اور اس کی کہانیوں پر بھی بہت پُراثر تبصرہ کیا ہے لیکن پہلی مرتبہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک چھوٹی سی کہانی لکھی ہے جو کہ آپ کے ڈائجسٹ میں شائع کروانے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کے رائٹر (لکھاری) بہت اچھے ہیں اور بڑی پُراثر کہانی لکھتے ہیں اور ہر کہانی بہتر سے بہترین ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے مقابلہ نہیں کرنا بلکہ ان کی کہانیوں کے مقابلے میں میری کہانی ایک ادنیٰ سے درجے کی ہے اور شاید ان کی سی پُراثر نہ ہو لیکن آپ کو اگر پسند آئے تو میری درخواست پر غور کریں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اپنا تعارف [illegible] کرایا۔ میں جام پور کا ایک رہائشی ہوں اور سیکنڈ ایئر میں ہوں، میں آپ کے ڈائجسٹ کو مثالی مانتا ہوں کیونکہ اس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اس لیے اس میں شرکت کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ کو میری کہانی پسند آئے جو کہ خط کے ساتھ ہی ہے تو اس پر غور فرمایئے گا۔“ (کہانی پڑھ کے ہی پتا چلے گا کہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں)

لاہور سے زویا اعجاز کی زوردار آوری ”جاسوسی ڈائجسٹ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین طور پر پہلی ہی کوشش میں دو نومبر کو مل گیا ورنہ تو ڈاکٹری نسخے کے مصداق صبح دوپہر شام بک اسٹال کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ عینک والا جن اوہ۔۔۔ سوری میرا مطلب ہے عینک والے بھائی صاحب اپنی پستول سے ڈھٹائی سے دانت کھوستے ہوئے بندے کو ڈرانے کی ناکام کوشش میں ہلکان نظر آئے اور ہونٹوں پر دلآویز تبسم سجائے دوشیزہ ان دونوں ہی سے انجان نظر آئی۔ ادارے میں ایڈیٹر نے کرکٹ کے میدان سے ملنے والی نایاب خوشخبری کو موضوعِ گفتگو بنایا، ہماری طرف سے بھی قوم کو 32 سال بعد آسٹریلیا کے خلاف تاریخی فتح بہت مبارک ہو۔ اب ذرا ہاتھ صاف کیا جائے اراکین اکھاڑا اوہ سوری میرا مطلب ہے اراکینِ محفل پر۔ شہنشاہِ جنات میرا مطلب ہے کہ شہزادہ کوہسار کے انکل سیانے کچھ زیادہ ہی شوخے ہوتے جارہے ہیں۔ بابا جی! اپنی صحت دے حساب نال کم کرو۔ حاجرہ ہاشمی اینڈ مہرین ناز! jdc آپ کو کس اینگل سے jdp لگا ذرا یہ وضاحت بھی کردیتیں۔ کاشف علی میراں! آپ کدھر سے رستہ بھول آئے، ویلکم بیک۔ اب پھر سے کہیں گواچ نہ جانا۔ ابنِ ندامت! آپ کبھی بھی جاسوسی اور پاکستانی کرکٹ ٹیم کو انڈر اسٹیمیٹ نہ کیجیے گا۔ یہ کبھی بھی کہیں بھی حیران کرسکتے ہیں۔ افتخار حسین! یہ چار پانچ ماہ کی غیر حاضری کی جو آپ نے توضیح دی ہے، اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ماہتاب گل! آپ ہی کی طرح ہماری بھی تمام تر رائٹرز اور مبصرین سے ملاقات فیس بک پر ہی ہوئی۔ وڈے شاہ جی! لیجیے تین ماہ بعد ہم آہی گئے واپس۔ رحیم یار خان والے بکّے چودھری بھی فل فارم میں ہیں۔ شاباش کاکا جی، لگے رہو۔ کہانیوں میں اس مرتبہ بڑے بڑے نام نظر آئے۔ ایچ اقبال کی جزوی گمشدگی بس جزوی سا ہی متاثر کرسکی۔ کہانی کا پلاٹ جن بالی وڈ موویز کا پلاٹ لیے ہوئے تھی ان کا نام لکھنے بیٹھوں تو سنسر کی قینچی جلال میں آجائے گی۔ کوکب کو بار بار خوابوں میں ماضی یاد آنا اور سب کچھ خود بخود سامنے آتے چلے جانا، تیمور کے انکشافات گویا ایک لطیفہ ہی تھے (پھر تو آپ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوگئی ہوں گی)۔ ماروی اور حکیم صاحب کا کردار بہت جاندار تھا۔ ماروی کی فلمی موت بھی ہضم نہیں ہوئی۔ اس کی شہر آمد کے حالات کچھ واضح ہونے چاہیے تھے۔ آوارہ گرد اور جواری کے ہیرو صاحبان کو فوری طبی معائنے کی اشد ضرورت ہے۔ فرید کو خواب دیکھنے کا کوئی مرض لاحق ہوچکا ہے اور ہمارے نئے نویلے پھنّے خان شہزی کاکا کو عارضہ بلڈ پریشر۔ ہر دو منٹ بعد اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور کنپٹیاں سائیں سائیں کرتی ہیں۔ آسیہ کا انجام بہت دردناک تھا۔ زرد صحافت انسانی قدروں کا خاتمہ کرچکی ہے۔ اسما قادری نے ایک نہایت نازک معاشرتی موضوع کو بہت مہارت سے بیان کیا۔ ضمیر جیسے ناسوروں کی افزائش میں ان خواتین کا بھی ہاتھ ہوتا ہے جو سب کچھ جانتے اور باشعور ہوتے ہوئے بھی اس کھائی میں بصد شوق جاگرتی ہیں اور ساری زندگی کا داغ دامن پر لگائے نمونۂ عبرت بن جاتی ہیں۔ جانے کیوں ان کو لگتا ہے کہ ان کی زندگی میں آنے والا فرد ہی دنیا سے نرالہ ہے جو کبھی غلط نہیں ہوگا۔ کاشف زبیر کی قسمت آزمانے بالکل بور نہیں ہونے دیا شرجیل جیسے کتنے ہی نوجوان موجودہ وقت میں اپنی ذہانت منفی ہتھکنڈوں میں استعمال کررہے ہیں۔ کتنے ہی بہترین دماغ غلط حکومتی پالیسیوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ عدیل کی قسمت اچھی تھی جو اس دلدل سے نکل آیا۔ منظر امام کی تخلیل ایک حساس اور سرپھرے آرٹسٹ کا عمدہ احوال تھی۔ چارا کا انجام بہت خوفناک تھا۔ گردشِ ایام میں نادر علی کی منصوبہ بندیوں کا محل ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہوگیا۔ اختتام نے بہت محظوظ کیا۔ قتلِ اول کا اختتام بھی بہت مزے کا تھا۔ آپ اپنے دام میں آگیا صیاد۔ نکتہ گر نے رائٹر حضرات کی بےبسی و چالاکیاں دونوں ہی کمال واضح کیں۔ معاوضہ، قیام گاہ اور سازش بس ٹھیک تھیں۔ مریم کے خان کی طرف سے کسی بار اسٹوری کا انتظار ہے اور کیا کمنٹس بھی ای میل کے ساتھ بھیجی جاسکتی ہیں؟“ (جی ہاں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ کاشف عزیز، کوٹری۔ حمیرا اقبال، کراچی۔ وقار احمد، میرپور خاص۔

بدلا ہوا زمانہ

احمد اقبال

ہر شخص کی زندگی کی اپنی حدیں ہوتی ہیں... ہزار ہا گزرگاہوں کے باوجود ہمارے خواب اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ لامحدود ہوتے ہیں... وہ وقت اور لمحات کی قید میں ہوتے ہیں... لیکن ہمارے تصورات ان سے آزاد ہوتے ہیں... وہ بہت پہلے اس سرحد کو پار کر جاتے ہیں جہاں زندگی ایک لازوال اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے... ہمارا تصور... صدیوں کا فاصلہ طے کر لیتا ہے... خوابوں اور تصورات کی دنیا سے نکل کے حقیقی جہاں کا سامنا کرنے والے دو ایسے ہی نوجوانوں کی داستانِ دگرگوں... جو گردشِ دوراں کے کمزور لمحوں کی کٹھنائیوں میں ایسے الجھے کہ ان کی زندگی کے سنہرے دن تنگ و تاریک زنداں کی نذر ہو گئے... وہ دن کھلکھلانے... تتلیوں کے پیچھے بھاگنے... اور تعلیم کی عظیم والشان منازل طے کرنے کے تھے مگر بادِ سموم نے انہیں بکھیر کے رکھ دیا... زمانے کے چلن سے ناآشنا... ناتجربہ کاروں کی بقا کا سنسنی خیز کھیل ہر موڑ... پر ایک بند گلی ان کی منتظر تھی... گزرے ہوئے ماضی کا ہر پل ان کے آنے والے کل کے لیے ایک خوفناک تازیانہ تھا...

آزمائش کی کڑی دھوپ میں آبلہ پا جانبازوں کا سفر... کشمکشِ حیات کی پل پل رنگ بدلتی کہانی...

دوسری کال سے اس نے اندازہ کیا کہ رات کتنی گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے۔

اس کے ساتھ فرش پر چت لیٹ کر چھت کو خاموشی سے گھورنے والا ایاز خان بھی وہی سوچ رہا تھا جو قاسم۔ اس سے سوال کیے بغیر وہ بتا سکتا تھا کہ آنے والی صبح دور نہیں۔ پھر بھی یہ ناقابلِ یقین سی بات لگتی ہے کہ اس رات کی صبح بھی ہوگی۔ اور دن ہر روز کی طرح طلوع نہیں ہوگا۔ صرف ان دونوں کے لیے۔ باقی سب اسی لیے سکون سے تھے اور جس حال میں بھی تھے، گزرے ہوئے دن کی ساری تھکن کا ازالہ کر کے آنے والے دن کی مشقت اور معمول بن جانے والے تشدد کو برداشت کرنے کے لیے جسمانی قوت کو بحال کر رہے تھے۔

''ابے قاسم! کیا سچ مچ'' ایاز خان پھر بولا۔ ''صبح ہم آزاد ہو جائیں گے؟''

قاسم نے اس کے ایک لات رسید کی۔ ''سچ مچ کی اولاد''

ایاز ہنسا۔ ''کچھ نہیں ہوتا لاتیں مارنے سے۔ دراصل میں یہی حساب کر رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں کتنی بار میری چھترول ہوئی۔ بالکل تھانہ اسٹائل میں۔ ہزار بار تو نہیں، دو سو بار تو ہوئی ہوگی۔''

''اچھا تھا ڈائری میں لکھتا جاتا۔ کتنی گالیاں، کتنے ڈنڈے، کتنے تھپڑ، مکے اور ٹھڈے اور کتنی بار چکی وارڈ کے پنجرے میں رکھا گیا۔''

وہ سر ہلانے لگا۔ "سچ بتاؤں قاسم، وہ سب میں بھول جاؤں گا بلکہ بھول گیا مگر شروع شروع میں جب وہ مجھے رات کو لے جاتے تھے۔ کم عمر ہی نہیں، میرا رنگ بھی گورا تھا اور میں صرف ایک بار بولا تھا۔ ایسا جواب دیا تھا کہ سب کی ماں بہن..."

"پھر بھگتا بھی تو تھا مگر جانے دے ایاز۔ ہم دونوں کا وقت گزر گیا۔ کیسے قاعدے ضابطے، اخلاق کے تقاضے اور انسانی اصول۔ یہ دنیا ہی الگ ہے کوئی جب تک یہاں کچھ دن نہ رہے اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ جیل کیا ہوتی ہے۔ باہر سڑک پر سے گزرنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ ان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے سلاخوں اور تالوں والی کوٹھریاں ہیں جن میں مجرم بند ہوتے ہیں اور دن میں ان سے جیل مینوئل کے مطابق کام لیا جاتا ہے۔ کھانے کو اچھا نہیں ملتا اور بس یہی سزا سب کاٹتے ہیں اور پھر نکل آتے ہیں۔ اندر کے اصل عذاب کی تو کسی کو خبر بھی نہیں۔ خیر چھوڑ، وقت گزر گیا اور ہم زندہ سلامت ہیں۔"

"اب تو لگتا ہے کہ وہ زندگی کسی اور کی تھی۔ ہماری جیل سے پہلے کی زندگی۔" ایاز خان اٹھ بیٹھا۔

"ہاں، ہم کسی اور دنیا سے آئے تھے اور اب ایک نئی دنیا میں پہلا قدم رکھیں گے۔"

ایاز ہنسنے لگا۔ "اپنے باوا آدم اور اماں حوا نکالے گئے تھے جنت سے... ہم نکالے جائیں گے جہنم سے۔"

"آدمی جب دنیا میں آتا ہے۔ وہ پہلا دن سالگرہ کے طور پر مناتا ہے اور بیس پچیس سال لگا دیتا ہے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں۔"

"بچہ گدھے کا ہو یا مرغی کا... اسے قدموں پر کھڑا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ معلوم نہیں میں کیا کروں گا۔ کم سے کم آدھی تو گزر چکی۔ باقی آدھی گزارنے کے لیے میرے دماغ میں کوئی پلان نہیں۔ تجھ سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔"

"کوئی کسی سے نہیں سیکھتا ایاز خان، وقت سکھاتا ہے سب کچھ... اگر آدمی سیکھنے والا ہو۔ ورنہ راستے کا پتھر سو سال وہیں پڑا رہتا ہے اور اس کے نیچے سے پھوٹنے والا ننھا سا پودا اتنا لمبا چوڑا اور پھیلا ہوا درخت بن جاتا ہے۔"

"سچ کہتا ہے جانی۔ تیرے جیسے سارے ہوتے تو سب ایم اے پاس کر کے نکلتے۔ مگر یہاں الٹی تربیت ملتی ہے۔ بلی کا بچہ یہاں سے شیر بن کے نکلتا ہے۔ جیب کترا ہو تو ڈاکو بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ کچھ نہیں بنتا۔ میرے جیسا الو کا پٹھا ہی رہتا ہے۔ جو میں پہلے بھی تھا اور نکل کے بھی رہوں گا... لے سگریٹ پی۔"

قاسم نے اس سے سگریٹ لے لی۔ "تجھے یہ دن یاد آئیں گے..."

"ہاں، بہت عرصہ تو مجھے باہر کی دنیا بھی اندر کی دنیا لگے گی۔ لوگ بھی ویسے ہی نظر آئیں گے۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ دو چار تو مستحق ہیں کہ میں انہیں اذیت دے کر قتل کروں جیسے انہوں نے مجھے قتل کیا تھا۔ ایک شریف اور سیدھے سادے لڑکے کو ہر رات کئی بار... مگر تو نے بریک لگا دیے میرے خیالوں پر۔ اور کیا تھا یہاں یاد رکھنے کو۔ ایک تو وہ تھی جو خود کو میرا سمجھتی تھی۔ اس بڈھے کانسٹیبل کی بیوی... اس نے بہت اکسایا مجھے بھاگنے پر اور بھاگ گئی بالآخر کسی کے ساتھ... ایک وہ تھی' چار بچے ضائع کیے گئے اس کے پھر خود ضائع ہو گئی۔ مجھے بہت اچھی لگتی تھی وہ۔ اگر میں بھاگ سکتا تو اسے لے کر نکل جاتا۔"

خاموشی کے ایک اور وقفے میں وہ دونوں چھت پر سینما اسکرین کی طرح چلنے والی فلم دیکھتے رہے جس میں گزرے ہوئے وقت کے وہ سارے منظر تھے جو اُن کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکے تھے۔ کسی طویل سفر کے مسافر کی طرح جو تھکن اور بیزاری سے بدحال کسی ریلوے اسٹیشن پر اترے تو انجن کی اس سیٹی کو یاد کرے جو ٹرین کو کھینچنے والے انجن نے حرکت کرتے وقت بجائی تھی۔ وہ وقت... وہ جگہ کتنا پیچھے رہ گئے لیکن جیتے جاگتے منظر کی طرح یادوں کے البم میں محفوظ تھے۔

☆☆☆

قاسم نے کسی قلعے کے مضبوط فولادی اور بلند و بالا دروازے کے دو پٹ صرف اتنی دیر کے لیے جدا ہوتے دیکھے جتنی دیر میں نووارد مہمان کا مظلوم وجود اس میں سے گزر جائے۔ جیسے کوئی اژدھا جو اپنے شکار کو منہ کھولے اور بند کر کے نگل جائے۔ آگے صرف اذیت اور عذاب کی دنیا تھی جس میں سب اپنے اپنے حصے کی سزا کاٹ رہے تھے، کسی نے بھی قاسم کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ جیسے کسی اسپتال کے جنرل وارڈ میں۔ نہ کوئی مرنے والے کی طرف دیکھتا ہے نہ پیدا ہونے والے کی طرف... یہ تو ہر روز ہر وقت ہوتا رہتا ہے... لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

وہ بھی اس ہجوم میں شامل کر لیا گیا۔ جیل کے معمولات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں چند دن ضرور لگے جو سیکھنے اور سکھانے کا کریش پروگرام تھا۔ اٹھتے بیٹھتے

سوتے جاگتے گالی... لاتیں... تشدد اور تذلیل... جتنا چاہو چیخو چلاؤ اور گالیاں دو یا احتجاج کرو۔ صبر اور خاموشی کے ساتھ سب قبول کرنے کے لیے ہفتہ دس دن کافی ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ہمدردی کرتا ہے نہ سمجھاتا ہے اور مشورہ دیتا ہے۔ آدمی خود اپنی عقل اور حوصلے سے جینا سیکھتا ہے اور اپنی زندگی کو زیادہ مشکل یا آسان بناتا ہے۔ اس کو پہلے تین افراد کے ساتھ ایک کوٹھری میں رکھا گیا۔ وہ سب قتل کے جرم میں عمر قید کاٹنے والے بڑے پاپی تھے۔ ان کو باہر سے سگریٹ کیا ہیروئن اور دیسی شراب تک فراہم کر دی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ پہلی رات کے عذاب کو یاد کر کے آج بھی قاسم کا دل چاہتا تھا کہ انہیں قتل کر دے اور پھر خود مر جائے مگر پہلے اسباب میسر نہ تھے اور بعد میں... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا... والی کیفیت نے قاسم کو بے حس بنا دیا تھا۔ ایاز خان کا اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں بڑا ہاتھ تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔

جیل کی پہلی صبح قاسم پر بہت بھاری تھی۔ حاضری کے وقت اسے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی جو باہر آنا چاہتی تھی۔ قاسم کو اس کی بو گٹر کے سیاہ پانی جیسی محسوس ہوتی تھی، گٹر اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور چکرا کے گر گیا۔ اسے مردہ کتے کی طرح ٹانگ پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے ایک طرف ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو تقریباً اس کا ہم عمر نوجوان چائے کا مگ لیے اس کے پاس بیٹھا تھا۔

”تیرا پہلا دن ہے؟ پہلے دیکھا نہیں تجھے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“ وہ پشتو لہجے میں اردو بالکل صاف بول رہا تھا۔ ”میرا نام ہے ایاز خان... مجھے سال ہونے والا ہے۔ قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہوں... ہمارا لمبا ساتھ ہے۔“

قاسم اٹھ بیٹھا۔ ”نہیں... میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“

”میں بھی ایسا ہی کہتا تھا۔ ایک ہفتے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ جو میرے ساتھ ہوا تھا تیرے ساتھ بھی ہوا۔ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن مرتا کوئی نہیں۔“

”میں ان سب کو ماردوں گا پہلے...“ وہ گھٹنوں میں سر دے کے رونے لگا۔

ایاز خان ہنسا۔ ”کلاشنکوف سے؟ وہ اپنے ساتھ لایا ہوگا تو... یار بس مجھے چھوڑ دینا۔ لیکن ابھی ایک کام کر... یہ مگ پکڑ اور چائے پی۔ گرم ہے ابھی۔ میں تیرے لیے لایا تھا۔ اپنے لیے بھی لے آؤں... لنگر بند ہو جائے گا۔“

وہ کچھ دیر میں پھر نمودار ہوا۔ ”او یارا... ابھی تک رو رہا ہے۔ اچھا چائے پی کے باقی آنسو بہانا۔“

ایاز کی قاسم کو چائے پلانے کی کوشش ناکام رہی۔ گزشتہ رات کے تینوں ساتھی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ”کیسے رو رہا ہے۔“ ایک نے ہنس کے وہ گالی دی جو وہاں سب سے مقبول تھی۔

”ابے تکلیف میں کیا آدمی روئے گا بھی نہیں۔ دو چار دن میں عادی ہو جائے گا۔“ دوسرا بولا۔

قاسم نے چائے اوپر... اچھال دی اور مگ اس کے منہ پر دے مارا۔ ایاز کی مداخلت رائگاں گئی۔ وہ پرانے پاپی تھے اور کچھ بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے قاسم کو لاتیں، مکے مار مار کے نیچے گرا دیا اور پھر اس کو ننگا کر دیا۔ جیل کے کسی محافظ نے مداخلت ضروری نہیں سمجھی۔ اس پہلے ہفتے میں قاسم نے ہر قانونی غیر قانونی اور غیر اخلاقی تشدد برداشت کیا۔ صرف ایاز خان تھا جو اس سے بات کرتا تھا تو اسے عقل سے کام لینے اور دماغ ٹھنڈا رکھنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ قاسم اسے بھی گالیاں دیتا مگر وہ ڈھیٹ بنا ہنستا رہتا... بار بار وہی بات دہراتا کہ تھوڑے دن کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب تو سمجھ لے گا کہ یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ دو ہفتے بعد حالات بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔ جیل میں زندگی گزارنے کا عملی سبق اسے پڑھا دیا گیا تھا۔ غصہ جو پہلے اس کے قابو میں نہیں تھا اب برداشت کی حد میں آ گیا تھا۔ ایاز اس کے دماغ کی لگام مسلسل کھینچتا رہتا۔ بریک لگا بریک قاسم... وہ بات بات پر کہتا۔ دیکھ بچے! کتنی زندگی تو نے باہر اپنی مرضی سے گزاری۔ یہ تھوڑی سی مشکل زندگی دوسروں کی مرضی سے گزار لے گا تو اس کے بعد پھر اپنی مرضی سے جینے کا حق مل جائے گا۔ زندگی بڑی لمبی ہے قاسم... عمر قید کاٹ کے بھی بہت دن ملیں گے۔ ابھی تو جوانی ہے، جوانی ساری پڑی ہے۔“

قاسم کو اس کی باتوں پر بہت حیرانی ہوتی مگر ایاز نے رفتہ رفتہ اسے قائل کر لیا۔ ”عقل سے بڑی طاقت کوئی نہیں۔ یہ جو ہمارے آس پاس ڈنڈے اور اسلحہ اٹھائے پھرتے ہیں، سب حکم کے غلام ہیں۔ غریب بھی ہیں اور بے وقوف بھی... میری تیری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ بس ان کی اتھارٹی کو چیلنج مت کرنا۔ فائدہ اٹھانا ہے تو انہیں سلام کر... بانس پر چڑھا انہیں۔“

اس کے سمجھانے سے قاسم کے لیے سخت حالات میں بھی جینا کچھ آسان ہو گیا لیکن انہیں بات کرنے کا موقع ہی بہت کم ملتا تھا۔ قاسم نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور جان لیا کہ اب سزا کی میعاد پوری کیے بغیر جیل کی دیواروں کے دوسری طرف کی دنیا میں واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ ابھی تک نہ اسے ایاز خان سے پوچھنے کا موقع ملا تھا کہ اس نے کسے قتل کیا تھا اور کیوں۔ نہ ایاز خان نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ شاید یہ غیر اہم تھا۔ آدمی خود کب کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں اور حالات ہر قتل کے پیچھے وہی ہوتے ہیں۔ زر... زن... زمین... کردار یا واقعات بدل جانے سے حقائق نہیں بدلتے۔

ابھی صرف ایک مہینا ہی ہوا تھا کہ ایاز خان اور قاسم ایک ساتھ ہو گئے۔ یہ کام ایاز نے اپنے تعلقات کی مدد سے کیا تھا جسے وہ ڈپلومیسی کہتا تھا۔ قاسم اور ایاز کے ساتھ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ ان کی کوٹھری آخر میں تھی جہاں جیل خانے کے اندر کی بے رحم آوازیں کم سنائی دیتی تھیں۔ قاسم نے جیل کے اندر آ کے پہلی بار سکون کا سانس لیا۔

اس رات پہلی بار قاسم نے پوچھا۔ ”ایاز! کس کو قتل کیا تھا تو نے؟“

”اپنے باپ کے قاتل کو... قتل نہیں کیا تھا پرانا قرض اتارا تھا۔ قصاص لیا تھا۔“ وہ بولا۔

”پرانا قرض؟“

”ہاں، بہت پرانا۔ پچیس سال پرانا۔“ وہ سگریٹ پیتا رہا۔ ”یہ ہماری روایت ہے۔“

قاسم حیران ہوا۔ ”تو پچیس سال اسے تلاش کرتا رہا؟“

”نہیں، اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ میں صرف سات سال کا تھا جب صرف ایک ہزار کی معمولی رقم کے لیے وہ میرے باپ کو قتل کر کے بھاگ گیا۔ وہ دونوں دوست تھے اور ایک شادی میں شریک تھے۔ رات کو یار دوست تاش لے کر بیٹھ گئے۔ جو میں نے سنا یہ تھا کہ دولہا نے اپنی موٹر سائیکل ہار دی اور پھر جیت لی۔ میرا باپ دس ہزار ہارا اور جیتنے والے کو دے دیے۔ اس نے گن کے نہیں لیے۔ جیب میں ڈال لیے۔ صبح گننے آ گیا کہ اسے نو ہزار ملے ہیں۔ اس پہ بات بڑھ گئی۔ میرا باپ بضد تھا کہ رقم پوری تھی۔ دوسرا مشتعل ہو گیا کہ تو مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔ اور بس... ڈز، ڈز... ریوالور سے دو گولیاں میرے باپ کے سر میں ماریں اور بھاگ گیا۔ روپوش ہو گیا۔ بہت عرصے بعد پتا چلا کہ وہ پاکستان میں بھی نہیں ہے۔ ولایت چلا گیا ہے۔ میں ایک ہی بیٹا تھا۔ ماں نے مجھے قسم دی کہ باپ کے قتل کا بدلہ لوں گا۔ وہ قسم نہ دیتی تب بھی یہ میرا فرض بنتا تھا۔ ایک ایک کر کے بہنوں کو رخصت کیا۔ پھر ماں کو سپردِ خاک کیا۔ میں سات سال کے بچے سے پچیس سال کا جوان مرد بن گیا۔“

”اٹھارہ سال تک تو نے کچھ نہیں کیا؟ میرا مطلب ہے پڑھا نہیں؟“

”پڑھا... صرف میٹرک تک۔ ہمارے علاقے میں کالج نہیں ہے اور زیادہ پڑھ کے مجھے کیا کرنا تھا۔ پروفیسر بن جاتا تو کیا ہوتا۔ یہاں نہ آتا تو مارا جاتا یا پھانسی ہو جاتی اسی لیے شادی بھی نہیں کی تھی کہ کوئی لڑکی بیوہ ہو گی اور بچے یتیم۔ سات سال تک میں اس کو تلاش کرتا رہا۔ خود ولایت نہیں جا سکتا تھا۔ آتے جاتے لوگوں سے پوچھتا تھا۔ جب اس کا باپ مرا تو وہ آیا۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ وہ رات کو آیا اور پھر صبح نکل گیا۔ پھر جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ آئے گا۔ ولایت سے آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں پشاور ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جہاز سے ہی آئے گا۔ اسے نہ آنا ہوتا تو ماں کی میت رکھی نہ جاتی۔ جیسے باپ کی نہیں رکھی گئی تھی۔ اسے سیٹ نہیں ملی تو وہ تدفین کے بعد تیسرے دن پہنچا تھا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے سامنے جا کے اسے شوٹ کر دیا۔ پوری چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں، میں وہیں گرفتار ہو گیا۔“

قاسم دم بخود سنتا رہا۔ ”تو نے اسے جنازہ بھی نہ پڑھنے دیا ماں کا؟“

”یار! مجبوری تھی۔ وہ گاؤں پہنچ جاتا تو یہ کام نہ ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اپنا بدلہ لینے کے لیے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے قبیلے والے مجھے دیکھتے ہی مار دیتے۔ یہ انہوں نے نہیں سوچا تھا کہ میں ایئرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔ قبیلے والوں کو صرف یہ پتا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے اور کب... قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ساتھ دیا۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قاسم نے کہا۔ ”تو اسے معاف نہیں کر سکتا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ہماری روایت نہیں ہے۔ میں بزدل اور بے غیرت کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ طعنے میری بہنوں کو بھی سننے پڑتے اور پھر ماں جو قسم دے گئی تھی۔“

”یہاں سے نکل کے تو کہاں جائے گا؟“

”پتا نہیں، کوشش کروں گا کہ روپوش ہو جاؤں۔ ورنہ

جسے میں نے قتل کیا تھا اس کے بیٹے مجھے قتل ضرور کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جیل کے دروازے کے باہر ہی میرا انتظار کریں۔ جیسے میں نے ائرپورٹ پر گیارہ گھنٹے کیا تھا۔ اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ میری رہائی کب ہو گی تو وہ ضرور آئیں گے لیکن ان کو نہ معلوم ہو... اس کا چانس زیادہ ہے۔ مجھے رعایت ملے گی جو سب کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی میری سزا کی میعاد میں پندرہ دن یا ایک مہینا کم ہو جائے۔ تاریخ کا پہلے معلوم ہونا مشکل ہے۔''

''روپوش ہو کے تو محفوظ ہو جائے گا؟''

''نہیں، موت ہر وقت میرے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ مگر میں خود کو قاتلوں کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟''

''مگر یار! یہ کیا زندگی ہو گی کہ موت ہر وقت ہر جگہ پیچھے رہے... تلوار لٹکتی رہے سر پر... اور تو بس بھاگتا رہے۔ اس نے بھی اٹھارہ سال گزار لیے تھے تیرے باپ کے قاتل نے مگر مارا گیا بالآخر... اتنی محنت کی۔ پیسا کمایا کس لیے؟ بیوی، بچوں کے ساتھ نہیں رہ سکا۔ خود کوئی خوشی نہ دیکھ سکا جو لمبی عمر پانے سے ملتی ہے۔ جب آدمی نانا دادا بنتا ہے۔''

ایاز نے ایک آہ بھری۔ ''تیری بات سو فیصد ٹھیک مگر یار یہ روایت اور خاندانی دشمنی کا نسل در نسل چلنے والا سلسلہ... یہ میں نے شروع نہیں کیا تھا اور نہ میں ختم کر سکتا ہوں۔ لیکن اب ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کوئی تجھ سے ملنے نہیں آیا، نہ بہن بہنوئی؟''

''بہنوں کا تو سوال نہیں۔ بہنوئی چھپ کر آئے تھے عید پر... عید کے کچھ دن بعد... کچھ چیزیں لائے تھے جو بہنوں نے بھیجی تھیں۔ میں نے منع کر دیا کہ آئندہ مت آنا... بعد میں بہت رویا میں... تیری ہے کوئی بہن۔''

''ہاں، مگر وہ بہت چھوٹی ہے سات سال کی۔'' قاسم نے بتایا۔

ایاز خان بولا۔ ''تو نے کس کو قتل کیا تھا؟''

''یار کسی کو بھی نہیں۔'' قاسم نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا مطلب؟''

''قتل میرے باپ نے کیا تھا۔ میں تو اس وقت بارھویں جماعت کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا اور بی اے کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری ماں کی خواہش تھی اور حکم بھی تھا۔ خود اس نے میٹرک کر لیا تھا جب اس کی شادی زبردستی کر دی گئی تھی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی، کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی اور اس کی عمر بھی نہیں تھی شادی کی۔ اس کا باپ ویگن چلاتا تھا۔''

''پھر کیا مجبوری تھی؟'' ایاز خان بولا۔

"اس کی مجبوری ایک ہی تھی، وہ عورت تھی۔ اس کا باپ مقروض تھا۔ اس نے ایک سود کا دھندا کرنے والے سے اپنی ویگن خریدنے کے لیے روپیہ لیا تھا۔ یہ ویگن کراچی میں ہونے والے لسانی فسادات کے دوران جلادی گئی۔ ادائیگی نہ کرنے سے قرض اتنی تیزی سے بڑھا کہ ادائیگی ناممکن ہو گئی۔ سود کا یہ کاروبار غیر قانونی ہوتا ہے تو اس کی وصولی کے طریقے بھی غیر قانونی ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قرض خواہ ایک دن دو غنڈے ساتھ لے کر گھر پہنچ گیا اور مقروض نے گھبرا کے اسے گھر کے اندر بلا لیا کہ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ گلی میں ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔"

"ہر آدمی بے عزتی سے ڈرتا ہے۔"

"ہاں، وہ اندر بات کر رہے تھے۔ بات کیا کر رہے تھے۔ ایک دھمکیاں دے رہا تھا، دوسرا منت سماجت کر رہا تھا کہ کچھ مہلت دے دو۔ کچھ نہ کر سکا تو یہ گھر بیچ کر قرض ادا کر دوں گا۔ اتنے میں میری ماں چائے لے کر اندر آئی اور صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔ میرے باپ کا رویہ نرم پڑ گیا۔ بعد میں اس نے کہا کہ مکان بیچ کے قرض ادا کرو گے تو خود کہاں جاؤ گے۔ تمہارا سارا قرضہ معاف کر دوں گا۔ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ وہ اس کی بات فوراً مان گیا۔"

ایاز خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے یار، ہم کہلاتے مسلمان ہیں اور کرتے ہیں وہ جو اسلام سے پہلے ہوتا تھا۔"

قاسم نے ایک آہ بھری۔ "میری ماں کے ساتھ یہی ہوا۔ میرے باپ کی عمر اس وقت بھی چالیس سال تو تھی۔ میرا باپ جنوبی پنجاب کے علاقے کا تھا۔ معلوم نہیں کراچی کب آیا تھا اور کیوں۔ وہ اَن پڑھ تھا لیکن حساب کتاب کر لیتا تھا۔ یہاں آ کے اس نے دکان کر لی تھی۔ وہاں ہر قسم کا جائز اور ناجائز کاروبار ہوتا ہے جیسے ہر جگہ ہو رہا ہے جبکہ میری ماں سود کے کاروبار کو حرام اور خطرناک بھی سمجھتی تھی کیونکہ وہ خود اس کا نشانہ بنی تھی۔ میرے باپ کے روابط اپنے جیسے لوگوں سے تھے جنہوں نے غنڈے، بدمعاش بھی پال رکھے تھے اور وہ تھانے والوں کو بھتا بھی دیتے تھے۔"

"پھر تمہارے گھر میں تو پیسے کی ریل پیل ہوگی؟"

"برکت کہاں ہوتی ہے ایسی کمائی میں ایاز! گھر میں کم لاتا تھا اور باہر زیادہ اڑا دیا کرتا تھا۔ وہی شراب، جوا اور پیشہ ور عورتوں پر... میری ماں تقدیر کو رونے کے سوا کیا کرتی۔ باپ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ خود لوٹ کے کبھی گھر نہیں گئی تھی۔"

"تجھے یہ سب اس نے خود بتایا؟"

"ہاں، جب میں چھوٹا تھا تو اسے مار کھاتا یا روتا دیکھتا رہتا تھا۔ میٹرک میں پہنچنے تک مجھے بہت سی باتوں کا پتا چل گیا تھا۔ عملاً یہ کہ میرا باپ بدکردار ہی نہیں، شکی مزاج بھی تھا۔ جس کے اپنے کرتوت ایسے ہوں وہ دنیا میں کسی پر اعتبار کیسے کر سکتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں میری ماں کے دو بچے تھے۔ میں اور میری بہن۔ اور خدا کی قدرت ہے جس نے اس کو خوب صورتی دی تھی۔ ایسے سخت حالات سے گزر کر بھی اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ اسی لیے میرا باپ اسے گھر میں بند رکھتا۔ کہیں ساتھ نہ لے جاتا۔ کسی کو گھر میں نہ آنے دیتا۔ وقت بے وقت گھر آ کے دیکھتا اور بلاوجہ مار پیٹ کرتا کہ ابھی کون آیا تھا۔ وہ روئے یا خدا رسولؐ کی قسمیں کھائے۔ اس کا شک برقرار رہتا تھا۔ جب میں نے ماں سے ہمدردی شروع کی اور باپ کے رویے پر برہمی کا اظہار کیا تو اس نے مجھے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہا کہ اس کی اپنی زندگی تو برباد ہوئی، پہلے باپ کی وجہ سے پھر شوہر کی وجہ سے۔ اب اس کی امیدیں بیٹے سے وابستہ ہیں۔"

"بہت اچھا کیا تو نے، یہاں بھی ایسے ہی عقل سے اور ٹھنڈے دماغ سے چلے گا تو کچھ نہیں ہوگا اور ایک بات پلو سے باندھ لے... اب تجھے جیل میں رہ کے پڑھنا ہے۔ بی اے کرنا ہے جو تو نہیں کر سکا تھا۔ پھر ایم اے... تجھے بہت فائدہ ہوگا، رعایت بھی ملے گی، یہاں ہر سہولت حاصل ہو جائے گی۔"

قاسم تلخی سے ہنسا۔ "اب کیا کرنا ہے بی اے، ایم اے کر کے... قاتل تو بن گیا۔"

"لیکن ماں سے کیا ہوا وعدہ تو اپنی جگہ ہے۔"

قاسم خاموش لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ "مگر وہ ماں کہاں ہے؟"

ایاز اٹھ بیٹھا۔ "اپنی ماں کے قتل کا الزام ہے... جو تو نے لیا اپنے سر؟ تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور میں نے ایسا کیا بھی نہیں تھا۔ لین دین کے کسی جھگڑے میں میرے باپ نے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا۔ ایک بار پہلے ایسا ہو چکا تھا۔ دوسری بار اسے قرض لینے والے کی بیوی پسند آ گئی۔ وہ دو بدمعاشوں کے ساتھ گھر میں گھسا تھا۔ انہوں نے مقروض کو بہت مارا۔ بہت توڑ پھوڑ مچائی۔ یہ سب مجھے بعد میں مقدمے کے دوران پتا چلا۔ مقروض کی بیوی چیختی چلاتی رہی اور ہاتھ جوڑتی رہی۔ اگلے دن میرا باپ ایسے وقت گیا جب عورت اکیلی تھی اور کہا کہ سارا قرض معاف ہو سکتا ہے اگر وہ چاہے... عورت نے

چالاکی دکھائی اور کچھ رضامندی ظاہر کی۔ یہ کہا کہ میں موقع دیکھ کر بلاؤں گی۔ تم لکھ کے دو گے کہ قرضہ وصول ہوا۔ میرے باپ نے جھوٹ بولا یا سچ اور کہا کہ پکی رسید پر وصولی لکھ دے گا۔ عورت نے اس سے فون نمبر لے لیا۔ بعد میں کسی دن اسے بلایا اور پکے کاغذ پر وصولی کی رسید سامنے رکھ دی۔ میرے باپ نے دستخط کر دیے۔ اب میں اندازہ کرسکتا ہوں اس سین کا... اس عورت کو میں نے مقدمے کے دوران اور اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اس کا اجلا بھرپور بدن بے حد پرکشش تھا۔ میرا باپ بھی انسان تھا، فرشتہ نہیں۔ میں اس کے کردار پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اس کا شوہر ہی ایسے لباس میں پسند کرتا ہو اسے... مگر وہ ہیجان خیز ضرور تھی۔ اس کے فون کرنے پر میرا باپ گیا تو اس کے جذبات کا آتش فشاں بھڑکا ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ پی کے گیا ہو۔ وہاں عورت نے زیادہ سنسنی خیز لباس میں اس کا استقبال کیا۔ اسے اپنے جسم کی بھرپور طاقت کو استعمال کر کے بہت بڑا فائدہ اٹھانا تھا۔ میرے باپ کے تو ہوش گم ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت عقل تو چلی گئی ہو گی ٹخنوں میں... عورت نے جو کاغذ سامنے رکھا اور جہاں دستخط کرنے کا کہا۔ وہاں اس نے دستخط بھی کر دیے اور انگوٹھا بھی لگا دیا۔"

"کتنا نقصان اٹھایا تیرے باپ نے؟" قاسم ہنسنے لگا۔

"دو لاکھ سے کچھ اوپر... دو لاکھ دس ہزار... اس کے بعد جیسے ہی میرے باپ نے قیمت وصول کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ایک ساتھ تین آدمی نمودار ہو گئے جو ادھر ادھر چھپے بیٹھے تھے۔ ایک اس کا شوہر تھا۔ دو پڑوسی... عورت نے چیخ پکار مچا دی تھی۔ میرے باپ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ عشق کا بھی اور شراب کا بھی۔ وہ ایک دم سمجھ گیا کہ یہ سازش تھی۔ وہ تینوں اس پر پل پڑے۔ اس کی ایک احتیاط یا عادت ہی میرے باپ کی بدقسمتی بن گئی۔ وہ بھرا ہوا ریوالور ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ریوالور نکالا اور دیکھے بغیر فائر کر دیا۔ گولی اس عورت کے شوہر کو لگی اور وہ وہیں مر گیا۔ میرا باپ بھاگا تو گھر کے باہر کئی لوگ جو شور سن کے اور فائر کی آواز پر نکل آئے تھے سب نے اسے فرار ہوتے دیکھا۔ وہ ہوائی فائر کرتا نکل آیا۔ اب اس کے بعد کا کھیل دیکھ جو میرے باپ نے پولیس سے مل کے کھیلا۔ پولیس نے اسے پٹی پڑھائی کہ اس کیس میں پھانسی سے بچنا ہے تو اپنے بیٹے سے کہہ کہ وہ الزام اپنے سر لے لے... وہ نابالغ ہے، بچ جائے گا۔ اور واقعاتی شہادت جو تیرے خلاف ہے اس کے خلاف نہیں ہو گی۔"

"اور وہ مان گیا؟"

"بالکل مان گیا۔ اسے پھانسی کے پھندے میں جھولتی اپنی لاش جو دکھائی دے رہی تھی۔ دو لاکھ دس ہزار وہ ایک عورت کے حسن و شباب پر لٹا سکتا تھا تو اپنی جان کی قیمت اس سے کہیں زیادہ دے سکتا تھا۔ اس نے وہی کیا جو پولیس نے کرنے کا کہا۔ پولیس نے ایف آئی آر لکھ لی اور چشم دید گواہوں کے بیانات بھی لے لیے مگر یہ تھانے میں ہوتا رہا۔ میرا باپ گھر کے باہر میرا منتظر رہا اور جیسے ہی میں نظر آیا، وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا، ایک پارک میں۔ وہاں اس نے بڑی بے شرمی سے اعتراف کیا کہ اس کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ایک بدکردار عورت نے مجھے گھر بلایا مگر اس وقت وہاں اچانک اس کا شوہر آ گیا اور اس نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اپنے دفاع میں گولی چلائی جس سے اس عورت کا شوہر ہلاک ہو گیا۔ اگر اس پر مقدمہ چلا تو پھانسی یقینی ہے۔ میری ماں بیوہ ہو جائے گی اور خاندان کو بدنامی کے علاوہ مالی مسائل کا سامنا بھی ہو گا۔ اگر الزام میں اپنے سر لے لوں تو کچھ نہیں ہو گا۔ اپنی ماں کے لیے میں یہ آزمائش قبول کر لوں تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ اس کے بات کرنے کا طریقہ ایسا تھا یا میری مت ماری گئی تھی، میں اس کی بات مان گیا۔ اس نے کہا کہ وہ میری ضمانت کرا لے گا اور میرے لیے شہر کے بہترین وکیل کرے گا جو ہائی کورٹ کیا، سپریم کورٹ تک اپیل کر سکتے ہیں۔"

"تو نے ماں سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟"

"میرا خیال تھا کہ ماں اس معاملے میں باپ کا ساتھ دے گی۔ کون عورت بیوگی قبول کرتی ہے۔ شوہر کو بچا سکتی ہو اور نہ بچائے... یہ مجھے ناممکن لگتا تھا۔ میں نے تھانے جا کے یہی بیان دے دیا کہ قتل مجھ سے ہوا ہے۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر کے بڑے آرام سے حوالات میں بند کر دیا۔ آرام کا مطلب ہے کہ مجھے چائے، کھانا سب ملتا رہا اور میں رات کو حوالات سے نکل کے چارپائی پر سوتا رہا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا پھر ایاز خان نے کہا۔

"چل یار! گزر ہی گیا وقت... ہم دونوں ایک ساتھ نئی زندگی شروع کریں گے۔ تو نے اچھا کیا کہ بی اے کے بعد ایم اے بھی پاس کر لیا۔"

"سب تیرے کہنے سے ہوا۔ تو نے ہمت دلائی اور مجبور کیا۔ میری زندگی یہاں بھی خراب ہونے سے بچائی اور

رعایت تمہیں دی گئی، اب اس کی سہولت واپس لے لی گئی ہے۔ تم کو سزا پوری کرنی ہے۔"

ایاز خان نے ایک گالی دی۔ "ان کی تو... اب کوئی روک کے دکھائے مجھے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ آزادی اور یہ زندگی پھر حاصل کی ہے۔ اب میں ان کے ہاتھ نہیں آنے والا۔"

"ابھی تک تجھے کسی نے قتل نہیں کیا۔" قاسم بولا۔

"ہاں، لگتا ہے وہ میری رہائی کی تاریخ معلوم نہیں کر سکے یا انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔"

"کیا مطلب؟ یعنی بدلہ لینے کا خیال چھوڑ دیا ہے انہوں نے؟"

ایاز ہنسا۔ "ارے نہیں۔ ان کو زیادہ بھروسا ہوگا خود پر کہ باہر نکلے گا تو بچ کر جائے گا کہاں... کسی دن قضا خود نشانے پر لے آئے گی، جلدی کیسی۔"

وہ جمشید روڈ پر آگئے۔ بہت کچھ بدلا ہوا تھا مگر بہت کچھ تھا جو ابھی کی طرح پرانا تھا۔ ان کی جیب میں وہ رقم تھی جو انہوں نے جیل میں مشقت کر کے کمائی تھی اور انہیں ساری ادا کر دی گئی تھی کیونکہ جیل کے بادشاہ کی نظر میں وہ خاص تھے۔ دونوں آرام و سکون سے چلتے رہے۔

ایاز بولا۔ "ابھی حیدرآباد کالونی کے چوک پر مجھے وہ ہوٹل نظر آیا جہاں میں نہاری کھانے آتا تھا اور میرے منہ میں پانی آگیا۔ کیسی مست کرنے والی خوشبو ہوتی ہے نہاری کی... اور گرم گرم تنور سے نکلنے والی روٹیوں کی۔"

قاسم ہنس پڑا۔ "چل تیری رہائی کی خوشی میں لنچ میری طرف سے... آجا نہاری کھاتے ہیں۔"

"اور تیرے اعزاز میں رات کی دعوت میری طرف سے ہوگی۔ ہم بریانی کھائیں گے۔ کینٹ اسٹوڈنٹ جاکے۔"

پیٹ کی گنجائش سے زیادہ کھانے کے بعد ایاز نے ہاضمے کی مدد سیون اپ سے کی۔ قاسم نے برسوں بعد پھر چائے پی جو اپنا وہی پرانا ذائقہ اور مہک رکھتی تھی۔ اب بالآخر انہیں اس یقین کی خوشی مل رہی تھی کہ وہ اپنی گمشدہ دنیا میں لوٹ آئے ہیں جہاں بہت کچھ وہی ہے۔ اب سوال آنے والے وقت کا تھا۔ آج کی رات وہ کہاں گزاریں گے۔ کل کیا کریں گے۔ انسانوں کی دنیا میں وہ خلائی مخلوق کی طرح اجنبی تھے۔ نہ ان کا کوئی شناسا تھا، نہ دوست نہ رشتے دار۔

"میں اپنے گھر جاؤں گا۔" قاسم نے اچانک کہا۔
زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔"

"چل چھوڑ قاسم... آگے کی سوچ۔"

ہم ساری رات باتیں کرتے رہے۔

"کسے نیند آتی ہے جیل میں آخری رات۔" قاسم نے کہا۔ "خواہ صبح پھانسی ہونی ہو یا رہائی... چل یہاں آخری ناشتا کرلیں۔ لوگوں سے مل لیں۔"

گیارہ بجے انہیں جیلر نے اپنے آفس میں طلب کرلیا۔ اس نے قاسم سے ہاتھ ملا کے اسے مبارک باد بھی دی۔ "تمہیں یہ نئی زندگی اور آزادی مبارک ہو۔ تم نے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی ہے اپنے رویّے سے اور اپنی ہمت سے... کتنے قیدیوں کو تم نے پڑھایا، دو نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ چار اس سال امتحان دے رہے ہیں۔ سب تمہارے شاگرد تھے۔"

"مجھے ہمت دلانے والا ایاز ہے سر۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے کسی اور کے حصے کی سزا کاٹی۔ اپنی ماں کو بیوہ ہونے سے بچایا۔ تمہاری قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔ دوسروں سے میں کہتا ہوں کہ پھر یہاں لوٹ کے مت آنا۔ تم سے نہیں کہوں گا، مجھے معلوم ہے کہ تم نہیں آؤ گے۔ ہاں مجھ سے ملنے کے لیے آتے رہنا۔ کوئی بھی کام ہو بتانا... خدا حافظ۔"

اور ایک بار پھر اژدھے کے منہ جیسے آہنی پھاٹک نے اپنا بھیانک منہ کھول کے ان کو اسی دنیا میں اگل دیا جہاں سے نگلا تھا اور وہ برسوں اس کے بے رحم وجود میں اذیت سے بھرے دن رات کی چکی میں پستے رہے تھے۔ بندوقیں لیے وہاں کھڑے پہرے داروں کے چہروں پر فرشتۂ اجل جیسی بے حسی تھی۔ انہیں راستہ دیتے ہوئے وہ اپنی بے بسی پر برہم نظر آتے تھے کہ بہت نچلے درجے کی قابلِ نفرت مخلوق کی دنیا چھوڑ کے وہ زیادہ معزز اور شریف انسانوں کی دنیا میں واپس جا رہے تھے۔

ایاز خان مین روڈ تک کے لمبے راستے پر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اوپر آسمان کو دیکھا۔ "یار قاسم! ذرا غور سے دیکھ اوپر... یہ آسمان وہی ہے اور یہ سورج... پہلے ایسا تو نہیں تھا۔"

قاسم نے اسے کھینچ لیا۔ "ہاں، سب بدل گیا ہے ہمارے لیے... ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے کہیں دور۔ ایسا نہ ہو کہ ابھی پیچھے سے گارڈ سیٹیاں بجاتے چلاتے ہمارے

پیچھے آ جائیں کہ ٹھہرو... تمہاری سزا باقی ہے۔ حساب کتاب میں کچھ غلطی ہوگی اور آرڈر آ گئے ہیں کہ اچھے رویے پر جو

''تیرا مطلب ہے اس گھر میں جہاں تو اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا مگر وہاں کون ملے گا تجھے؟''

قاسم بولا۔ ''کوئی تو ملے گا اور میں کب کسی سے ملنے جا رہا ہوں، گھر کو دیکھوں گا۔''

''بیٹے پرائے گھر کو دیکھنے سے زیادہ ضروری ہے اپنے ٹھکانے کی فکر کر... بے گھر لوگوں کا سنا تھا، آج ہم بے گھر ہیں۔''

''کوئی نہ کوئی ٹھکانا مل جائے گا۔ لوگ فٹ پاتھوں پر بھی تو سوتے ہیں۔''

ایاز بولا۔ ''اس کے لیے بھی کسی سے اجازت لینی ضروری ہے۔ کوئی ٹھیکے دار ہوگا جو بھتا لے گا۔ پولیس الگ پوچھے گی۔''

''شام تک دیکھ لیں گے کوئی جگہ... ایک دن یا ایک رات کی بات تو نہیں ہے نا ایاز... رہنے کی جگہ بھی چاہیے۔ کوئی کام دھندا بھی کرنا ہے۔ یہ تھوڑی سی رقم جو ہمارے پاس ہے کب تک ساتھ دے گی؟''

''چل پہلے اپنا یہ حلیہ ہی شریفانہ بنالیں۔ شریف تو ہم رہے نہیں جب سزا یافتہ ہوگئے۔''

انہوں نے بال کٹوائے اور شیو کرانے کے بعد خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کیا۔ ابھی تک وہ عام لوگوں میں ان جیسے ہی تھے۔ کسی نے ان کے چہرے پر شک کی سوالیہ نظر تک نہیں ڈالی تھی۔ وہ اپنی پرانی دنیا میں تو وارد تھے چنانچہ وہ بندر روڈ تک پیدل ہی گئے اور گردوپیش کو بڑے غور اور تجسس کے ساتھ دیکھتے رہے۔ کیا بدلا تھا۔ کتنا بدلا تھا۔ کیا ابھی تک وہی تھا اور وہیں تھا۔ ٹریفک کا اژدحام اور شور پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا تھا۔ باقی سب وہی دنیا تھی جس کو وہ دس برس بعد دیکھ رہے تھے۔ یقیناً جو آج نوجوان تھے وہ اس وقت بچے اور ناز و ادا کی بجلیاں گراتی شوخ و شریر اور خوب صورت لڑکیاں بھی اس وقت بچی ہوں گی۔ اور وہ جو دس سال پہلے ان کے جیسی طرح دار اپنے اندازِ حسن میں یکتا تھیں، وہ اب کہاں ہوں گی؟ چار چھ بچوں کی ماں بن جانے کے بعد پہچانی بھی نہ جائیں گی۔ ان دونوں کے خیال میں ناموں کے بہت سے چراغ روشن تھے۔

لنڈا بازار کی وسعت اور رونق میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایاز نے اس کی توجہ وہاں شاندار خواتین کی طرف دلائی جو اپنے اور بچوں کے لیے امپورٹڈ سویٹر اور جرسیاں خریدنے میں مگن تھیں اور شاید اس لیے اِدھر اُدھر نہیں دیکھ رہی تھیں کہ کسی شناسا کی نظر سے نظر نہ ملے۔ ''شاپنگ کرتے ہوئے یا ساحل پر انہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان خواتین نے لنڈے کے پرانے کپڑے پہن رکھے ہیں؟''

ایاز بولا۔ ''گوروں کی خیرات کے۔''

قاسم نے سر ہلایا۔ ''ہم بھی تو انہی میں شامل ہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ دس سال میں لوگ زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ پہلے لنڈے میں ایسے چہرے کہاں نظر آتے تھے اور یار میں نے دیکھا تھا ایسی ہی خواتین کو کار سے اتر کر گلی میں آتے ہوئے۔''

قاسم نے اس کی تائید کی۔ ''میں نے بھی دیکھا تھا۔ سوشل کمپلیکس ہے ایاز... ایک پرانی گاڑی لے لی۔ امپورٹڈ کپڑے اور بیگ یہاں سے خریدے اور شامل ہو گئے اپر کلاس میں۔ جہاں چاہو کہو... جب میں لندن گئی تھی تو لائی تھی، اعتماد ہونا چاہیے۔''

نئے یعنی نئے نظر آنے والے کپڑوں کا بنڈل انہوں نے بغل میں رکھا۔ یہاں لباس بدلنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ چلتے چلتے ایاز کی نظر نے ایک گلی کی مسجد دیکھی۔ عصر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ انہیں خالی غسل خانے مل گئے۔ پرانے کپڑے انہوں نے وہیں چھوڑے اور غسل کر کے نماز پڑھنے والوں کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ وہ دوبارہ سڑک پر آئے تو عام معزز شہری تھے۔ ان کا یقین اور اعتماد پوری طرح لوٹ آیا تھا اور احساسِ جرم وندامت کی شرمندگی جس کو وہ خود یوں محسوس کرتے تھے جیسے ان کے منہ پر کالک ہے۔ اب باقی نہیں رہی تھی۔

اچانک قاسم نے کہا۔ ''یہ ہے وہ گلی۔''

ایاز چونکا۔ ''کون سی گلی؟''

''جس میں میرا گھر تھا۔'' قاسم بولا اور گلی میں مڑ گیا۔

ایاز کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چلتا گیا۔ سامنے سے آنے والے ان کی طرف دیکھے بغیر گزرتے گئے۔ یہ خاصی چوڑی پختہ فرش والی گلی تھی جس میں لوگوں نے اپنی گاڑی کو دیوار سے لگا کے کھڑا کیا تھا تاکہ دوسری گاڑی کے گزرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

''تو نے کسی کو پہچانا؟'' ایاز نے کہا۔

''مجھے کسی نے نہیں پہچانا، سامنے سے آنے والے دو بڈھوں کو میں جانتا ہوں۔ یہاں کے پرانے رہنے والے

ہیں۔‘‘ وہ چلتے چلتے ایک دروازے پر رک گیا۔ ’’یہ میرا گھر ہے۔‘‘

’’یہ تیرا گھر تھا؟‘‘ ایاز نے نرمی سے پوچھا۔

قاسم نے دو منزلہ مکان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ’’یہ ایک منزلہ تھا۔ دوسری منزل نہیں تھی۔ نیچے کا نقشہ وہی ہے۔‘‘

ایاز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ’’کیا خیال ہے چلیں؟ گھر دیکھ لیا تو نے... کوئی پہچان لے گا تو...‘‘

’’گلی میں سب جانتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ نئے آنے والوں کو پرانے لوگوں نے بتا دیا ہوگا۔ ماں کے اچھے تعلقات تھے چند گھروں سے۔‘‘

’’ہاں، ہوں گے۔ اب چل۔‘‘ ایاز نے اس کی آستین کھینچی۔

قاسم وہیں کھڑا رہا۔ ’’میں... ماں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ شاید کوئی جانتا ہو کہ وہ اب کہاں ہے؟‘‘

ایاز نے ایک گہری سانس لی۔ ’’ٹھیک ہے، معلوم کر لے اگر کوئی بتا دے تو اچھا ہے۔‘‘

قاسم نے دونوں طرف کے تین دروازوں پر لگی کال بیل بجائی۔ دو گھروں کے مکین نئے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ تیسرے میں ایک دس بارہ سال کا بچہ کئی بار سوال جواب کے بعد نمودار ہوا اور بالآخر اس نے کہا۔ ’’اماں کہتی ہے کہ شام کو آنا۔‘‘ اور دروازہ بند کر دیا۔

ایاز نے خفگی سے اسے گالی دی۔ ’’یہ شام نہیں ہے کیا؟‘‘

قاسم نے اسے ٹوکا۔ ’’یار، اپنے محلے میں پیار محبت سے بات کرتے ہیں۔ شرافت کی زبان میں اور وہ تو بچہ ہے۔‘‘

’’عادت جاتے جاتے ہی جائے گی۔‘‘ ایاز نے شرمندگی سے کہا۔

’’کام پر جانے والے مرد رات کو لوٹتے ہیں۔ عورتوں کو دس سال پہلے کی باتوں کا کیا پتا۔ آئی ہوں گی کہیں سے بیاہ کے... جو یہاں تھیں وہ دوسرے محلوں، شہروں یا ملکوں میں گئیں۔‘‘

’’یار تو انہی سے پوچھ لے نا۔‘‘ ایاز بولا۔ ’’جو اب تیرے گھر میں رہتے ہیں۔‘‘ ایاز بولا۔

قاسم لوٹ کے اپنے پرانے گھر کی طرف آیا۔ اس کی نظر میں اندر کا پورا منظر تھا لیکن درمیان میں حائل بند دروازے نے سب اوجھل کر رکھا تھا۔ ابھی اس کا ہاتھ خاصی اونچائی پر لگی کال بیل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے کہا۔ ’’جی؟‘‘

وہ چونک کر پلٹے۔ ایک لمحے کے لیے قاسم کی نظر اس پیکرِ حسن و شباب پر جیسے جم کے رہ گئی۔ اس کی نظر نے اپنے مقابل بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑی دبلی پتلی نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ ’’آپ رہتی ہیں، اس گھر میں؟‘‘

اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکن آ گئی۔ ’’اور کیا آپ رہتے ہیں؟ دروازے پر تو دونوں کھڑے ہیں۔‘‘

’’آئی ایم سوری... یہ کبھی میرا گھر تھا۔‘‘ قاسم نے رواں انگریزی میں کہا۔

’’اوہو... آپ کے غالباً دادا نے بنوایا ہوگا یہ مکان... لیکن آٹھ سال... پہلے میرے والد نے خرید لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب آپ کو یہاں کھڑے رہنے کا حق بھی حاصل نہیں۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے۔ بس آج پھر اس شہر میں آیا تھا تو قدم اُدھر اٹھ گئے۔ پرانی یادیں ساتھ کہاں چھوڑتی ہیں۔ میرا بچپن اسی گھر میں گزرا تھا۔‘‘

اس کا رویہ قدرے ہمدردانہ ہو گیا۔ ’’آپ ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں اندر سے؟ میں ڈیڈی سے کہتی ہوں۔ اس میں کوئی پرابلم تو نہیں ہونی چاہیے۔‘‘

بیٹ کندھے پر رکھے ایک نوجوان کہیں سے نمودار ہوا۔ ’’شانو باجی! باہر کیوں کھڑی ہیں آپ؟ اور یہ کون ہیں؟‘‘ اس نے ایاز اور قاسم پر ایک شکی نظر ڈالی۔

’’ظفر ہم سے پہلے یہ ان کا گھر تھا۔‘‘ شانو نے کال بیل پر انگلی رکھی اور دروازہ کھلتے ہی اندر چلی گئی۔ ظفر ان کو گھورتا ہوا گیا اور ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے دروازے کو دھڑ سے مار کے بند کیا۔ پھر اندر کی آوازیں باہر سنائی دینے لگیں۔

کسی مرد نے غرا کے کہا۔ ’’کون رہتا تھا اس گھر میں؟ تجھے معلوم ہے؟‘‘

لڑکی نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ ’’جو بھی رہتا ہو، اگر ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے تو... شریف آدمی ہے...!‘‘

’’جس بات کا پتا نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔‘‘ مرد نے دہاڑ کے اس کی بات کاٹ دی۔

اب ظفر بولا۔ ’’مجھے تو چھٹا ہوا لوفر لگ رہا تھا۔‘‘

’’اتنی صاف رواں انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ مہذب طریقے سے۔‘‘ شانو بولی۔

’’چپ کر، میں جا کے بات کرتا ہوں اس حرام

زاویے سے... اس کی ہمت کیسے ہوئی اِدھر آنے کی۔''
''ڈیڈی! آپ ٹھہریں، میں کہہ دیتی ہوں کہ یہ نہیں ہوسکتا ابھی۔''
مرد دہاڑا۔ ''ابھی نہ کبھی... ٹانگیں توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا پھر اس گلی میں بھی قدم رکھا۔''
اب کسی عورت نے کہا۔ ''شاہینہ! تو بیٹھ آرام سے۔ تیرے ڈیڈی بات کریں گے۔''
ایاز اور قاسم کو احساسِ ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس بھی ہورہا تھا۔ شاہینہ کا باپ جو بھی تھا، سب جانتا تھا۔ نام سن کے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ قاسم وہی ہے جو قتل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک دم سامنے آگیا۔ کسی طرح بھی وہ قاسم یا ایاز کے مقابلے میں ٹارزن نہیں تھا کہ انہیں اس غلطی کی سزا میں دھنک کے رکھ دیتا۔ مگر وہ شیر بنا ہوا تھا کیونکہ ایک سزا یافتہ قتل کے مجرم کے مقابلے میں اس پر کوئی الزام نہیں تھا اور معاشرے میں اسے شرافت کی سند حاصل تھی۔ باپ کے پیچھے بیٹا تھا اور اس کو جوانی کی جسمانی قوت فراہم کرنے کے لیے موجود تھا۔
اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گیٹ کی لائٹ کسی نے اندر سے جلائی۔ مالک مکان آتش فشاں بنا قاسم سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ''کیا بات ہے؟ تو قاسم علی ہے نا؟'' وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔
''حمید صاحب! میری خواہش۔ اتنی ناجائز بھی نہیں تھی۔'' وہ شرافت سے بولا۔
''ابے بکواس مت کر میرے سامنے... سب جانتا ہوں کہ کون ہے تو... عمر قید کی سزا کاٹ کے آیا ہے نا جیل میں... قاسم ہے تیرا نام... تیرے باپ کے کرتوت بھی پتا ہیں مجھے... تیری ماں...''
قاسم گرم ہوگیا۔ ''بس... بہت کہہ کیا آپ نے۔ غلطی کی میں نے اِدھر آکے۔ کوئی جرم اگر کیا بھی تھا میں نے تو اس کی سزا مل گئی۔ جھوٹ سچ کا آپ کو کیا پتا؟''
وہ اچھلا۔ ''مجھے نہیں پتا۔ ابے... وہ سب مر نہیں گئے ہیں جو سارے کرتوت جانتے تھے تم سب کے۔''
اونچی آوازوں نے اِدھر اُدھر کے گھروں سے فارغ لوگوں کو کھینچ لیا تھا۔ کچھ دریچے کھل گئے تھے اور عورتیں گلی میں ہونے والی ہنگامہ آرائی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ گھر کا مالک یوں چلا رہا تھا جیسے قاسم اس کے گھر کو آگ لگانے آگیا تھا۔ ایاز نے مجمع کے ڈر سے اس کی آستین کھینچی۔
''چل قاسم! کوئی فائدہ نہیں کچھ کہنے کا... کوئی نہیں سنے گا تیری۔''
''ابے او چھچھے... آدھی گلی اب بھی جانتی ہے اس کے سود خور باپ کو... یہ جو شرافت کا دعوے دار کھڑا ہے نا تیرے ساتھ... اس کی ماں کو بھی وہ خرید کے لایا تھا۔ دوسری عورت کو اغوا کر کے لانا چاہتا تھا۔''
کسی نے قاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''قاسم! دیکھ مجھے سب معلوم ہے۔ اپنے باپ کو بچانے کے لیے تم نے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔''
''جب آپ جانتے ہیں حقیقت...'' قاسم نے برہمی سے کہا۔
''بہتر ہے کہ تم پھر یہاں نظر نہ آؤ۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے اور تم مجرم نہ سہی... دس سال مجرموں کی صحبت میں رہے ہو۔ عمر قید کاٹی ہے تم نے... وہاں سے تو فرشتہ بھی شیطان بن کے نکلتا ہے۔''
''لیکن میں نے جیل میں رہ کے بی اے کیا۔ ایم اے پاس کیا ہے۔''
''ابے شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟'' ایک نوجوان ٹی شرٹ سے نظر آنے والے طاقتور بازو اور سینہ نکال کے آگے بڑھا۔ ''اب کیوں آیا ہے اِدھر... کیا ہے تیرا یہاں... باپ تو منہ کالا کر گیا۔ مکان بیچ گیا حمید اللہ صاحب کو۔''
وہاں اب آٹھ دس افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک دو ہی کا جارحانہ رویہ تھا مگر باقی بھی انہی کے حامی تھے۔ ایاز چاہتا تھا کہ مزید بدمزگی یا ہنگامہ آرائی سے پہلے وہ یہاں سے نکل جائیں۔ قاسم کی خواہش فطری تھی مگر یہ امید ایاز کو بھی نہ تھی کہ عوامی جذبات ان کے اس حد تک خلاف ہو جائیں گے۔ اوپر کی کسی کھڑکی سے عورت نے مقابل کے گھر کی کسی عورت کو مطلع کیا۔
''ارے وہی ہے... وہ جو رہتا تھا نا پہلے یہاں سود خور... اس کا بیٹا جیل کاٹ کے آیا ہے۔''
''اچھا وہی... جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ بیوی کو بھی بیچ گیا تھا مکان کے ساتھ...'' دوسری عورت بولی۔
ان مخالف اور دشمن لوگوں میں بیشتر سابق ہمسائے تھے لیکن یہاں ہمسائیگی کا نام لینا بھی جرم بن چکا تھا۔ ان کے کردار پر سزا یافتہ کی مہر ہی انہیں مجرم قرار دینے کے لیے کافی تھی اور پھر اس کا باپ اپنے کردار کے سبب ایسا محلے دار نہیں تھا کہ کوئی اسے جانے کے بعد اچھے لفظوں میں یاد کرتا۔ حالات کو بدتر ہونے سے بچانے کے لیے فرشتۂ غیب

کا کردار ادا کرنے والا پیچھے سے آیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ سفید ریش شخص تھا جس نے جالی دار ٹوپی لگا رکھی تھی اور کندھے پر چارخانے والا رومال ڈال رکھا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں ہیرو بننے والے نے کہا۔ ''اجی مولوی صاب! وہ جو یہاں رہتا تھا نا سودخور... ہاں جس نے اپنی جگہ بیٹے کو جیل بھیج دیا تھا، وہی بیٹا جیل کاٹ کے آگیا ہے گھر دیکھنے۔ اس کے باپ کا گھر تھا نا، میں سالے کو دھن کے رکھ دیتا۔''

مولوی صاحب نے قاسم کا ہاتھ تھاما۔ ''باپ کے حصے کی سزا کاٹ لی اس نے... اور کیا کرے؟''

''سزا یافتہ تو ہو گیا ناجی... چور، ڈاکو اور قاتلوں کے ساتھ رہ کے آیا ہے۔'' کسی نے کہا۔

قاسم نے ایک ہمدرد پا کے پھر کہا۔ ''مولوی صاحب! میں نے جیل میں رہ کے بی اے کیا۔ پھر ایم اے... تعلیم دی۔''

''اچھا آؤ میرے ساتھ۔'' مولوی صاحب نے گویا معاملہ ختم کیا۔ ''جاؤ بھائی تم بھی اپنے گھر... کیا تماشا لگا رکھا ہے یہاں۔''

ان دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے ہی وہ مولوی صاحب کے ساتھ ہو لیے جو نماز عشا کی امامت کے لیے جا رہے تھے۔ ''اچھا تو قاسم ہو تم... میں جانتا تھا تمہارے باپ کو۔ مگر تم اس وقت شاید میٹرک کر رہے تھے؟''

''جی میں ایف اے کا امتحان دینے والا تھا۔ ماں کو بچانے کے لیے الزام اپنے سر لیا تھا۔ وہ بیوہ ہو جاتی۔''

''اس کا اجر اللہ دینے والا ہے۔'' وہ مسجد میں داخل ہو گئے۔ ''آج کل کیا کرتے ہو؟''

''مولوی صاحب! آج ہی صبح رہائی ہوئی تھی۔ یہ میرا جیل کا ساتھی ہے ایاز خان۔ مجھ پر باپ نے ظلم کیا تھا اس کو ماں نے پھانسی چڑھنے بھیجا تھا۔ ہماری کم عمری نے بچا لیا۔''

مولوی صاحب مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے۔ ''انسان کا اتنا بڑا دل نہیں کہ وہ معاف کر سکے۔ وہ رب العالمین سزا دینے پر آئے تو ہر روز ہمارے گناہ شمار کرے، کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ماں باپ... وہ چلے گئے ہیں نہ جانے کہاں؟''

''لگتا ہے آپ بھی کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے مولوی صاحب، میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھے۔''

مولوی صاحب نے انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کی۔

''قاسم! سنی سنائی کا کیا اعتبار، یہ بتاؤ تم نے اس گھر میں جانے کی بے وقوفی کیوں کی تھی؟''

قاسم نے فوراً تردید کی۔ ''نہیں مولوی صاحب! میں پاگل نہیں ہوں کہ ایسے منہ اٹھا کے کسی بھی گھر میں گھس جاؤں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ اب وہاں میرا کوئی نہیں۔ ماں، باپ کا بھی پتا نہیں۔ سوچا تھا شاید کوئی بتا دے۔ گھر کو ایک بار پھر اندر سے دیکھنے کی خواہش کوئی گناہ تو نہیں۔ مالک کی اجازت سے جاتا میں۔''

''چلو چھوڑو... بہت سی باتیں لوگ نہیں سمجھتے۔ یہ ایک جذباتی حرکت تھی جو تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی تھی... اب بتاؤ آگے کے لیے کیا سوچا ہے؟''

اسی وقت عشا کی اذان بلند ہوئی۔ وہ خاموش بیٹھے فلاح کی طرف بلانے والی آواز کو سنتے رہے۔ دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد قاسم بولا۔ ''میں نے بتایا تھا آپ کو... ایم اے کر لیا تھا میں نے جیل میں... خبر بھی آئی تھی اور میرا انٹرویو بھی آیا تھا کسی اخبار میں۔ کچھ نہ کچھ کر لوں گا میں۔''

''اللہ تمہیں نیکی کے راستے پر چلائے اور کامیاب کرے۔'' وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔ یہ محلے کی چھوٹی سی مسجد قاسم کو یاد تھی۔ یہ آج بھی اتنی ہی تھی۔ آس پاس خالی جگہ کہاں تھی کہ اس کی توسیع ممکن ہوتی۔ اب تک ان کا اس طرف خیال نہیں گیا تھا اور مولوی صاحب نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ چلو نماز کے لیے وضو کرو۔ وہ ازخود جماعت میں شامل ہوئے جہاں انہیں بہت سی گھورتی نظروں کا سامنا ہوا۔ یہ پرانے محلے دار تھے جو اُن کی آؤ بھگت کا تماشا دیکھ چکے تھے مگر یہاں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ناپسندیدگی کے جذبات کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

نماز کے بعد جب وہ اپنے جوتے پہن رہے تھے تو انہوں نے مولوی صاحب کی آواز سنی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

قاسم نے پلٹ کے کہا۔ ''جہاں تقدیر لے جائے۔ آج کی رات کہیں گزار کے کل کوئی نوکری بھی تلاش کریں گے اور رہنے کی جگہ بھی... آپ کا شکریہ کیسے ادا کریں کہ آپ نے مزید تماشا بننے سے بچا لیا۔''

مولوی صاحب بولے۔ ''تم چاہو تو آج رات یہاں

رک سکتے ہو۔ موذن کے کمرے میں نیچے سو جاؤ۔ کھانا گھر سے بھجوا دیتا ہوں۔''

موذن اجنبی اور بن بلائے مسلط ہو جانے والے مہمانوں سے خوش نہیں تھا مگر مولوی صاحب کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جن کے وہ مہمان ہو گئے تھے۔ کھانا کھانے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ اس نے پوچھا اور نہ انہوں نے اپنے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔ باہر سردی نہ ہوتی تو وہ صحن میں بھی سو جاتے۔ مولوی صاحب نے ان کے لیے دو کمبل بھی بھیجے تھے۔ وہ اوڑھ کر خاموش لیٹ گئے۔ جب موذن کے خراٹے سنائی دینے لگے تو ایاز نے کہا۔ ''یار! آج بھی اچھے لوگ ہیں دنیا میں... اور مُلا جی تو فرشتہ ہیں۔''

قاسم اس لڑکی شاہینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس گھر کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کچھ الگ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ پڑھی لکھی تھی۔ کہیں جاب کرتی تھی، اس میں اعتماد تھا اور ایک وہی ہمدرد بھی محسوس ہوتی تھی۔ جیل کی دنیا کی ساری بدصورتی کے بعد حسن کا یہ پہلا احساس تھا۔

''اوئے خانہ خراب... کیا سو گیا؟''

قاسم چونکا۔ ''نہیں یار، میں کچھ سوچ رہا تھا تو نے کچھ پوچھا تھا۔''

''کیا سوچ رہا تھا؟''

''یہی... کہ کل کی رات سے آج کی رات کتنی مختلف ہے۔ کہاں وہ جیل کی کوٹھری... کہاں یہ اللہ کے گھر کا ایک گوشہ... کتنے امان کا احساس ہے یہاں اور سکون ہے۔'' قاسم بولا۔

''ہاں، کوٹھری تو اتنی ہی بڑی ہے اور یہاں بھی ہم تین ہیں۔'' ایاز نے سرگوشی میں کہا۔

''آج کی رات بھی وہاں سب کچھ وہی ہوگا۔ ویسا ہی ہوگا۔ معلوم نہیں ہماری جگہ کس نے لی۔''

''اب چھوڑ کل کی بات... آنے والے دن کا سوچ۔''

قاسم نے کہا۔ ''سوچنے سے کیا ہوگا؟ یار جس نے آج سہارا دیا، وہ کل بھی دے گا۔ سوجا۔''

مگر وہ خود ایاز کے سو جانے کے بعد بھی جاگتا رہا۔ نہ وہ دکھی تھا اور نہ آنے والے دن کے لیے پریشان۔ وہ گزر جانے والے وقت کی آزمائش اور عذاب کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ آج دن بھر میں اس نے بازاروں میں گھومتے پھرتے کتنی لڑکیاں دیکھی تھیں؟ شاید سیکڑوں... مگر وہ اس ایک لڑکی کے بارے میں نہ سوچنے کے ارادے میں ناکام رہا جس نے پیچھے سے آ کے کہا تھا۔ ''جی؟'' کتنی سنجیدگی اور شوخی تھی اس کے سوال میں کہ یہاں میں نہیں رہتی تو کیا آپ رہتے ہیں۔ کتنی مختلف تھی وہ ان سب سے جو آج اس کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ اپنی ماں کی مظلومیت اور اپنی چھوٹی بہن کی معصومیت کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔ کتنی سفاک حقیقت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں آج کچھ نہیں جانتے تھے حالانکہ ان کے درمیان خون کا رشتہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہ کون کہاں ہے۔ اس دنیا میں یا کسی اور دنیا میں۔

صبح مسجد کے غسل خانے میں نہا کے قاسم نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ نماز فجر کے بعد انہوں نے مولوی صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ محلے کے بچے بچیوں کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے قاسم اور ایاز کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ آٹھ بجے بچے رخصت ہوئے تو مولوی صاحب انہیں اپنے گھر لے گئے جو چند قدم دور ایک کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ وہاں انہوں نے ناشتا کیا جو اندر سے مولوی صاحب کی بیوی نے بنا کے بھیجا تھا۔ خدا نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ یہ بات انہوں نے کسی دکھ یا حسرت کے بغیر بتائی۔ پھر وہ ایاز اور قاسم سے جیل میں گزارے ہوئے وقت کی باتیں سنتے رہے۔

''کبھی تم نے غور کیا کہ اتنے لوگوں میں تم ہی ایم اے کرنے اور دوسروں کو پڑھانے میں کیوں کامیاب ہوئے؟''

قاسم نے حیرانی سے کہا۔ ''اس لیے کہ میں نے کوشش کی۔''

''نہیں۔ اس لیے کہ خدا نے تمہیں منتخب کیا۔ توفیق دی۔ اس کا خصوصی کرم رہا تم پر... اور وہ تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کی تلافی بھی کرے گا لیکن...'' وہ خاموش ہو گئے۔

قاسم نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''لیکن کیا مولوی صاحب؟''

''ہم انسان اتنے فیض اور معاف کرنے والے نہیں ہوتے۔ یہ تمہیں اپنے ماضی کو بھلانے نہیں دیں گے، بس ہمت نہ ہارنا۔ میرا تو باہر کی دنیا سے بس یہی تعلق ہے کہ میں بھی دنیا میں رہتا ہوں۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

قاسم نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ کا یہی

احسان کیا کم ہے کہ آپ ہم پر اعتماد کرنے والے پہلے آدمی تھے۔ آپ نے ہمارے ماضی کو ہمارے لیے شرمندگی کی وجہ نہیں بنایا۔"

ایک پُرعافیت رات کے بعد وہ پھر اس اجنبی دنیا میں زندگی گزارنے نکل آئے، جو ان پر مہربان بہرحال نہ تھی۔

قاسم بہت پُرامید تھا کہ اس کو اپنی تعلیمی صلاحیت کی بنیاد پر کہیں نہ کہیں پڑھانے کے لیے رکھ لیا جائے گا۔ ایم اے میں اس کا مضمون اردو تھا جو اسکول اور کالج میں ہر سطح پر انگریزی کی طرح لازمی تھی۔ یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ موجودہ نسل کے لیے انگریزی کوئی مسئلہ نہ تھی۔ بدیسی آقاؤں کی زبان پر انہیں اسکول کے علاوہ ٹی وی پروگراموں، گھر کے ماحول اور گیمز وغیرہ سے دسترس حاصل ہو جاتی تھی۔ ان کی ساری پریشانی اردو کا نصاب تھا جس میں غالب اور اقبال جیسے شاعروں کی نظمیں غزلیں شامل تھیں جو اردو میں فارسی لکھتے تھے۔ اردو میں پاس ہونا لازمی تھا چنانچہ ٹیوٹر اور کوچنگ سینٹر طلبا کو اردو میں پاس ہونے کے لیے پڑھانے کے علاوہ دیگر طریقے بھی سکھا رہے تھے جن سے یہ مشکل آسان ہو۔

ایاز مایوسی کا شکار تھا۔ وہ کوئی خاص ہنر نہیں جانتا تھا اور خود کو قاسم پر بار سمجھتا تھا مگر قاسم کسی قیمت پر اسے الگ کرنے کے لیے راضی نہ تھا۔ قاسم نے اپنی کوشش کا آغاز ایک ایسے اسکول سے کیا جہاں گیٹ پر "ٹیچرز کی ضرورت ہے" کا اشتہار ہارڈ بورڈ پر بدخطی کا نمونہ تھا۔ قاسم نے ایسے بہت سے اسکول دیکھے تھے جو ایک سو بیس گز کے رہائشی گھروں میں چل رہے تھے اور چوتھی منزل تک ڈربے جیسے کمرے بنا کے ان میں بچوں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ کھیل کا میدان کیا وہاں بنیادی سہولتوں کا بھی فقدان تھا۔

اس اسکول کی حالت بہتر لگتی تھی۔ یہ چھ سو گز پر محیط تھا۔ باہر چوکیدار یونیفارم میں موجود تھا اور بہت سی گاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ سیدھا پرنسپل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ پرنسپل عقاب جیسی آنکھوں اور طوطے کی چونچ جیسی ناک والا دبلا پتلا ساٹھ سالہ شخص تھا جو صورت سے ہی مکار نظر آتا تھا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور ٹائی بھی باندھی تھی لیکن اس سے وہ جوکر ہی نظر آنے لگا تھا۔ سوٹ پرانا اور ڈھیلا تھا۔ ٹائی گلے کا پھندا بنی ہوئی تھی۔

"آیئے آیئے۔" اس نے نوواردوں کو نظروں سے پرکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کسی بچے کو داخل کرانے کے لیے آنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ "بچے کو داخل کرتے ہیں ہم مئی جون میں لیکن آپ کے لیے گنجائش نکالیں گے۔"

قاسم نے کہا۔ "جی میں ٹیچر کی جاب کرنا چاہتا ہوں۔ میرا نام قاسم ہے۔"

پرنسپل صدمے سے کرسی پر گر گیا۔ "ٹیچر... تم تو پھٹیچر نظر آتے ہو حلیے سے... یہ انگلش میڈیم اسکول ہے۔ اپر کلاس کی جنٹری کے بچے پڑھتے ہیں یہاں... ہمارا چپراسی بھی..."

"پڑھانے کے لیے کوالی فکیشن ضروری ہے یا اچھا لباس... میں نے اردو میں ایم اے کیا ہے فرسٹ کلاس... لیکن انگلش اور اسلامیات بھی پڑھا سکتا ہوں۔"

پرنسپل نے کچھ کم جارحانہ انداز اختیار کیا۔ "دیکھو مسٹر، ہاں... قاسم! وقت بدل گیا ہے۔ ایم اے، پی ایچ ڈی سے کوئی امپریس نہیں ہوتا۔ ٹیچر کو فرفر انگلش بولنا آنا چاہیے امریکن لہجے میں... اور یہی وجہ ہے کہ ہم سینٹ جوزف کی اے لیول لڑکی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک دم ماڈل ٹائپ... والدین تم جیسے ٹیچر سے خوش نہیں ہوتے جو گنوار نظر آتا ہو۔"

قاسم اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر تو میں غلط جگہ آگیا۔"

"آئی ایم سوری... میں تم کو بے عزت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ لوگوں کی چوائس بدل گئی ہے۔ ہر معاملے میں... تم دیکھ سکتے ہو کہ پلاؤ قورمے کی جگہ برگر اور پیزا نے لے لی ہے۔ تمہیں خود کو بدلنا ہوگا نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق... پھر تمہاری صلاحیت کی قدر ہو گی۔"

قاسم بیٹھ گیا۔ "لباس اگر صرف ٹائی اور سوٹ ہے یا رنگین ٹی شرٹ اور جینز۔"

"بس، یہ تمہاری عمر کے لوگوں کا کلچر ہے۔ انٹرنیشنل برانڈ اب گلی گلی بنتے ہیں اور پہنے جاتے ہیں۔ ہوائی، رینگلر، ارامانی، سب پہنے پھر رہے ہیں اور کلرفل ٹی شرٹ تو فٹ پاتھوں پر ملتی ہے بس ذرا وہ نہ ہو... میرا مطلب ہے فحش... باقی جو آگے پیچھے لکھا ہو... سب چلتا ہے... اچھا اب بولو پگار کی بات۔"

"پگار؟"

"میرا مطلب ہے سیلری... دیکھو ابھی اسکول کو ایک سال ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو چار پانچ سال میں ہماری برانچ ڈیفنس، کلفٹن، گلشن بلاک سیون میں ہو گی... اس سے اچھا پاکستان میں کوئی بزنس نہیں۔ ایجوکیشن یا ہیلتھ... ہم صرف نرسری... پری اسکول اور پرائمری کلاس رکھیں

گے۔ اس میں محنت زیادہ نہیں۔ بس شوشا اچھی ہونی چاہیے۔ بچہ ایک دم ڈفر ہو تب بھی اس کو اے گریڈ دو... ناٹنٹی پرسنٹ سے اوپر... ماں باپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ سب کو پروگریس رپورٹ دکھاتے پھرتے ہیں۔"

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" قاسم نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم آئے ہو ٹیچر بننے... ٹپس دینا ضروری ہے۔" پرنسپل بولا۔

"لیکن ابھی آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ میری ڈگری..."

"اب تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا... آدمی کو ٹرسٹ کرنا چاہیے۔ ہاں بگار بولو... تنخواہ۔"

"آپ کیا دے سکتے ہیں؟"

وہ کچھ دیر خاموشی سے قاسم کو دیکھتا رہا۔ "اپنی مجبوری بتا دی میں نے... ابھی پندرہ سو۔"

"پندرہ سو؟ کیا اس تنخواہ میں کوئی جی سکتا ہے۔ مکان کا کرایہ، بل، کھانا پینا، جوتے کپڑے؟"

"تو کیا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟" پرنسپل حیران ہوا۔ "فٹ پاتھ پر سوتے ہو؟ عالمگیر ٹرسٹ سے کھاتے ہو؟"

"آپ مجھے پھر بے عزت کر رہے ہیں۔ اگر فقیر ہوتا تو اس سے دس گنا کما لیتا... یہاں کیوں آتا۔"

"مگر بھی کھانے کی بات نہیں۔ تمہارا گھر تو ہوگا۔ کھانا اپنا فیملی کے ساتھ ہوگا۔"

"میری کوئی فیملی نہیں اور کوئی گھر نہیں۔"

ایاز نے پہلی بار دخل دیا۔ "دراصل ہم اس شہر میں نووارد ہیں۔ مظفر گڑھ سے آئے ہیں۔ جنوبی پنجاب سے۔"

"ہاں، اُدھر سے ہر کوئی اِدھر آ رہا ہے۔ کراچی کا خانہ خراب کرنے... خیر اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا میں۔ ہاں تنخواہ دو ہزار ہو جائے گی۔ جو سینئر اسٹاف کو ملتی ہے۔ وہ بڑے گھروں کی لڑکیاں ہیں۔ اپنی گاڑی میں آتی ہیں۔ اپنا خرچہ پورا کر لیتی ہیں۔"

"آپ ان سے میرا موازنہ نہ کیوں کرتے ہیں۔ دو ہزار ان کی پاکٹ منی ہے۔ وہ محض وقت گزاری کے لیے... میڈم کہلانے کے لیے ٹیچر بن گئی ہیں۔ ان کے تمام اخراجات تو ان کی ارسٹوکریٹ فیملی پورے کرتی ہے۔" وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

پرنسپل خود مالک تھا اور اس کی نظر قاسم میں ایک دلکش پرنسپل کو دیکھ رہی تھی جو کوالیفائڈ تھا اور اس کے انتظامی مسائل کو حل کر سکتا تھا۔ اس کی پرسنالٹی اچھے لباس میں انتہائی متاثر کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ایم اے آکسفورڈ... پی ایچ ڈی کیمبرج اس کے نام کی تختی پر لکھ دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کون تصدیق مانگے گا۔ اگر اسے ایڈمنسٹریٹر بنا دیا جائے تو وزارتِ تعلیم کے اعلیٰ حکام سے ڈیل کرے گا۔

"مسٹر قاسم! سٹ ڈاؤن۔ میں تین ہزار دوں گا تمہیں فائنل... اور یہ ہو سکتا ہے کہ کومن کا سرونٹ کوارٹر تمہیں مل جائے۔ تمہارے اکیلے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔"

"میرے ساتھ بھائی بھی ہے۔" اس نے ایاز کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو رہ سکتا ہے تمہارے ساتھ... کیا یہ نہیں پڑھا سکتا؟"

ایاز نے گھڑے جیسا سر ہلا دیا۔ "آپ مجھے کلرک رکھ لو فیس وغیرہ لینے کے لیے۔"

"تو، اس کے لیے ضمانت چاہیے کسی کی۔ کیش کا معاملہ ہے۔ مگر تم اسکول وین چلا سکتے ہو۔ پندرہ سو تم کو بھی مل جائیں گے۔ اب مسٹر قاسم! پڑھانے کے ساتھ تم کو ایڈمنسٹریٹر کی ذمے داری بھی سنبھالنی ہوگی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ پی آر کا کام ہے۔ مجھے اپنا سی وی دو۔" پرنسپل نے قاسم کی خاموشی کو رضامندی سمجھ لیا تھا۔

"سی وی؟ وہ تو نہیں بنائی میں نے۔"

"اب بنا لو۔ میٹرک، بی اے اور ایم اے کہاں سے کیا۔ کس اسکول میں پڑھاتے رہے۔ شناختی کارڈ... حوالہ اور مستقل پتا... دو ریفرنس۔"

اب وقت آ گیا تھا کہ پرنسپل کو سچ بتا دیا جائے۔ "نہ میرا کوئی ریفرنس ہے، نہ مستقل پتا۔ میں نے جیل میں رہ کے بی اے کیا۔ پھر ایم اے... اور وہیں پڑھاتا رہا۔ قتل کے الزام میں دس سال کی جیل کاٹ کے میں کل رہا ہوا ہوں۔ قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ آپ سینٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے فون پر پوچھ لیں۔ وہ میرے کردار..."

اب تک کی خاموشی اس الیکٹرک شاک کا نتیجہ تھی جو پرنسپل کو قاسم کے انکشافات سے لگا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "اٹھو... یو بلڈی مرڈرر... تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے بیٹھنے کی اور میرا وقت ضائع کرنے کی۔ تم نے کیا سمجھ رکھا تھا۔ یہاں کسی کرمنل کو رکھا جا سکتا ہے۔ کیا میں پاگل ہوں۔ اپنے فیوچر پر کلہاڑی مار سکتا ہوں۔ تو جیل وہ

یو راہم اے... تمہارے ماتھے پر سزا یافتہ قاتل کی کالک ہے اور تم کہتے ہو جیلر تمہارے کردار کا ضامن ہوگا۔ گیٹ آؤٹ۔ دو منٹ میں باہر نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلالوں گا۔ یہاں باعزت لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔'' وہ اپنی کانپتی آواز میں چلاتا رہا اور خود بھی کانپتا رہا۔

ایاز نے اسے کھینچ لیا۔ ان کا ماضی ہونٹوں پر خاموشی کی مہر بن گیا تھا۔ وہ بے عزت ہونے پر مجبور تھے کیونکہ وہ عزت کی بات کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مختصر گراؤنڈ سے گیٹ تک کا فاصلہ انہوں نے بوجھل قدموں سے طے کیا اور گیٹ سے باہر آتے ہی ایک طرف چل پڑے۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ جو اعتماد انہیں مسجد کے پیش امام نے دیا تھا دھواں بن کے اڑ گیا تھا۔ اب انہیں یوں لگتا تھا جیسے ہر شخص کی نظر میں ان کے لیے نفرت ہے۔ حقارت ہے۔ قریب سے گزرنے والے اپنا دامن بچا کے گزر رہے ہیں کیونکہ وہ سزا یافتہ قاتل ہیں۔ ایک فقیر، بھنگی، موچی، گدھا گاڑی ہانکنے والا... سب عزت دار ہیں۔

ایاز نے اسے کھینچ کر ایک بینچ پر بٹھا لیا۔ قاسم کا حلق خشک تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک بس چلتا رہا تھا۔ جیسے وہ سب سے دور بھاگ رہا ہو۔ ایاز سڑک پار کے ایک کھوکھے سے پانی کی بوتل لایا۔ قاسم کے حلق میں اذیت کے کانٹے موجود رہے۔

''دیکھ بیٹے! یہ جو ہوا ہے نا ہمارے ساتھ... یہ ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ ہم...''

''ہم کیا؟ کہاں سے لائیں حوالے۔ فیملی بیک گراؤنڈ... گزرے ہوئے دس سالوں کو کہاں دفن کریں؟''

''سوچتے ہیں یار... دنیا میں رہنے کے لیے جھوٹ کا سہارا تو لینا ہی پڑے گا۔''

''ان سے اچھے تو وہ جیل کی دنیا کے لوگ تھے۔ جنہوں نے ہمیں ہمدردی اور سپورٹ دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جیل میں مجرم بنائے جاتے ہیں۔ جیب تراش وہاں جا کے ڈاکو بن جاتا ہے۔''

''یہ بھی غلط نہیں ہے قاسم، ہمیں قسمت نے محفوظ رکھا لیکن اب تو زندگی اسی دنیا میں گزارنی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ماضی کو لاوارث لاش کی طرح دفن کر دیں۔ ایک نیا ماضی بنالیں۔ فخر کے قابل۔ اس دنیا میں ہر چیز جعلی چل رہی ہے۔ جعلی لیڈر، جعلی پیر، جعلی ڈگری، جعلی نوٹ، ہر مشہور برانڈ کے جعلی نام سے ہر چیز... حد ہے کہ دوائیں تک جعلی فروخت ہو رہی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔''

قاسم خاموشی سے سنتا رہا۔ ایاز غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جیل کے اندر ہر قسم کے مجرم تھے۔ شاید باہر سیدھی سادی شریفانہ اور آباؤ اجداد کی طرح زندگی ایک معمول کے دائرے میں گزارنے والوں کو آج کی دنیا کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا جتنا جیل کے اندر کی دنیا والوں کو معلوم ہوتا رہتا تھا۔

آدھا دن گزر گیا تھا۔ ابھی تک وہ وہیں تھے جہاں چوبیس گھنٹے پہلے جیل سے باہر آئے تھے مگر ایک دن میں گھر، نوکری یا ذریعۂ معاش، فیملی اور انسانی رشتے کہاں سے آتے۔ یہ بازار میں ملنے والی چیز تو تھی نہیں۔ وہ پریقین تھے کہ انہیں ایک موقع مل جائے اور تھوڑا سا وقت تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے گاڑی اسٹارٹ ہو جائے تو بیٹری بھی چارج ہو جاتی ہے۔ مگر دنیا کے نام نہاد عزت داران کا راستہ روک رہے تھے۔ ان کو دھتکارتے جا رہے تھے۔ جاؤ، ہمارے پاس مت آؤ، تم سزا یافتہ ہو، قاتل ہو، جھوٹ سچ کا کسے پتا۔ یہ تمہارے ریکارڈ پر ہے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے کہ تمہیں اپنی محفوظ زندگی، اپنی فیملی، اپنے گھر، اپنے بچوں یا ان کی درس گاہوں میں گھسنے دیں۔

رفتہ رفتہ قاسم کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ اپنے ماضی پر خوشنما جھوٹ کی ایسی چادر ڈالیں جس کے پیچھے سب کچھ چھپ جائے۔ شام تک انہوں نے کئی جگہ قسمت آزمائی لیکن گزرے ہوئے دس سالوں کی کالک کے باعث ہر جگہ سے دھتکارے گئے۔

ابھی ان کی جیب میں جیل کی کمائی کے پیسے تھے لیکن وہ کسی ہوٹل میں رات گزارنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ابھی مستقبل غیر یقینی تھا۔ رات گزارنے کے لیے فٹ پاتھ سے ریلوے پلیٹ فارم تک مفت کے ٹھکانے کم نہ تھے۔ وہ کہیں سے بھی سردی سے بچاؤ کے لیے پرانا کمبل حاصل کر سکتے تھے لیکن قاسم نے اصرار کیا کہ ہم اپنے محلے کی اسی مسجد میں سونے کے لیے جا سکتے ہیں۔

''وہ موذن خوش نہیں تھا ہم سے۔''

''مولوی صاحب اتنے مہربان تھے ہم پر... وہ موذن کو سمجھالیں گے اور ہم کون سا مستقل ٹھکانا مانگ رہے ہیں رہائش کے لیے... بس دو چار دن۔''

مولوی صاحب انہیں نماز عصر کے بعد مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے ملے۔ ان کے پاس محلے کے لوگ تھے جو

چاہتے تھے کہ کرایہ دار اور مالک مکان کے قضیے میں وہ کوئی پُرامن تصفیہ کرا دیں۔ وہ دونوں بھی خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے کے باوجود مولوی صاحب نے انہیں توجہ نہ دی۔ دو افراد کو قاسم نے بھی پہچان لیا۔ گزشتہ شام وہ بھی مخالف جذبات رکھنے والوں میں شامل تھے۔ اس وقت بھی وہ انہیں ناپسندیدہ نظروں سے بار بار دیکھ رہے تھے۔ سوال ان کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ تمہیں خبردار کیا تھا کہ دوبارہ محلے میں نظر نہ آنا، لیکن مسجد میں وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

اپنا مسئلہ لے کر آنے والے مولوی صاحب کی کیا مانتے، وہ آپس میں بحث کرتے اور ان دونوں کو گھورتے ہوئے نکل گئے تو مولوی صاحب نے اخلاقاً پوچھ لیا۔ ”ہاں بھئی، کہیں کام بنا؟“

”نہیں مولوی صاحب، اب ہم اس دنیا کے قابل نہیں رہے۔“ ایاز بولا۔

”کیوں بھئی؟ ایسی کیا بات ہوگئی آخر؟“

”بات ایک ہی ہے مولوی صاحب! ہم قتل کے جرم میں سزا یافتہ ہیں۔ ہمارا رب ہمیں معاف کرسکتا ہے، دنیا کے نزدیک اب ہم خطرناک مجرم ہیں۔ ایک ٹھپا لگ گیا ہے ہمارے کردار پر... ہمارا نام ونسب گھر بار کچھ نہیں ہے۔ صرف اعلیٰ تعلیم ہماری ضمانت نہیں ہوسکتی۔“ قاسم نے دکھی لہجے میں کہا۔

مولوی صاحب خاموش رہے اور پھر بولے۔ ”اسے بھی اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھو، میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قاسم بولا۔ ”کل آپ کی بروقت مدد نے ہمیں بچالیا تھا۔ اب... ایک درخواست ہے کہ دو چار دن کے لیے ہمیں یہاں رہنے دیں۔ چند دن میں ہم کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔ نوکری نہ ملی تو مزدوری... اور سونے کی جگہ۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مولوی صاحب نے کھنکھار کے کہا۔ ”دیکھو برخوردار! مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔ آج کچھ لوگ آئے تھے مجھ سے یہی بات کرنے کہ ایک رات کی کوئی بات نہیں لیکن وہ پھر ان سے ملنے آئیں تو منع کردیا جائے کہ مسجد بھی محلے کی ہے اور عبادت کی جگہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں سزا یافتہ قاتل ٹھہریں۔ میں ان سے کیا بحث کرتا۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اتنا عرصہ میں نے امامت کی ہے۔ جنازے بھی پڑھائے ہیں اور نکاح بھی... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ مجھے کسی کی نظر میں مروت اور لحاظ محسوس نہیں ہوتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کا سبب میرے لیے اس عمر میں پریشانی پیدا کرے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میرا مطلب۔“

”جی مولوی صاحب۔“ انہوں نے سر جھکا کے کہا اور سلام کر کے مسجد سے باہر آگئے۔ مطلب بہت صاف تھا۔ اہلِ محلہ نے کہہ دیا تھا کہ ان سزا یافتہ قاتلوں کو محلے کی مسجد میں آنے سے نہ روکا گیا تو مسجد رہے گی... پیش امام بدل جائے گا۔ یہ بات دونوں کے دل میں تھی کہ ضرور موذن نے بھی مخالفوں کی حمایت کی ہوگی۔ وہ چاہتا ہوگا کہ پیش امام صاحب کا پتا کٹ جائے تو ان کی جگہ لے سکے۔ تاہم ان میں سے کسی نے بھی زبان سے یہ بات نہیں کہی۔

وہ رات انہوں نے ریلوے کے مسافر خانے میں گزاری۔ اس میں بھی قلیوں کے ٹھیکے دار سے اجازت لینی ضروری تھی۔ وہ سخت چہرے والا سابق ہسٹری شیٹر تھا۔ ایک عمر رسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے والے قلی نے ترس کھا کے انہیں اشارے سے بتا دیا کہ وہ ہے استاد... اس سے بات کرلو، میں کچھ نہیں کرسکتا۔

استاد کینٹ اسٹیشن پر تھرڈ کلاس مسافر خانے کے ایک گوشے میں دیوار کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے سر کی مالش ہو رہی تھی اور وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کے کھڑے دو قلیوں کو گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ کمینہ پن کرتے ہو میرے ساتھ... یہ بلّا لے لوں گا اور ریلوے کی پولیس رکھے گی ایک رات تو نانی یاد آجائے گی۔ چلو دفع ہوجاؤ۔“

مالشیے نے استاد کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا تو استاد کا بھیانک کرخت چہرہ ان دونوں کی طرف گھوم گیا۔ ”کچھ کام ہے۔ سیٹ چاہیے خیبر میل میں؟“

ایاز نے دوٹوک بات کی۔ ”ہم مسافر خانے میں سونا چاہتے تھے چند دن۔ تمہاری اجازت چاہیے۔“

وہ ان کو حیرانی سے دیکھتا رہا پھر مالشیے کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ”کیوں؟ کون ہو تم دونوں؟ گھر بار کوئی نہیں؟“

”نہیں، ایاز خان نے بے خوفی سے کہا۔“ ہم کل ہی قتل کے الزام میں عمر قید کاٹ کے رہا ہوئے تھے۔ میں نے تو خیر قتل کیا تھا اس نے باپ کو بچایا تھا۔ وہ شہر سے ہی غائب ہے۔ معلوم نہیں کدھر گیا۔“

استاد اٹھ کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر باری باری ان کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔

”نہ گھر بار ہے نہ نوکری ملتی ہے۔ حالانکہ میں نے

جیل میں بی اے اور پھر ایم اے کیا۔ سب ضائع گیا۔'' قاسم بولا۔

استاد کا چہرہ بے یقینی کی تصویر بن گیا۔ ''ایم اے؟ سچ بولتا ہے تو؟''

''تم سے جھوٹ بول کے کیا ملے گا؟'' قاسم تلخی سے بولا۔

''اچھا اچھا، بیٹھو ادھر۔'' گلو استاد نے نرمی سے کہا اور کسی کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا۔ ''سامان ہے کوئی... میرا مطلب ہے بستر وغیرہ؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''پیسے ہیں کچھ بچے ہوئے۔ کرایے پرل جائے کسی کا پرانا کمبل تو دلا دو اور ہاں استاد! ہم پہلے کھانا کھائیں گے۔ چائے بعد میں پئیں گے۔'' ایاز نے جیب سے دو نوٹ نکال کے استاد کی طرف بڑھائے۔

''انہیں رکھ اپنے پاس۔'' اور چائے لانے والے کو نئے احکامات جاری کیے۔ ''باہر سے دو دال فرائی اور روٹی... اسی لنگڑے سے... بول دینا گلو کے مہمان ہیں فٹافٹ جا۔''

کھانا ویسے ہی تھا جیسا ریلوے مسافر خانے کے گرد آباد ہوٹلوں میں ملتا ہے۔ ایاز اور قاسم دونوں کو احساس تھا کہ یہ ہسٹری شیٹر قلیوں کا ٹھیکے دار جو صورت سے ہی سفاک اور بدمعاش لگتا ہے ان لوگوں کے مقابلے میں نرم دل اور کچھ ہمدرد لگتا تھا جب وہ کھانا کھاتے ہوئے اپنی گزشتہ زندگی کا حساب پیش کر رہے تھے تو وہ سمجھ رہا تھا۔

''ہوتا ہے، یہی ہوتا ہے۔'' اس نے کئی بار کہا۔ ''پتا ہے مجھے۔''

''کیا تم بھی جیل جا چکے ہو استاد؟'' ایاز نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ''اے کوئی ایک بار... ہم تو سسرالی تھے پولیس کے۔ اپنا میکا ہو گیا تھا جیل خانہ۔ مگر بچے نالی کا کیڑا بھی زندہ رہتا ہے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی جو گٹر میں گرے اور نکل آئے۔ فکر نہ کرو، تھوڑے دن بعد یہ سب بھی گئی گزری ہو جائے گی۔ کون یاد رکھتا ہے کسی کو... فرصت کسے ہے۔ تم کر لو گے جو کرنا چاہو گے۔ ایک دن گھر بار بیوی بچے سب ہوں گے۔ اے دس سال پوری زندگی تو نہیں ہوتے۔ میں بھی بھول گیا۔ تم بھی یاد کرو گے تو بس اس طرح جیسے بچپن میں ٹائی فائڈ ہوا تھا یا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ میرے سارے بدن پر داغ ہیں زخموں کے... سب میڈل ہیں پولیس کے دیے ہوئے... ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

حساب برابر
بدلا ہوا زمانہ

مریض ڈاکٹر سے: ''اگر آنکھ میں مرچیں پڑ جائیں تو کیا کرنا چاہیے؟''
ڈاکٹر: ''جتنی مقدار میں مرچیں پڑی ہوں، اتنی ہی مقدار میں چینی ڈال لیں۔''
(ریاض بٹ، حسن ابدال)

لوہے کی راڈ پڑی ہوئی ہے۔ میں ان پڑھ تھا، یہ زندگی کا تجربہ ہے جو کام آیا۔''

''بیوی بچے ہیں تمہارے؟''

''ہاں، ایک بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ اس کا شوہر پلمبر تھا۔ دبئی چلا گیا۔ عیش کر رہی ہے۔ دو بیٹے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ سب لاہور میں ہیں۔ رام گلی میں گھر ہے۔ شاہ جی کہتے ہیں سب... کسی کو پتا نہیں کہ میں کون تھا اور اب کیا ہوں۔ ایک دو بار میرے پڑوسی سامنے سے گزر گئے پہچانے بغیر... وہ دیکھتے بھی تو کوئی ہمشکل سمجھتے۔ مگر گلو کا شاہ جی سے کیا تعلق۔ تو ماسٹر بننا چاہتا ہے؟''

قاسم نے چونک کے اقرار میں سر ہلایا۔ ''سوچا تو یہی تھا۔''

''چلو ابھی تو جاؤ اور سو جاؤ سب بھول کے... کل کرتے ہیں کچھ انتظام۔''

استاد گلو اس دنیا کے معاملات جانتا تھا جو سامنے ہوتے ہوئے بھی سب کی نظر سے اوجھل رہتی ہے مگر دنیا کے ہر بڑے شہر میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ جیسے انڈر گراؤنڈ ریلوے، محاورے کے مطابق گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کر کے نکالا جا سکتا ہے۔ اور استاد گلو کا کہنا تھا کہ کراچی جیسے شہر میں جینا ایک آرٹ ہے۔ اگلے چند دن میں اس نے قاسم اور ایاز کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کر دیں۔ جب اس نے بی اے کا امتحان دیا تھا تو رجسٹریشن فارم کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی لگائی تھی۔ اس کا رہائشی پتا وہی پرانا تھا جو اب وہ قانونی طور پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ استاد گلو نے ہر موقع پر کہا۔ ''اے قانون کے گھوڑے کیا ہوتا ہے قانون... کہاں ہے قانون... جیسا میں کہوں کرتا جا۔''
اور صرف ایک ہفتے میں استاد گلو نے اس کا سارا ماضی بدل دیا۔ اس کے پاس نامعلوم اسکولوں میں پڑھانے کا تجربہ رکھنے کے سرٹیفکیٹ آ گئے۔ ایک لاہور کا تھا۔ دوسرا پنڈی کا۔ دو کراچی کے اسکول تھے۔ سب میں تعلیم دینے کا زمانہ وہی تھا جو عمر قید کا زمانہ تھا۔ ہر سرٹیفکیٹ مستند تھا۔

ایاز نے متاثر ہو کے ایک دن کہا۔ ''استاد! میں بھی تو

ہوں قاسم کے ساتھ۔‘‘

’’کب تک؟‘‘ استاد گلو تلخی سے بولا۔ ’’جب تک تیرے نام کی گولی دل میں نہ اترے۔‘‘

’’استاد میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مارنا بھی نہیں چاہتا تھا کسی کو۔۔ مگر ماں نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ قربانی کا بکرا بنا دیا۔‘‘

استاد گلو سوچتا رہا۔ ’’اچھا‘‘ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ’’تیرا بھی کرتے ہیں کچھ، کیا پتا میرے مولا کو یہی ایک نیکی پسند آجائے۔ گناہ تو بہت کیے ہیں گلو نے۔۔۔ یہ بتا کچھ پڑھا ہے؟‘‘

’’ہاں، قاسم نے بڑی کوشش سے اتنا کر دیا تھا کہ امتحان دیتا تو ایف اے، بی اے کر لیتا۔‘‘

استاد گلو نے صرف سر ہلایا مگر جب چند دن بعد قاسم کے ہاتھ میں بی اے کی ڈگری آگئی جو کراچی یونیورسٹی کی جاری کردہ تھی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

’’اس پر تو میرا نام لکھا ہے۔‘‘

’’ابے تو کیا میرا نام ہوگا؟ اب بکواس کی نا کہ یہ جعلی ہے تو ایسا ہاتھ ماروں گا۔‘‘

دس بارہ دن ریلوے کے ویٹنگ روم میں گزار کے قاسم اور ایاز نے زندگی کا وہ سبق حاصل کیا جو کتابی نہیں تھا۔ دو ہفتے بعد قاسم نے بڑے اعتماد کے ساتھ ایک اچھے اسکول میں انٹرویو دیا۔ اس کے اعتماد نے جھوٹ کو سچ بنا دیا۔ اس کی شخصیت نے کامیابی کے نئے راستوں کا سفر شروع کیا۔ سات ہزار روپے ماہانہ پر وہ ٹیچر بن گیا۔ پروبیشن پیریڈ تین ماہ کا تھا۔ اس کے بعد تنخواہ دس ہزار ہو جاتی۔ ایاز نے ایک سپر اسٹور میں کاؤنٹر سنبھال لیا۔ انہوں نے گلشن میں تین بیڈ کا ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کیا اور اسے سجانے سنوارنے میں لگ گئے۔

ان کا داغ دار ماضی کسی لاوارث لاش کی طرح ایک بے نشاں قبر میں دفن ہو گیا تھا، ہمیشہ کے لیے۔ پرانا وقت کسی اور کا تھا۔ اب اس کا ذکر وہ خود بھی نہیں کریں گے۔ جیسے وہ کسی اور کا وقت تھا اور انہیں ایک نئی زندگی کے راستے پر گامزن کرنے کا یہ کارنامہ کسی ماہرِ نفسیات، کسی سماجی کارکن، کیریئر پلاننگ کے ایکسپرٹ، سیاست داں، صنعت کار یا بیوروکریٹ نے نہیں کیا تھا۔ یہ ہسٹری شیٹر کی سند رکھنے والے استاد گلو نے کیا تھا جو کینٹ اسٹیشن پر قلیوں کا ٹھیکے دار تھا۔

☆☆☆

قاسم نے کچھ دن اردو ہی پڑھائی تھی پھر انگلش بھی دے دی گئی۔ اس کی تنخواہ تین ماہ بعد کسی درخواست کے بغیر ہی دس ہزار کر دی گئی تھی۔ جب اس نے استاد گلو کی ہدایت پر اپنا حلیہ تبدیل کیا تو جیسے بہت کچھ بدل گیا۔ یہ بدلے ہوئے ماحول کی ضرورت تھی۔ خود اس کے اندر وہ امنگ پیدا ہو گئی تھی جو شباب کے تقاضوں کو ابھارتی تھی۔ اس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس کا ظاہری حلیہ باقی اسٹاف کے مقابلے میں کتنا دقیانوسی اور مختلف ہے۔ اس سے پہلے اسکول کے میمن مالک نے جس نے ماضی کے حوالے پر انہیں بے عزت کر کے نکالا تھا، ایک بات ضرور صحیح کہی تھی کہ عزت آدمی کی کوالی فکیشن سے زیادہ اس کے لباس کی ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک پہچان ان کا لائف اسٹائل بن گیا تھا۔ یہ اپر کلاس کے گھروں کا مغربی ماحول تھا جسے اپر مڈل کلاس اپناتی تھی اور معاشی طور پر نہ سہی ظاہری طور پر ماڈرن کلچر کی پروردہ نظر آنے سے معزز ہو جاتی تھی۔

قاسم نے بھی اپنا روپ بدلا۔ ابتدا میں اس نے لنڈے بازار پر انحصار کیا پھر لالوکھیت اور زینب مارکیٹ تک پہنچ گیا۔ اس نے بیش قیمت نظر آنے والی برانڈڈ جینز اور ٹی شرٹس اور پینٹس کے ساتھ ۔۔۔۔۔ ٹائی بھی لگانی شروع کی تو اس کی شخصیت نکھر کے سامنے آئی۔ اسکول انتظامیہ کے متاثر ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے تعلیم سے ہٹا کے ایڈمنسٹریٹر لگا دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شگفتہ شائستہ لہجے میں اور قائل کرنے والے انداز میں بات کرتا تھا۔ اب اس نے ضرورت سمجھتے ہوئے اردو سے زیادہ انگریزی میں بات کرنے کی عادت بنا لی تھی۔ بطور ایڈمنسٹریٹر اس کے فرائض میں ایک طرف طلبا کے والدین سے رابطہ رکھنا تھا اور دوسری طرف اسٹاف سے۔ وہ براہِ راست پرنسپل کو جواب دہ تھا جو مالک بھی تھا۔

اس کا رویہ اسٹاف کے ساتھ دوستانہ ہونا ضروری تھا۔ اسٹاف روم میں تین چوتھائی سے زیادہ خواتین تھیں جن میں سے نصف غیر شادی شدہ تھیں۔ بے تکلفی کے ماحول نے اس کے تعلقات کو اس قربت میں بھی بدل دیا تھا جس کا ایک نام محبت ہو سکتا تھا تو دوسرا افیئر یا ناجائز تعلق۔ بہت جلد قاسم کو احساس ہو گیا کہ کس کی نظر میں اس کے لیے پسندیدگی ہے۔ وہ محتاط نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور اس کے فرائض کا تقاضا تھا کہ وہ الگ اور غیر جانبدار رہے۔ چند ٹیچر اس ماحول کی پروردہ تھیں جہاں تکلف کو

بزدلی یا شرمیلے پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک دو نے از خود پیش قدمی کی اور اس سے بے تکلف ہونے کے بعد یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ ان کو انوائٹ کرے۔ ڈنر پر نہ سہی کافی کے لیے۔ لنچ کے اوقات میں وہ سب کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ اس جمود کو ایک لڑکی نے اسے انوائٹ کر کے توڑا۔

اس نے بڑی پریشانی کی ادا سے کہا۔ ''قاسم! آج میں لنچ نہیں لائی۔''

''تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ شیئر کرلو یا منگوا لو۔'' قاسم نے کہا۔

''اچھا نہیں لگتا۔ ایک گھنٹے میں لنچ باہر بھی کیا جاسکتا ہے۔''

''لیکن بریک تو چالیس منٹ کا ملتا ہے۔''

''اوہو، اگر بیس منٹ کی دیر ہو جائے کسی دن تو قیامت نہیں آجاتی ہے۔'' اس نے بیگ میں سے کٹ نکال کے اپنا میک اپ ٹھیک کیا جو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ تھا مگر یہ ایک سگنل تھا باہر جانے کی تیاری کا۔

''اوکے، جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔ پرنسپل سے تم خود نمٹ لینا۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''ایڈیٹ، میں اکیلی جاؤں گی؟''

قاسم اس خطاب پر سٹپٹا کے رہ گیا۔ مروتاً اس نے کہا۔ ''کس کے ساتھ جاؤ گی؟''

''تمہارے ساتھ اور کس کے ساتھ۔ تم واقعی اتنے ڈفر ہو، سوشل ایٹی کیٹس ہیں کہ تم خود مجھے آفر کرتے۔ چلو اٹھو، میں انوائٹ کر رہی ہوں تمہیں۔ پرنسپل سے بھی نمٹ لوں گی میں۔''

نہ چاہنے کے باوجود وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ''قاسم صاحب مجھے گھر چھوڑنے جارہے ہیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔''

قاسم نے مجبوراً جھوٹ نبھایا۔ ''ہاں، میں نے کہا کہ تم ڈرائیو مت کرو۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔''

لیکن ایک گھنٹے بعد وہ لنچ کر کے لوٹے تو بیماری کی نوعیت سب پر عیاں ہوگئی۔ بیمار اب پہلے سے زیادہ اچھے حال اور اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے بڑی شگفتگی سے پرنسپل کو مطلع کیا۔ ''سر! قاسم مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ شوگر لیول ڈراپ کر گیا ہوگا۔ دراصل آج صبح ناشتا نہیں کیا تھا میں نے۔''

''پھر بھی واپس آنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو؟'' پرنسپل نے کہا۔

''وہ، میں نے کچھ کھالیا۔ اب ٹھیک ہوں۔'' اس بات نے رازِ عشق افشا کر دیا۔ اسٹاف روم میں سب نے اتفاق رائے سے کہا کہ سر قاسم لنچ پر لے گئے تھے مس روشی کو... ان کا افیئر چل رہا ہے۔ پرنسپل کے سامنے قاسم نے سختی سے اس کی تردید کی۔ مس روشی کے لنچ کا اسکینڈل پرانا نہیں ہوا تھا کہ قاسم ایک اور چکر میں پڑ گیا۔ مس گل نے اسے اپنی برتھ ڈے پر بلالیا اور یہ جھوٹ بول کر کہ اس نے سب کو بلایا ہے۔ یہ سو فیصد جھوٹ نہیں تھا۔ دو چار لوگوں کو اس نے اگلے دن آنے کو کہہ دیا تھا۔

قاسم شام کو پورے اہتمام کے ساتھ گفٹ میں پھولوں کا گلدستہ لے کر گیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی اور تحفہ مثلاً جیولری یا پرفیوم دینے سے غلط فہمی پیدا ہوتی۔ اسے مس گل نے جو ایک پوش علاقے کی بہت بڑی کوٹھی میں رہتی تھی، اپنے ممی پاپا سے ملوایا۔ یہ بتایا کہ ان کے پاس یو ایس اے کی سٹیزن شپ بھی ہے۔ اپنے فرینڈز اور کزن کے سامنے قاسم کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی لیکن قاسم کو سب سے زیادہ پریشانی باقی اسٹاف کو غیر موجود پا کے ہوئی۔

''مس گل! دوسرے لوگ کیوں نہیں آئے؟''

گل مجسم گلزار بنی ہوئی تھی، اس نے ہنس کے کہا۔ ''مجھے کیا معلوم، بداخلاق لوگ ہیں۔''

''وہ بداخلاق ہیں یا تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ کسی اور کو نہ بلا کر؟''

وہ قاسم کے اور قریب آکے سرگوشی میں بولی۔ ''جب سمجھتے ہو تو پوچھتے کیوں ہو۔ میں نے ان سب کو کل آنے کا کہہ دیا تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''تمہیں تو خوشی اور فخر محسوس کرنا چاہیے۔''

''اور وہ جو کل آکے شرمندہ ہوں گے؟''

''ان کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انجوائے... ممی پاپا نے بہت پسند کیا ہے تمہیں۔''

خطرے کی گھنٹی اب قاسم کے سر میں فائر الارم کی طرح بج رہی تھی۔ وہ ٹریپ ہو رہا تھا۔ ان دولت مند غیر ملکی شہریت رکھنے والوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لاوارث گھر داماد خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے ترغیب کا جال تھا۔ دولت مندی کی کشش، اپر کلاس کی ایک خوب صورت لڑکی کا شوہر کہلانے کا فخر۔ امریکی شہریت کا لالچ، کار، کوٹھی، کیش... آج کا نوجوان بھلا اور کیا چاہے گا۔

فائدہ یہ کہ امریکا میں یہ زرخرید شوہر مشرق کا سرتاج اور مجازی خدا نہیں بن سکے گا۔ ان کی آزاد خیال بیٹی کو اپنی کنیز بنا کے نہیں رکھ سکے گا اور کوشش کرے گا تو مارا جائے گا۔ وہاں کا قانون مختلف ہے اور اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔

قاسم نے ایاز کے مشورے سے بروقت قدم اٹھایا۔ اس نے صبح پرنسپل کو سب بتا دیا۔ گواہی میں اسٹاف کے وہ لوگ پیش ہو گئے جن کو آج خفت اٹھا کے اور جھوٹا بنا کے واپس ہونا تھا۔ مس گل یہی کہتی کہ یہ لوگ خود بھول گئے کہ آج جانا ہے۔ میں کسی کو بلاؤں گی تو اگلے دن کیوں بلاؤں گی۔

پرنسپل نے مس گل کو آفس میں بلا کے برطرفی کا حکم نامہ پکڑا دیا۔ وجہ بتانا ضروری نہیں اور ضروری ہو تو یہ کہ وہ اچھی ٹیچر نہیں ہے۔ یہ خبر اسٹاف روم میں ایک دھماکا بن گئی۔ سر قاسم نے مس گل کی چھٹی کرا دی۔ مس گل کی کردار کشی میں مس روشی پیش پیش رہی جس نے خود ساختہ ''چشم دید'' واقعات سے مس گل کو بدکردار ثابت کیا۔ آئی تھی اس کی حریف بننے۔ ایک طرح سے مس روشی نے یہ سمجھ لیا کہ سر قاسم نے اسے مسترد نہیں کیا۔ گویا قبول کیا۔ اللہ وہ دن لائے کہ یہی دو بول قاضی کے سامنے بولے جائیں۔

قاسم نے سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ مس گل کا فون آ گیا۔ قاسم کے لیے یہ غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نیوٹن کے قانون کے مطابق ہر ایکشن کا ری ایکشن مساوی ہوتا ہے۔ مس گل نے اسے امریکی جاہلوں کی اور غنڈے بدمعاشوں کی مستند گالیاں انہی کے لب و لہجے میں دیں اور قاسم نے خاموشی سے سنیں یہاں تک کہ مس گل کو شک ہوا کہ اس نے فون بند کر دیا ہے۔ ''تم سن رہے ہو نا؟''

''جی مگر مطمئن رہیے، ریکارڈ نہیں کر رہا ہوں۔''

''کرلو ریکارڈ۔'' مس گل نے مزید گل فشانی کی اور اسے دھمکی دی کہ اب وہ اپنی برطرفی یقینی سمجھے۔ صرف برطرفی ہی نہیں اسے وہ سبق سکھایا جائے گا کہ... قاسم نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ مس گل کی دھمکی ایک وقتی غصہ ہو گی مگر ایسا نہیں تھا۔ اگلے دن پرنسپل اور اسکول کے مالک نے اسے طلب کیا۔

وہ کچھ پریشان تھا۔ ''قاسم صاحب! ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''میں اس میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں تو کہیے۔''

''تم؟ تم ہی نے تو مسئلہ کھڑا کیا تھا اور اب خود مسئلہ بن گئے ہو۔'' وہ ناخوشی سے بولا۔

قاسم حیران ہوا۔ ''میں! میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ بولا مگر اچانک آنے والا ایک خیال قاسم کے دل میں یوں جاگ اٹھا جیسے مردہ سانپ پھر پھن اٹھا کے کھڑا ہو جائے۔ کہیں کسی بدخواہ نے اس کے ماضی کے مردے کو تو قبر سے نہیں نکال لیا ہے۔

''تم نے مس گل کو برطرف کرایا تھا۔''

''برطرف آپ نے کیا تھا۔ میں نے اپنی ایک ذاتی شکایت کی تھی۔''

''اب اس کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی ہے، تم جانتے ہو اس کا باپ کون ہے؟''

''نام سے واقف نہیں، لیکن ہے کوئی دولت مند امریکی شہری۔'' قاسم نے کہا۔

''اس کا... برسراقتدار جماعت سے پرانا تعلق ہے۔ وہ سینیٹر ہے اور ایک کمیٹی کا رکن۔ اس کا داماد عدالت عالیہ میں جج ہے اور بیٹا وزارتِ داخلہ...''

''دیکھیے، مجھے اس کے اسٹیٹس سے کیا۔''

پرنسپل نے میز پر مکا مارا۔ ''ایڈیٹ، تم نہیں... میں... نے سوچے سمجھے بغیر تمہارے کہنے پر ایک قدم اٹھا لیا۔ یہ اسکول میرا بزنس ہے۔ مجھے دھمکی ملی ہے کہ میں نے آج ہی تمہیں برطرف نہ کیا تو میرے اسکول کے بارے میں اس علاقے میں وال چاکنگ کر دی جائے گی۔ راتوں رات یہ لکھ دیا جائے گا کہ میں اسکول نہیں بدکاری کا اڈا چلا رہا ہوں۔ اخبارات میں خبروں اور کالموں میں اس وال چاکنگ کے حوالے سے تبصرے ہوں گے۔ پھر کون بھیجے گا اپنے بچوں کو یہاں... کون ٹیچر یہاں پڑھائے گی؟''

قاسم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''او مائی گاڈ۔''

پرنسپل نے ایک گہری سانس لی۔ ''آئی ایم سوری۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میرے لیے بہت کارآمد رہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اپنا بزنس گڈول اور زندگی کچھ داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ کیشیئر تمہارا حساب کر دے گا۔ تین ماہ کی تنخواہ میں اپنی طرف سے دے رہا ہوں۔ تمہاری بہترین سروسز پر۔ مجھے امید ہے اس عرصے میں تمہیں کوئی جاب مل جائے گی۔''

قاسم نے سر ہلایا۔ ''تھینک یو سر، میں نے آپ کی مجبوری سمجھ لی۔''

قاسم اسکول سے سیدھا ایاز کے پاس گیا۔ وہ اپنے کیش اینڈ کیری اسٹور کے کاؤنٹر بیٹھا تھا۔ ابھی صبح کا وقت تھا اس لیے دوسرے کاؤنٹرز پر بھی کیشیئر فارغ بیٹھے تھے۔

''قاسم، تو اس وقت یہاں... خیریت تو ہے نا؟''

قاسم مسکرایا۔ ''کوئی کاؤنٹر خالی ہے تو مجھے بٹھا دے۔ میری اسکول سے چھٹی ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟ تیرے مقدر کا ستارہ تو عروج پر تھا۔ مس روشی کے ساتھ لنچ اور مس گل کی سالگرہ میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت۔''

''وہ ستارہ ڈوب گیا ایاز اور اس کے ساتھ ہی میری چھٹی ہوگئی اسکول سے۔''

اب اِکا دُکا گاہک آنے لگے تھے مگر وہ دوسرے کاؤنٹرز پر چلے گئے۔ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے اس نے بتایا کہ حق گوئی و بے باکی اسے کتنی مہنگی پڑی ہے۔ دنیا بہت بدل گئی ہے ایاز۔

''یہ تو استاد گلو نے بہت اچھی طرح سمجھایا تھا۔''

''مگر اتنی جلدی سمجھ میں کہاں آتی ہے ایاز۔ جب تک عملی تجربہ نہ ہو۔ گلو نے تو رحم کھا کے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میرے منہ پر لگی ہوئی کالک چھپا دی تھی۔ لیکن وہ جا کیسے سکتی ہے۔ یہی خوف بیٹھا ہوا ہے میرے دل میں کسی دن پھر ہمارا اصلی چہرہ نظر آنے لگے گا۔''

''خوامخواہ کی فکروں میں کیوں پڑتا ہے۔''

''یہ بات نہیں ایاز، اس لڑکی کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ وہ بھی میرے جیسے معمولی دو ٹکے کے ماسٹر کے ہاتھوں... وہ زخم خوردہ ناگن بنی ہوئی ہے۔ صرف مجھے برطرف کرا کے وہ مطمئن نہیں ہوگی۔''

''اس سے زیادہ کیا کرے گی وہ؟'' ایاز نے اسے گالی دی۔

''ہم بے سہارا، بے تعلق لوگ ہیں اور ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے جرم کو اختیار نہیں کیا۔ پیشہ یا عزت یا دولت کمانے کا راستہ نہیں سمجھا، ہم جیسے پڑھے لکھے صرف کتابوں میں لکھے علم کو سمجھتے ہیں۔ اس دنیا کو سمجھنے والے حاکم ہیں اور عزت دار ہیں۔ اس دنیا کو یہ لوگ چلا رہے ہیں ایاز... جس میں زندہ رہنا بھی ان کی شرائط پر ہوتا ہے۔ اگر میں چاہتا تو خوش نصیبی کی جو لاٹری میرے نام مس گل کی صورت میں نکل آئی تھی، اسے کیش کرا لیتا۔ حرام ایا ناجائز اور غلط یا غیر اخلاقی قرار دے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مارتا۔ میں ذرا بھی معاملہ فہم اور دور اندیش ہوتا تو گل کے ابا کی غلامی قبول کر لیتا۔ سب کچھ مل جاتا مجھے جس کی دنیا میں خواہش کی جا سکتی ہے۔''

''واقعی، مگر یار اب بھی زیادہ خرابی نہیں ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تیرا۔ میں جا کے گل کے سامنے ہاتھ جوڑ کے دو زانو بیٹھ کر کہوں کہ مجھے معاف کر دو۔ اس کے باپ کے قدموں میں کُتّے کی طرح لوٹنے لگوں تا کہ وہ مجھے داماد بنا کے امریکا ساتھ لے جائے۔ وہاں میں غیرت اور خودداری کو دفن کر کے صرف اس دولت پر قناعت کر لوں جو مجھے گل کے طفیل حاصل ہو... اپنے آپ سے سمجھوتا کر لوں کہ یہ سب لائف اسٹائل ہے۔ میری بیوی جو چاہے کرے مجھے کیا۔ میں بھی سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ وہ عیش کر رہی ہے تو میں اس سے زیادہ عیش کروں۔ نہیں ایاز، سب ایسا نہیں کر سکتے اور ان میں ایک میں ہوں۔''

ایاز نے ایک آہ بھری۔ ''اچھا بیٹے جو تیری مرضی، اب کیا کرے گا تو؟''

''میں نے سوچا ہے کہ نوکری تو چھوڑنی پڑی ہے۔ ہمیں گھر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔''

ایاز نے حیران ہو کر کہا۔ ''وہ کیوں؟''

''مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خلاف کوئی اور کارروائی شروع نہ کرا دی جائے۔ مجھے کسی مقدمے میں نہ الجھا دیا جائے اور پولیس کو جانتا ہے تو... وہ حکم کی غلام ہے۔ کُتّے کی طرح دم ہلاتی جاتی ہے طاقتور کے پیچھے، یہ نہ ہو مستقبل تباہ کرنے والوں کے سامنے ہمارا ماضی بھی آ جائے۔''

''ہم استاد گلو سے بات کریں؟''

قاسم تلخی سے ہنسا۔ ''وہ گالیاں دے گا کہ اُلّو کے پٹھے یہی سیکھا ہے تو نے؟ سو پیاز اور پھر سو جوتے۔ اب کے گیا تو لمبا جائے گا اندر... جعلی ڈگری اور جعلی کاغذات کا کیس تو کچھ بھی نہیں۔ انسداد دہشت گردی کے کیس میں پھنس جائے گا۔ یہاں تو روز لاشیں ملتی ہیں۔ کسی کے ساتھ بھی لگا دیں گے تیرا نام۔ پہلے بچ گیا تھا اب کے ہوگی پھانسی... وہ تو سب بھول کے جا چکی ہوگی امریکا جس نے سب کرایا۔ وہاں کسی ڈسکو میں ناچتی رہے گی اور کسی ٹام اینڈ جیری جیسے بوائے فرینڈ کی بانہوں میں اسے قاسم کا نام تک بھول چکا ہوگا۔''

اس رات انہوں نے اپنا اسباب اس فلیٹ سے اٹھا لیا جہاں وہ کئی ماہ سے بڑے سکون اور عافیت کے ساتھ رہے اور ان کا خیال تھا کہ اس میں آرام و آسائش کے سب اسباب ہوں گے تو کہیں اور جانے کی فی الحال ضرورت نہ ہو گی۔ ان کو ایک ماہ کے نوٹس کی وجہ سے کرایہ بھی دینا پڑا لیکن مالک مکان کی شرافت کی وجہ سے باقی رقم واپس مل گئی۔ وہ میلوں دور کلفٹن میں فلیٹوں کے اس جنگل میں گم ہو

گئے جہاں دس بارہ منزلہ عمارات ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ دو اور تین بیڈ کے سستے کہلانے والے فلیٹوں میں بھانت بھانت کے لوگ آباد تھے جو سارے ملک سے یہاں روزگار کے چکر میں آئے ہوئے تھے۔ ہر قوم کے ہر زبان بولنے والے ایک دوسرے کے تمام معاملات سے لاتعلق تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ پڑوس یا سامنے کے فلیٹ میں رہنے والا کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ تھے تو کچھ بیوی بنا کے کسی کو بھی ساتھ رکھ لیتے تھے آتی جاتی عورتوں کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

ان فلیٹوں کی تعمیر ناقص تھی اور ان میں ضروریاتِ زندگی کا بھی فقدان تھا۔ آئے دن بجلی نہ ہونے کے باعث لفٹ کام چھوڑ دیتی تھی یا خراب ہو جاتی تھی۔ بوڑھے، بچے، جوان سب ہانپتے ہوئے زینے طے کرتے تھے اور شمار کرتے جاتے تھے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں تھرڈ فلور پر فلیٹ ملا۔ ایاز کو یہ جگہ بہت دور پڑتی تھی مگر دوست کا ساتھ نبھانا زیادہ اہم تھا۔ وہ بسوں میں دھکے کھاتا ہوا جاتا تھا اور رات کو دیر سے لوٹتا تھا۔ اس نے قسطوں پر کوئی پرانی موٹر سائیکل لینے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ کیش اینڈ کیری اسٹور والوں نے سالانہ بونس دیا تو سال پورا نہ ہونے کے باوجود ایاز کو بھی نواز دیا کیونکہ اس کی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ اس سے موٹر سائیکل کا مسئلہ حل ہو گیا۔ قاسم فوری طور پر کہیں قسمت آزمانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تین ماہ کی ایڈوانس تنخواہ کو غنیمت جانا اور بالکل روپوش ہو گیا۔ سلامتی سب پر مقدم تھی۔ اسے بالواسطہ طور پر معلوم ہوا کہ پولیس اسے تلاش کرتی اسکول گئی تھی اور فلیٹ پر بھی پہنچی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر الزام کیا تھا۔ اس کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔

ایک ماہ بعد موسم اچانک بدل گیا۔ فلیٹوں کے اندر ساحل کے نزدیک ہونے کے باوجود حبس کی سی کیفیت تھی۔ قاسم پیدل چلتا ساحل پر پہنچ گیا اور کنارے پر بنی میلوں لمبی حفاظتی دیوار پر بیٹھ کے تفریح کرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ سمندر کی لہریں ابھی دور تھیں۔ لوگ گیلی ریت پر ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ کپڑوں سمیت پانی میں اترے ہوئے تھے۔ ریت پر موٹر سائیکلیں دوڑا رہے تھے اور خوش تھے۔ جوڑوں کا پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ نو بیاہتا ہے یا ابھی محبت کے تجربے سے گزر رہے ہیں۔ قاسم نے گل اور پھر روشی کو یاد کیا۔ روشی مجبور تھی۔ وہ سہارے کی تلاش میں ایک مرد سے دوسرے مرد کی طرف بھٹک رہی تھی اور ابھی تک اسے اپنی منزل نہیں ملی تھی۔ گل اس کے برعکس شوہر خریدنا چاہتی تھی جو اس کے معیار پر پورا اترے۔ ایسا ہینڈسم جوان جسے وہ فخر سے سب کے سامنے پیش کرے۔ ایسا حکم کا غلام جو کبھی سر نہ اٹھائے۔

اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے ہجوم کے درمیان مگر سب سے الگ ایک آشنا صورت دیکھی اور درمیان میں حائل وقت کی دیوار کے باوجود اسے یوں نظر آ گئی جیسے دیوار شیشے کی تھی۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ مسلسل بھاگ دوڑ اور چیخ پکار میں مصروف ہجوم سے نکل کر وہ صورت قدم قدم آگے آ رہی تھی اور اس کے درمیان فاصلے کو جیسے کوئی زوم کیمرا کم کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کے ٹھہر گئی۔ وہ بلندی سے اسے بالکل صاف دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی دیکھ کے وہ حیران تھا اور مسرور بھی... پھر وہ چھلانگ لگا کے ریت پر اترا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''تم شاہینہ ہو نا؟'' اس نے تیز ہوا میں اُڑتے ہوئے کپڑوں اور بالوں کو سنبھالنے والی لڑکی سے کہا۔

''تمہیں نام یاد ہے میرا؟'' وہ حیران ہوئی مگر اس حیرانی میں ایک خوشی تھی۔ ''مجھے تو نہیں یاد۔''

''پھر کیسے پہچان لیا تم نے مجھے؟''

وہ ہنسی۔ ''آدمی صورت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ تم ہمارے گھر آئے تھے۔ میرا مطلب ہے اس گھر میں جہاں پہلے تم رہتے تھے مگر تم تو بالکل بدل گئے ہو۔''

''وقت کے ساتھ سب بدل جاتے ہیں۔ گھر... گھر کے مکین... لوگوں کے رویے۔''

''تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا میرے گھر والوں نے... مجھے افسوس ہے۔''

''میں بھولا نہیں تھا کہ وہاں صرف تم نے میری حمایت کی تھی۔ میرا نام قاسم ہے۔''

''اچانک اتنے عرصے بعد دکھائی دیے تم تو میں نے سوچا کہ معذرت کر لوں۔ میں یہاں اپنے اسٹاف کے ساتھ آئی تھی۔ کہاں ہو آج کل... کیا کر رہے ہو؟''

قاسم کو اس لڑکی شاہینہ کی سادگی اور بے تکلفی جیسی ادا پر حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی۔ ''میں پڑھا رہا ہوں بلکہ پڑھا رہا تھا۔ ایک اسکول میں... آج کل فارغ ہوں۔ ایک فلیٹ میں رہتا ہوں اور بیکار ہوں۔''

''کیوں، اسکول کیوں چھوڑ دیا؟''
''مجھے نکال دیا گیا تھا۔''
''دیکھو ابھی وقت نہیں ہے۔ وقت نکال کے مجھ سے ملو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے نوکری کا۔''
''تم بھی نوکری کرتی ہو کہیں؟''
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''دراصل، تمہارے بارے میں کچھ تم سے سنا تھا۔ بعد میں لوگوں سے سنا۔ یہ کہانی مجھے بڑی عجیب لگی۔ کیا تم نے واقعی جیل میں رہ کے ایم اے کیا تھا؟ اور قتل کے جرم میں عمر قید کاٹی تھی؟''
''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔'' اس نے پروین شاکر کی زبان میں کہہ دیا۔
''یہ لو میرا کارڈ، میں باس کی سیکریٹری ہوں۔ وہ ذرا دیر سے آتا ہے اگر کسی دن وقت نکال کے تم صبح نو بجے آجاؤ۔'' اس نے بیگ میں سے کارڈ نکال کے آگے بڑھا دیا۔
وہ انکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی داستانِ حیات کی تشہیر نہیں چاہتا۔ اس نے تو بڑی مشکل سے ساری غلاظت کو سمیٹ کے کارپٹ کے نیچے چھپا دیا تھا، اتنے خوشنما رنگ اور ڈیزائن والے کارپٹ کو ہٹا کے اس گندگی کو کھنگالنا عقلمندی نہیں خطرناک ہے۔ لیکن اس نے کارڈ لے لیا کیونکہ وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی وساطت سے نوکری ملے نہ ملے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ماضی کے مزاروں کو کھود کے اپنے زخم کریدنا نہیں چاہتا۔
وہ پلٹ کے آہستہ آہستہ ادھر چلی گئی جہاں آٹھ دس افراد کا ایک گروپ ریت پر دریاں بچھا کے اپنا اسباب پھیلا رہا تھا۔ وہ سب شاہینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ضرور پوچھا ہوگا کہ یہ کون مل گیا یہاں؟ ہمیں چھوڑ کے اس سے بات کرنے چلی گئیں اور اس نے کوئی ٹالنے والا جواب دے کر انہیں مطمئن بھی کردیا ہوگا کیونکہ اب وہ کھانے پینے میں مگن ہوگئے تھے۔ اس گروپ میں چار خواتین اور آٹھ مرد تھے۔ ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص اپنے رویے سے اور دوسروں کے رویے سے بھی باس نظر آتا تھا۔ خواتین مردوں کو چائے، کافی اور کھانے پینے کی چیزیں دے رہی تھیں۔ وہ سب خوش تھے۔ خوش بخت لوگ جو محفوظ تھے جو خاندان اور خلوص و محبت کے سارے رشتے رکھتے تھے۔ جن سے وہ محروم تھا۔
رات کو اس نے کئی بار ایاز کو اپنی اور شاہینہ کی ملاقات کے بارے میں بتانے کا سوچا اور نہ بتاسکا۔ صبح وہ پونے نو بجے اس پتے پر موجود تھا جو شاہینہ کے دیے ہوئے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت نو بجے ہو تو ملنے کے لوگ پانچ دس منٹ بعد ہی آتے ہیں مگر شاہینہ اپنے کیبن میں موجود تھی۔ یہ نیچے سے آدھا لکڑی کا تھا اور اوپر چارفٹ اندھا شیشہ تھا جس پر دوسری طرف کی صرف پرچھائیں ہی نظر آتی تھی۔ شاہینہ مین گیٹ کے ساتھ ہی دائیں طرف کے دروازے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مین گیٹ پر پیتل کے چمکتے حروف میں مینجنگ ڈائریکٹر کا نام لکھا ہوا تھا۔ سائڈ کی دیوار پر کمپنی کا نام تھا۔ باس کے کمرے کا راستہ شاہینہ کے کیبن سے گزرتا تھا۔ کوئی بھی سیدھا اس کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ہر آنے والے کا نام اور ملاقات کی غرض و غایت سے مالک کو آگاہ کرتی اور اجازت ملنے پر دوسرے گیٹ کو ان لاک کردیتی تھی جو اس کے کیبن سے براہِ راست باس کے کمرے میں پہنچاتا تھا۔ یہ یک طرفہ لاک تھا یعنی باس اسے اندر سے جب چاہے کھول سکتا تھا۔
شاہینہ ایک خوب صورت میز کے پیچھے گزشتہ شام سے زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ اس کا لباس مہنگا نہیں لیکن جدید فیشن کے مطابق تھا اور اس نے صبح کی تازگی میں ہلکے سے میک اپ کے ساتھ احساسِ حسن کو دوچند کردیا تھا۔ اس نے اپنی بے حد دلکش پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہوئے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''ویری گڈ، تم وقت کے پابند لگتے ہو۔''
''آج تو آپ کو امپریس کرنا ضروری تھا۔'' وہ بولا اور شاہینہ کے نازک ہاتھ کا اشارہ دیکھ کر دائیں طرف کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آگے انتظار کرنے والوں کے لیے ایک صوفہ سیٹ اور سینٹر ٹیبل تھے۔ شاہینہ کی فائلیں ریک میں ترتیب سے کھڑی تھیں۔
''میں جاب کرنے والی لڑکیوں کو پسند کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اس لیے نہیں کہ وہ کماتی ہیں، ان کی ہمت کی وجہ سے یہاں تم جیسی کسی لڑکی کا مردوں کے ساتھ رہنا آسان نہیں ہوسکتا۔''
''میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں اور ہر جگہ ایسا ہی ہے۔ یہاں میرے ساتھ بھی ہوتا اگر باس مجھے اپنی بیٹی نہ سمجھتا۔ بے شک باس وہ ہے مگر رعب میرا ابھی کم نہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اچھا بتاؤ کیا پیوگے، چائے یا کافی؟''
''کافی میں نے کبھی پی نہیں۔''
''آج میرے کہنے سے پی کے دیکھو، سب کہتے ہیں میں اچھی بناتی ہوں۔'' وہ اٹھی اور ایک الیکٹرک کیتل کا

سوئچ آن کر دیا۔

چند منٹ بعد اس نے ایک مگ قاسم کے سامنے رکھا اور دوسرا اپنے سامنے۔ ''اپنے ہاتھ میں ہے نا تو بہت پینے لگی ہوں میں۔''

''تم کیا کرتی ہو یہاں؟''

''جو ہر سیکریٹری کرتی ہے۔ جو باس چاہے۔ میں صرف گریجویٹ ہوں لیکن یہ سب آپریٹ کر لیتی ہوں۔'' اس نے اپنی میز پر رکھے ڈیجیٹل فون ایکس چینج، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر اور انٹرکام سیٹس کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں پڑھاتی تو اس سے آدھی تنخواہ بھی نہ ملتی۔''

''تم میرے ماضی کو کیوں کریدنا چاہتی ہو، ڈر نہیں لگتا تمہیں مجھ سے؟''

''میں ضرور ڈرتی، اتنی بزدل ہوں کہ کاکروچ دیکھ کے چیخ مارتی ہوں۔ کوئی سزا یافتہ قاتل میں نے پہلے دیکھا نہیں۔ بس خیال ہے کہ وہ بہت خوفناک ہوتے ہوں گے۔ تم تو بڑے بے ضرر سے لگتے ہو۔ بلکہ معاف کرنا بے وقوف۔''

''میں بے وقوف ہوں۔''

''نہیں، تم ایک اچھے اسکول میں پڑھا رہے تھے، تمہیں کس خطا پر نکالا گیا؟''

''ایک دولت مند اثر رسوخ رکھنے والے باپ کی خوب صورت بیٹی سے عشق نہ کرنے پر۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''ہاں یہی بات ہے مس شاہینہ! اگر میں چاہتا تو اس سے شادی کر لیتا اور عیش کرتا۔ وہ امریکن نیشنل بھی تھی۔ بس وقت گزاری کے لیے میرے ساتھ پڑھا رہی تھی۔ جتنی تنخواہ لیتی تھی اس سے زیادہ شاید گاڑی کے پیٹرول پر خرچ کر دیتی ہوگی۔''

وہ کچھ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ''قتل بھی تم نے کیا نہیں تھا مگر سزا پائی۔''

''شاید یہی میری قسمت ہے۔ ناکردہ جرائم کی سزا کاٹنا اور کچھ نہ سیکھنا۔'' قاسم بولا۔

''تمہارے چلے جانے کے بعد۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں نے بہت باتیں سنیں اور کسی حد تک مجھے اندازہ ہوا کہ قتل تمہارے باپ نے کیا تھا۔ ماں کو بیوہ ہونے سے بچانے کے لیے تم نے الزام اپنے سر لیا۔''

''وہاں بھی دھوکا ہوا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ نابالغ ہونے کی وجہ سے مجھے سزائے موت نہیں ہوگی۔ مجھے چند سال قید کاٹنی ہوگی مگر میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں لکھی گئی عمر کو چیلنج کیا گیا تو میڈیکل رپورٹ نے مجھے بالغ ثابت کر دیا۔ سزائے موت سے میں بچ گیا۔ جج سمجھتا تھا کہ اصل کیس کیا ہے گواہ ثبوت سے کچھ بھی ثابت کیا جائے۔ وہ اب کہاں ہیں؟''

شاہینہ چونکی۔ ''کون؟'' وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے کچھ بتانے سے گریزاں ہے۔ ''مجھے صحیح پتا نہیں۔''

''کیا سنا ہے تم نے... کیا کسی نے ان کی بات کی؟''

''جھوٹ سچ خدا جانے، شاید تمہاری ماں نے خودکشی کر لی تھی اور باپ تمہاری بہن کو لے کے چلا گیا تھا، یہ مکان بیچ کے جو اس کے کردار سے واقف ہیں وہ کہتے ہیں کہ بیٹی کو بھی اس نے پیسا لے کر کسی سے بیاہ دیا ہوگا۔ خیر تم اپنی بتاؤ۔''

''اب کیا ہے بتانے کو؟''

''جیل کی ساری زندگی کیسے گزری۔ تم پیشہ ور مجرم کیوں نہیں بنے، ایم اے کیسے کر لیا؟''

''دیکھو، میری بات کا برا مت ماننا۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلا دیا ہے۔ دفن کر دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔ میں اب وہ نہیں ہوں کہ جو تھا بس میں خوش قسمت تھا کہ آج تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ جب میں نے ایم اے کیا اور اس سے پہلے بی اے کیا تب بھی... کسی صحافی نے انٹرویو لیا تھا میرا... چھپا بھی تھا اور میں نے بھی دیکھا تھا۔ شاید وہ اخبار مل جائے تمہیں۔''

وہ سیریس بیٹھی خلا میں دیکھتی اور ناخن کاٹتی رہی۔

''میں تمہاری کہانی لکھنا چاہتی تھی۔''

''تم کہانیاں لکھتی ہو؟''

''تم ایک سلسلے وار کہانی کے ہیرو ہو سکتے ہو۔ حالات تمہارے ہوں گے۔ نام بدل جائیں گے۔ اس میں پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے اور بھی بہت کچھ ڈالوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قسط وار کہانی ہٹ ہوگی۔ کئی سال چلے گی۔ ہر ماہ ایک قسط لکھنے کے مجھے دس ہزار ملیں گے۔ آدھے تمہیں دے سکتی ہوں۔''

''اس فراخ دلی کی وجہ؟''

''ایک ضرورت مند ہو تم، دوسرے میں... مجھے جیل کے اندر کے روز و شب کا کچھ پتا نہیں۔ میں تمہیں یہاں بھی ایڈجسٹ کرا دیتی اگر تم نے ایم بی اے کیا ہوتا۔ کمپیوٹر کتنا آتا ہے؟''

''صرف دیکھا ہے۔ جیسے تمہارے سامنے ہے۔''

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔ ''یہ کوئی مشکل نہیں۔ میرا

مشورہ ہے کہ سیکھ لو۔ کسی بھی انسٹی ٹیوٹ سے۔ زیادہ سے زیادہ تین ماہ لگیں گے۔ آج کل اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ اچھی نوکری نہیں ملتی۔ کسی اسکول میں تو آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''تمہاری کافی کا شکریہ... لیکن میں تمہاری خواہش پوری نہیں کرسکتا۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے جو میں بتاؤں گا نہیں لیکن میری کہانی شائع ہوگی تو... اس زندگی کے خواب کی تعبیر چھن جائے گی جو میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ قاسم کو خاموشی سے باہر جاتا دیکھتی رہی' اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ اپنی زندگی پر مبنی کسی مقبول سلسلے وار کہانی سے حاصل ہونے والی شہرت اور مالی فائدے کو وہ بہت خوش ہو کے قبول کرے گا۔ اگر وہ راضی ہوتا تو وہ بتاتی کہ بعض اوقات یہی مطبوعہ کہانیاں کسی ہٹ ٹی وی سیریل کے لیے بھی منتخب ہو جاتی ہیں بلکہ اب تو ایسا ہی ہو رہا تھا کہ شائع شدہ ناول اور کہانی کو کسی ڈرامے یا سیریل کی بنیاد بنایا جا رہا تھا۔ اس کا خیال یہ بھی تھا کہ جب اسے معلوم ہوگا کہ شاہینہ رائٹر بھی ہے تو اس سے ملنے کی خوشی دگنی ہو جائے گی۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ جب کسی سے تعارف میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہانیوں کی مقبول رائٹر ہے تو لوگ اسے ایسی حیرانی اور خوشی سے دیکھتے تھے جیسے وہ انسانوں سے برتر کوئی مخلوق ہے۔ قاسم نے اسے مایوس کیا تھا۔ باس کے آجانے کے بعد وہ سب بھول گئی۔

لیکن رات کو پھر اسے قاسم کا خیال آیا اور اس نے خود سے سوال کیا کہ آخر وہ کیوں اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اگر فائدے کی بات اس نے نہیں سنی تو اس کی مرضی... کیا وہ صرف ایک کہانی تھا اس کے لیے؟ اور اس کے دماغ نے بڑے منطقی انداز میں جواب دیا... سنو شانو عرف مس شاہینہ مہتاب... سچ بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ تم نے اسے جب پہلی بار دیکھا تھا تو اس کی مردانہ وجاہت نے تمہیں متاثر کیا تھا اس کو تم نے ہمدردی کا نام دے دیا۔ دراصل کچھ غرور تمہیں حسنِ صورت پر تھا۔ اس عمر کو پہنچنے والی ہر لڑکی جیسا کہ تم جس پر مہربانی کی نظر ڈالو وہ تمہیں ٹھکرا کے کیسے جا سکتا ہے۔ اضافی غرور کا سبب تمہارے ایک مصنف ہونے کی شہرت پر تھا۔ آئے دن ایسی کہانیاں پڑھ کے تعریف کرنے والوں نے تمہیں خود اپنی نظر میں دوسری تمام لڑکیوں سے ممتاز کر دیا تھا۔ تمہاری مدد کی آفر اسے قریب لانے کا بہانہ تھی۔ اس کے بعد وہ تمہاری کشش کے دائرے سے کیسے نکلتا۔ لیکن اس نے تمہیں ایک باس کی سیکریٹری سے زیادہ نہ جانا اور تمہاری پیشکش کے ساتھ تمہیں ٹھکرا کے چلا گیا۔ اب تم کب تک اسے یاد کرتی رہو گی۔

چنانچہ جب اگلے دن صبح آفس پہنچنے کے بعد پہلی ٹیلی فون کال کی گھنٹی بجی تو اس نے جذبات سے عاری روز کی طرح سپاٹ خوش اخلاقی سے ٹیپ کی ہوئی آواز بنا کے پوچھا۔ ''ایکس وائی زیڈ کارپوریشن؟''

دوسری طرف سے قاسم نے کہا۔ ''شاہینہ، میں قاسم ہوں۔''

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ ''کیسے ہیں آپ؟ کیسے صبح صبح زحمت کی؟''

''شاہینہ! مجھے اپنے کل کے رویے پر ندامت ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں لیکن آفس میں نہیں۔''

''آفس میں نہیں؟ اگر آپ کا خیال بدل گیا ہے تو آپ فون پر بھی بتا سکتے ہیں۔''

''صرف خیال کیا، میں خود بدل گیا ہوں لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں خود تم سے براہِ راست اور اکیلے میں کہیں بیٹھ کے کچھ کہہ سکوں؟''

شاہینہ کا دل دھڑکا۔ آخر ایسی کیا بات کہے گا وہ اکیلے میں؟ اور میں خود بدل گیا ہوں... اس کا مطلب کیا؟

''مس شاہینہ! آپ لائن پر ہیں؟''

''جی... جی دراصل میں سوچ رہی تھی کہ... اچھا فرض کریں میں باس سے چھٹی لے لوں دو تین گھنٹے کی۔''

''تھینک یو شاہینہ، اگر تم ایسا کر سکو۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

''لیکن کب... کہاں ملنا چاہتے ہیں آپ؟''

''آج... ابھی... میں کلفٹن کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوں ساحل کے قریب ہے۔''

''سوری، میں اتنی دور... اور ساحل ویران ہوگا۔ دھوپ میں گرمی ہے۔'' وہ بے ربطی سے بولی۔

''او کے، برا نہ مانو تو... جگہ تم بتا دو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔''

''فرض کرو، کوئی پبلک پلیس ہو مثلاً کوئی ریسٹورنٹ، مثلاً سالٹ اینڈ پیپر ویلج...'' اسے بعد میں اپنی دہری حماقت کا احساس ہوا۔ وہ ریسٹورنٹ بھی تو ساحلِ سمندر پر ہی تھا اور بڑے بھونڈے پن سے اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے لنچ پر انوائٹ کرلو۔ شاہینہ کو اس خیال سے پسینا آ گیا کہ

وہ کیا سوچے گا۔ میں وہاں ملنے جاتی رہتی ہوں۔

''یہ میرے لیے اعزاز اور میری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ آج لنچ میرے ساتھ کریں۔ تھینک یو مس شاہینہ۔''

اس کے کچھ کہنے سے پہلے فون بند ہوگیا۔ اگر وہ چاہتی تو کال لاگ سے نمبر دیکھ کے خود بات کرسکتی تھی مگر وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا۔ اور شاید یہی تو وہ خود بھی چاہتی تھی۔ کسی فون کال نے اس کا دھیان قاسم کی طرف سے ہٹا دیا۔ باس کے آنے تک وہ مصروف ہوگئی۔ گھڑی دیکھ کے اس نے اپنی بات کی۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے سر، مجھے چھٹی چاہیے۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

شفیق باس نے کہا۔ ''کیا ہوا ہے؟ اور بیٹا طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں، تمہیں چھوڑ آئے۔''

''نہیں سر، میں چلی جاؤں گی۔''

''ضد مت کرو۔ وہ پہلے تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔''

شاہینہ مسکرائی۔''سر! رات ایک سہیلی کی شادی میں دیر تک جاگی... بس اسی کا اثر ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں گھر جا کے سو جاؤں گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ تھینک یو۔'' وہ اگلی بات سنے بغیر باس کے کمرے سے نکل آئی۔

سالٹ اینڈ پیپر دور تھا لیکن اپنی لوکیشن اور کوالٹی کی وجہ سے مقبول تھا۔ وہ اوپر گئی تو ہال میں ہر میز پر لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں جتنے مرد تھے اتنی عورتیں۔ اس کی نظریں کسی خالی جگہ کو نہیں قاسم کو تلاش کر رہی تھیں اس توقع کے ساتھ کہ قبل از وقت اس کو پہنچ جانا چاہیے۔ اینٹی کیٹس... پھر اس نے ایک ہاتھ ہلتا دیکھا اور اس میز کی طرف بڑھی جس پر قاسم براجمان تھا۔ یہ آخری قطار میں تھی جہاں سے ایک طرف سمندر کی وسعت کا اور آسمان کی نیلاہٹ کا نظارہ کسی خاموش تصویر کی طرح کیا جاسکتا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے شیشے باہر کی ساری آوازوں کو روک لیتے تھے۔

وہ سامنے جا کے بیٹھ گئی تو قاسم نے کہا۔ ''تھینک یو، میں ڈر رہا تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''ڈرنے کی وجہ تو کوئی نہیں تھی۔''

''تھی، کل میں نے خاصی بدتہذیبی کا ثبوت دیا تھا۔ خیر، کیا خیال ہے کھانا کچھ دیر بعد منگوالیں۔ ایک کولڈ ڈرنک پلیز۔'' اس نے وردی پوش مستعد اور خوش اخلاق ویٹر سے کہا اور سوچتا رہا کہ اگر اس نے کہا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے جو غلط نہ تھا، تو کیا شاہینہ اسے روایتی پیش قدمی کا پہلا قدم سمجھے گی۔

''اب فرمائیے۔ مفلسی میں آٹا گیلا کرنا کیوں اتنا ضروری تھا؟'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''آپ نے بتایا تھا کہ بے روزگار ہیں پھر اتنی مہنگی جگہ لنچ۔''

''پلیز، اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں بہت جلد ریسٹورنٹ کے سامنے کٹورا رکھ کے بیٹھ جاؤں گا اللہ کے نام پر کوئی لنچ کرادے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''خدا نہ کرے۔ بری بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں؟ آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔''

اگلے ڈھائی گھنٹے میں قاسم نے شاہینہ کو وہ سب بتا دیا جو سچ تھا لیکن بتانے کے لیے نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی اور سنتی رہی۔ کولڈ ڈرنک اور پھر کھانے کے بعد تھوڑا سا وقفہ دے کر انہوں نے کافی پی۔ پھر وہ چپ ہوگیا اور شاہینہ کو دیکھتا رہا۔ وہ باہر سمندر کی خاموش پُرسکون حرکت، سڑک پر سے گزرتی بے آواز کاروں اور آتے جاتے لوگوں کے چہرے دیکھتی رہی۔

''اب کیا خیال ہے۔ بنے گی اس پر ایک دھانسو قسط وار آپ بیتی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نے کل ٹھیک کیا تھا کچھ نہ بتا کے۔ آج فیصلہ کیوں بدلا؟''

قاسم اسے دیکھتا رہا۔ ''پتا نہیں۔ لیکن کل رات...''

''کیا ہوا کل رات؟'' شاہینہ نے دل کی دھڑکن میں تبدیلی محسوس کی۔

''میں تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔'' اس نے نظر چرا کے باہر دیکھا۔ ''مجھے خیال آیا کہ تم کو سب بتا دینا چاہیے۔ تم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ تم سنو گی اور... حقیقت جان کے میں تمہاری نظر سے گر نہیں جاؤں گا۔ اس اعتماد کی وجہ خود مجھے نہیں معلوم۔ آج یہ میری تم سے چوتھی ملاقات ہے۔''

''چوتھی ملاقات؟''

''ہاں، پہلی بار تم کو میں نے اپنے... میرا مطلب ہے تمہارے گھر کے دروازے پر دیکھا تھا۔ اور وہ نقش میرے ذہن میں اسی طرح محفوظ ہے۔ تم نے کیا لباس پہن

رکھا تھا۔ کیسے بالوں کی ایک لٹ تمہارے ماتھے پر جھول رہی تھی۔ کیسے تم نے صرف ایک لفظ کا سوال کیا تھا۔ ''جی؟'' پھر اتنا عرصے بعد تم اچانک ساحل پر میرے سامنے آئیں تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ تم نے مجھے دیکھا اور پہچان لیا۔ صرف میں ہی نہیں تھا جو تمہارے بارے میں سوچتا تھا۔ کبھی کبھی... اور تمہاری وہ تصویر آکے میرے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی اور میں تمہیں دیکھتا رہا۔ تمہاری آواز سنتا رہا۔ دھیمی، پُرسکون، مہربان، ہمدرد، کتنا خوش تھا میں کہ صبح تم سے ملوں گا۔ تمہارا پتا میرے پاس تھا۔ لیکن...''

''لیکن کیا، بولو، میں سن رہی ہوں۔''

''میں بزدل اور خود غرض ثابت ہوا۔ ڈر گیا کہ سچ بولا تو سب ختم ہو جائے گا۔ زندگی کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ جیسے کوئی فانوس سنگ مرمر کے فرش پر گرے اور ختم ہو جائے۔ نہ اس کا حسن رہے نہ روشنی اور نہ وقار... مگر رات تک سب الٹا ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ کیا ختم ہو جائے گا؟ ابھی ہے کیا میرے پاس اگر خواب ہیں تو اس میں تم کو ساتھ ہونا چاہیے ورنہ وہ بے رنگ ہوں گے۔ اگر زندگی ہے تو اس میں تمہیں شریک ہونا چاہیے ورنہ جینے کا مزہ کیا۔ اگر مستقبل کی کامیابی ہے تو وہ عورت تم ہو سکتی ہو جس کا... ہاتھ مرد کے پیچھے ہوتا ہے۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ''تو بس... میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میں ڈرا نہیں کہ تم ناراض ہو تو انکار بھی کر سکتی ہو۔''

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئے۔ وہ باتیں جو الفاظ کی محتاج نہ تھیں اور سب سمجھ گئے جو ضروری تھا۔ پھر شاہینہ نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ایک ویٹر مسکرایا جو دیکھ رہا تھا کہ لنچ کرنے والے سب جا چکے ہیں تو یہ تین گھنٹے سے کیوں بیٹھے ہیں۔ تجربہ کہتا تھا کہ وہ میاں بیوی نہیں ہو سکتے۔ شاید ہو جائیں گے۔ ایسے مناظر وہ صبح شام دیکھتا رہتا تھا۔

شاہینہ نے کہا۔ ''اب تم کو کمپیوٹر پر کام کرنا سیکھنا ہے۔ میں تمہیں سکھا دوں گی۔ کیسے... اس کی فکر تم مت کرو۔ صرف تین مہینے بعد تم اسی آفس میں اسسٹنٹ منیجر ہو گے۔ پی آر او... یا ایچ آر میں... اور جو تنخواہ سب کو ملتی ہے تمہیں بھی ملے گی۔''

وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ ''کیسے؟''

''آج تک میں نے باس کی جذباتی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ آخر کیا ہے مجھ میں کہ میں سیکنڈ باس کہلاتی ہوں۔ نہیں، غلط سوچ رہے ہو تم... بالکل غلط۔ سارے دفتر کی نظر ہو سکتی ہے مجھ پر۔ کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں لیکن باس کی نہیں۔ دراصل اس کی ایک بیٹی تھی۔ بیٹا بھی ہے جو ابھی لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہا ہے۔ ایک رات کو ان کے گھر میں ڈاکو آگئے۔ انہوں نے گن پوائنٹ پر سب کو یرغمال بنالیا۔ پھر سب کو چھوڑ دیا اور بیٹی کو قابو میں رکھا۔ انہوں نے جو مانگا دے دیا گیا۔ وہ بھی جو خفیہ تجوریوں اور الماریوں میں محفوظ تھا۔ سب ملا کے ایک کروڑ کا مال تھا۔ زیور، کیونکہ بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ نقد، بانڈ تا فدغیر ملکی کرنسی... جاتے وقت وہ بیٹی کو یرغمال بنا کے ساتھ لے گئے کہ یہاں سے نکل کے چھوڑ دیں گے۔ کسی پیٹرول پمپ پر... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ لڑکی کو اپنے ٹھکانے پر لے گئے اور اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی اور پھر اس کی لاش پیٹرول پمپ پر پھینک گئے۔ پولیس کا خیال تھا کہ ڈکیتی کے ساتھ یہ انتقامی کارروائی لگتی ہے۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ماں باپ پر کیا گزری ہوگی۔ ماں تو علاج کے باوجود اب بھی نفسیاتی مریض ہے۔ باس سنبھل گیا ہے۔ جب میں یہاں نوکری کی درخواست لے کر آئی تو اسے بڑا شاک لگا۔ میری صورت میں اسے بیٹی کی مشابہت نظر آئی۔ اس نے کئی بار مجھے تمی کہا۔ تہمینہ نام تھا اس کی بیٹی کا۔ مجھے بعد میں سب معلوم ہو گیا کہ اس کی جذباتی کمزوری کیا ہے۔ کیوں اتنا مہربان ہے وہ مجھ پر۔ ٹھیک ہے میرٹ پر بھی میں پوری اترتی تھی اور یہ بھی نہیں کہ سیکریٹری، باس کا رشتہ عام طور پر بدنام ہوتا ہے' اس نے مجھے پہلے دن سے بیٹی کہا۔ میں اس کی جذباتی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ مجھے انکار نہیں کرتا۔ حالانکہ میں نے کبھی ایسی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ فائدہ اٹھاؤ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت دکھی آدمی ہے۔ اندر سے زخمی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو اس نے تمہیں اپنے بیٹے کے لیے کیوں پسند نہیں کیا؟''

''وہ ایسا ضرور کرتا لیکن لندن میں بیٹے نے ایک کلاس فیلو گوری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس کے علاوہ آج تک وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے گیا۔ اس ڈر سے کہ اس کی بیوی دیکھے گی تو اس کو دورہ پڑ جائے گا۔ اس کا جذباتی توازن پھر بگڑ جائے گا۔''

''تم میری سفارش کرو گی؟''

''میں کیا کروں گی، یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، اگر اعتماد کیا

ہے تو پورا کرو۔ چلو اٹھو تین گھنٹے سے بیٹھے ہیں میز گھیر کے، سب نے نوٹ کیا ہوگا۔"

وہ ہنسا۔ "ان کے لیے نئی بات کچھ نہیں، ہم اکیلے تو نہیں ہیں یہاں۔"

اور نکلتے وقت شاہینہ نے دیکھا تو اسے یقین آیا کہ یہ محض اس کے اندر کی خلش تھی ورنہ اس مصروف دنیا میں کسی کی طرف دیکھنے کی نہ کسی کو فرصت ہے اور نہ ضرورت۔ ٹیکسی میں قاسم کو اس کے فلیٹ کے نزدیک اتارتے ہوئے شاہینہ کو احساس ہوا کہ آفس کی گاڑی نہ لا کے اس نے کوئی عقلمندی نہیں کی تھی۔ باس یوں بھی ہر روز اسے گلی کے نکڑ پر اتارتا تھا۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ ڈرائیور کو سالٹ اینڈ پیپر میں قاسم سے ہونے والی خفیہ ملاقات کا علم ہو جائے گا۔ آج نہ سہی کل... جب وہ قاسم کو باس کے سامنے پیش کرے گی تو کیا اس کی جہاں دیدہ زمانہ شناس نظر سب نہیں سمجھ لے گی۔

اور اگلے دن یہ ہوا۔ قاسم بہترین لباس میں شاہینہ کے ساتھ باس کے کمرے میں داخل ہوا تو دفتر کی شان و شوکت سے اس نے کاروبار کی وسعت کا اندازہ کرلیا۔ "سر یہ میرے کزن ہیں قاسم... قاسم یہ میرے باس ہیں۔"

باس نے اسے ہاتھ ملا کے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک مہذب آدمی تھا۔ "کیسے ہیں آپ؟" اس نے رسماً پوچھا اور پھر شاہینہ سے مخاطب ہوگیا۔ "پہلے کبھی ذکر نہیں کیا ان کا تم نے۔"

"یہ ابھی کراچی آئے ہیں سر۔ ان کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہاں میں کام کرتی ہوں۔ یہ جاب کی تلاش میں تھے۔"

"آئی سی، کس قسم کی جاب چاہتے ہیں آپ مسٹر قاسم؟"

"سر! انگریزی محاورے کے مطابق... خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی... میں صرف اردو میں ایم اے ہوں۔ انگریزی بھی بری نہیں... ایک اسکول میں ایڈمنسٹریٹر تھا۔ پڑھاتا بھی رہا ہوں۔"

"پھر؟ وہ ملازمت کیوں چھوڑ دی؟"

اب شاہینہ نے اس کی وکالت شروع کی۔ "ان کو نکال دیا گیا۔ ایک ٹیچر مس گل کی شکایت پر... اس کا باپ بہت اثر رسوخ والا تھا اور ان کو گھر داماد منتخب کر چکا تھا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔"

باس مسکرایا۔ "ایموشنل ہیں آپ کے کزن... آج کل کے نوجوان سونے کا انڈا دینے والی مرغی مانگتے ہیں کہ انڈے دیتی رہے اور وہ عیش کریں۔ خیر، سب ہوتا ہے اس کاروباری دنیا میں... ان کو ایک بگ ڈیل کی آفر ملی تھی۔ انہوں نے قبول نہیں کی۔ ان کو دوسرا مل جائے گا۔ آپ کیا کریں گے؟ میرا مطلب ہے پڑھانے کا یہاں کوئی کام نہیں۔"

شاہینہ نے کہا۔ "سر! ابھی آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کو آفس ٹائم کے بعد کمپیوٹر پر کام کرنا سکھا دوں... میرا دفتری کام متاثر نہیں ہوگا۔ تین مہینے بعد آپ فیصلہ کریں کہ یہ کارآمد ہوگئے ہیں یا نہیں۔"

"آئی سی۔" باس نے کہا اور نظر جما کے شاہینہ کو دیکھا۔ شک و شبہے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ان کی بیٹی نے اپنا لائف پارٹنر چن لیا تھا۔ اس کے لیے کچھ نہ کرنا مشکل تھا۔ ایسا نہ ہوا تو یہ نوجوان قاسم کہیں اور کچھ کرلے گا اور اس کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ اپنا راستہ بنا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت مضبوط ہے۔ کامیاب وہ ضرور ہوگا۔ پھر اسے چانس کیوں نہ دیا جائے ورنہ چانس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہینہ اس کے ساتھ چلی جائے۔ آج نہ سہی کل۔

"کیا میں نے بہت زیادہ مانگ لیا آپ سے سر؟" شاہینہ نے مایوس لہجے میں کہا۔ "یہ کسی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کو بھی جوائن کر سکتے ہیں ویسے تو۔"

"ڈونٹ بی اے فول لڑکی۔" باس نے چونکے بغیر مسکرا کے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کو کہاں کا ستارہ بنایا جا سکتا ہے۔"

"ابھی تو ویکنسی نہیں ہے سر۔"

"ویکنسی ہونے والی ہے۔ وہ جو جولڑکا ہے کسٹمر ریلیشن کی مس حجاب کے ساتھ... وہ کینیڈا جانے والا ہے بہت جلد۔ میں اس سے معلوم کرتا ہوں۔ کل کے بجائے آج جگہ خالی کر جائے۔ ایک ماہ بعد جانا ہے تو ایک ماہ کی تنخواہ لے جائے۔"

قدرت زندگی میں ہونے والے ہر ظلم اور زیادتی کی تلافی کرتی نظر آتی تھی۔ اسکول سے نکالا جانا ایک بہانہ بن گیا تھا اب اس کا فیصلہ ہرگز جذباتی، بے وقوفی نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ گل کو مسترد نہ کرتا تو شاہینہ تک کیسے پہنچتا۔ ناقابلِ یقین تیزی کے ساتھ حالات اس کے حق میں ہوتے جا رہے تھے۔ اگلے دن وہ آفس ٹائم کے بعد شاہینہ کے پاس پہنچا تو باس جا چکا تھا۔

"وہ آج جانتے بوجھتے جلدی اٹھ گیا۔ شاید روز ایسا ہی کرے گا اور ایک گاڑی مع ڈرائیور چھوڑ گیا ہے میرے

لیے۔ روز خود گھر چھوڑنے جاتا تھا۔"
"وہ واقعی تمہارا بہت خیال کرتا ہے۔"
"کل سے تم عبدالرحمن کی جگہ لو گے۔" وہ معصوم صورت بنائے بیٹھی رہی۔
"کون عبدالرحمن؟"
"وہی جس کو کینیڈا جانا تھا ایک مہینے بعد۔ باس نے اسے بلا کے کہا کہ تھینک یو مسٹر رحمن تم نے اچھا کام کیا مگر تم کینیڈا جا رہے ہو۔ آئی وش یو سکسس... مجھے تمہاری جگہ کام کرنے والا ایک اچھا آدمی مل گیا ہے۔ کیشیئر سے ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس لے لو۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کو اس کے عزائم کا علم نہیں اور وہ عین وقت پر بم... چھوڑے گا۔"
"شاہینہ! دس از ٹو مچ۔ ابھی اسٹاف کے باقی لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟"
"کیا تم کو ان کی زیادہ پروا ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔
"نہیں۔ مجھے صرف تمہاری پروا ہے۔" اس نے شاہینہ کا ہاتھ تھام لیا۔
اس نے مصنوعی خفگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "مسٹر! تم یہاں.... کمپیوٹر پر کام کرنے آئے ہو۔ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"
اس نے مسکرا کے سلیوٹ کیا۔ "یس باس... پہلا سبق تو ہو گیا۔"
قاسم کی تنخواہ بیس ہزار مقرر کی گئی تھی جو شاہینہ کے برابر تھی اور اس سیٹ کو چھوڑ کر جانے والا عبدالرحمن لے رہا تھا۔ اس کی باس مس حجاب دراصل ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں جو شوہر سے طلاق لے چکی تھیں۔ ذاتی محنت اور صلاحیت سے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے کے بعد جیسے انہوں نے دنیا تیاگ دی تھی۔ ان کے بال زیادہ سفید تھے۔ وہ سادہ ہلکے رنگ کی ساڑی استعمال کرتی تھیں اور موٹے سیاہ فریم کی عینک لگاتی تھیں۔ اگر وہ ہیئر ڈائی استعمال کرتیں، جدید طرز کے رنگین ملبوسات پہن لیتیں اور سنہرے فریم والا نازک سا چشمہ لگاتیں تو بلاشبہ دلکش نظر آتیں۔ جب شاہینہ نے قاسم کا تعارف کرایا کہ "یہ میرے کزن ہیں عبدالرحمن کی جگہ کام کریں گے۔ ان کو کچھ دن کام سیکھنے میں لگیں گے۔ کمپیوٹر آپریٹ کرنا میں سکھا رہی ہوں۔" وہ سب سمجھ گئی تھیں اور قاسم نے ان کی توقع سے پہلے ہی کام سیکھ لیا تھا۔ ایک حقیقت سے سب نے پُرامن بقائے باہمی کا سمجھوتا کر لیا تھا۔ قاسم عام ملازم نہیں، وہ مس شاہینہ کا ہونے والا شریکِ حیات ہے۔ چنانچہ اس کے سر پر باس کا ہاتھ ہے لیکن قاسم ہر طرح سے میرٹ پر پورا اترتا ہے۔ چنانچہ سب ٹھیک ہے۔

شاہینہ اب اس کے مستقبل کا حصہ بن چکی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے زندگی نے ماضی کے تمام دکھوں کا مداوا کر دیا ہے۔ آفس میں وہ ساتھ ہوتے تھے لیکن باہر بھی لنچ یا ڈنر کے لیے چلے جاتے تھے۔ اب وہ اظہارِ عشق کی منزل سے بہت آگے جا چکے تھے اور اس وقت کو پلان کر رہے تھے جب وہ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی کے سفر کا آغاز کریں گے۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ کزن ہیں اور یہ بھی کہ وہ شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں چنانچہ باتیں بنانے والوں کے لیے اس چٹخارے دار موضوع میں مزے لینے اور ایک کی دو لگانے، انہیں بدنام کرنے یا ان کے تعلقات کو ناجائز سمجھتے ہوئے بلیک میل کرنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔ دفتر میں وہ کام سے کام رکھتے تھے اور کوئی ان کی کارکردگی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔
"بیٹی!" باس نے ایک دن شاہینہ سے کہا تھا۔ "یہ تمہارا کزن تو بہت اچھا نوجوان ہے۔"
"اس نے مجھے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔"
"تم اسے پسند بھی کرتی ہو۔ میرا مطلب ہے جیون ساتھی بنانے کے لیے؟"
"جی۔" شاہینہ نے نظر جھکا کے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔"
"بھئی زندگی تمہاری ہے اور تم خود بہت ذہین اور سمجھدار ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔"
"آپ کی دعائیں چاہئیں سر۔"
"کیا تمہارے فیصلے میں وہ بھی شریک ہیں... تمہارے والدین؟"
"ان کو بھی اعتراض نہیں ہوگا سر۔"
"ہاں، کزن ہے۔ تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہے۔ ہینڈسم ہے اور کیا چاہیے۔"
بات وہاں ختم ہو گئی لیکن اس رات شاہینہ نے سمندر کے سامنے کی دیوار پر قاسم کے ساتھ بیٹھ کر اس موضوع کو چھیڑا جس پر ابھی تک انہوں نے آپس میں بات نہیں کی تھی۔ "قاسم! ایسے کب تک چلے گا۔ یوں باہر ملتے رہنا۔

''جب تک تم چاہو گی۔'' قاسم نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ تم نہیں چاہتے کہ ہم ایک ہو جائیں؟'' وہ ناراضی سے بولی۔

''اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں ابھی تمہیں اپنے گھر لے جاتا۔ لیکن آج تک اس محبت کے احترام میں فرق نہیں پڑا جو مجھے تم سے ہے۔ میں نے تمہاری قربت میں بھی ایک فاصلہ رکھا۔''

''کیا میں محسوس نہیں کرتی، سمجھتی نہیں۔ اس سے میرے دل میں تمہارے لیے جو عزت ہے...''

''لیکن صرف تمہارے عزت کے جذبات سے تو فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے گھر والے مجھے کتنی عزت دیں گے۔ ان کو تم راضی کر سکتی ہو۔ میں دوسری بار بے عزت ہو کے ناکام لوٹنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے صرف وہ راستہ رہ جائے گا جو آج بھی کھلا ہے۔ کورٹ میرج کا مگر نہ میں ایسا چاہوں گا اور نہ تم قبول کرو گی۔''

''میرے گھر والے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں لیکن میں ایسے کب تک بیٹھی رہ سکتی ہوں۔ میرے رشتے آتے ہیں تو میں انکار کر دیتی ہوں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کیوں۔''

''یہ میری خواہش سمجھ لو یا ضد کہ جس گھر سے نکل کے مجھے جیل جانا پڑا تھا۔ جہاں مجھے دروازے سے بے عزت کر کے بھگا دیا گیا تھا کہ تم سزا یافتہ قاتل ہو اور یہ شریفوں کا محلہ ہے... اسی دروازے پر میں برات لے کر آؤں... وہیں سے تمہیں دلہن بنا کے لے جاؤں۔ وہ سب مجھے مبارک باد دیں جو میری ذلت اور رسوائی کے کھیل میں شریک تھے۔ وہ دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے کہ میں کتنا عزت دار ہوں ان کے مقابلے میں آج۔''

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ یہ ہو بھی سکتا ہے۔ اگر کوئی تمہارا پیغام لے کر اسی طرح آئے جیسے دوسرے آتے ہیں پھر میں پوچھ سکتی ہوں کہ جب مجھے قبول ہے تو ان کو کیا اعتراض ہے؟ اور اعتراض کی وجہ؟ کیا کمی ہے اس رشتے میں... شاید آج سے پہلے آنے والے تمام رشتوں سے یہ رشتہ بہتر ہے۔ تعلیم، آمدنی، صورت شکل۔''

''مگر دیکھنے والے خاندانی حسب نسب دیکھتے ہیں۔ ماضی کو کریدتے ہیں۔ وہ میرے ماضی کو مسترد کریں گے۔ ہم ایک قاتل کے حوالے کر دیں بیٹی... ناک کٹ جائے گی ہماری اگر پتا چلا کہ داماد جیل کاٹ چکا ہے قتل کے الزام میں۔''

''مجھے معلوم ہے وہ کیا کہیں گے لیکن میں ان کو انہی کے جال میں ٹریپ کروں گی تم دیکھتے جاؤ۔''

''کیا کرو گی تم... مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' وہ ہنسا۔

''مسٹر قاسم! تم نے بھی زندگی سے یہی سبق سیکھا ہے۔ سیدھے اور شرافت کے راستے پر یہ دنیا چلنے نہیں دیتی۔ ہمیں بھی چکر چلانا پڑے گا۔ تمہارے ڈیڈی کا رول تو باس ادا کر سکتا ہے، اسے تمہارا پیغام لے کر جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ کون سا غلط کام ہے۔ اس کی بیوی نارمل ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ پیغام لے کر جاتے اور میرے گھر والے لڑکا دیکھنے آتے تو کوٹھی دیکھتے ہی ان کے ہوش گم ہو جاتے۔ لڑکا بعد میں سامنے آتا تو اعتراض کی ہمت بھی نہ پڑتی۔ لیکن باس کی بیوی ابھی تک بیٹی کے صدمے سے سنبھل نہیں سکی ہے اسی لیے ڈاکٹر کے کہنے پر اس کا میرا سامنا نہیں ہوا۔''

''ماں کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟''

''بالکل چل سکتا ہے۔ باس کی بات کی تصدیق کون کرنا چاہے گا۔ یہ تو غریب اور گمنام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے سارا شہر جانتا ہے اگر مسز حجاب جن کو تم آنٹی کہتے ہو اس کارِ خیر میں شریک ہو جائیں تو کام پکا۔''

قاسم ہنس پڑا۔ ''سوچتی دور کی ہو تم لیکن حقیقت بہرحال وہ جانتے ہیں۔ تمہارے ماں باپ۔''

''میں نے اس پر بھی سوچا۔ پہلی بات ہے میرا دباؤ... میں سمجھا سکتی ہوں کہ وہ ماضی پر نہ جائیں حال کو دیکھیں، اپنا اور میرا مستقبل دیکھیں۔ پھر بھی نہ مانیں تو ایک دھمکی کہ میں بالغ ہوں اور چلی جاؤں گی کورٹ... ناک ان کی کٹے گی محلے میں اور رشتے داروں میں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ یہ دنیا بڑی عجیب ہے قاسم۔ دولت کی چکاچوند میں کسی کا عیب کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ لنگڑے، لولے، بہرے یا کانے کو بھی حسین حور پری چاہیے، مل جاتی ہے۔ سب سے بڑا عیب بن جاتی ہے غربت، یا جہالت، تو میرا خیال ہے کہ میرے ماں باپ کے خیالات بھی پلٹ جائیں گے۔ سب کی طرح وہ بھی کہنے لگیں گے کہ اب گڑے مردے کیا اکھاڑیں... صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور قاسم تو بے چارہ بغیر کسی جرم کے جیل کاٹ آیا۔ ماں بیوہ نہ ہو، یہی خیال تھا اسے۔ کتنی بڑی

قربانی دی اس نے... قصوروار تھا تو باپ۔''

''بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب دلائل الٹ جاتے ہیں۔ الزام لگانے والے خود سے بڑے وکیل بن کر مخالفت کے بجائے حق میں دلائل تلاش کر لیتے ہیں۔ تمہیں ایک بات بتاؤں شاہینہ، جب میں جیل سے نکلا تو یہ سمجھتا تھا کہ مجرم وہی ہیں جو قید میں ہیں اور سزا کاٹ رہے ہیں لیکن بہت جلد مجھے پتا چل گیا کہ ان سے بڑے مجرم تو باہر اپنے چہروں پر شرافت کا نقاب ڈالے پھر رہے ہیں۔ شرافت کی سند رکھتے ہیں اور شریف کہلاتے ہیں۔ اندر والوں پر تو مہر لگ گئی کہ مجرم ہیں اور وہ تسلیم بھی کرنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے جرم کیا تھا۔ باہر منافق اور بزدل لوگ شرافت کے نقاب میں رہتے ہیں۔''

''ایسا ہی ہے قاسم۔ اب پیسا بے گناہی، شرافت اور نیک نامی خرید لیتا ہے۔ قانون آپ کی مٹھی میں رہتا ہے۔ دولت تمام بند سرحدوں کو کھول دیتی ہے۔ جن کو عام آدمی ویزا، پاسپورٹ رکھنے کے باوجود عبور نہیں کر پاتا۔''

''تم تو بولتی بھی ایک رائٹر کی طرح ہو۔'' قاسم دیوار پر سے کود کے اترا۔ ''چلو اب چلیں۔''

''تم نے ابھی تک وہ منحوس فلیٹ نہیں چھوڑا؟''

''چھوڑ رہا ہوں۔ ایک دو روز لگیں گے شفٹ ہونے میں۔''

وہ کچھ مطمئن ہوئی۔ ''اب کہاں ڈیرا جمایا ہے؟''

''جہاں کا حکم تھا جو آپ کی پسند تھی جہاں آپ کو میرے ساتھ رہنا ہے۔''

وہ خوش ہوئی۔ ''وہیں، نیشنل اسٹیڈیم کے پیچھے۔''

''یس معمار اسکوائر میں فرسٹ فلور پر تین بیڈ کا فلیٹ ہے۔ فرسٹ فلور پر۔ کھڑکی کھلے تو درمیان کے احاطے میں بنا ہوا سرسبز باغ کا نظارہ ہے۔''

''اس کا کرایہ تو بہت ہوگا؟''

''یہ قربانی دیے بغیر چارہ نہیں۔ مگر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم دونوں کی آمدنی یہی نہیں رہے گی۔ میں تمہارے ساتھ ایک بہت خوش گوار اور روشن مستقبل دیکھ رہا ہوں۔ تصدیق کر سکتا ہوں ایمپریس مارکیٹ پر بیٹھے ہوئے کسی پروفیسر نجومی سے۔''

وہ ایک پلان کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے کہ آگے پیچھے دو واقعات ہوئے۔ وہ اپنے آفس میں شام کے وقت چھٹی کے بعد شاہینہ کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے نکلا ہی تھا کہ ایک شخص سامنے آ گیا۔ اس کے بال پریشان، حلیہ خراب اور چہرے پر بکرے جیسی داڑھی تھی۔ ''آپ؟'' اس نے سامنے آ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ کو میں نے کہاں دیکھا ہے؟''

''آپ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میرا راستہ روکے کھڑے ہیں۔'' قاسم نے کہا۔

اس نے چٹکی بجائی۔ ''یاد آ گیا۔ میں نے جیل میں آپ کا انٹرویو لیا تھا۔ ایک بار نہیں دو بار... جب آپ نے بی اے کیا تھا اور پھر ایم اے کرنے کے بعد... نام کیا ہے آپ کا؟''

''ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے آفس میں اسسٹنٹ منیجر پی آر ہیں۔'' شاہینہ نے کہا۔

''ضرور ہوں گے۔ ان کو تو ابھی بہت آگے جانا ہے لیکن صوفی کو غلط فہمی ہو جائے... ناممکن ہے۔ ایک تو یہ گلے کا ہار بنا ہوا کیمرا ہے جو گواہی دے گا۔ دو کیمرے یہاں ہیں۔'' اس نے ماتھے پر انگلی رکھی۔ ''میری دو آنکھیں اور ان کا عکس محفوظ ہو جاتا ہے اوپر دماغ کے کمپیوٹر میں۔'' وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ ''فائل میں سے وہ اخبار نکالنا دو منٹ کی بات ہے۔'' اس نے پھر چٹکی بجائی۔

''او کے صوفی صاحب! اب کیا چاہتے ہیں آپ؟'' قاسم نے کہا۔

''بھوکا کیا مانگتا ہے، ایک روٹی۔ صوفی انٹرویو مانگتا ہے۔ ایک اور انٹرویو ہوتا کہ اس کو موقع ملے اپنی پیش گوئی کو سچ ثابت کرنے کا۔ میں نے تو تمہارے لیے ایک تابناک مستقبل لکھ دیا تھا۔''

''آپ کی بڑی مہربانی... لیکن میں انٹرویو دینا نہیں چاہتا۔'' قاسم نے رکھائی سے کہا۔

''ارے بھائی انٹرویو میں چاہتا ہوں، تم نہیں آئے ہو میرے پاس... میں آ گیا ہوں تقدیر کی مہربانی سے۔ میرے تو کیریئر کا سوال ہے۔ تمہارے انٹرویو سے یوں جائے گا اوپر... زوم... راکٹ کی طرح۔'' اس نے ہاتھ سے راکٹ چلایا۔

''دیکھیے، ابھی مجھے فرصت نہیں۔'' قاسم نے ٹالنے کی ایک اور کوشش کی۔

''یہ کل ایک کاروباری دورے پر جا رہے ہیں۔'' شاہینہ نے اسے بروقت سپورٹ کیا۔

''جائیں جائیں، جم جم جائیں۔ ہم تو کہیں نہیں جا رہے اور یہ بھی واپس تو آئیں گے۔ ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔ کیا خوب کہا ہے شاعر نے... میں معلوم

کرتا رہوں گا خدا حافظ۔'' وہ باہر آ کے ایک دم پلٹ گیا۔

وہ دونوں کچھ دیر دم بخود کھڑے رہے۔ پھر شاہینہ نے کہا۔''یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی؟''

قاسم خاموشی سے کار پارکنگ کی طرف چلتا رہا۔

''اور بھی بہت ملیں گے، میرے ماضی کے گواہ۔''

''اس کو رو کو کسی طرح۔''

''کوشش ضرور کروں گا لیکن وہ آدمی ضدی اور خبطی لگتا ہے مشکل ہے کہ مانے۔''

اس کا خیال اگلے روز ہی درست ثابت ہوا۔ رات کو پریشانی کے باعث اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی تھی اور اس کی تشویش بجا تھی۔ اس کا سارا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اس کے خوابوں کی دنیا میں زلزلہ آ رہا تھا۔ اس نے اگلے دن آفس جانے کے بجائے پریس کلب کا رخ کیا۔ وہ غلط وقت پر آ گیا تھا۔ نائٹ برڈ کہلانے والی یہ مخلوق جو اخبارات میں ڈیسک پر کام کرتے تھے وہ دوپہر کے بعد جاگتے تھے اور لنچ کی جگہ ناشتا کرتے تھے۔ وہاں جو تھوڑے بہت لوگ بیٹھے تھے انہوں نے قاسم سے کہا کہ وہ شام کے بعد آئے۔ قاسم کو احساس ہوا کہ اس نے بلاوجہ چھٹی کی۔ لیکن اب وہ واپس جا کے بھی کیا کرتا۔ شاہینہ کے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ وہ صوفی کی تلاش میں ہے۔

ایک نوجوان نے اس کی مایوسی کو دیکھ کے کہا۔''کوئی ضروری کام ہے تو اس کے گھر چلے جاؤ۔ آفس میں تو وہ اسے ملے گا شام کے بعد... گھر قریب ہے۔''

قاسم نے ایک لمحہ سوچا۔''گھر، ٹھیک ہے۔ میں گھر جا کے مل لیتا ہوں۔ وہ برا تو نہیں مانے گا؟''

''وہ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے نہ کسی کی بات مانتا ہے نہ برا مانتا ہے۔''

پہلی بات نے قاسم کے کان کھڑے کیے لیکن پھر بھی وہ نوجوان صحافی کے دیے ہوئے ایڈریس تک پہنچ گیا۔ کافی دیر تک وہ گھنٹی اور پھر دروازہ بجاتا رہا۔ وہ مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ صوفی کا خوابیدہ چہرہ نمودار ہوا۔ اس وقت وہ قابلِ اعتراض حلیے میں تھا۔

''بہرے ہو گیا؟ کب سے کہہ رہا ہوں کہ آ جاؤ، دروازہ تو کھلا رہتا ہے۔''

''آپ کو ڈر نہیں چوروں، ڈاکوؤں کا؟'' قاسم نے دوستانہ لہجے بلکہ خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''سالا وقت ضائع کرنے آئے گا یہاں۔ یہ چور، ڈاکو پہلے چھان بین کر لیتے ہیں کہ گھر میں ہے کیا اور کہاں... بیٹھ جاؤ جہاں دل چاہے۔'' اس نے پہلے سگریٹ جلائی اور پھر اسی حلیے میں کباڑی کی دکان جیسے کچن میں چائے بنانے چلا گیا۔ اس کا کمرا بھی کباڑ خانہ ہی تھا۔ ہر چیز وہاں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا یا ہونا ہی نہیں چاہیے تھے صفائی کون کرتا... کمرے میں ہر قسم کی بدبو تھی۔ تکیے کے قریب شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی۔ دیواروں پر ہر سائز کی عریاں تصاویر لگی ہوئی تھیں، راتوں رات نیک نامی اور بدنامی کما لینے والی پاکستانی اداکارہ کی قدِ آدم تصویر تھی۔

قاسم کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ صوفی نے اس کی ایک نہیں سنی۔ قاسم نے بڑی منت سماجت کی اور اسے سمجھانا چاہا کہ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ مگر اس نے صاف کہا کہ بھائی! میں تمہارے مستقبل کا سوچوں... یا اپنے مستقبل کا۔ یہ تو نفسا نفسی کی دنیا ہے میری جان، انٹرویو نہیں دو گے تو میں پرانے میں نیا ملا کے چھاپ دوں گا۔ معلوم تو ہو ہی جائے گا کہ تم کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو، خطرہ اب قاسم کو سر پر منڈلاتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کا فوری تدارک ضروری تھا۔ ورنہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ نہ نوکری، نہ شاہینہ کے ساتھ خوابوں کی جنت آباد کرنے کا خواب۔

اچانک اسے استاد ڈگلو کا خیال آیا۔ اسے بڑی شرم آئی کہ اتنے عرصے میں وہ اس شخص سے صرف ایک بار ملا تھا جس نے اس کے لیے کامیابی کا راستہ ہموار کیا تھا۔ جو خود اس کے لیے ناممکن کام تھا اور کوئی بھی نہ کرتا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ آ گیا۔ اس 'بُدرو' ایک پاؤں میں لنگ اور دونوں ہاتھوں میں نصف انگشت شہادت رکھنے والے (یہ سب پولیس کے دیے ہوئے میڈل تھے۔ وہ کہتا تھا) شخص کے پاس سونے کا دل تھا جو دیکھنے والے کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔

''ارے قاسم!'' اس نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔''کہاں تھا تو... اپن کو تو یار ٹائم ملتا نہیں، سالا تو چوبیس گھنٹے کیا کرتا ہے۔ ابھی ادھر ہی ہے؟ اور بچے کتنے ہیں ایک کہ دو... اور شاہینہ کیسی ہے؟''

قاسم ہنسنے لگا۔''استاد ایک ساتھ اتنے سوال۔ شادی سے پہلے تو بچے ہوتے نہیں۔''

''ہوتے ہیں پاگل خانے... بہت ہوتے ہیں۔''

قاسم پھر ہنسنے لگا۔''استاد پہلے وہی چائے پلاؤ پھر دکھڑا سنو۔ خود غرض کہو یا کچھ اور... لیکن کون ہے میرا جس کے پاس جاؤں میں۔''

استاد نے اس کی ساری بات ظاہری بے نیازی سے سنی اور دیوار کے سہارے نیم دراز سگریٹ کے کش لگاتا، قاسم کی بات ختم ہوتے ہی وہ بولا۔ ''ابے شادی میں بلائے گا نا؟''

''استاد میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''سن لیا بیٹے' میں سمجھا دوں گا اسے... کچھ نہیں بگڑے گا تیرا۔''

''وہ سننے والا اور ماننے والا آدمی نہیں ہے استاد۔''

''قاسم جانی، سمجھانے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ جیسے سبق پڑھانے والے ماسٹر الگ الگ ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سمجھ میں نہیں آتی، کوئی ڈنڈے سے سمجھاتا، کوئی پیار سے۔ اطمینان رکھ۔''

مطمئن نہ ہونے کے باوجود قاسم لوٹ آیا۔ اس کے اندر غصہ بھرا ہوا تھا۔ آخر یہ دنیا اسے شرافت سے جینے کیوں نہیں دیتی؟ کیا کرے وہ؟ گلے میں تختی ڈال کے پھرے کہ میں قتل کے جرم میں عمر قید بھگت چکا ہوں۔ میرے شریفانہ حلیے اور لہجے پر مت جاؤ، میں نفرت اور ملامت کا مستحق ہوں خواہ نیکی بھی کروں۔ قتل میں نے نہیں کیا تھا لیکن اب کردوں گا اگر اس صوفی نے میرے ماضی کو دکھا کے میرا مستقبل تباہ کیا تو میں اسے قتل کردوں گا۔ ایک کیسٹ سے وہ اپنے لیے صرف ایک خواب اور سکون آور گولی حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور رات کو سو کے اٹھا تو صبح نسبتاً پُرسکون تھا۔ وہ اپنے لیے ناشتا بنا رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور قاسم نے شاہینہ کو اپنے مقابل پایا۔

''تم؟ یہاں کیوں آئی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ رخصت کرا کے لاؤں گا۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''کل سے تم نے بات نہیں کی۔'' وہ اس کی برہمی کو نظر انداز کر کے بولی۔ ''کیا کرتی میں؟''

''دعا... دعائے مغفرت۔''

شاہینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم بیمار لگ رہے ہو۔ اب میں نہیں جاؤں گی۔ لیٹ جاؤ آرام سے، ناشتا کیا؟''

قاسم نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اور نرمی سے بولا۔ ''میں ناشتا بنا رہا تھا۔ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' پھر وہ شاہینہ کو ناشتا بناتے اور ٹرے میں سجا کر لاتے دیکھتا رہا۔ یہ اس کے آنے والے کسی دن جیسا دن ہو گیا تھا۔ وہ خود ناشتا کر کے آئی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اخبار دیکھتی رہی جو دروازے کے پاس پڑا تھا۔

اچانک اس نے ایک ہسٹریائی چیخ ماری۔ ''قاسم! یہ... وہ صوفی۔''

قاسم گھبرا گیا۔ ''کیا ہے۔ کیا ہوا ہے صوفی کو؟'' اس نے شاہینہ کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔

اس کی نظر ایک سرخی پر جم گئی۔ ''ایک اور نامور صحافی ٹارگٹ کلنگ کا شکار۔'' اس چوکھٹے میں ایک طرف صوفی کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی خبر پڑھی۔ شام کے وقت پریس کلب سے نکل کر موٹر سائیکل پر آفس جاتے ہوئے اس پر دو موٹر سائیکل سواروں نے دو طرف سے گولیاں برسائی تھیں۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔

''یہ کیا کر دیا تو نے استاد گلو۔'' قاسم نے اپنا سر تھام لیا۔

''تم نے استاد گلو سے کہا تھا کہ صوفی کو مار ڈالو۔ اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دو۔ کیونکہ وہ تمہارے لیے اور تمہارے مستقبل کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔'' شاہینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہسٹریا کا شکار تھی۔

''تم ایسا سمجھتی ہو مجھے؟'' قاسم نے دکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''دنیا کی طرح مگر ہاں اس کے قتل کا میں ذمے دار ہوں۔ میں نے ہی کہا تھا استاد گلو سے کہ اس کا چپ رہنا ضروری ہے۔ اس نے بھی سمجھانے کا وعدہ کیا تھا۔''

غصے میں کھولتا وہ استاد گلو کے پاس پہنچا اور اخبار اس کے سامنے پٹخ دیا۔ ''تم نے صوفی کو مار دیا۔''

''مار دیا۔ ابے بھوت کے بچے، میں تو سارا دن یہاں تھا۔ اور کل تو گیارہ آدمی مارے گئے ہیں ٹارگٹ کلنگ میں' کیا ان سب کو بھی میں نے مارا ہے۔ ابے یہ کراچی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے تم نے مروایا اسے... مانتے کیوں نہیں۔ میں نے سمجھانے کا کہا تھا۔''

''آہستہ بول الو کے پٹھے۔ میں نے بھی سمجھانے کا کہا تھا۔ سلطان بھائی عرف کو برا سے۔''

''کون ہے یہ سلطان بھائی عرف کو برا؟''

''مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔ سارا شہر واقف ہے اس سے۔ مل سکتا ہے تو اس سے جا کے پوچھ۔'' استاد گلو دو قلیوں کا پھندا ٹمٹا نے نکل گیا۔

اندازہ تو قاسم نے کر لیا تھا کہ یہ سلطان بھائی عرف کو برا کون ہو گا۔ شاید وہ اس تک پہنچ بھی نہ پائے۔ سارا دن کوشش کے بعد بھی اسے سلطان بھائی کا پتا معلوم نہ ہو سکا حالانکہ اس کے نام کی دہشت تھی اور سارا شہر اسے جانتا تھا۔

شام کو جب وہ مایوس ہو چکا تھا اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے بڑی شرافت سے اس کا نام پوچھا۔

قاسم نے نمبر دیکھا اور کہا۔ ”جی میں قاسم ہوں، آپ کون؟“

”میں سلطان بھائی ہوں۔ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے تلاش کر رہے تھے۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”جی، آپ کا پتا کوئی نہ بتا سکا۔“

”فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

لہجے کی انکساری اور شائستگی نے قاسم کے وجود میں بھرا ہوا غصہ یوں خارج کر دیا جیسے غبارے کے منہ پر سختی سے بندھا ہوا دھاگا کھل جائے۔ ”جی، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ صوفی کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کون صوفی؟ اچھا وہ اخبار والا۔ قاسم صاحب! اسے سمجھانے کے لیے اسی کے ہم پیشہ بہت سینئر صحافی کو بھیجا گیا تھا مگر کچھ لوگ شرافت کی زبان سمجھتے ہی نہیں۔“

”آپ سے کس نے کہا تھا کہ وہ نہ سمجھے تو اسے جان سے مار دینا؟“

”ہمارے ایک کرم فرما ہیں۔ براہِ راست نہیں۔ غلام محمد صاحب۔ ان کا پیغام ملا تھا اب انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ ہمارا نمبر آ گیا نا آپ کے پاس... آئندہ ضرورت ہو تو بس فون کر دیں، غلام محمد کے حوالے سے۔ خدا حافظ۔“

قاسم نے ریسیور رکھ دیا۔ یا میرے خدا! اس دنیا کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کیا اب زندگی کے لیے موت ضروری ہے۔ اپنی زندگی کے لیے مجھے سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ دوسرے کی زندگی اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اسی دنیا میں رہتا جہاں یہ سب نہیں تھا۔ وہ مجرم کہلانے والوں کی دنیا میرے لیے محفوظ تھی۔ وہاں مجھے سہولت ہی نہیں عزت بھی ملی۔ وہیں سے میں نے تعلیم کی دولت حاصل کی۔ اس نے اردو پڑھی اور پڑھائی تھی۔ اسے منیر نیازی کا ایک شعر یاد آیا۔ اِک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو... میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا۔ اس شعر میں ترمیم کی ضرورت تھی یا شاید نہیں تھی کیونکہ شاعر تو استعاروں میں بات کرتے ہیں۔ مطلب اس کا یہی ہوگا کہ ایک اور زندان کا سامنا تھا منیر مجھ کو۔ میں ایک زندان میں رہ کے نکلا تو میں نے دیکھا۔

اس کے اردگرد کی دنیا میں مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔ قتل، ڈاکے، بھتے، اغوا، زنا، دھماکے، اسٹریٹ کرائم ہر قسم کی مافیا، پانی کی مافیا، ٹرانسپورٹ مافیا اور ہر مافیا کا دوسری مافیا سے لنک تھا۔ استاد گلو قلیوں کی بھرتی کا ٹھیکے دار تھا۔ بھتا وصول کرتا تھا اور آگے پہنچاتا تھا۔ ایسے بہت سے ٹھیکے دار تھے۔

وہ صوفی کی نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شریک ہوا جہاں کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ سب جانتا ہے جو دوسرا کوئی نہیں جانتا، لوگ وہی ہزار دفعہ کی گھسی پٹی غم و غصے کی باتیں کر رہے تھے۔ صحافی بازوؤں پر سیاہ پٹی باندھے نعرے لگا رہے تھے اور ان کا ساتھ دینے میں وہ پیش پیش تھے جو اَب حکومت میں نہیں تھے۔ ان کی باری گزر چکی تھی۔ خطرناک نتائج کی دھمکیاں، تین دن کے اندر اندر قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ، تحقیقاتی ٹریبونل کا بائی کاٹ، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینے کے دعوے، سب پرانے ہو چکے تھے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ سوچتا رہا کہ وہ جو سب جانتا ہے کہ صوفی کو کس نے مارا اور کیوں مارا، خاموش رہنے پر مجبور ہے۔ وہ کسی ٹریبونل میں پیش نہیں ہوگا۔ کسی سے بات تک نہیں کرے گا کہ صوفی کو کس جرم کی سزا ملی۔ کیونکہ وہ بزدل ہی نہیں انتہائی خودغرض اور بے ضمیر انسانوں میں شامل تھا جو جینا چاہتے تھے۔ اور یہ سب غم و غصہ اکیلے صوفی کے لیے نہیں تھا۔ مزید دس تھے جو بظاہر کسی وجہ کے بغیر مارے گئے تھے۔ حالانکہ وجہ جاننے والا شاید ہر جنازے کی نماز میں موجود تھا۔ گزرے ہوئے کل کے مرنے والوں کا غم کل کے ساتھ گیا۔ آنے والا دن ہوگا تو نئے شہید ہوں گے۔ جن کا قاتل کوئی نہیں مگر وہ مقتول ہوں گے۔

ڈپریشن اور اپنی خودغرضی سے نفرت اور اس زندگی پر شرمندگی کا یہ دورہ ایک ہفتہ چلا جس میں سب سے زیادہ شاہینہ اسے دلائل دیتی رہی کہ اس کا قصور کوئی نہیں۔ موت برحق ہے آج تم، کل ہماری باری ہے۔ دنیا میں جب آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا اور آہستہ آہستہ خود قاسم کا ذہن دلیل دینے والوں میں شامل ہو گیا۔

حالات کو معمول پر آنے میں پندرہ دن سے زیادہ لگ گئے۔ ایک ماہ بعد سب پہلے جیسا ہو گیا۔

قاسم پہلے بھی اپنی باس مسز حجاب کا احترام کرتا تھا اور وہ بھی اس کے خصوصی التفات سے متاثر تھیں۔ اس نے ایک دن کہا۔ ”آنٹی! آپ نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے۔ زندگی کی جنگ تنہا لڑنے کے بعد آپ کامیاب ہو گئی ہیں تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ خوش نظر آنا چاہیے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتے قاسم اکیلی عورت کا دکھ، یہ زندگی

آج بھی ایک سزا ہے میرے لیے۔''

''سزا آپ نے خود بنائی ہے۔ آپ اچھا کماتی ہیں، اچھا اور خوش رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟''

''بیٹا! عورت بدنامی کے خوف کے ساتھ تو اپنے شوہر کے ساتھ بھی جیتی ہے جب شوہر نہ رہے تو اس کے ساتھ یہ ہوس پرست دنیا کیا کرتی ہے۔''

''مجھے سب معلوم ہے لیکن اب کوئی آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اچھے کپڑے پہنیے، بیوٹی پارلر جائیے اپنی خوب صورتی پر سوگ کی خاک مت ڈالیے۔''

وہ مسکرائیں۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو، یہ عمر ہے میری؟''

''عمر کی بات بالکل نہ کریں۔ چالیس ہوگی زیادہ سے زیادہ، لگتی کم ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ عمر تو چالیس ہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ پچاس کی نظر آتی ہوں میں کم سے کم۔''

''غلط، بالکل غلط۔'' اس نے ایک درجن فلمسٹارز، ماڈلز اور دیگر پاکستانی اور غیر ملکی خواتین کی مثال دے دی جو ساٹھ سے اوپر کی اور نانی دادی کے مرتبے پر فائز تھیں لیکن جوان نظر آتی تھیں۔ خوب صورت نظر آنا تو عورت کا حق ہے بلکہ فرض ہے۔

مسز حجاب جن کو سب مس حجاب کہتے تھے، کبھی خفا ہو جاتی تھیں تو اسے بے عزت کر کے کمرے سے نکال دیتی تھیں کہ اپنا کام کرو، میری ذاتی زندگی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن قاسم نہ برا مانتا تھا نہ ان کی جان چھوڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے مس حجاب کو متاثر کر لیا۔ وہ اس سے اپنی گزشتہ زندگی کے غم والم کو شیئر کرنے لگیں۔ اسے بتانے لگیں کہ بیوہ ہونے کے بعد خود ان کے اپنوں نے کیا نہیں کیا۔ کون سا الزام تھا جو نہیں لگایا۔ کس کس نے ایک تنہا عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنی تعلیمی استعداد کو بہتر بنانے کے بعد انہوں نے بالآخر یہ ملازمت حاصل کر لی، اس سے پہلے ملازمت کے تلخ تجربات اپنی جگہ تھے۔ اب ان کا بیٹا سولہ سال کا اور بیٹی چودہ سال کی تھی۔ ان کا گھر سوسائٹی میں تھا جو شوہر چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی اس وقت بھی تھی۔ آج بھی ہے۔ انہوں نے قاسم کو اپنے بیٹے کی اور پھر بیٹی کی سالگرہ میں مدعو کیا جو چند روز کے وقفے سے آگے پیچھے آتی تھیں۔ قاسم کے علاوہ صرف دو مہمان اور تھے باس اور شاہینہ۔

قاسم کو اب انہوں نے اپنا حقیقی ہمدرد اور مشیر سمجھ لیا تھا۔ ''تم میرے بڑے بیٹے کی طرح ہو۔'' ایک دن انہوں نے کہا اور قاسم نے محسوس کیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ تاہم اسے یہ شرمندگی نہیں تھی کہ وہ مسز حجاب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مس حجاب خوش رہنا سیکھ لیں اور اچھی نظر آئیں۔ ان میں یہ تبدیلی آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ اس وقت جب وہ شاہینہ کے ساتھ مل کر طے کر چکا تھا کہ اب اسے باس سے بات کر لینی چاہیے اور وہ مسز حجاب سے کہے گا کہ وہ اس کے سرپرست بن کر شاہینہ کے والدین سے رسمی طور پر رشتہ مانگنے جائیں۔ ورنہ اس کا دنیا میں اور ہے کون جو یہ کام کر سکے۔ باس کی وائف نارمل ہوتیں تو لڑکی والوں کو ان کے گھر بلا لیا جاتا۔ رہی شادی تو رخصتی ہال سے ہوگی اور دلہن اس کے فلیٹ میں جائے گی۔ ولیمہ بھی ہال میں ہوگا۔ باس اور مسز حجاب کی مدد کے بغیر یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کورٹ میرج کا راستہ وہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ مگر آخری لمحے میں ایک اور حادثہ پیش آ گیا۔

ترقی ایاز نے بھی کی تھی اور اسی کیش اینڈ کیری اسٹور میں جہاں وہ دیگر چھ نوجوانوں کے ساتھ کاؤنٹر پر کیش وصول کرتا تھا اور مشینوں پر خریداری کی تفصیل کا اندراج کرتا تھا۔ اس کو منیجر بنا دیا گیا۔ موقع شناس یا مردم شناس تو وہ پہلے ہی تھا۔ ایماندار اور محنتی بھی تھا جب منیجر ایک بہتر جاب کے لیے دبئی گیا تو خالی جگہ کے لیے ایاز کو منتخب کر لیا گیا جو شاید سب سے جونیئر تھا مگر یہ ایسی نوکری نہ تھی جہاں شرائط ملازمت لاگو ہوتی ہوں۔

ایک رات وہ آیا تو بہت اپ سیٹ تھا۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور بند ہونے کے بعد بھی اس کو حساب کتاب میں کچھ وقت لگتا تھا اور وہ عموماً آدھی رات سے پہلے نہیں آتا تھا۔ اس وقت تک قاسم سو چکا ہوتا تھا۔ پھر اسٹور ہفتے کے سات دن کھلتا تھا چنانچہ چھٹی کے دن کا ایاز کے لیے کوئی تصور نہ تھا۔ دونوں دوستوں میں بعض اوقات ایک ایک ہفتے بات کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی تاہم قاسم جانتا تھا کہ اس کا اسٹور میں کام کرنے والی کسی لڑکی سے افیئر چلتا تھا۔ صرف تین ماہ بعد اس نے ایاز کو باپ بننے کی خوش خبری سنادی اور مطالبہ کیا کہ اب انہیں بلا تاخیر شادی کر لینی چاہیے۔ ایاز کو شک ہوا تو اس نے لڑکی کے ساتھ ایک میڈیکل سینٹر کا رخ کیا اور رپورٹ میں اس کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ لڑکی کسی اور کی کہانی پر ایاز کا عنوان لکھنا چاہتی تھی۔ ایاز کے انکار پر اس نے ہنگامہ کیا اور دھمکی دی۔ ایاز نے بھی نئی زندگی میں کامیابی کے لیے جائز اور ناجائز سارے راستے اختیار کرنا سیکھ لیا تھا۔

اب وہ علاقہ غیر کا سادہ لوح پٹھان نہیں تھا، وہ عروس البلاد کراچی کا شہری تھا اور نئے زمانے کا آدمی جو مشکلات کی بھول بھلیوں میں سے اپنا راستہ بنانا جانتا تھا۔ اس نے دھمکی کا چیلنج قبول کرلیا۔ اس کو کسی ڈاکٹر نے کہا کہ انکار پر ڈٹے رہو۔ اس لڑکی سے کہہ دو کہ تم فکر مت کرو، اگر ڈی این اے ٹیسٹ سے میں باپ ثابت ہوا تو اسی وقت شادی کرلوں گا تم سے۔ ورنہ اصل باپ سے رجوع کرنا۔

اس کے بعد لڑکی تو غائب ہوگئی تھی اور ایاز اس اسٹور کی ایک مالک کو پسند آگیا تھا۔ اس کاروبار میں دو بھائی اور دو بہنوں کی پارٹنرشپ تھی۔ وہ شادی شدہ عورت عمر میں ایاز سے دس سال بڑی تھی لیکن کلفٹن کے جدید ترین بیوٹی سیلون اس کی عمر کو دس سال کم دکھانے میں کامیاب تھے۔ خود ایاز کہتا تھا کہ یار سونا تو سونا ہی رہتا ہے خواہ دس ہاتھوں سے گزرے۔ کرنسی گردش میں رہے تو بوسیدہ ہوجاتی ہے، اور پھٹ بھی جاتی ہے۔ اس نے اشارہ پاتے ہی اپنی نیازمندی کو عاشقی میں تبدیل کر دیا تھا اور اب کروڑپتی ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ خاتون مالک کے تیسرے شوہر کے منصب پر فائز ہونے کے حق میں ایک سے زیادہ دلائل بھی رکھتا تھا۔

اسے پریشان دیکھ کے قاسم نے کہا۔ ”مجنوں کے گھوڑے، گھڑی کی طرح بارہ کیوں بج رہے ہیں تیری صورت پر؟“

ہر روز وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا جاتا تھا مگر آج لائٹ دیکھ کے قاسم کے پاس آبیٹھا تھا۔ ”یار! بات ہی ایسی ہے۔“

قاسم اٹھ بیٹھا۔ ”کیا اس بڑھیا نے تجھے گود لینے سے انکار کردیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے فرشتۂ اجل کو دیکھ لیا ہے اور اس نے مجھے۔“

قاسم نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کھل کے صاف بات کر۔“

”بس، میری زندگی کا آخری اسٹیشن آگیا۔ قاتل پہنچ گئے ہیں مجھ تک۔“

قاسم سارا مذاق بھول گیا۔ شروع شروع میں ایاز کہتا تھا۔ یار آج بھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تک میرے قاتل میرا سراغ نہیں لگا سکے۔ قاسم اسے حوصلہ دیتا تھا کہ یار ممکن ہے اللہ نے ان کے دل میں نیکی ڈالی ہو۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ لیکن ایاز کی دلیل وہی رہتی تھی۔ یار ارادے سے کون قتل کرتا ہے یا قتل ہوجاتا ہے یا کرایا جاتا ہے۔ میں بھی کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ماں نے کرادیا۔ کسی بری نیت سے نہیں۔ اس کے اندر خالص پٹھان خون تھا جس میں غیرت کا تناسب کولیسٹرول کی طرح زیادہ تھا اور یہ زیادہ ہو تو آدمی خود نہیں مرتا۔ مار دیتا ہے۔ میرے قاتل مرتے دم تک مجھے تلاش کریں گے اور مرتے وقت وصیت کر جائیں گے بیٹوں کو کہ قتل کا قرض ابھی وصول نہیں ہوا۔... دن گزرنے کے ساتھ یہ بات ہر دن کا موضوع نہیں رہی مگر کبھی کبھار ایاز کے لاشعور کا خوف اس کی زبان پر آجاتا تھا۔

آج بہت عرصے بعد اس کی بات کو سن کے نہ جانے کیوں قاسم کو جیل کا زمانہ یاد آیا جہاں سزائے موت پانے والے ہر اپیل منظور ہونے کی خوش فہمی کے سہارے جیتے تھے۔ یہ ان کے وکیل پیدا کرتے تھے۔ پھر وہ خود پیدا کر لیتے تھے۔ آخری سہارا رحم کی اپیل ہوتی تھی جو بعض اوقات مہینوں مسترد نہیں ہوتی تھی اور اب تو ایسے ہزاروں قیدی تھے جن کی سزائے موت کئی کئی سال سے موخر ہوتی چلی آرہی تھی کیونکہ پاکستان سیاسی مصلحت کے تحت عالمی برادری کے دباؤ میں تھا جو سزائے موت کو غیر انسانی قرار دے کر ختم کرانا چاہتی تھی۔

قاسم کو یوں لگا جیسے ایاز کی صدر کو جانے والی رحم کی اپیل مسترد ہوگئی ہے اور اب اسے پھانسی کے تختے پر لے جانے کی تاریخ کا بلیک وارنٹ کسی بھی دن موصول ہوجائے گا۔ ”ایاز! اگر یہ تیری غلط فہمی نہیں ہے تو پھر اب تک زندہ کیوں ہے تو؟“

”پتا نہیں، شاید وہ موقع کے منتظر ہیں یا کنفرم کررہے ہیں کہ صورت اور حلیہ بدل لینے والا وہی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ وہ پہچان گئے ہیں مجھے۔“

”اگر اتنا یقین ہے تجھے تو پھر اب تک کچھ کیا کیوں نہیں تو نے؟“

”کیا کروں؟ پہلے انہیں مار دوں؟ اسٹور کے اندر اور پھر جیل جا کے لٹک جاؤں؟ اس سے تو بہتر ہے دوسرے قتل کے الزام کی اذیت اٹھائے بغیر فوراً مر جاؤں۔“ وہ اداسی سے بولا۔

”اگر بھاگنا نہیں چاہتا تو انہیں پکڑوا دے۔“

”کیسے؟ جا کے پولیس سے کہوں کہ کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اسے پکڑلو، اور وہ پکڑلیں گے تو میں محفوظ ہو جاؤں گا؟ کیسی بچوں جیسی بات کرتا ہے۔“

”اچھا یہ بتا، تو نے کیسے جانا کہ وہ تجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟“

"دو دن سے میں دیکھ رہا ہوں ان کو، پہلے ایک تھا پھر دوسرا بھی آیا اور ایک نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ کھڑے تھے۔ خریدار نہیں تھے جو ٹرالی لیے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

قاسم نے چٹکی بجائی۔ "نظر آتے ہیں؟ خفیہ کیمروں کو اور وہ دکھاتے ہیں ٹی وی اسکرین پر... جگہ جگہ وارننگ اسی لیے لکھی نظر آتی ہے کہ کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے۔"

"مگر میں نے اسکرین پر نہیں دیکھا۔"

"ابے دماغ سے کام لے۔ جو اسکرین پر کیمرے دکھاتے ہیں، اس کی وڈیو ریکارڈنگ بھی تو ہوتی ہے۔ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو دیکھی جا سکے۔ ابھی وہ محفوظ ہوگی۔"

ایاز کا بجھا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ روشن ہوا۔ "یار یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟"

"اس لیے کہ تو پٹھان ہے۔ اب کل صبح بلکہ ابھی فون کر اپنی اس مالکن محبوبہ کو، جس نے تجھے گود لے لیا ہے۔"

وہ بےوقوفوں کی طرح بولا۔ "کیا کہوں اس سے؟ وہ پاگل سمجھے گی مجھے... وقت دیکھ۔"

"رات کے ایک بجے کسی شوہر ہونے والے شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہونے والی بیوی کو خطرے سے آگاہ کر سکے۔ کہہ سکے کہ جانِ من، یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قاضی سے پہلے فرشتہ اجل آ گیا ہے، بتا دو۔"

"تو مان گیا اس لیے کہ تجھے سارا کیس معلوم ہے۔ کیا اسے پہلے بتاؤں کہ میں کیوں مقتول ہونے والا ہوں۔ کوئی کروڑپتی بیوہ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہوئے شخص کے لیے کہے گی کہ قبول ہے۔ خواہ جلاد کے ساتھ قاضی بھی موجود ہو۔"

"یہ تو ہے ایک طرف بڑا خطرہ، دوسری طرف چھوٹا خطرہ۔ اچھا کل پہلے تو نکلواتے ہیں وڈیو ریکارڈنگ، پھر سوچتے ہیں۔"

"تو اکیلا سوچتا رہتا۔ اتنا وقت کہاں دیں گے وہ۔"

"او کے، تو گم ہو جا دو چار دن کے لیے۔ میں کرتا ہوں کچھ۔"

قاسم نے اسٹور کی اس مالکن سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرایا۔ "میں اس کا بھائی تو نہیں مگر بھائی سے زیادہ ہوں۔ آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ایاز کی جان خطرے میں ہے۔"

وہ عورت فل میک اپ کے باوجود جوان لڑکی نہیں لگتی تھی مگر اس خوش فہمی کو پال رہی تھی کہ وہ لگتی ہے اور اتنی بری بھی نہیں تھی۔ کروڑوں کے ساتھ تو حسینہ عالم سے بہتر تھی۔ ایاز کے بچوں کی ماں بھی بن سکتی تھی۔ "ایاز خود کہاں ہے؟"

"زیرِزمین، میرا مطلب ہے روپوش، وہ سچ مچ زیرِزمین نہیں ہونا چاہتا۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"اسے پرچی ملی ہے۔ ایک کروڑ کی۔"

پرچی کے نام پر اس کا رنگ بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ پرچی کا مطلب ہے اغوا برائے تاوان کی وارننگ۔ ایک کروڑ فلاں دن فلاں جگہ پہنچا دو ورنہ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے جہاں تمہارے فرشتے نہیں پہنچ سکتے۔ "کون ہیں وہ لوگ؟"

"وہ لوگ سامنے آ کے مطالبہ نہیں کرتے۔ انہوں نے ایاز کو فون کیا تھا۔"

"کس نمبر سے؟"

"آپ ماشاءاللہ جوان ہیں۔ بچوں جیسی بات کیوں کرتی ہیں۔ کیا آج تک کوئی نمبر سے پکڑا گیا ہے۔ ایک سم کو وہ دوسری بار استعمال نہیں کرتے بلکہ موبائل فون کو بھی۔ ایاز نے ان کو اسٹور میں دیکھا ہے دو دن سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے ایک تھا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ آیا۔ وہ ایاز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایاز نے خود دیکھا اور جو ایاز نے دیکھا وہ کیمرے کی آنکھ نے بھی دیکھا ہوگا۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں، مگر اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوگا۔"

"آپ مجھے وڈیو ریکارڈنگ دلوا دیں۔ تصدیق ہو جائے گی اور ثبوت پولیس خود حاصل کرلے گی۔"

"تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو۔ اگر انہیں پتا چلا تو وہ ایاز سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے گھر بم پھینک جائیں گے۔ ہینڈ گرنیڈ... یا یہاں؟"

"آپ جو مناسب قدم اٹھا سکتی ہیں اٹھائیں۔ پولیس سے آپ کے اچھے مراسم ہوں گے۔"

"اس معاملے میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے میں سودا کروں۔ ایک کروڑ مانگنے والے پچاس لاکھ پر مان جاتے ہیں۔"

قاسم بھونچکا رہ گیا۔ یہ عورت ایاز کو اس لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ جوان اور ہینڈسم تھا۔ وہ ایاز سے محبت کرتی تھی۔ اس کے لیے پچاس لاکھ کا تاوان ادا کرنے پر فوراً مان گئی تھی۔ قاسم نے کہا۔ "آپ کے جذبات کی قدر کرتا

ہوں میں لیکن وہ حرام زادے پرانے پاپی لگتے ہیں۔ مجھ سے میرا مطلب ہے ایاز سے کہا کہ ہم سے بارگیننگ کرنے میں وقت ضائع مت کرنا۔ ہم ایک بات کرتے ہیں اور بس۔"

"اچھا؟ یہ کہا انہوں نے۔" وہ متفکر ہو گئی۔ "تم ایاز سے کہو کہ وہ ایک کروڑ دے گا۔ میں دوں گی مگر ایاز سے کہو مجھ سے ملے۔ میں اسے روپوش رکھ سکتی ہوں اور اس کی حفاظت بھی کر سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا لیکن وڈیو ریکارڈنگ پھر بھی چاہیے مجھے۔"

ڈیڑھ گھنٹے بعد قاسم کو وڈیو ریکارڈنگ مل گئی۔ وہ دہری کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اب امکان پیدا ہو گیا تھا کہ مجرم پکڑ لیے جائیں اور پولیس ان سے اعترافِ جرم بھی کرا لے۔ دوسری ایاز کے لیے واقعی خوش خبری تھی۔ اس کی محبت سچی ہے۔ ایک کروڑ کی رقم وہ اس کی جان کا صدقہ دے سکتی ہے۔ اس پر وار کے پھینک سکتی ہے اور آج کے زمانے میں۔ واقعی عشق کی کوئی سرحد نہیں۔ نہ عمر، نہ رنگ، نہ مذہب اور نہ غربت۔

ان دونوں نے فلیٹ میں قفعہ بند ہو کے اپنے وڈیو سسٹم پر ساری ریکارڈنگ دیکھی۔ ایاز کو تاریخ اور وقت کا اندازہ تھا چنانچہ انہوں نے وہی حصہ دیکھا۔ ایک ایک فریم کو زوم کر کے خریداروں کے چہرے دیکھے جو سامان سے بھری گلیوں میں ٹرالی لیے گھوم رہے تھے۔ مرد عورت بچے اور اچانک وہ سامنے آ گئے۔ اس لیے بھی کہ جو خریدار تھے وہ ایاز کو دیکھ رہے تھے اور نہ کیمرے کو... وہ خریداری میں مصروف تھے۔

"یہ..." ایاز چلایا۔ "یہی ہیں وہ۔ یہ پہلے دن اکیلا تھا۔ دوسرے دن اس کو ساتھ لے آیا۔ دیکھ کس طرح ان کی نظر مجھ پر فوکس ہے۔"

قاسم نے اس فریم کو زوم کیا اور اسکین کر کے پرنٹ نکال لیا۔ "اب دوربین لگا کے دیکھ، اپنے ماضی میں کہ ان کی صورت کس سے ملتی ہے۔ گیارہ سال پہلے کس کے چہرے کا تصور ابھرتا ہے۔"

"میں نے دیکھ لیا۔ شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ اس کا بیٹا ہے جسے میں نے قتل کیا تھا دوسرا اس کا بھائی ہوگا یا دوست۔"

"نام یاد ہے؟"

"گلاب خان یوسف زئی۔" ایاز بولا۔ "بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی ہیں اس نے۔"

"تیرے چہرے پر بھی داڑھی ہے۔ جھاڑ جھنکاڑ نہ سہی، فیشن کے مطابق تراشی ہوئی۔"

"اب ہم کیا کریں گے؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ جا بے تو اپنی محبوبۂ دلنواز کی زلفوں کے سائے میں جا کے سو جا۔ وہ کہتی ہے کہ ایک کروڑ تجھ پر قربان۔ وہ خود تجھ پر قربان۔"

قاسم نے جیل کے باہر ایک سال میں جو سیکھا تھا، وہ دس سال جیل میں رہ کے نہیں سیکھا تھا۔ وہاں اس نے کتابی علم سیکھا تھا۔ زندہ رہنے کا آرٹ اس سے قطعی مختلف تھا۔ کراچی کا شہر، اس کی سمندر جیسی آبادی میں موجود کروڑوں مچھلیوں کے درمیان پھرنے والے خون کے پیاسے مگرمچھ۔ شریف انسانوں کو احمق اور کمزور سمجھنے والے مافیا کے رکن۔ اسٹریٹ کرائم سے، دھماکوں اور پرچیوں سے دہشت پھیلا کے اپنا کاروبار چلانے والے کم تھے، بہت کم۔ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں مگر انہوں نے بہت بڑی اکثریت کو جو انہیں اپنی طاقت سے چٹکیوں میں مسل دیتی، بزدل اور خود غرض بنا دیا تھا۔ نظر نہ آنے والی اقلیت متحد تھی۔ شریف آدمی کہلانے والوں کی اکثریت متحد نہیں تھی۔ پھر اپنی مدد آپ کا اصول ہی بقا کا ضامن تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ جب نہ قانون آپ کے ساتھ ہو اور نہ حکومت تو پھر شیدا پستول جیسے کردار ابھرتے ہیں۔ وحشی گجر اور جیرا بلیڈ سامنے آتے ہیں۔

قاسم نے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ اس کے نزدیک دوسرے سب لوگوں کے جینے کا حق بعد میں آتا تھا۔ پہلے اس کی اپنی زندگی اہم تھی۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا جو نئے زمانے سے نمٹ سکتا تھا۔ خواہ وہ کیسا بھی ہو۔ قاسم وہ جذباتی احمق نہیں رہا تھا جو اپنے مستقبل کے لیے خطرہ بننے والے کی موت پر آنسو بہا رہا تھا اور خود کو اس کی موت کا ذمے دار سمجھ کے احساسِ جرم کی سزا پا رہا تھا۔ یہ تو قانونِ قدرت ہے۔ بقا اسی کے لیے ہے جو مخالف حالات سے نمٹ سکے۔

پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ غلام محمد عرف استاد گلو کے پاس جائے لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل کے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے کہا۔ "کیا ہے؟"

"مجھے سلطان بھائی سے بات کرنی ہے۔"

"کون ہے تو؟" کوئی غرایا۔

قاسم نے پہاڑ جیسی دو گالیاں لڑھکا ئیں۔ "بھونکنے کی ضرورت نہیں۔ جو کہا ہے، وہ کر۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر سلطان کی آواز آئی۔ ”جی فرمائیے۔“ آواز میں وہی ملائمت اور انکساری تھی جو قاسم نے پہلی بار محسوس کی تھی۔

”سلطان بھائی! آپ کا ایک نیازمند ہوں میں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ کبھی ضرورت ہو تو اس نمبر پر بتا دینا۔“

”اچھا۔“

”اگر یاد ہو آپ کو... وہ صوفی تھا نا ایک الٹی کھوپڑی کا صحافی۔ مجھے پریشان کررہا تھا۔ غلام محمد نے کہا تھا۔“

”وہ تو مجھے نہیں یاد۔ آپ بتائیے کیا کرسکتا ہوں آپ کے لیے؟“

”سلطان بھائی، دو بندے ہیں۔ وڈیو بھی ہے اور تصویر بھی۔ میری بہن کے شوہر کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ بھائی اسے بیوہ ہونے سے بچالیں۔“

کچھ دیر بعد آواز آئی۔ ”تصویر اور وڈیو بھیج دیں۔“ اور فون بند ہوگیا۔

قاسم نے پھر نمبر ملایا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تصویر یا وڈیو کہاں اور کس کو بھیجے مگر دوسری طرف سے ٹیپ چل پڑا۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔“ اسے سخت مایوسی ہوائی۔ شاید سلطان بھائی نے اسے ٹال دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے کچھ یاد نہیں اور کیسے یاد رہے گا جب ہر روز نئے احکامات جاری کرنے پڑتے ہوں۔ لیکن شام کو وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو چند منٹ بعد کال بیل بجی اور اس نے دروازہ کھولا تو ایک لڑکی مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔

”جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ قاسم نے گھبرا کے کہا۔

”وہ تصویر اور وڈیو دے دیں مجھے۔“ اس نے معصومیت اور سادگی سے کہا۔

”آپ کو سلطان بھائی نے بھیجا ہے؟“

”جی نہیں۔ مجھے صدر صاحب نے بھیجا ہے۔“ وہ اتنی ہی سادگی سے بولی۔

قاسم نے تصویر اور وڈیو اس کے حوالے کی۔ وہ جتنی بے خوفی سے آئی تھی اتنی ہی بے نیازی سے چلی گئی... یا میرے خدا۔ کیا ہوگئی ہے یہ دنیا جس میں مجھے جینا پڑ رہا ہے۔ ادائے حسن کی معصومیت کو ختم کردے۔ گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے۔ ایسی سیدھی سادی شریف اور صرف محبت کے لائق لڑکی بھی؟ مگر عورت ہو یا مرد، جینے کی ضرورت تو سب کی مجبوری ہے۔

اگلے دن قاسم نے کئی اخبارات دیکھے لیکن ان میں ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والوں کا صرف اسکور تھا۔ سترہ افراد مختلف علاقوں میں مارے گئے تھے۔ نہ مدعی نہ شہادت۔ ٹارگٹ کلنگ کی مہر لگاؤ اور کیس کو داخلِ دفتر کرو۔ اس نے مزید تفصیل دیکھی تو اسے کچھ نام نظر آئے۔ مطمئن ہوکے اس نے اخبار رکھ دیا۔

رات کو اس نے سرسری انداز میں ایاز سے کہا۔ ”کل سے تو جا اپنا کام کر۔“

”کام پر جاؤں؟“

”ہاں، یہ اخبار دیکھ لے۔ ان میں مرنے والوں کے نام ہیں۔ سب کے تو نہیں مگر ایک نام خاص ہے جا ہے تو صبح جانے سے پہلے سرکاری مردہ خانے میں دیکھ لینا جہاں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے پڑی ہیں یا ایدھی کے سردخانے میں جہاں لاوارث رہ جاتے ہیں۔“

☆☆☆

صرف ایک مہینے بعد سہرا باندھے قاسم کی کار اپنی گلی میں داخل ہوئی تو پرانے محلے دار دونوں طرف کھڑے تھے۔ گلی کے آغاز میں ”خوش آمدید“ والا گیٹ تھا اور آگے اس پر پھول برسانے والوں کی قطار، کوٹھوں پر سے جھانکتی اور کھڑکیوں سے لٹکتی ہر عمر کی عورتوں نے چیخ ماری” دولھا آگیا۔ دولھا آگیا۔ ہائے اللہ کتنا خوب صورت ہے اور گاڑی اس کی اپنی ہے۔ سنا ہے ایک لاکھ لیتا ہے اب۔ ارے ایک نہیں دو۔ بڑے گھر کا بیٹا ہے۔“

نکاح انہی مولوی صاحب نے پڑھایا جنہوں نے دوسرے دن محلے والوں کے ڈر سے قاسم کو مسجد میں سونے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ نکاح اسی کمرے میں ہوا جو اس کی ماں کا کمرا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ آج کون تھا جو اس سے ذات اور نسب پوچھنے کی جرأت کرتا۔ اس کے ماضی کے بارے میں سوال کرتا۔ یہ قاسم کی خواہش تھی کہ نکاح اسی گھر میں ہوگا۔ اگلے دن شہر کے سب سے بارونق اور مہنگے شادی ہال سے وہ دلہن کو اپنے گھر لے جائے گا۔ پھر دوسرے شاندار ہال میں ولیمہ ہوگا۔ جس میں شہر کے معززین اور سلطان بھائی بھی شریک ہوں گے۔ نکاح کے گواہوں میں ایک غلام محمد تھا اور دوسرا ایاز خان۔ وہ دن بہت پیچھے ماضی میں گم ہوگیا... جب اسے اپنے گھر کے دروازے سے دھتکارا گیا تھا۔ دھتکارنے والوں نے بھی جان لیا تھا کہ وقت بدل گیا ہے۔ انہیں بھی بدل جانا چاہیے۔

قاتل سانپ

بابر نعیم

دولت کی چکا چوند وہ کام کروا دیتی ہے... جن کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے... دو ایسے ہی پارٹنرز کے مشترکہ کام کی نوعیت... دونوں ہم پلہ تھے... مگر ایک کا ارادہ تھا کہ دونوں پلڑوں میں صرف وہی ہو...

قاتل و مقتول دونوں سامنے تھے..... مگر قاتل کی تلاش جاری تھی

"آلۂ قتل۔" پولیس افسر نے کہا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سانپ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ اس سانپ کی لمبائی تین فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کے جسم پر سرخ اور پیلے رنگ کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سانپ کا سر کچلا ہوا تھا اور تقریباً ہموار ہو چکا تھا۔

"یہ شوخ رنگ کا زہریلا سانپ کورل اسنیک کہلاتا ہے۔" سراغ رساں نے لاش پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے بتایا۔

"یہ مردہ سانپ دفتر کے گوشے میں وہاں ہیٹر کے ان

کریٹس کے پیچھے پڑا ہوا ملا ہے۔"

پولیس افسر کی نگاہیں بیئر کے ان بکسوں کی جانب اٹھ گئیں جو آئرش روز پب کے عقبی داخلی دروازے کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے دفتر کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے تھے۔

اتنے میں شراب خانے کا شریک مالک ایڈی تیزی سے دفتر میں داخل ہوا۔ "اسے مرنا نہیں چاہیے۔" اس نے اپنے پارٹنر کی لاش پر نظریں جماتے ہوئے کہا جو فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ سراغ رساں لاش پر جھکا ہوا تھا۔ "کم از کم سینٹ پیٹرک ڈے پر نہیں۔"

سراغ رساں نے لاش کی گردن پر موجود سوراخ کے نشانات کا جائزہ لیا اور پھر اٹھ کر قریب سے مردہ سانپ کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا یہ سانپ پہلے کبھی یہاں دکھائی دیا تھا؟" سراغ رساں نے ایڈی سے پوچھا۔

"ایسا زہریلا سانپ سانتا مونیکا شہر کے وسط میں واقع اس شراب خانے میں کس طرح داخل ہوا ہو گا؟" ایڈی نے قدرے حیرت سے کہا۔

"کوئی تو اسے یہاں لے کر آیا ہوگا۔" سراغ رساں نے جواب دیا۔

"کون...؟"

"یہ ہم پتا لگالیں گے مسٹر ایڈی... ہم جان لیں گے کہ تمہارے پارٹنر کو کس نے قتل کیا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ اسے کس نے ہلاک کیا ہے۔" ایڈی نے کہا۔ "اسے سانپ نے ہلاک کیا ہے۔ اسے قتل نہیں کیا گیا۔ سانپ کسی طرح اندر گھس آیا تھا اور اسے ڈس لیا۔"

شارٹ اسکرٹ میں ملبوس ایک پستہ قد ویٹرس اوپر تک بھرا ہوا وہسکی کا ایک چھوٹا گلاس لے کر آئی اور ایڈی کو تھمایا۔

ایڈی نے دو گھونٹ میں وہ گلاس خالی کر دیا پھر خالی گلاس ویٹرس کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ "شکریہ... اب ایک ایک گلاس سراغ رساں اور پولیس افسر کے لیے بھی لے آؤ۔"

"ہم ڈیوٹی پر ہیں۔" سراغ رساں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ اس قاتل سانپ کو نیچے کیوں نہیں رکھ دیتے۔" ایڈی نے خوف زدہ نظروں سے مردہ سانپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس قدر پُریقین کیوں ہو کہ تمہارے پارٹنر کو سانپ ہی نے ہلاک کیا ہے؟" سراغ رساں نے کہا۔

"مجھے سانپ کے کاٹنے کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سانپ کو غور سے دیکھیں۔ مجھے وہ کہاوت ابھی تک یاد ہے جو میں اپنے بچپن میں سنا کرتا تھا۔ زہریلے کورل سانپ کو دیگر اقسام میں کس طرح شناخت کیا جاسکتا ہے۔ پیلے پر سرخ رنگ قاتل سانپ... سیاہ پر سرخ رنگ حملے سے محفوظ نسل... یہ قاتل سانپ ہے کیونکہ اس کے جسم پر پیلی اور سرخ دھاریاں ہیں۔"

"تمہیں سانپوں کے بارے میں خاصی معلومات ہیں؟"

ویٹرس نے قدرے جھرجھری سی لی اور واپس جانے کے لیے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ سراغ رساں نے اسے آواز دی۔ جب وہ پلٹی تو سراغ رساں نے اس کے نام کے ٹیگ کو پڑھتے ہوئے کہا۔ "لیزا... کیا آج صبح تمہاری مسٹر کارلائل سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"جب میں کام پر آئی تھی تو میں نے ان کی لاش وہاں پڑی ہوئی پائی تھی۔ تب میں نے آپ لوگوں کو فون کیا تھا لیکن آج وہ شراب خانہ کھولنے کے لیے معمول سے جلدی آگئے تھے۔ وہ اس بات کا یقین کر لینا چاہتے تھے کہ ہم نے بیئر کی وافر مقدار اسٹاک کر رکھی ہے یا نہیں۔ سینٹ پیٹرک ڈے آئرش پب میں سال کا مصروف ترین دن ہوتا ہے۔"

"اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنا کام فوری طور پر نمٹا دیں تاکہ ہم صفائی وغیرہ کر لیں۔ ورنہ سہ پہر تک گاہکوں کا رش بڑھنا شروع ہو جائے گا۔" ایڈی نے کہا۔

"یہ جو لاش یہاں موجود ہے یہ تمہارے پارٹنر کی ہے؟" سراغ رساں نے کارلائل کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویل، یقیناً۔" "یہ درست ہے کہ ہم پارٹنر تھے لیکن وہ ایک کاروباری آدمی بھی تھا۔ وہ حالات کے تقاضوں کو سمجھ سکتا ہے۔" ایڈی نے کہا۔ "جب بھی ہمیں کاروبار کا موقع ملے ضرور کرنا چاہیے۔"

"کاروبار کے لیے تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک ہماری تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں۔" سراغ رساں نے جواب دیا۔

"اس طرح تو ہمارا پورا دن ضائع ہوسکتا ہے۔" ایڈی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "ہم یہ دن ضائع کرنے کے

متحمل نہیں ہو سکتے۔ کم از کم سینٹ پیٹرک ڈے پر نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ پلیز، آفیسر... صاف ظاہر ہے کہ یہاں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔''

''یہ ایک قسم کا طنز ہے۔'' باوردی پولیس افسر نے درمیان میں فقرہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''سینٹ پیٹرک ڈے پر سانپ بہ طور قاتل جبکہ سینٹ پیٹرک نے آئرلینڈ سے تمام سانپوں کو نکال باہر کر دیا تھا۔''

''سراغ رساں نے باوردی پولیس افسر کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور پوچھا۔ ''کیا کورونر روانہ ہو چکا ہے؟''

''راستے میں ہے۔'' پولیس افسر نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھے آپ کو یہ بتانے کا کہا ہے کہ کورل سانپ کا زہر سانس لینے والے عضلات کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس سے عمل تنفس رک جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔''

سراغ رساں، ایڈی کی جانب گھوم گیا۔ ''کیا مسٹر کارلائل کا کوئی دشمن بھی تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں... ایک دشمن تھا۔'' ایڈی نے غراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کم بخت سانپ...''

ایڈی کے درشت لہجے پر کمرے میں موجود ہر فرد نے ردعمل ظاہر کیا۔ سراغ رساں نے شانے تانتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنی پشت پر رکھ لیے اور تند نگاہوں سے ایڈی کو گھورنے لگا۔ ویٹرس لیزا نے اپنے سر کو پیچھے کی جانب جھٹکا سا دیا اور ایڈی کی جانب اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا۔ یہ بات سراغ رساں نے نوٹ کر لی۔ اپنی یہ حرکت سراغ رساں کی نگاہ میں آنے پر ویٹرس لیزا کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے تاثرات منڈلانے لگے۔

''سوری...!'' ایڈی نے کہا۔ ''میں فکرمندی سے بولا سا گیا ہوں۔ میرا پارٹنر مر گیا ہے۔ یہ سال میں سب سے زیادہ کمائی کا دن ہے۔ کاروبار کی حالت تشویشناک ہے، ہم آج کے دن زیادہ سے زیادہ آمدنی کی توقع کر رہے ہیں۔''

پھر ایڈی نے پولیس افسر کے ہاتھ میں دبے ہوئے سانپ کی جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا تھا صاف ظاہر ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا... سانپ نے کارلائل کو چونکا دیا ہوگا۔ اس نے کارلائل کو ڈس لیا ہوگا اور پھر بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن کارلائل نے اسے جالیا ہوگا اور اس کے سر کو اپنے جوتے یا کسی اور شے سے کچل دیا ہوگا۔ لیکن پھر زہر نے اس پر اپنا اثر دکھا دیا ہوگا اور وہ جان گنوا بیٹھا ہوگا۔ صاف ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہوگا... ہے ناں...؟''

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''کیا مسٹر کارلائل عام طور پر صبح سویرے شراب کا جام لیا کرتے تھے؟'' ساتھ ہی سراغ رساں نے میز پر موجود ایک گندے جام کی جانب اشارہ کیا۔

ایڈی نے شانے اچکا دیے... لیزا نے بھی شانے اچکا دیے۔

سراغ رساں نے ہاتھوں میں ایک حفاظتی دستانہ چڑھایا اور اس شیشے کے گندے جام کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کون سا مشروب پیا کرتے تھے؟''

ایڈی نے شانے اچکا دیے۔ لیزا نے بھی شانے اچکا دیے۔

سراغ رساں نے جام کو سونگھا اور پھر تیزی سے اسے دور ہٹا دیا۔

فیس

''ڈاکٹر صاحب! میرے بہرے پن کے علاج کی آپ کتنی فیس لیں گے؟''

''دو ہزار خرچ آئے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''دو ہزار؟'' مریض نے تصدیق چاہی۔

ڈاکٹر نے مریض کے تیور بھانپتے ہوئے قلابازی کھائی اور رکھائی سے بولا۔ ''نہیں، پندرہ ہزار۔''

''ٹھیک ہے۔'' مریض نے سر جھکا کر کہا۔

سکون

ریل میں سفر کا آغاز ہوتے ہی دو عورتوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔

ایک کہہ رہی تھی کہ کھڑکی کھولی گئی تو وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے گی۔ دوسری بضد تھی کہ کھڑکی بند کی گئی تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

مسافر اس عجیب جھگڑے سے سخت پریشان تھے۔ کسی نے تنگ آکر گارڈ کو خبر دی۔ اس نے بہت سنجیدگی سے دونوں کا موقف سنا پھر مسافروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پہلے کھڑکی کھولو، ایک مر جائے گی۔ اس کے بعد کھڑکی بند کر دو، دوسری کا قصہ بھی تمام ہو جائے گا اور بقیہ لوگوں کا سفر سکون سے طے ہو جائے گا۔''

اوکاڑہ سٹی سے تصویر الحسن کا فیصلہ

''اس میں سے تو عجیب سی بُو آرہی ہے، یہ مکمل طور پر شراب کی بُو ہرگز نہیں ہے۔''

سراغ رساں نے جام ایڈی کی جانب بڑھایا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ تب سراغ رساں ویٹرس لیزا کی جانب گھوم گیا۔ وہ بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سراغ رساں نے خالی جام نیچے رکھ دیا۔ ساتھ ہی پولیس افسر کو اشارہ کیا کہ وہ مردہ سانپ کو نیچے ڈال دے۔ پولیس افسر نے سراغ رساں کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہاتھ خالی کر لیے۔

''کیا اب ہم شراب خانہ کھولنے کی تیاری شروع کر دیں؟'' ایڈی نے پوچھا۔ ''ہم صرف بار میں کام کریں گے۔ یہاں عقبی دفتر سے دور رہیں گے۔''

''تم سانپوں کے بارے میں بہ خوبی جانتے ہو۔'' سراغ رساں نے ایڈی سے کہا۔

ایڈی ساکت ہو گیا۔ اس نے ویٹرس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں ہو گیا۔

''میرے آفیسر نے سینٹ پیٹرک کے بارے میں جو داستان سنائی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے آئرلینڈ سے سانپوں کو نکال باہر کیا تھا اور وہاں سے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ درحقیقت سینٹ پیٹرک کی آئرلینڈ میں آمد سے قبل وہاں کوئی سانپ نہیں تھے۔ آئرلینڈ کی سرزمین پر ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ کیا تم یہ بات جانتے ہو؟'' یہ سوال سراغ رساں نے براہِ راست ایڈی سے کیا تھا۔ ''سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ گلیشیرز سے متعلق تھا۔''

''اچھا ایسا تھا؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔'' ایڈی نے جواب دیا۔

سراغ رساں نے خالی جام کی طرف اشارہ کیا۔ ''سینٹ پیٹرک نے سانپوں سے نجات کا کریڈٹ حاصل کیا جبکہ وہاں سانپوں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس بے چارے سانپ، اس کورل سانپ کو بھی قتل کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے لیکن یہ اس کو کس طرح مار سکتا تھا جو پہلے ہی مرا ہوا تھا۔''

کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''کوئی سوال نہیں...؟'' سراغ رساں نے جھوٹ موٹ حیرت سے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً تمہارے پاس سوال کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں کیونکہ تم اس بات سے پہلے ہی واقف تھے۔ مسٹر کارلائل کے صبح کے مشروب میں جو کچھ بھی شامل کیا گیا تھا اس نے انہیں مار ڈالا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کورونر اس زہر کو تلاش کرلے گا جو عضلاتِ تنفس کو اسی طرح مفلوج کر دیتا ہے جیسا کہ سانپ کے زہر سے سانس لینے کا عمل رک جاتا ہے۔''

''کیا پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو۔'' ایڈی نے کہا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ بالآخر وہ بول پڑا۔

''یہ سانپ ہی تھا۔ کیا تمہیں گردن پر سانپ کے کاٹے کا نشان دکھائی نہیں دے رہا؟''

''مجھے دکھائی دے رہا ہے، میں حیران ہوں کہ سانپ مسٹر کارلائل کی گردن تک کس طرح پہنچا ہوگا۔ اونچائی پر کوئی ایسا شیلف بھی نہیں ہے کہ جس سے وہ نیچے ٹپک پڑا ہو۔ اور نہ ہی اس کے پر ہیں کہ یہ اڑتا ہوا ان کی گردن پر آگیا ہو۔''

''اوکے...'' ایڈی یہ کہہ کر رک گیا... پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''کارلائل اونگھ رہا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ اونگھتے ہوئے نیچے گر پڑا ہو اور سانپ نے اسے جالیا ہو۔''

''یا ہو سکتا ہے کہ جب وہ پہلے ہی مر چکا ہو تو سانپ کے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیے گئے ہوں۔ دانتوں کے نشانات کے اطراف گردن پر کوئی خون دکھائی نہیں دے رہا۔ حتیٰ کہ خون کی ایک بوند تک نہیں ہے۔ جو کوئی بھی سانپوں کے متعلق معلومات رکھتا ہے اسے اس بات کا دھیان ہونا چاہیے تھا۔''

ایڈی نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کو اس طرح ملنا شروع کر دیا جیسے کہ مٹی گوندھ رہا ہو۔ ''نہیں، نہیں... تم دیکھ سکتے ہو...'' وہ یہ کہہ کر رک گیا اور ویٹرس کو گھورنے لگا پھر ایک اونچی زوردار آواز میں چیخ کر بولا۔ ''مشروب میں ملاوٹ اس نے کی تھی۔''

''احمق... کہیں کے!'' ویٹرس لیزا بھی پھٹ پڑی۔ ''وہ تمہیں کاروبار سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا۔ تم اپنے لیے اس کاروبار کو بچانا چاہتے تھے... ہمارے لیے... ہم دونوں کے لیے۔''

تب سراغ رساں نے پولیس افسر کو اشارہ کیا تو اس نے اپنے یوٹیلٹی بیلٹ سے بندھی ہتھکڑی اتار لی۔

''سینٹ پیٹرک کو اب بھی سانپوں سے نجات دلانے والے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے گا لیکن ہم اس بے چارے سانپ پر قتل کا جھوٹا الزام عائد نہیں کریں گے۔'' سراغ رساں نے کہا۔

ایڈی اور ویٹرس لیزا کے منہ لٹک گئے اور انہوں نے خاموشی سے ہتھکڑیاں پہننے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

کوٹ کی گواہی

تنویر ریاض

بعض اوقات بظاہر صاف اور عیاں نظر آنے والے منظر نامے کے پیچھے وہ کچھ چھپا ہوتا ہے جو نظر آنے کے بعد کسی قیامت سے کم نہ ہو... ایک سیدھی سادی لڑکی کی زندگی کے شب و روز... اچانک ہی اسے ایک کوٹ ملا... اور پھر داستان کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ایک سرے کے بعد دوسرے سرے کی کھوج نے اسے سنگین راز سے آشنا کر دیا۔

ایسا سچ جس کی حقیقت نے وقت گزرنے کے بعد اپنی اہمیت کو غیر اہم ثابت کر دیا

''ڈاکٹر اسٹیوارٹ! یہ تمہاری غیر موجودگی میں کوئی دے گیا ہے۔''

لزی اسٹیوارٹ نے ای میل سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنی اسسٹنٹ کلاڈیا کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنے بازوؤں میں ایک بڑا سا باکس پکڑا ہوا تھا اور خاصی پُرجوش نظر آ رہی تھی۔

''میں ایسی کسی چیز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟''

کلاڈیا نے نفی میں سر ہلا اور بولی۔ ''یہ معلوم نہیں۔ جو لڑکا یہ پارسل لے کر آیا ہے، وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہ باکس کمپنی کے ٹرک کے پاس رکھا ہوا ملا تھا۔ جب اس نے اسے اٹھایا تو اس کے ساتھ ایک لفافہ بھی منسلک تھا۔''

''اس لفافے میں کیا تھا؟''

''ڈاک خرچ کے برابر رقم۔ چنانچہ وہ اس باکس کو دفتر میں لے گیا۔ وہاں اسے کھول کر دیکھا گیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے تو سپروائزر نے کہا کہ اس باکس کو متعلقہ پتے پر پہنچا دیا جائے کیونکہ ڈاک خرچ کی ادائیگی ہو چکی ہے تاہم اس باکس پر بھیجنے والے کا نام اور پتا درج نہیں ہے۔''

''حیرت ہے۔'' لزی نے کہا۔

''تمہارے خیال میں اس میں کیا چیز ہو سکتی ہے؟'' کلاڈیا نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' لزی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو اسے کھولنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔''

''ممکن ہے کہ کسی نے کانفرنس کے لیے کچھ بھیجا ہو۔''

''ہم جن تنظیموں کے لیے کام کر رہے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو اپنا نام پتا ظاہر کیے بغیر اس طرح کوئی پارسل ہمیں بھیجے۔''

''مجھے تو یہ معاملہ بہت پُراسرار لگ رہا ہے۔'' کلاڈیا کے لہجے میں ہلکا سا خوف جھلک رہا تھا۔

''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' لزی نے کہا اور دراز سے قینچی نکال کر باکس پر لگا ہوا ٹیپ کاٹنے لگی اور جب اس نے باکس کا اوپری حصہ کھول کر وہ چیز باہر نکالی تو کلاڈیا کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ ایک سیاہ ویلوٹ کا کوٹ تھا جس کے کالر اور کف پر سرخ کپڑا لگا ہوا تھا۔

''یہ تو بہت شاندار ہے ڈاکٹر اسٹیوارٹ۔'' کلاڈیا بولی۔ ''قدیم زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے کوٹ انیس سو تیس یا چالیس میں استعمال کیے جاتے تھے۔''

لزی نے کرسی کی پشت پر وہ کوٹ پھیلایا اور بولی۔ ''تمہارا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔''

''ممکن ہے کہ کسی نے تمہیں یہ تحفے کے طور پر بھیجا ہو۔'' کلاڈیا نے کہا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسٹر چرڈ کی نظر اس پر پڑی ہو اور انہوں نے تمہیں حیران کرنے کے لیے یہ تحفہ بھیجا ہو۔''

''تم جانتی ہو کہ وہ پولیس میں رہ چکا ہے اور پولیس والے کسی پر اتنا بھروسا نہیں کرتے کہ ٹرک کے پاس پارسل رکھ کر چلے جائیں۔''

کلاڈیا نے پُرشوق نگاہوں سے کوٹ کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''کیا تم اسے پہن کر نہیں دیکھو گی۔ اگر یہ مسٹر چرڈ نے نہیں بھیجا تو یہ کسی اور کی جانب سے بھی تمہارے لیے تحفہ ہو سکتا ہے۔''

لزی نے باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولی۔ ''شاید کسی نے ہمارے ادارے کو بطور عطیہ دیا ہو اور اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو۔''

''لیکن کوئی اس قدیم زمانے کے کوٹ کو ایسے ادارے کے لیے عطیہ کیوں کرے گا جو سدرن کرائم اور کلچر پر تحقیق کر رہا ہو۔''

''تم جانتی ہو کہ لباس بھی سدرن کلچر کا حصہ ہے۔''

''لیکن یہ تو بہت شاندار کوٹ ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نے نیویارک کے بڑے اسٹور یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ سے خریدا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی نے اسے پہنا ہی نہ ہو۔'' لزی نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا جو باکس کی تہ میں رکھا ہوا تھا اور بولی۔ ''اس میں شاید ہمارے سوالوں کا جواب موجود ہو۔''

''یہ کاغذ کسی کاپی سے پھاڑا گیا تھا اور اس کے وسط میں صرف ایک ہی جملہ لکھا ہوا تھا۔ لزی نے وہ کاغذ کلاڈیا کی طرف بڑھا دیا۔

''اپنے خالق کے پاس جانے سے پہلے یہ میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔'' کلاڈیا نے بہ آواز بلند پڑھا اور مستفسرانہ بولی۔ ''اس کا خالق، کیا یہ اشارہ خدا کی جانب ہے؟''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔''

''لیکن اس تحریر اور کوٹ کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔'' کلاڈیا نے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' لزی نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ یہ کوٹ کسی ایسی عورت کا نظر نہیں آتا جو لکھنے کے لیے اس طرح کا کاغذ استعمال کرے۔''

''پھر تمہارے خیال میں یہ کوٹ کس عورت کا ہو سکتا ہے؟''

''وہ عورت جو اپنے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر خط لکھے اور فاؤنٹین پین کا استعمال کرے۔'' کلاڈیا نے کہا.... ''وہ کبھی بھی خدا کے پاس جانے کی بات نہیں کرے گی۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ جس عورت کا یہ کوٹ ہو وہ اب بوڑھی ہو چکی ہو اور خط لکھنے کے لیے اس نے اپنے پوتے یا

پوتی کی کاپی سے کاغذ پھاڑا ہو اور وہ مرنے سے پہلے اپنی چیزیں لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہو۔'' لزی نے کہا۔

''لیکن اس نے گمنام رہ کر یہ کوٹ کیوں بھیجا؟'' کلاڈیا نے پوچھا۔ ''اگر وہ بوڑھی عورت ہے تو اس کے لیے اس باکس کو بازوؤں میں اٹھا کر ٹرک تک لے جانا ممکن نہیں۔''

لزی نے کوٹ اور اس کی پُراسرار آمد کے بارے میں مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''پانچ بج چکے ہیں۔ اب تم اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جاسکتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری شام بہت اچھی گزرے گی۔ ویسے بھی کل کافی کام ہے۔ کانفرنس ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو جائے گی۔''

''لیکن کیا تم اس بارے میں جاننا نہیں چاہتیں؟''

''فی الحال میں صرف اس کانفرنس کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس کی منصوبہ بندی ہم کئی مہینوں سے کررہے ہیں۔ یہ ہمارے ادارے کی پہلی کانفرنس ہے۔ کیا تم نے ان طالب علموں کی فہرست بنالی ہے جو کل مندوبین کی رجسٹریشن کریں گے۔''

''ہاں۔'' کلاڈیا بولی۔ ''میں اور ڈاکٹر فیلڈنگ تمہاری غیر موجودگی میں یہی کام کررہے تھے۔''

''ویسے ڈاکٹر فیلڈنگ اس وقت ہے کہاں؟''

''ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی۔ ڈاکٹر فیلڈنگ نے تمہارے لیے پیغام دیا تھا کہ وہ کہیں جارہی ہے تاکہ ڈین بیلر سے مل کر اسے یاد دلا سکے کہ کل صبح اسے مہمانوں کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کا تعارف بھی کروانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر چلی جائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے تمہیں آدھی رات تک یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب سارے کام ہو چکے ہیں۔''

''شکر ہے کہ تمہیں اس کا پیغام دینا یاد رہا۔''

''مجھے یاد تھا لیکن جب تم آئیں تو اس وقت میں ٹیلی فون پر مصروف تھی۔ اس کے بعد ہم اس باکس میں الجھ گئے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر کوٹ پر نظر ڈالی اور بولی۔ ''کیا تم واقعی اس کے بھیجنے والے کے بارے میں جاننا نہیں چاہتیں؟''

''نہیں۔'' لزی بولی۔ ''اب تم گھر جاؤ۔ میں کل صبح تمہیں تروتازہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ڈیلیوری کمپنی کو فون کرنے میں صرف ایک منٹ لگے گا۔ ممکن ہے کہ وہاں سے کچھ پتا چل سکے۔''

''تمہارے پاس اس کی رسید تو ہوگی۔ وہ مجھے دے دو تاکہ میں اسے حفاظت سے رکھ دوں۔''

کلاڈیا نے رسید کی کاربن کاپی اسے تھما دی جو وہ باکس کے ساتھ ہی لائی تھی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر، اب صبح ملاقات ہوگی۔''

اس کے جانے کے بعد لزی نے دروازہ بند کیا اور کوٹ کو دوبارہ غور سے دیکھنے لگی۔ کلاڈیا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ کوٹ انیس سو تیس یا انیس سو چالیس کے زمانے کا لگ رہا تھا اور اس لحاظ سے اس کا شمار قدیم نوادرات میں کیا جاسکتا تھا۔

''نہیں۔'' لزی نے بہ آواز بلند خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''فی الحال اس بارے میں مت سوچو۔ اس کوٹ کو باکس میں رکھ کر الماری میں بند کردو اور کانفرنس کے ختم ہونے تک اسے وہیں رہنے دو۔''

اس نے ایسا ہی کیا اور کوٹ کو باکس میں رکھ کر الماری میں بند کردیا پھر اس نے جلدی جلدی ایک نظر کل کے پروگرام پر ڈالی تاکہ اطمینان کرسکے کہ کہیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ اس کے بعد گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ اس نے اپنے شوہر رچرڈ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات کے کھانے سے قبل گھر پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

قدیم زمانے کے کپڑوں کی دکان پیر کے روز بند ہوتی تھی چنانچہ وہ منگل کو علی الصباح وہاں پہنچ گئی لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں ابھی تک 'بند ہے' کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس نے اپنے پروگرام کے بارے میں کلاڈیا، یا رچرڈ کو نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ کلاڈیا کو اپنے ساتھ نہیں لانا چاہتی تھی اور رچرڈ کو کچھ بتانے کا مطلب اپنا مذاق بنوانا ہوتا۔ وہ مایوس ہو کر واپس جانے والی ہی تھی کہ دکان کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر آکر وہ بورڈ ہٹادیا۔ یہ دیکھ کر لزی نے اطمینان کا سانس لیا اور باکس سمیت کار سے باہر آگئی۔

دکان کی مالکہ کا نام کیرول بیکر تھا جب لزی نے بتایا کہ وہ اسی کوٹ کے بارے میں بات کرنے آئی ہے جس کے بارے میں اس نے ہفتے کی سہ پہر کو فون کرکے بتایا تھا تو کیرول نے اپنی معاون کو کاؤنٹر پر رہنے کی ہدایت کی اور لزی کو لے کر دکان کے عقبی حصے میں واقع اپنے دفتر میں آگئی۔ اس نے باکس سے کوٹ نکالا اور اسے غور سے دیکھتے

ہوئے بولی۔ ”یہ اچھی حالت میں ہے۔ بس ایک آستین کہنی کے پاس سے تھوڑی سی گھسی ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور ویلوٹ پر گہری تہ نظر آ رہی ہے۔ غالباً اسے کافی عرصے سے موڑ کر رکھا گیا تھا۔“

”مجھے کپڑوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔“ لزی نے کہا۔ ”کیا یہ سلک ہے؟“

”کریم ساٹن۔“ بیلر نے کہا اور یہ کسی گارمنٹ کمپنی کا تیار کردہ ہے۔ گوکہ اس پر کوئی لیبل نہیں ہے لیکن بہت سے گاہک ایسے ہی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر تم اسے نمائش میں رکھنا چاہتی ہو تو اس کے کوائف اس طرح بیان کیے جاسکتے ہیں۔“ آرٹ ڈیکو۔ انیس سوتیس کا سیاہ ویلوٹ کوٹ۔“

”کیا تم یہ مجھے لکھ کر دے سکتی ہو؟“ لزی نے کہا۔

”مجھے خوشی ہوگی۔“ بیکر بولی اور دراز سے ایک پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگی۔

”تمہاری مدد کا بہت بہت شکریہ۔“ لزی بولی۔

”کوئی بات نہیں۔“ بیکر اسے کاغذ پکڑاتے ہوئے بولی۔ ”کیا ڈلیوری کمپنی نے کچھ بتایا کہ یہ کوٹ کس نے بھیجا ہے؟“

”نہیں، ان کے دفتر میں گاہکوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس لیے کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی کہ کون اس باکس کو ڈلیوری ٹرک کے پاس رکھ کر چلا گیا۔“

☆☆☆

وہ بوڑھی عورت کچن کے باہر اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لزی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے آنے کا وقت ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا۔“

لزی نے آگے بڑھ کر اکیانوے سالہ اور لینز کیفے کی مالکن کے جھریوں بھرے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔ ”میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ کانفرنس میں مصروف تھی۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ مس ایلس ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا شوہر کہاں ہے؟“

کچن سے آنے والی کھانے کی خوشبو نے لزی کی بھوک اور بڑھا دی۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”وہ کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔ اگر اسے دیر ہوگئی تو میں اس کے بغیر ہی کھانا شروع کردوں گی کیونکہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

”لگتا ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی بہت مصروف ہے۔“

”مس ایلس! اس سے پہلے کہ رچرڈ آئے، میں تم سے کسی چیز کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”تم دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کر کے اپنے آپ کو مشکل میں ڈال لیتی ہو۔ بہتر ہوگا کہ یہی وقت اپنے شوہر کو دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسری عورت اسے لے اڑے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لزی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو ایک نمائش کی تیاری کر رہی ہوں اور تم سے ایک ایسے کوٹ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں جو کسی نے مجھے بھیجا ہے۔“

”میں یہاں کوٹ نہیں بیچتی پھر میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاسکتی ہوں؟“

لزی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں کچھ یاد ہو اگر کبھی تم نے اس طرح کا کوٹ دیکھا ہو۔“

یہ کہہ کر لزی نے اپنے بیگ سے کوٹ کی ایک تصویر نکالی اور مس ایلس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ مس ایلس نے تصویر پر نظر ڈالی اور بولی۔ ”اس طرح کے کوٹ پرانی فلموں میں عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ آج کل ایسے کوٹ نظر نہیں آتے۔ پرانے زمانے میں بھی صرف امیر عورتیں ہی ایسے کوٹ پہن سکتی تھیں۔“

”کیا تم نے یہاں کسی عورت کو اس طرح کا کوٹ پہنے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“

لزی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے امید تھی کہ شاید اس کوٹ کو دیکھ کر تمہیں کچھ یاد آجائے۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ کسی نے یہ کوٹ تمہیں بھیجا ہے۔“ مس ایلس کے لہجے میں تھوڑا سا تجسس تھا۔

”ہاں مادام یہ مجھے گزشتہ بدھ کی سہ پہر کو ملا، اس پر کسی بھیجنے والے کا پتا نہیں تھا۔ میں یہی سمجھ رہی ہوں کہ کسی نے ہمارے ادارے کو یہ عطیہ کے طور پر بھیجا ہے لیکن میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی ہوں۔ شاید اس کے پیچھے کوئی کہانی ہو۔“

”اگر ایسی کوئی کہانی ہوتی اور بھیجنے والا یہ چاہتا کہ تم اس کے بارے میں جان جاؤ تو وہ اس کوٹ کے ساتھ ہی کہانی بھی بھیج سکتا تھا۔“

”ہاں مادام لیکن بعض اوقات لوگ چاہتے ہیں کہ وہ چیز صحیح ہاتھوں میں پہنچ جائے تو وہ ایسے گمنام عطیات بھیجے

ہیں لیکن اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔''

''اگر تم یہ بات جانتی ہو تو پھر اتنی چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' مس ایلس بولی۔

''شاید یہ ممکن نہیں کیونکہ میرا تجسس بڑھ گیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ تحریر دیکھ رہی ہو؟'' یہ مجھے کوٹ کے ساتھ ہی ملی ہے اور اس پر ایک ہی جملہ لکھا ہے۔ تم بھی پڑھ لو۔''

مس ایلس نے زیرِ لب وہ تحریر پڑھی جس میں لکھا تھا۔ ''اپنے خالق کے پاس جانے سے پہلے میں یہ کوٹ تمہیں بھیج رہی ہوں۔'' پھر بولی۔ ''لگتا ہے کہ وہ اپنے گھر کی صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔''

''میرے دماغ میں بھی یہی بات آئی تھی لیکن اس کے لیے اس نے ہمارے ادارے کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ وہ اپنے کسی رشتے دار کو بھی یہ کوٹ دے سکتی تھی۔''

''شاید اس نے سوچا ہو کہ یہ کوٹ تمہارے ادارے کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی رشتے دار کو دیتی تو شاید وہ اسے بیچ دیتے۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی مال دار عورت تھی۔ کم از کم اس کوٹ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر تم کسی ایسی بوڑھی مالدار عورت کو تلاش کرو جو بسترِ مرگ پر ہو شاید اس طرح یہ معلوم ہو جائے کہ کس نے یہ نفیس کوٹ تمہیں بھیجا ہے۔''

لزی ہنستے ہوئے بولی۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ مس ایلس۔''

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی رچرڈ بھی آ گیا۔ وہ مس ایلس کی میز کے پاس پہنچ کر تعظیماً جھکا اور بولا۔ ''کیسی ہو مس ایلس؟ کیا مجھے یہ کہنے کی اجازت ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد میرا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔''

''پھر تو تمہیں صبح کا ناشتا بھی یہیں کرنا چاہیے۔'' مس ایلس مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

لزی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوٹ کی تصویر اپنے بیگ میں ڈال لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رچرڈ یہ تصویر دیکھے اور اس کا موڈ خراب ہو جائے۔

☆☆☆

لزی کی اگلی منزل پبلک لائبریری تھی لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریفرنس روم کی لائبریرین بیماری کی وجہ سے چھٹی پر ہے تاہم اس کی جگہ ڈیوٹی پر موجود عورت نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکتی ہے۔ تب لزی نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ کس کی تلاش میں یہاں آئی ہے اور اسے کیا معلومات درکار ہیں۔

''اس کے لیے تمہیں پرانے اخبارات کی مائیکرو فلمیں دیکھنا ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی مدد سے تم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی کہ اس زمانے کی عورتیں کیسا لباس پہنتی تھیں اور یہ تمہاری نمائش کے لیے ایک اچھا آئیڈیا ہوگا۔''

لزی نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا بلکہ اس نے لائبریرین کو اپنے ارادوں کے بارے میں کم و بیش سب کچھ بتا دیا تھا۔ البتہ اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کسی خاص نوجوان عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہی ہے جو ایک خوب صورت سیاہ ویلوٹ کا کوٹ پہنا کرتی تھی۔

وہ دو گھنٹے تک پرانے اخبارات کی مائیکرو فلمیں دیکھتی رہی لیکن اسے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ کافی تھک چکی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سوچنے لگی کہ بقیہ کام اگلے روز تک ملتوی کر دیا جائے لیکن پھر اسے اپنی مصروفیات کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ لائبریری آنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ ابھی چار بجے تھے اور وہ مزید دو تین گھنٹے یہاں گزار سکتی تھی۔ اسے اسٹور کی مالکن کورل بیکر کی بات یاد آ گئی جس کے مطابق یہ کوٹ 1930ء، 1940ء کے درمیان بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تلاش کو 1935ء کے اخبارات تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے معاشرتی صفحات دیکھنے لگی تاکہ جان سکے کہ اس زمانے میں مقامی خواتین تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے کس طرح کا لباس استعمال کیا کرتی تھیں۔

ساڑھے آٹھ بجے اعلان ہوا کہ لائبریری آدھے گھنٹے بعد بند ہو جائے گی۔ لزی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ وہ ابھی تک کچھ معلوم نہیں کر پائی۔ اس نے مایوس ہو کر مائیکرو فلم مشین بند کر دی اور اٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کے ذہن نے ایک اور رخ سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے کوٹ کے ساتھ آنے والی تحریر کے الفاظ پر غور کیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوٹ بھیجنے والی عورت واقعی مر گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے انتقال کے بعد کسی رشتے دار نے یہ کوٹ لزی کو بھیج دیا ہو۔ لزی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اخبارات میں گزشتہ چند ہفتوں کے دوران ہونے والی اموات کے بارے میں جان سکے۔

اس نے تمام اخبارات چھان ڈالے لیکن ان میں

.... کسی سفید فام عورت کے انتقال کی خبر نہیں ملی پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا، یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوٹ بھیجنے والی عورت کوئی سیاہ فام ملازمہ ہو جسے اس کی مالکن نے یہ کوٹ بخش دیا ہو یا پھر اس نے خود ہی مالکن کے مرنے کے بعد اس کی الماری سے یہ کوٹ نکال لیا ہو اور اب وہ مرنے سے پہلے اپنے اس جرم کی تلافی کرنا چاہ رہی ہو چنانچہ اس نے ایک بار پھر اخبارات کھنگالنے شروع کر دیے۔ اس مرتبہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی وفات کا کالم دیکھ رہی تھی۔

نو بجنے میں پانچ منٹ اور باقی تھی جب اسے مطلوبہ خبر مل گئی۔ وہ تیزی سے فوٹو اسٹیٹ مشین کی جانب لپکی تاکہ اس صفحے کی نقل حاصل کر سکے۔ آپریٹر نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا تاہم لائبریری بند ہونے میں چند منٹ باقی تھے لہٰذا اسے لزی کی فرمائش پوری کرنا پڑی۔

☆☆☆

دروازہ کھولنے والی عورت نے اسے غور سے دیکھا اور بے یقینی سے بولی۔ ”کیا تم ہی پروفیسر اسٹیوارٹ ہو؟“

”ہاں، بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ملنے کا وقت دیا۔“

”اندر آجاؤ۔“ وہ عورت ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام پیٹ ہے، پیٹریشیا فریزر، جیسا کہ فون پر بتا چکی ہوں کہ تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے ایک گھنٹے بعد اسپتال جانا ہے۔“

”کیا تم نرس ہو؟“

”نہیں، میں استقبالیہ پر بیٹھتی ہوں۔“

لزی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مسز کنگ تمہاری آنٹی تھیں؟“

”ہاں، تمام رشتے داروں میں وہی ایسی تھیں جن کی موجودگی سے میں لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔“

”کیا وہ تمہارے ساتھ ہی رہتی تھیں؟“

”ہاں، وہ ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ شوہر سے طلاق ہو چکی ہے۔ ورنہ وہ تو میرے کسی رشتے دار کو گوارا نہ کرتا۔“

”میں تمہاری آنٹی کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا تم ہاؤس کیپرز کے بارے میں کوئی تحقیق کر رہی ہو؟“

”نہیں، میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا کہ ایک ادارے کی ڈائریکٹر ہوں اور تمہارے پاس ایک کوٹ کے سلسلے میں آئی ہوں جو غالباً انیس سو تیس کا بنا ہوا ہے اور مجھے کسی نامعلوم شخص نے ڈاک کے ذریعے بھیجا ہے۔ میں اس کوٹ کی مالکن کو تلاش کر رہی ہوں کیونکہ اسے نمائش میں رکھنا ہے اور چاہتی ہوں کہ بھیجنے والا شخص مجھے اس کوٹ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرے۔“

پیٹ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس کوٹ کا آنٹی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”مجھے اس کوٹ کے ساتھ ایک تحریر ملی تھی جس میں کوٹ کی مالکن نے اپنی متوقع موت کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ میں نے گزشتہ دو ہفتوں کے اخبارات دیکھے جن سے مجھے تمہاری آنٹی کے انتقال کا پتا چلا اور یہ بھی کہ وہ ایک ہاؤس کیپر تھیں، میرا خیال ہے کہ یہ کوٹ ان کی مالکن نے انہیں دیا ہوگا۔“

پیٹ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم غلط جگہ پر آگئی ہو، میں نے آنٹی کے مرنے کے بعد خود ان کا سامان پیک کیا تھا اور ان میں جو قابل استعمال اشیا تھیں، وہ خیراتی اداروں اور چرچ کو بھیج دی گئی تھیں۔“

لزی نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کوٹ کی تصویر نکالتے ہوئے بولی۔ ”اس تصویر کو دیکھو۔ شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔“

پیٹ نے تصویر دیکھی اور دوبارہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بہت شاندار کوٹ ہے لیکن میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ لزی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے قیمتی وقت کا شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔“

وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکی اندر داخل ہوئی۔ پیٹ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بیٹی جین ہے۔“

لزی نے غور سے جین کو دیکھا اور پیٹ سے بولی۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اس کوٹ کی تصویر تمہاری بیٹی کو بھی دکھا دوں۔“

”دکھا دو لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ پیٹ بولی۔ ”جب مجھے اس کوٹ کے بارے میں کچھ علم نہیں تو اسے کیا معلوم ہوگا؟“

”کیسا کوٹ؟“ جین بولی۔

لزی نے تصویر جین کو دی اور بولی۔ ''ہم اس کوٹ کی بات کر رہے ہیں۔ کیا تم اسے پہچانتی ہو یا تم نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے؟''

جین بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ آنٹی نیز کے پاس ایسا کوٹ تھا۔''

پیٹ نے اپنی بیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ آنٹی کے پاس ایک سیاہ ویلوٹ کا کوٹ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں نے اسے نہ دیکھا ہو۔''

''کیونکہ آنٹی نے یہ کوٹ میرے پاس رکھوایا تھا۔ جب وہ ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اسے اپنے کمرے میں رکھ لوں۔ وہ چاہتی تھیں کہ جب تک وہ یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ اس کا کیا کرنا ہے میں اس کوٹ کو چھپا کر رکھوں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر کسی دوسرے رشتے دار کی نظر اس پر پڑگئی تو وہ یہ کوٹ مانگ سکتا ہے۔''

''اور تم نے مجھے بھی اس بارے میں نہیں بتایا؟'' پیٹ غصے سے بولی۔

''آنٹی نے کہا تھا کہ میں کسی سے بھی اس کوٹ کا تذکرہ نہ کروں۔''

لزی بولی۔ ''کیا تمہاری آنٹی نے بتایا تھا کہ ان کے پاس یہ کوٹ کہاں سے آیا؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ وہ جس گھر میں کافی عرصہ پہلے ہاؤس کیپر کے طور پر کام کرتی تھیں، ان کی لڑکی نے جانے سے پہلے یہ کوٹ انہیں دیا تھا۔''

''وہ لڑکی کہاں چلی گئی تھی؟'' لزی نے پوچھا۔

''انہوں نے یہ نہیں بتایا۔ دراصل وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ میں یہ کوٹ اپنے پاس رکھ لوں۔ چنانچہ میں نے اسے ایک باکس میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا جب تک انہوں نے نہیں بتایا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔''

''پھر انہوں نے اس بارے میں کیا فیصلہ کیا؟''

''جب ان پر نمونیہ کا حملہ ہوا تو میں انہیں دیکھنے اسپتال گئی۔ انہوں نے ٹی وی پر کسی پروفیسر کو سنا تھا جس نے یونیورسٹی میں کوئی ادارہ قائم کیا ہے۔ آنٹی ... نے کہا کہ ان کے مرنے کے بعد یہ کوٹ اس پروفیسر کو عطیہ کے طور پر بھیج دیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے ایک کاغذ مانگا اور اس پر ایک تحریر لکھ کر میرے حوالے کی اس تاکید کے ساتھ کہ یہ تحریر بھی کوٹ کے ہمراہ پروفیسر کے پتے پر بھیج دی جائے۔''

''تم نے پروفیسر کا پتا کیسے معلوم کیا؟''

جین بولی۔ ''مجھے یہ جاننے میں تھوڑا سا وقت لگا کہ آنٹی ٹی وی پر کون سا پروگرام دیکھ رہی تھیں پھر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ انہوں نے یقیناً دوپہر کی خبروں میں اس پروفیسر کو سنا ہوگا چنانچہ میں نے تینوں ٹی وی اسٹیشنز فون کر کے معلوم کیا کہ اس روز وہ کس کا انٹرویو کر رہے تھے اور اس طرح مجھے پروفیسر کا پتا معلوم ہوگیا۔''

''بہت خوب۔'' لزی بولی۔ ''بائی دا وے، میں ہی لزی اسٹیوارٹ ہوں۔''

''اوہ میرے خدا!'' جین... حیرت سے بولی۔ ''تو یہ تم ہو۔ کیا تمہیں وہ کوٹ مل گیا؟ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' لزی بولی۔ ''وہ کوٹ مجھے مل گیا ہے اور میں صرف یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس کا بھیجنے والا کون ہے تاکہ اس سے مل کر اس کوٹ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرسکوں کیونکہ میں اسے نمائش میں رکھنا چاہتی ہوں، مجھے حیرت ہے کہ بھیجنے والے نے اسے ڈلیوری ٹرک کے پاس کیوں رکھ دیا۔''

''کیا؟'' پیٹریشیا اپنی بیٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری آنٹی نے یہ کوٹ پروفیسر کو بھیجنے کے لیے کہا تھا اور...''

''میں ڈر گئی تھی۔'' جین بولی۔ ''آنٹی نے جس انداز میں یہ کوٹ بھیجنے کی بات کی تھی، اس سے مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کہیں یہ کوٹ چوری کا تو نہیں یا پھر اس کے ساتھ کوئی اور مسئلہ ہے۔ اسی لیے میں نے باکس پر بھیجنے والے کا نام اور پتا نہیں لکھا اگر میں ڈلیوری کمپنی کے کاؤنٹر پر جاتی تو وہ اس کے بغیر باکس قبول نہ کرتے لہٰذا میں نے اسے ٹرک کے برابر میں رکھ دیا اور ساتھ ہی اس کی فیس بھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ یہ باکس مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیں گے۔''

''انہوں نے ایسا ہی کیا۔'' لزی بولی۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ کیا تم مجھے اس عورت کے بارے میں بتا سکتی ہو جس نے تمہاری آنٹی کو یہ کوٹ دیا تھا؟''

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے پھر اتنی چھان بین کیوں کر رہی ہو؟'' جین بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' لزی نے کہا۔ ''میں صرف یہ چاہ رہی تھی کہ جب ہم اس کوٹ کو نمائش میں رکھیں تو ہمارے پاس اس کی مالکن کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔''

''ممکن ہے کہ وہ عورت یہ نہ چاہتی ہو کہ لوگ اس کے بارے میں جان سکیں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' پیٹریشیا نے کہا۔ ''کیا آنٹی نے تمہیں اس کوٹ کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔''

''نہیں لیکن ان کا رویہ کچھ عجیب سا تھا جیسے وہ اس کوٹ کو اپنے پاس رکھنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔''

پیٹریشیا نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی۔ ''سوری، مجھے کام پر جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھی اب چلوں گی۔'' لزی نے کہا۔ ''تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔''

اس نے اپنی کار تک پہنچنے کے لیے نصف فاصلہ طے کیا ہوگا کہ جین نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''پیرس۔'' پھر وہ دروازے سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ عورت شاید پیرس جا چکی ہے جس نے آنٹی کو یہ کوٹ دیا تھا۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' لزی نے پوچھا۔

''میں نے آنٹی کی فوٹو البم دیکھی تھی۔ اس میں ایک پرانے اخبار کا تراشہ رکھا ہوا تھا۔''

''کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔'' لزی بولی۔

جین تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی اور چند منٹوں بعد واپس آگئی۔ اس نے ایک اخبار کا تراشہ لزی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ میں نے پوری البم دیکھ ڈالی۔ اس میں ایسی کوئی تصویر نہیں جس میں کسی نے یہ کوٹ پہن رکھا ہو۔ زیادہ تر تصویریں سیاہ فام لوگوں کی ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس مضمون سے کچھ معلوم ہو جائے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' لزی بولی۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہ اخبار اپنے ہمراہ لے جاؤں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس کی کاپی کروانے کے بعد تمہیں واپس کردوں گی۔''

''تم اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔'' جین نے کہا پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پلاسٹک بیگ کو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ میں یہ بھی تمہیں دے دوں۔ ویسے تو انہیں کوٹ کے ساتھ ہی بھیج دینا چاہیے تھا۔''

لزی نے بیگ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''اونچی ایڑی کے جوتے۔'' جین نے کہا۔ ''یہ پیروں میں بڑے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد میں انہیں پہن سکوں گی۔ ان میں سے ایک جوتے کی ایڑی پر دھبا ہے۔ میں نے سوچا کہ جب میں یہ جوتے پہننے کے قابل ہو جاؤں گی تو کسی جوتے بنانے والے سے یہ دھبا صاف کروا دوں گی۔''

لزی بولی۔ ''تمہاری آنٹی نیز چاہتی تھیں کہ تم یہ دونوں چیزیں مجھے بھیجو۔''

جین سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہ جوتے اپنے پاس نہیں رکھنے چاہیے تھے۔ آئی ایم سوری۔''

''کوئی بات نہیں۔'' لزی نے کہا۔ ''جوتے دینے کا شکریہ۔''

اپنے دفتر پہنچ کر لزی نے وہ باکس نکالا جس میں کوٹ رکھا ہوا تھا اور اسے اپنی کرسی کی پشت پر لٹکا دیا اس کے ساتھ ہی اس نے فرش پر وہ جوتے بھی رکھ دیے اور تھوڑا سا جھک کر دونوں چیزوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد اس نے... اخبار کا تراشہ نکالا جو جین نے اسے دیا تھا اور اسے پڑھنے لگی۔ اس کے مطابق نیز جس گھر میں کام کرتی تھی۔ اس کی مالکن کا نام رینا سی بروک تھا اور وہ اپنے سوتیلے باپ کے انتقال کے بعد پیرس چلی گئی تھی۔

لزی نے اخبار کا تراشہ میز پر رکھا اور سر جھکا کر سیدھے پاؤں کے جوتے پر لگے ہوئے دھبے کو دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا کہ یہ دھبا کس چیز کا ہو سکتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس نے وہ مضمون دوبارہ پڑھا۔ رینا سی بروک کا سوتیلا باپ سیڑھیوں سے گر کر مر گیا تھا۔

''اوہ، میرے خدا۔'' وہ بہ آواز بلند بولی۔

اسے یاد آیا کہ کوٹ کے اندر کی سلائی ایک جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی جسے بڑی نفاست سے دوبارہ سی دیا گیا تھا بظاہر یہی لگتا تھا کہ پرانا ہونے کے سبب کوٹ کا اندرونی حصہ اس جگہ سے پھٹ گیا ہے لیکن اس کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لزی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کلاڈیا جا چکی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اپنا اسکرٹ اتار کر کوٹ پہن لیا۔ اس میں سے ابھی تک اس پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی جو کبھی رینا سی بروک نے استعمال کیا ہوگا وہ کوٹ پہن کر کمرے کا چکر لگانے لگی۔ تب اسے محسوس ہوا کہ کہنی کے پاس کوئی چیز اسے چبھ رہی ہے۔ اس نے کوٹ اتار کر دوبارہ کرسی کی پشت پر لٹکا دیا پھر اس نے دروازہ کھول کر قینچی نکالی اور بہ آسانی اس جگہ کے ٹانکے کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس میں ایک چھوٹا سے سلنڈر رکھا ہوا تھا جس کا سرا ربر کے ڈھکنے سے بند تھا۔ اس نے وہ ڈھکنا اٹھایا تو اس میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا۔

''پیاری نیز، میں پیرس پہنچ گئی ہوں اور خیریت سے ہوں...''

تین دن بعد لزی اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رچرڈ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بولا۔

''لیبارٹری کی رپورٹ آگئی ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا۔''

''یعنی اس کے جوتے پر جو دھبا ہے وہ خون...''

''انسانی خون۔'' رچرڈ نے صحیح کرتے ہوئے کہا۔

''گویا یہ ممکن ہے کہ رینا سی بروک کے سوتیلے باپ کا سیڑھیوں سے گرنا محض ایک حادثہ نہیں تھا۔''

''میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف اس خون کے دھبے کی بنیاد پر اس کی لاش قبر سے نہیں نکالی جاسکتی۔''

''لیکن وہ خط۔'' لزی نے دل میں سوچا۔ ابھی تک اس نے رچرڈ کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

''اگر لاش قبر سے نکالی جائے۔'' وہ بولی۔ ''تو شاید میڈیکل ایگزامنر کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ وہ جان سکتا ہے کہ لاش کو لگنے والی چوٹیں کسی فاؤل پلے کا نتیجہ ہیں۔''

''شاید۔ اگر یہ چوٹیں جوتے کی ایڑی کے سبب ہوئی ہوں۔''

لزی نے اپنی میز کی دراز پر نظر ڈالی جس میں... اخبار کا تراشہ رکھا ہوا تھا جو جین نے اسے دیا تھا۔ لزی اس مضمون کو اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ وہ تقریباً اسے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ مارچ 1939ء میں رینا سی بروک کے دوستوں نے اسے فرانس جانے سے پہلے ایک الوداعی پارٹی دی تھی۔ رینا نے پیرس میں ہی تعلیم حاصل کی تھی اور اب وہ اپنے باپ کی المناک موت کے بعد وہاں غیر معینہ عرصے کے لیے رہنے جارہی تھی۔

رینا سی بروک دوسری جنگِ عظیم کے دوران فرانس میں انتقال کرگئی۔ لزی نے رچرڈ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''پیٹریشیا فریزر نے آج مجھے فون پر بتایا کہ اسے کسی وکیل کا فون موصول ہوا ہے جس کا کہنا ہے کہ اس کی آنٹی نے جین کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔''

''ٹرسٹ فنڈ؟'' رچرڈ نے تعجب سے کہا۔ ''اس کے پاس یہ ٹرسٹ قائم کرنے کے لیے پیسا کہاں سے آیا؟''

''1939ء میں رینا سی بروک نے یورپ جانے سے پہلے اپنے وکیل کو سابق ملازمہ نیز کنگ کے نام سے ایک اکاؤنٹ کھولنے کی ہدایت کی تھی اور اس میں دس ہزار ڈالرز بھی جمع کروائے تھے۔''

''اس زمانے کے لحاظ سے تو یہ ایک بڑی رقم تھی۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ہاں، لیکن نیز نے کبھی اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگایا اور اس میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا۔ تین سال پہلے اس نے ایک وکیل سے رابطہ کرکے کہا کہ اس رقم سے ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کیا جائے جو جین کی تعلیم میں استعمال ہو۔'' لزی نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''پیٹریشیا نے مجھے فون کیا کیونکہ وہ اس بات پر حیران تھی کہ رینا سی بروک نے اس کی آنٹی کو دس ہزار ڈالرز کیوں دیے تھے۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''یہی کہ میری سمجھ میں ایسی کوئی وجہ نہیں آتی کہ انہیں یہ ٹرسٹ فنڈ کیوں نہیں قبول کرنا چاہیے۔''

''اب تم اس سے کیا کہوگی؟''

''کچھ نہیں۔'' لزی نے جواب دیا۔ ''میں اب بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انہیں یہ رقم کیوں نہیں قبول کرنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ رینا سی بروک نے اپنی اونچی ایڑی کے جوتے کو کس مقصد کے لیے استعمال کیا، اس کا سوتیلا باپ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنی فیکٹری میں کام کرنے والے لوگوں کی زندگی اجیرن کررکھی تھی۔ اس نے ایک امیر بیوہ سے شادی کی جس کی بیٹی کو شبہ تھا کہ اس نے فیکٹری ملازمین کی طرح اس کی ماں کی زندگی بھی عذاب بنادی ہوگی اور ماں کے مرنے کے بعد وہ اس پر بھی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''تمہارے خیال میں اس کے سیڑھیوں سے گرنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟'' رچرڈ نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی کہ جب وہ سیڑھیوں سے نیچے گرا تو اس وقت کیا کررہا تھا۔ فی الحال اتنا ہی سمجھ میں آرہا ہے کہ رینا کے جوتے پر خون کا دھبا شاید اس وجہ سے لگ گیا ہو جب وہ اپنے سوتیلے باپ کی مدد کے لیے آگئی ہو تاہم ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ اسی کے خون کا دھبا ہے۔ بظاہر یہ ایک حادثہ ہی لگتا ہے۔''

رچرڈ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس نے بہت زیادہ پی لی تھی اس لیے توازن برقرار نہ رکھ سکا۔''

''ہاں اسے اچھی برانڈی اور اچھے سگار کا شوق تھا۔''

''اب تم کیا سوچ رہی ہو؟'' رچرڈ نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارے مشورے پر عمل کرنا ہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ رینا نے اپنی ہاؤس کیپر کو اتنی بڑی رقم کیوں دی تاہم اب اسے ایک ذہین طالبہ کی

تعلیم کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ میں پیٹریشیا اور جین دونوں کو بھی مشورہ دوں گی کہ وہ اس فنڈ کو قبول کر لیں۔"

"اور اس کوٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں نہیں سمجھتی کہ فوری طور پر اس کی نمائش کرنا ممکن ہے۔" وہ اکتاہٹ کے عالم میں بولی۔ "اس کانفرنس کے بعد میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" رچرڈ بولا۔ "چلو گھر چلتے ہیں۔"

لزی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "اچھا خیال ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وہ اخباری تراشہ میز کی دراز میں رکھ دیا۔ وہ اس خط کو اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اسے تقریباً زبانی یاد ہو گیا تھا۔

"پیاری نیز! میں پیرس میں بہت سکون سے ہوں گو کہ تم نے زبان سے نہیں کہا لیکن میں جانتی ہوں کہ تم خوف زدہ ہو کہ شاید ہم دونوں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد میں سکون سے نہ رہ سکوں لیکن مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ اس نے میری ماں کو مار ڈالا اور اگر میں اس کے بچے کی ماں بن جاتی تو میری زندگی برباد ہو جاتی۔ میں تمہیں بھی نہیں بھولوں گی۔ یہاں بہت خوش ہوں۔ اپنا خیال رکھو اور میرے بارے میں پریشان مت ہونا۔"

لزی نے سوچا کہ اسے یہ خط رچرڈ کو دکھا دینا چاہیے لیکن ابھی نہیں۔ وہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور اگر وہ یہ معاملہ پولیس کے علم میں لے آتا تو شاید وہ اس ٹرسٹ فنڈ کو منجمد کر دیتے اور اس طرح جین ایک بڑی رقم سے محروم ہو جاتی۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل۔ ریناسی بروک اور نیز کنگ، دونوں ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ دنیا کی کوئی عدالت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اب ان کا فیصلہ بڑی عدالت میں ہوگا۔

رچرڈ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لزی نے اس کی عقابی نظروں سے بچنے کے لیے مسکراہٹ کا سہارا لیا اور بولی۔

"کیا تم نے سوچا تھا کہ اس کوٹ کے ذریعے میں کہاں تک پہنچ سکتی ہوں۔"

رچرڈ نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں، بعض اوقات زیادہ کریدنے سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچ سکتا ہے لہٰذا میں بھی اس کیس کو یہیں ختم کر کے دستبردار ہو رہی ہوں۔"

"کیا واقعی؟" رچرڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، میں نے یہی سوچا ہے۔"

☆☆☆

حقیقت بھی یہی تھی کہ اب لزی کے پاس آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ریناسی بروک کا سوتیلا باپ کسی حادثے کا شکار ہوا یا اسے دھکا دے کر سیڑھیوں سے گرایا گیا، یہ جاننا لزی کا کام نہیں تھا۔ نیز کنگ نے جب اپنی بھتیجی سے کہا کہ وہ یہ کوٹ اور جوتے اس پروفیسر کو بھیج دے جس کا انٹرویو اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ شاید اعتراف کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ موت کے منہ میں جانے سے پہلے اپنا یہ راز کسی کو بتانا چاہ رہی ہو لیکن اگر وہ اعتراف کرنا چاہ رہی تھی تب بھی اس نے کسی پر اعتماد کرنے سے گریز کیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ کوٹ اس کے کسی رشتے دار کے ہاتھ لگ جائے اور وہ ریناسی بروک کا خط پڑھ لے۔

لزی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیز نے کوٹ بھیجنے کے لیے اس کا انتخاب کیوں کیا۔ اگر اسے اپنے جرم کا اعتراف کرنا ہی تھا تو وہ یہ کوٹ کسی پادری کو بھی بھیج سکتی تھی۔ اسے لزی سے کیا توقع تھی کہ وہ اس راز سے واقف ہو جانے کے بعد خاموش رہے گی اور کوٹ کو بیچ کر اس سے ملنے والی رقم کسی فلاحی کام میں خرچ کر دے گی لیکن خون آلود جوتا بھیجنے کا کیا مقصد تھا۔ کیا جوتے کی ایڑی پر خون کا دھبا اسے نظر نہیں آیا تھا اور اس نے یہ قیمتی جوتے بھی لزی کے انسٹی ٹیوٹ کو عطیہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب دینے والی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

لزی کی سوچ بار بار ایک ہی نکتے پر مرکوز ہو جاتی۔ آیا وہ اس معاملے کو آگے بڑھائے یا یہیں ختم کر دے۔ اگر وہ اس حادثے کی تحقیقات کروانا چاہتی تو اس کے لیے اسے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں، اس کا شوہر رچرڈ خود بھی ایک سراغ رساں فرم میں پارٹنر تھا لیکن اس کا پارٹنر یہ پسند نہ کرتا کہ وہ بلا معاوضہ کوئی کام کرے اور لزی مالی طور پر اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ رچرڈ کی فرم کو بھاری معاوضہ ادا کر کے اس کی خدمات حاصل کر سکے۔ اس نے دراز کی چابی اپنے شولڈر بیگ میں ڈالی اور اس کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔ "میری طرف سے کیس ختم ہو گیا۔ چلو گھر چلتے ہیں۔"

نہاں اور عیاں حقائق کے شانہ بشانہ سفر کرتی رشتوں کی تلاش و جستجو

نیت کا پھل

سیرینا راض

حقیقت تک رسائی دراصل خود شناسی کے راستے سے ہوتی ہے... یہ راستے پیچیدہ ہی نہیں مشکل ترین بھی ہوتے ہیں... اسے اپنی صلاحیتوں اور نیک نیتی پر بھروسا اور کامل اعتماد تھا... قدم قدم پر اسے ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا... مگر وہ مایوس کن صورتِ حال کے باوجود ایک جگہ تھما نہیں ... بلکہ اس کا مقرر کردہ ہدف ہنوز مرکزِ نگاہ بنا رہا۔
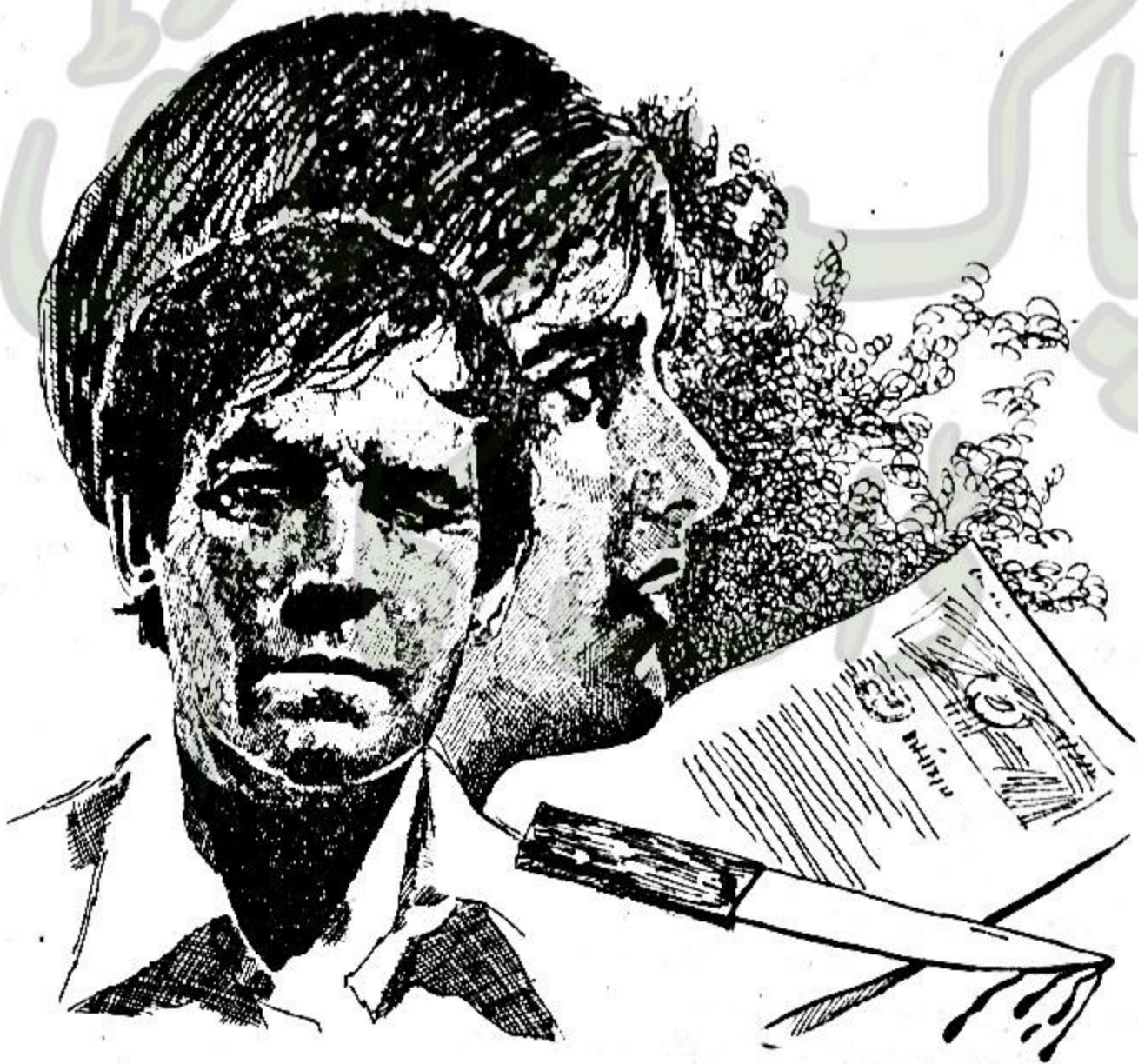
وہ موسم بہار کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور موسم سرما کی شدت کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ میں گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس روز میں نے اپنی بیٹی کو رات کے کھانے پر بلایا تھا جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس دعوت کے لیے خاص اہتمام کیا تھا اور اس کی پسند کے کھانے تیار کروائے تھے۔

مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ ڈنر کر کے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اچانک اس نے ایک سوال کر کے مجھے چونکنے پر مجبور

کردیا۔

''ڈیڈی، آپ نے کبھی اپنے والد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔''

''اچھا، کیا واقعی؟'' میں نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا لیکن دل میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت سام کو میرے باپ کا خیال کیسے آگیا۔

''دادی کبھی کبھی ان کا تذکرہ کیا کرتی ہیں اور ہوٹل میں آنے والے لوگ بھی ان کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ موضوع کبھی زیرِ بحث نہیں آیا۔''

''آپ کو ان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ بہرحال وہ آپ کے باپ تھے اور ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی ہو اور دادی کو چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔''

''ہاں، اس وقت میں نوعمر تھا۔ وہ مجھے بیس بال کا میچ دکھانے لے جاتے تھے پھر ان کا انتقال ہوگیا۔ اس بات کو بھی کافی عرصہ ہوگیا اور میں ان کے بارے میں نہیں سوچتا۔''

''ان کے انتقال کے وقت آپ کی کیا عمر تھی؟''

''انیس سال۔''

''اور ان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا تھا؟''

''ہاں یہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا لیکن میں یہاں نہیں تھا اور نہ ہی میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھا۔''

''آپ اس وقت گریجویشن کورس کے دوسرے سال میں تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہوٹل چلانے میں دادی کی مدد کرنے یہاں آگئے۔''

''ہاں وہ ہوٹل انہی دنوں شروع ہوا تھا اور مما کے مالی مستقبل کا انحصار اسی پر تھا اگر وہ کاروبار ناکام ہوجاتا تو وہ اسے برداشت نہ کرپاتیں ویسے ہی شوہر کی موت ان کے لیے بہت بڑا سانحہ تھی۔''

''مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے کیا کرتے تھے؟''

''انہوں نے بڑھئی کے طور پر کام شروع کیا پھر مختلف پیشے اختیار کیے۔ بعد میں انہوں نے دوسرے تعمیراتی کام بھی کرنا شروع کردیے۔''

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا سوال کرے جس کے جواب میں مجھے اپنے باپ کی حقیقت بیان کرنی پڑ جائے چنانچہ میں نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنا شروع کردی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اب میرے آرام کا وقت ہورہا ہے۔ اسے چلے جانا چاہیے، اس سے پہلے کہ وہ میرا اشارہ سمجھتی، دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہولسٹر سے پستول نکال کر میرے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ میری بیٹی ایک پولیس آفیسر ہے اور ہمیشہ اپنے یونیفارم میں گھر سے باہر نکلتی ہے۔

دروازے پر کرٹس نیلسن کھڑا تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایک کلائنٹ کے طور پر میرے پاس آیا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ ایک متاثرہ شخص کی صورت میں میرے پاس آیا۔ اس کے بعد بھی وہ دوسرے لوگوں کو میرے پاس لاتا رہا جنہیں میری مدد کی ضرورت تھی لیکن اس وقت اس کی آمد میرے لیے تعجب خیز تھی کیونکہ عام طور پر میں ملاقاتیوں سے دن کے اوقات میں ملتا تھا۔

''ہیلو البرٹ، کیسے ہو؟'' اس نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''جانتا ہوں کہ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی لیکن یہ معاملہ بہت اہم ہے۔''

میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ میرے پیچھے چلتا ہوا دفتر میں داخل ہوگیا جہاں سام ریوالور لیے چوکنا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو آفیسر سام۔''

''میں بس جانے ہی والی تھی مسٹر...؟''

سام کی یادداشت اتنی بری نہیں اور وہ اس کا اصل نام بھی جانتی تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ وقفے وقفے سے اپنا نام بدلتا رہتا ہے۔ اس بار اس نے اپنا نام فشر بتایا۔ میں نے مذاقاً پوچھا۔ ''بوبی یا کیری؟''

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بوبی فشر..... مجھے تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس کام کا تمہیں معقول معاوضہ ملے گا۔''

''تم جانتے ہو کہ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور اسی کی آمدنی سے میرے گھر کا کچن چلتا ہے اس لیے معاوضے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ البتہ تمہاری بات سننے کے کوئی پیسے نہیں لوں گا۔ تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں اس کے بعد مجھے برتن دھوکر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا ہے۔''

سام بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔''

''اگر تم بھی میری بات سن لو۔'' بوبی بولا۔ ''تو میں تمہارا شکرگزار رہوں گا۔''

''اگر اس کا تعلق پولیس سے ہے تو تم پولیس اسٹیشن جاؤ

یا انہیں فون کرو۔ ویسے بھی میں اپنے باپ کے کام میں مداخلت نہیں کرتی۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی میز کی دراز سے ایک نوٹ بک نکالی اور بولا۔ ''شروع ہو جاؤ۔''

''میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ شاید تم نے بتایا تھا کہ وہ کافی عرصے سے بیمار تھی۔''

''وہ کئی سالوں سے بیمار تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس اذیت سے نجات مل گئی۔'' وہ تقریباً روہانسا ہو گیا۔

''اس کا انتقال کب ہوا؟''

''دس روز قبل لیکن البرٹ، میرے یہاں آنے کی یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اپنے بڑے بھائی کے لیے پریشان ہوں، وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ تم اکلوتے ہو۔''

''مجھے بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔'' بوبی نے کہا۔ ''اور نہ ہی جانتا تھا کہ اس کا کوئی وجود ہے۔ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔''

''تمہاری ماں کا ایک بیٹا اور بھی تھا اور اس نے یہ بات تمہیں کبھی نہیں بتائی؟''

''مجھے اس کا پتا مما کی وصیت اور دیگر کاغذات سے چلا۔ اب میں ہی اس کی جائداد کا مختار ہوں۔''

''یقیناً یہ اطلاع تمہارے لیے حیرت کا باعث ہو گی؟''

''ایسا لگتا ہے کہ مما نے چودہ برس کی عمر میں فٹز کو جنم دیا اور اس کے باپ کے والدین نے اس کی پرورش کی۔''

میں نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا سوتیلا بھائی، دادا، دادی کے گھر میں پرورش پاتا رہا اور تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے؟''

''وہ یعنی مچلو فیملی کے لوگ مما کو الزام دیتے رہے اور مما کے خاندان والے ان کے بیٹے ممون کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کبھی ان کے درمیان بات چیت ہوئی ہو۔''

''فٹز۔'' میں نے زیرِ لب دہراتے ہوئے کہا۔ ''کیا پیدائش کے وقت اس کا یہی نام رکھا گیا تھا؟''

''ہاں، اس کا پورا نام فٹز گیرالڈ مچل ہے اور میں اس سمجھتا ہوں کہ بعد میں اس نے مما سے رابطہ استوار کر لیا تھا اور وہ ایک مرتبہ سرائے میں بھی آیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے پہلے اس نے کتنی بار مما سے رابطہ کیا ہو گا لیکن سرائے والوں نے بتایا ہے کہ اس نے چند مرتبہ مما کو فون بھی کیا تھا۔''

''تمہاری ماں سانتا کلاز میں رہتی تھی اور اب تمہارا سوتیلا بھائی گم ہو گیا ہے۔ تم اسی وجہ سے مجھے اس معاملے میں شامل کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں، مجھے وصیت کے سلسلے میں اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس نے سرائے والوں کو جو نمبر دیا تھا، اس پر بات نہیں ہو پا رہی۔ جب انہوں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ مما کا انتقال ہو گیا ہے تو کسی عورت نے فون اٹھایا اور کہا کہ وہ نہیں جانتی کہ فٹز لاپتا ہے اور یہ کہ اسے مزید پریشان نہیں کیا جائے۔ وہ اس کی نگہبان نہیں تھی۔''

''کیا سرائے والوں کے پاس اس جگہ کا پتا ہے جہاں کا یہ فون نمبر ہے؟''

''ہاں، وہ جگہ ڈیلٹی میں ہے۔''

انڈیانا پولس کے شمال مغرب میں یہ چھوٹا سا قصبہ ہے پھر میں نے بوبی سے پوچھا۔ ''کیا تم نے عورت سے پوچھا تھا کہ فٹز کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔''

''تم نے اسے کب فون کیا تھا؟''

''گزشتہ روز۔''

''گویا تم ابھی تک ڈیلٹی نہیں گئے؟''

''میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کے علاوہ مجھے مما کی جائداد کے معاملات بھی دیکھنا پڑ رہے ہیں۔''

''تمہارے پاس فٹز کو ڈھونڈنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس لیے تم یہ کام مجھ سے لینا چاہ رہے ہو؟''

''اس سے رابطہ بہت ضروری ہے کیونکہ وصیت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔''

''گویا تمہیں نہیں بلکہ جاگیر کو میری خدمات درکار ہیں۔ کیا وہ مجھے منہ مانگا معاوضہ دے سکیں گے؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میری ماں نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی ہے۔''

''اگر میں نے تمہارے سوتیلے بھائی کو تلاش کر لیا تو اس سے کیا کہوں؟''

''اسے بتا دینا کہ ہماری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور اس نے پتا لے لینا تاکہ میں اسے جائداد کے مختار کی حیثیت سے خط لکھ سکوں۔''

''تم اسے اپنی ماں کی تدفین کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے؟''

''تدفین تو تین روز پہلے ہو چکی۔''

''اور تم نے گزشتہ روز تک اسے فون نہیں کیا؟''

''سرائے والوں نے اس عورت کو تدفین کے بارے میں پیغام دے دیا تھا۔''

''یہ بتاؤ کہ تمہاری ماں کی وصیت میں اس کا کتنا حصہ ہے؟''

''وہ اس کی جائداد اور اثاثوں میں آدھے کا مالک ہے۔''

''اوہ میرے خدا..... وہ تو پلک جھپکتے ہی لاکھوں کا آدمی بن جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ وصیت کس تاریخ کو لکھی گئی تھی؟''

''ماں نے تقریباً ایک ماہ پہلے نئی وصیت لکھی تھی۔''

''اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟''

''میں اس وصیت کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس نے وہی لکھا جو وہ چاہتی تھی۔''

''اگر فرٹز مر جائے تو اس کے حصے کی رقم کا کیا ہوگا؟'' میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''وہ کیوں مرے گا؟''

''عام طور پر لاپتا افراد مردہ حالت میں ملتے ہیں۔''

''اگر وہ ماں کے انتقال سے پہلے مر گیا ہو تو اس کا حصہ بھی مجھے مل جائے گا۔''

''کیا تم نے اپنے سوتیلے بھائی کو قتل کیا ہے؟'' میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

اس کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے نہیں رکا حالانکہ اس نے پندرہ منٹ سے زیادہ وقت لے لیا تھا لیکن میں صبر اور سکون سے اسے برداشت کرتا رہا کیونکہ اس نے ایک بڑی رقم کا چیک میرے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے برتن دھوئے اور سوچنے لگا کہ اس نئے کیس کی شروعات کیسے کی جائے۔ پہلے میں نے اس عورت کو فون کرنے کا سوچا لیکن وہ پہلے ہی فرٹز کے بارے میں کسی سوال کا جواب دینے سے بیزاری ظاہر کر چکی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہ کرے اس لیے میں نے اس سے ملنے اور روبرو بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ساتھ ہی میں نے انٹرنیٹ پر فرٹز گیرالڈ مچل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہاں اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی ڈیلفی کے علاقے میں فون نمبرز کی فہرست میں اس کا نام نظر نہیں آیا۔ وہ کسی کلب کا ممبر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے نام کا فیس بک یا لنکڈ اِن اکاؤنٹ تھا۔ میں نے احتیاطاً ڈیلفی پولیس ڈپارٹمنٹ کے ایسے سات افسروں کے نام اور پتے نوٹ کر لیے جو ریاستی قانون پر عمل درآمد کے ذمے دار تھے اور عام لوگوں کو اسلحہ کے لائسنس جاری کیا کرتے تھے۔

انٹرنیٹ سے ڈیلفی کے بارے میں کچھ معلومات ضرور حاصل ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ اس قصبے کی آبادی کل تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ تقریباً دو سو سال پرانا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑی مل تھی جس میں مکئی کے دانے رکھنے کے لیے کریٹ تیار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں انیسویں صدی کا تعمیر شدہ ایک اوپیرا ہاؤس بھی تھا جس نے اپنے عروج کے زمانے میں نامور فنکاروں کی میزبانی کی تھی۔

دوسری صبح میں ڈیلفی کے لیے روانہ ہو گیا۔ موسم خوش گوار تھا اور راستے میں جا بجا حسین نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہوا سبک خرامی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور اس طرح نوے منٹ کا راستہ دو گھنٹے میں طے کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت کسی خستہ حال مکان میں رہتی ہوگی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہاں پچاس کی دہائی میں بنے ہوئے مکانوں کی قطار تھی۔ اس عورت نے دروازہ کھولا اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''تم کون ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟''

''معاف کرنا۔'' میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن میں انڈیانا پولس سے آیا ہوں اور فرٹز مچل کی ماں کی چھوڑی ہوئی جائداد کے لیے کام کر رہا ہوں۔ مسٹر مچل نے...... سرائے کے لوگوں کو رابطہ کے لیے یہی پتا دیا تھا۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کئی ہفتوں سے فرٹز کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہی میں اس کی نگراں ہوں۔''

وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ میں جلدی سے بولا۔ ''دو روز قبل تمہاری جس شخص سے بات ہوئی، وہ اس جائداد کا مختار ہے اور اس نے فرٹز کو تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ برائے کرم مجھے دو منٹ دے دو ہمیں مچل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اس سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔''

''لیکن میں تمہیں نہیں جانتی۔ پہلے اپنا تعارف

گرواؤ۔"

میں نے اپنا لائسنس نکال کر اسے پکڑا دیا۔ وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی پھر لائسنس واپس کر کے مجھے لونگ روم میں لے گئی جسے بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود فرش پر پڑے ہوئے کشن پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟"

"کلارا جونس۔"

"کیا میں تمہیں صرف کلارا کہہ کر پکاروں یا تم مسز جیونس کہلوانا پسند کرتی ہو؟"

"تمہیں جو مناسب لگے اسی نام سے پکارو۔"

"تم نے کہا کہ فٹز کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں لیکن میرے لیے اس کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کی ماں نے مرنے سے پہلے وصیت میں اس کا نام بھی شامل کیا ہے۔"

"یعنی وہ بھی اس جائداد میں حصے دار ہے؟"

"میں نے وصیت نہیں دیکھی اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو جائداد کے مختار نے اسے تلاش کرنے پر مامور کیا ہے۔ کیا وہ یہیں رہتا ہے؟"

"پہلے رہتا تھا لیکن مجھے کمرے کی ضرورت تھی اس لیے وہ یہاں سے چلا گیا۔ یہ تقریباً تین مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"اب وہ کہاں رہتا ہے؟"

"اس نے مجھے اپنا پتا نہیں دیا۔"

"کیا اس کی کوئی ملازمت ہے؟"

"وہ ایک ہنر مند شخص ہے اور سارے کام کر لیتا ہے۔"

"کیا تمہارے پاس اس کا کوئی سیل نمبر ہے؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے جانے کے بعد وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنی ڈاک لینے آتا ہے۔"

"لیکن تم نے دو دن پہلے فون کرنے والے شخص کو بتایا تھا کہ مچل لاپتا ہے۔"

"کیونکہ تین ہفتے سے وہ یہاں نہیں آیا جبکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو دی تاکہ وہ اس کا نام لاپتا افراد کی فہرست میں شامل کر لیتی۔"

"فٹز کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ میں اس کی گم شدگی کی اطلاع پولیس کو دوں۔"

"کیوں؟"

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ اب تم جا سکتے ہو مسٹر البرٹ۔"

"کیا تم ایسے لوگوں کے بارے میں جانتی ہو جو اس کے دوست ہوں۔ انہیں شاید معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے یا کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ ان جگہوں کے بارے میں بتاؤ جہاں وہ کھانے پینے جایا کرتا تھا؟"

"لوگن اسپورٹ میں ڈینزل کے نام سے ایک بار ہے وہ وہاں اپنے چند دوستوں سے ملنے جایا کرتا تھا جو فوج میں تھے۔"

"کیا وہ خود بھی فوجی خدمت انجام دے چکا ہے؟"

"ہاں وہ دو مرتبہ افغانستان گیا تھا۔"

"کیا تمہارے پاس اس کے لیے کوئی میل یا پیغام آیا ہے؟"

"تین ہفتے پہلے ایک شخص نے اسے پیغام بھیجا تھا۔"

"کیا تم مجھے اس کا نمبر دے سکتی ہو؟"

"اس نے کہا تھا کہ فٹز کے پاس اس کا نمبر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ فٹز اسے فون کرے۔ اس نے اپنا نام پیر روز بتایا تھا۔ وہ ڈیر کریک کے قریب رہتا ہے۔ مجھے اس کا پتا یاد نہیں رہا لیکن تم وہاں جا کر لوگوں سے بات کرو گے تو وہ بتا دیں گے۔"

"تم روز کو جانتی ہو؟"

"وہ ایک مرتبہ فٹز کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی فوج میں رہ چکا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا پھر اچانک ہی میری زبان سے ایک سوال پھسل پڑا۔ "فٹز کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

میرا خیال تھا کہ وہ اس کا کوئی سابق دوست ہوگا جو کچھ عرصے اس کے ساتھ رہا اور پھر اس نے اسے جانے کے لیے کہہ دیا لیکن وہ بولی۔ "فٹز مچل میرا سوتیلا بھائی ہے۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور میں نے بے ساختہ کہا۔ "اس کا ایک سوتیلا بھائی بوبی فشر ہے جس نے مجھے اسے تلاش کرنے کے لیے بھیجا ہے اور اب تم بھی اس سے رشتے داری جتا رہی ہو؟"

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ بوبی فشر سے اس کا کوئی براہِ راست رشتہ نہیں۔ فٹز اور کلارا کا باپ ایک تھا جبکہ مائیں الگ الگ تھیں۔ ان کا باپ مسن مچل ایک شرابی جواری اور غیر ذمے دار شخص تھا۔ اس نے فٹز کو دادا، دادی کے پاس چھوڑا

اور خود اپنی ذمے داریوں سے بچنے کے لیے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ کلارا اس سے کئی برس چھوٹی تھی۔ اس کی پرورش ماں نے کی۔ فنٹز پہلی بار اس علاقے میں اس وقت آیا جب وہ چھٹیوں پر تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ یہیں کہیں قریب میں موجود ہے تاہم وہ ٹمن کو ڈھونڈنے میں اس کی کوئی مدد نہ کرسکی۔

''کیا ٹمن بھی لاپتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہی سمجھتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''صرف فنٹز ہی اسے ڈھونڈنا چاہ رہا تھا۔''

''کیا تمہارے دادا، دادی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟''

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ٹمن، فنٹز اور میری ماں سب ان سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے فنٹز کی پرورش صرف اس لیے کی کہ دنیا اسے ٹمن کی ناجائز اولاد کے نام سے جانے اور وہ اسے اذیت پہنچاتے رہیں۔ جب ٹمن فوج میں گیا تو فنٹز کو محسوس ہوا کہ اس کا باپ صرف اسی وجہ سے سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔''

''کیا تمہارے پاس فنٹز کی کوئی تصویر ہے؟''

اس نے اپنے سر پر انگلی رکھی اور بولی۔ ''یہاں۔''

میں اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولا۔ ''اگر فنٹز تمہیں مل جائے تو کیا تم اسے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ سکتی ہو؟''

''معاف کرنا، اس سے زیادہ تمہاری مدد نہیں کرسکتی۔''

''میرا خیال ہے کہ شاید فنٹز کی ماں نے اسے کبھی کچھ نہیں بتایا کہ اس کا... ایک سوتیلا بھائی بھی ہے اور نہ ہی یہ بات اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو بتائی۔ اسے بھی جائداد کا مختار بننے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا سوتیلا بھائی بھی ہے۔''

''اگر فنٹز کو یہ بات معلوم تھی تو اس نے مجھے بھی نہیں بتائی۔'' اس عورت نے بے رخی سے کہا۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں ایسی کئی جگہیں تھیں جہاں سے فنٹز کے بارے میں معلومات مل سکتی تھیں مثلاً لوگن اسپورٹ کا بار، جیسپر روز اور فنٹز کے دادا، دادی لیکن کلارا نے مجھے واضح طور پر بتادیا تھا کہ میں مقامی پولیس اسٹیشن نہ جاؤں کیونکہ فنٹز اسے پسند نہیں کرے گا۔ میں نے کسی ٹی وی ڈرامے میں ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ مرد کو جس کام سے منع کرو سب سے پہلے وہ وہی کرے گا۔

میں نے بھی اپنی گاڑی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ لیا۔

وہاں پر موجود ایک پولیس آفیسر نے میرا خوش دلی سے استقبال کیا۔ اس کا نام ڈین مارٹن تھا۔ اس نے میرا کارڈ دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ''تمہیں کس قسم کی مدد درکار ہے مسٹر البرٹ؟''

''میں فنٹز گیرالڈ مچل نامی ایک شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

''کیوں؟''

میں نے وجہ بتائی تو وہ بولا۔ ''اب وہ تمہیں ڈیلفی میں نہیں ملے گا۔''

''کیا وہ کوئی جرم کرکے بھاگا ہے؟''

''ایسی بات نہیں، دراصل اس نے تقریباً ایک ہفتہ اس پولیس اسٹیشن میں ملازمت کی تھی۔ ابھی وہ آزمائشی مدت پوری کررہا تھا کہ ایک شام پولیس چیف ہل مین دورے پر آگیا۔ اس نے فنٹز کو کمپیوٹر پر بیٹھے دیکھا۔ وہ بغیر اجازت پولیس ریکارڈ دیکھ رہا تھا۔ چیف نے غصے میں آکر اسے فوراً ڈیلفی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔''

''یہ کتنی پرانی بات ہے؟''

مارٹن نے ایک نوٹ بک اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹتے ہوئے بولا۔ ''سات ہفتے ہوگئے۔''

''اس کی بہن نے تین ہفتے سے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ملی ہے۔ شاید تم یا تمہارا کوئی ساتھی آفیسر جانتا ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''میں نے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔'' مارٹن بولا۔

''اس نے جب ملازمت کے لیے درخواست دی تھی تو اپنا کوئی پتا بھی دیا ہوگا۔''

اس نے دراز کھول کر ایک فائل نکالی۔ اس میں فنٹز کا جو پتا اور فون نمبر درج تھا، وہ کلارا کا تھا۔

''ذاتی طور پر تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مارٹن نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ صرف یہاں ایک ہفتے رہا۔ اتنے کم وقت میں کسی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟''

''ایک بات اور، یہ بتاؤ کہ وہ کمپیوٹر پر کیا تلاش کررہا تھا؟''

''اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''اس کے باپ کا نام ٹمن مچل ہے۔ کیا تم اسے جانتے

ہو؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''چار سال پہلے ہم نے اسی نام کے ایک شخص کو ایسٹ فرنٹ اسٹریٹ سے آوارہ گردی اور ہنگامہ آرائی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ وہ نشے میں گالیاں بک رہا اور اپنی رائفل سے ہوائی فائر کر رہا تھا۔''

''کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

''وہ لمبے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جس پولیس آفیسر نے اسے گرفتار کیا، وہ یہاں سے جا چکا ہے۔ میں نے ٹمن کو سرسری طور پر کوٹھری میں دیکھا تھا۔''

''تمہارے پاس اس کا پتا تو ہوگا؟''

مارٹن نے ایک فائل کھولی اور ٹمن مچل کا ایڈریس اور فون نمبر بتا دیا۔

میں نے کار میں بیٹھتے ہی اس فون نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن فون کام نہیں کر رہا تھا چنانچہ میں نے مارٹن کے دیے ہوئے پتے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ لوگن اسپورٹ کا قصبہ ڈیلفی سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے وہ مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان کافی پرانا تھا اور باہر کی دیواروں پر رنگ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پہلی دستک کے جواب میں خاموشی رہی لیکن دوسری دستک سے پہلے دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ اس کی عمر سو سال کے قریب معلوم ہوتی تھی لیکن آواز میں کرارا پن تھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''میں ایک شخص کو تلاش کر رہا ہوں جو شاید گزشتہ دو ماہ کے دوران اپنے باپ کو پوچھتا ہوا یہاں آیا ہو۔''

''اندر آجاؤ۔''

میں اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے مجھے کچن ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے سامنے کافی مگ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا بیٹا لیوس اب ایک جیولری اسٹور پر کام کرتا ہے لیکن وہ نوٹرے ڈیم کے لیے فٹ بال بھی کھیلتا رہا ہے۔''

میں نے جواب میں سر ہلا دیا تو وہ بولی۔ ''ٹمن اسی مکان کے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن لیوس نے اسے نکال دیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ واقعہ کب پیش آیا لیکن شاید لیوس کچھ بتا سکے اور ہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک شخص ٹمن کو پوچھتا ہوا آیا تھا لیکن اس نے کافی پی اور نہ ہی بسکٹ کھائے۔ مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔''

''کیا تم لیوس سے میری بات کرواسکتی ہو؟''

اس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا سیل فون اٹھایا اور لیوس کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولی۔ ''میرے پاس ایک شخص بیٹھا ہے جو تم سے ٹمن کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے سیل فون میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ میں کوئی ایسا شخص ہوں جو گھر گھر جاکر چیزیں فروخت کرتا ہے لیکن میں نے جلدی اس کی غلط فہمی دور کردی تو اس نے مجھے پتا سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس وقت وہ اپنی دکان پر ہی مل سکتا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کسی گاہک کے ساتھ مصروف تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے تعارف کرواتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ بولا۔

''وہ شخص انتہائی خطرناک تھا۔ وہ اپنے آپ کو کاریگر کہتا تھا چنانچہ میں نے اس سے نانی کے گھر پر کچھ کام کروا دیا تاکہ انہیں اچھا کرایہ مل سکے لیکن اس کا بنایا ہوا کچن کیبنٹ چند روز بعد ہی زمین پر گر پڑا اور اس میں رکھا ہوا سارا سامان فرش پر بکھر گیا۔ ذرا سوچو کہ اگر نانی کیبنٹ کے پاس کھڑی ہوتیں تو کیا ہوتا۔ انہوں نے مجھے فون کرکے بلایا اور جب میں نے اس کا سارا کام دیکھا تو بہت غصہ آیا۔ اس نے انتہائی گھٹیا سامان استعمال کیا تھا اور اوپر سے رنگ کر دیا تاکہ دیکھنے میں وہ کیبنٹ اچھا لگے۔ میں نے اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا اور اس کا سامان اٹھا کر باہر لان میں پھینک دیا۔

''یہ کتنی پرانی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً دو سال ہوگئے۔ وہ غالباً بہار کا موسم تھا۔''

''تمہاری نانی نے بتایا کہ حال ہی میں ایک اور شخص بھی اسے پوچھتا ہوا یہاں آیا تھا؟''

''ہاں۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹمن کا بیٹا ہے۔''

''اس نے نانی کو یہی بتایا تھا۔'' لیوس نے کہا۔ ''لیکن نانی کو وہ شخص پسند نہیں آیا چنانچہ انہوں نے فون کرکے مجھے بلایا لیکن جب میں گھر پہنچا تو وہ جا چکا تھا۔''

''کیا تم نے بعد میں بھی ٹمن کو دیکھا؟''

''ہاں، ایک دفعہ وہ میرے سامنے آیا تھا لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے وہ سڑک پار کرکے دوسری طرف چلا گیا۔''

''یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

''تقریباً پانچ چھ ماہ پہلے۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ اب وہ کہاں رہ رہا ہے؟''

لیوس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''تم اسے کیوں تلاش کرنا چاہ رہے ہو؟''

''اگر میں نے باپ کو تلاش کرلیا تو شاید بیٹا بھی وہیں مل جائے۔''

دوپہر کا وقت تھا جب میں اس بار میں پہنچا جس کا پتا کلارا نے بتایا تھا۔ میں نے بارٹینڈر کو سیب کے جوس کا آرڈر دیا اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔ ''میں یہاں ایک سابق فوجی کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس کی بہن نے بتایا ہے کہ وہ کبھی کبھی ڈرنک کرنے یہاں آیا کرتا تھا۔ مجھے اس کی تلاش پر مامور کیا گیا ہے کیونکہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا ہے اور وصیت کے مطابق وہ بھی وارثوں میں شامل ہے۔''

''کہیں تم فٹز مچل کی بات تو نہیں کر رہے؟'' بارٹینڈر نے کہا۔ اس کا نام کوری تھا۔

''تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے لگا جیسے مچل کے بارے میں اس کے خیالات اچھے نہیں ہیں پھر وہ بولا۔ ''کیا اس کی ماں مرگئی؟''

''ہاں اس کے انتقال کو گیارہ دن ہوگئے۔''

''اس نے بتایا تھا کہ ماں مرنے والی ہے اور اس کے بعد وہ بہت امیر ہوجائے گا۔ تمہارے خیال میں اس کے حصے میں کتنی دولت آئے گی؟''

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے جائداد کے مختار نے اسے تلاش کرنے کے لیے کہا ہے۔ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا؟''

''دو ہفتے پہلے۔ وہ یہاں اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا۔''

''باپ کے ساتھ؟'' میری بھوئیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تمہیں حیرت ہو رہی ہے؟''

''میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے باپ کو برسوں سے تلاش کر رہا تھا۔''

''کیسی عجیب کہانی ہے۔'' کوری نے کہا۔ ''مجھے تو وہ بوڑھا شخص کوئی جعل ساز لگ رہا تھا جس نے کہیں سے سن لیا ہوگا کہ فٹز کے پاس دولت آنے والی ہے۔''

''تمہیں یہ خیال کس طرح آیا؟''

''مجھے اس کی کچھ باتیں غلط لگ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے دیوانگی جھلک رہی تھی لیکن وہ یہاں کئی گھنٹے بیٹھے رہے مجبوراً میں نے بار کا وقت ختم ہونے پر انہیں اٹھایا۔''

''پھر تو تم نے ان کے لیے ٹیکسی منگوائی ہوگی اور ان کا پتا بھی نوٹ کیا ہوگا؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کی نوبت نہیں آئی۔ ان کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔''

''تم اس آدمی کا نام جانتے ہو؟''

''جیسپر۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''جیسپر روز۔''

یہ نام سن کر میں چونک پڑا اور بولا۔ ''کیا وہ ڈیئر کریک کے پاس رہتا ہے؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ فٹز کے ساتھ فوج میں تھا اور ایک حادثے میں زخمی ہوجانے کی وجہ سے اس کی ٹانگ میں ہلکی سی لنگڑاہٹ پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ شاید پنشن پر گزارہ کر رہا ہے۔ اس نے قسمت آزمانے کے لیے کئی منصوبے بنائے اور لوگوں کو ان میں پیسے لگانے کے لیے کہا لیکن کسی میں کامیابی نہیں ہوئی۔''

میں نے ڈیئر کریک جانے کے لیے روٹ نمبر اڑتیس پر سفر کرنا شروع کردیا۔ سب سے پہلے مجھے ایک پرانے طرز کا گیس اسٹیشن نظر آیا۔ میں نے وہیں سے ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے باہر احاطے میں کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ دفتر کے دروازے پر دستک دی تو ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئی۔ شاید وہ اسی وقت سو کر اٹھی تھی۔ میں نے اس سے جیسپر روز کا پتا پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تب میں نے کہا۔ ''قرب وجوار میں کوئی ایسا فرد ہے جو یہاں رہنے والے ہر شخص کے نام اور کاروبار سے واقف ہو؟''

اس نے مسکراتے ہوئے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''غلہ گودام کے بعد جو سفید مکان ہے، وہاں ملی سے معلوم کرو۔''

وہ لیوس کی نانی سے عمر میں کم تھی۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دکھا کر جیسپر کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی بتادیا کہ میں اس سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا اس نے تم سے بھی ادھار لیا تھا؟''

''نہیں، کیا وہ لوگوں سے ادھار لیتا ہے؟''

''وہ ہر ایک کا مقروض ہے۔'' وہ پورچ کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ''اس دوست کا کیا نام ہے جس کے لیے تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟''

''فٹزجیرالڈ مچل۔''

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور مجھے روز کے گھر کا

پتا سمجھا دیا۔ مجھے گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ مکان کے برابر میں ایک سبز رنگ کی پک اپ کھڑی تھی۔ میں نے عمارت کی کھڑکیوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک کمرے میں کاؤچ، ٹیلی ویژن، میز اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جبکہ بقیہ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ روز اپنے کمرے میں سو رہا ہو یا غسل کر رہا ہو۔ میں نے عقبی دروازے پر دستک دی لیکن وہ بھی مقفل تھا۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے میری نظر مکان کے مشرق میں ایک مٹی کے ڈھیر پر گئی۔ اس کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ ہوگی۔ شاید روز کو سبزیاں اگانے کا شوق تھا لیکن اس کے لیے اسے مکان کے جنوبی حصے کا انتخاب کرنا چاہیے تھا جہاں سورج کی روشنی براہِ راست پڑتی تھی۔ میں گھوم کر واپس آیا اور پک اپ کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا عقبی حصہ خالی تھا اور وہاں چند رسیاں پڑی ہوئی تھیں جبکہ پسنجر سیٹ کے ساتھ فرش پر ایک بڑا سا سرخ رنگ کا ٹول بکس رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں چند اوزار موجود تھے۔

میں نے اپنا فون نکالا۔ وہاں کمزور سگنلز آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی نمبر ملانے کی کوشش کرتا، ایک گرے رنگ کی پک اپ آئی اور میری کار کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ میں نے سبز رنگ کی پک اپ کا دروازہ بند کیا اور اس سے دور ہٹ گیا۔ گرے رنگ کی پک اپ سے دو آدمی باہر آئے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر لمبے بالوں والا شخص تھا جبکہ ڈرائیونگ سیٹ سے اترنے والا اس کے مقابلے میں بہت کم عمر تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی۔ وہ دونوں میرے پاس آئے اور ڈرائیور بولا۔ ''تم پک اپ میں کیا دیکھ رہے تھے؟''

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم جیسپر روز ہو؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' وہ تند لہجے میں بولا۔

''میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھا جس کی مدد سے فنٹز گیرالڈ مچل کو ڈھونڈ سکوں۔''

''تمہیں فنٹز سے کیا کام پڑ گیا؟'' بوڑھے شخص نے پوچھا۔

''اس کی ماں مر چکی ہے اور اس نے وصیت میں فنٹز کا حصہ رکھا ہے۔ میں اسی لیے اسے تلاش کر رہا ہوں۔''

شاٹ گن والا شخص کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی بوڑھا بول پڑا۔ ''بیٹا، تمہاری ماں مر گئی ہے۔''

اس کے بعد گفتگو کا انداز بدل گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم ہی فنٹز گیرالڈ مچل ہو؟''

''یقیناً۔'' جوان آدمی بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ یہ بری خبر تمہیں دے رہا ہوں۔''

''ہمیں معلوم تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔'' وہ بوڑھے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے دیکھنے کے لیے سانتا کلاز جانا چاہ رہا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی حالت اتنی تشویش ناک ہوگی۔''

بوڑھے آدمی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے بیٹا۔''

''کیا تم ٹمن مچل ہو؟''

''ہاں، میں ہی وہ بدنصیب ہوں۔ لورنی مجھے چھوڑ کر چلی گئی جبکہ وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔''

''میں دوبارہ اس سے ملنے جاتا۔'' جوان آدمی نے کہا۔ ''لیکن میں اپنے باپ کو عرصہ دراز سے تلاش کر رہا تھا اور جب وہ مجھے ملا تو یقین نہیں آیا۔''

ٹمن نے کہا۔ ''اگر معلوم ہوتا کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو تو میں تمہیں پوسٹ کارڈ یا اس قسم کی کوئی چیز ضرور بھیجتا۔''

''بہرحال جو ہوا سو ہوا۔'' میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں اس لیے آیا ہوں کیونکہ جائداد کے مختار کو فنٹز سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا میں تمہارا فون نمبر جان سکتا ہوں یا میں تمہیں اس کا نمبر دے دوں؟''

''تم مجھے اس کا نمبر دے دو، اس کا نام کیا ہے؟''

''بوبی فشر۔'' میں نے اس کا فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے اپنا پتا دے دو۔''

''میرا پتا یہی ہے۔'' اس نے میل باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ جیسپر روز کا مکان نہیں ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں مل سکتا ہوں؟''

''مجھے تمہاری بہن نے یہاں کا پتا دیا تھا۔''

''اوہ کلارا۔۔۔۔ وہ کیسی ہے؟''

''وہ پریشان تھی کیونکہ تم اس سے رابطے میں نہیں ہو۔'' میں نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے بھائی کو بتا دوں گا کہ تمہارے فون کا انتظار کرے۔''

ان لوگوں سے رخصت ہونے کے بعد میں نے

راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر بوبی فشر کا نمبر ملایا اور کہا۔ ”میں نے ابھی ابھی تمہارا نمبر ایک ایسے شخص کو دیا ہے جو اپنے آپ کو فنز گیرالڈ مچل کہتا ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا دے سکتا ہوں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ فنز گیرالڈ مچل ہے؟“

”اس نے مجھے اپنا یہی نام بتایا اور کچھ دوسری تفصیلات بھی بتائیں۔ وہ تمہارا اصلی نام بھی جانتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو اپنے آپ کو فنز کا باپ بتا رہا تھا۔“

”یعنی تم نے ٹمن مچل کو بھی تلاش کرلیا؟“

”ہاں، ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ تمہاری ماں مرچکی ہے۔ وہ شخص اسے لورنی کے نام سے یاد کررہا تھا۔ کیا تمہاری ماں کا یہی نام تھا؟“

”ہاں۔“ اس نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ”وہ اپنے باپ کو عرصہ دراز سے تلاش کررہا تھا اور حال ہی میں اس سے ملا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دوبارہ سانتا کلاز جانے والا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری ماں اتنی زیادہ بیمار ہے۔“

بوبی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ فنز کی ایک سوتیلی بہن بھی ہے۔ وہی عورت جس سے تم نے بات کی تھی۔ وہ ڈیلفی میں رہتی ہے اور ٹمن اس کا باپ بھی ہے۔“

بوبی بولا۔ ”اس آدمی نے سانتا کلاز کا نام لیا تھا؟“

”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ مما کی سرائے ایونزولی میں تھی۔“

”کیا یہ جگہ سانتا کلاز سے قریب ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دونوں کے درمیان پچیس میل کا فاصلہ ہے۔“

”اوہ تب تو ہمیں مزید چھان بین کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تصدیق کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کروایا جاسکتا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر مزید چھان بین کروں گا۔ اس لیے مجھے واپس آنے میں دیر ہوسکتی ہے۔“

میں ایک بار پھر ڈیلفی گیا تاکہ کلارا سے مل کر کچھ مزید معلومات حاصل کرسکوں۔ وہ گھر پر نہیں تھی لہٰذا میں کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد آئی۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

”میں نے تمہارے باپ کو تلاش کرلیا ہے۔“

”تم خوش قسمت ہو، کیا فنز بھی ملا، وہ کیسا ہے؟“

”میں نے ایک آدمی کو تلاش کیا ہے جو اپنے آپ کو فنز کہتا ہے۔“

”لیکن تمہیں یقین نہیں آرہا، آخر کیوں؟“

”اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید تم اس سلسلے میں میری مدد کرسکو۔ جب تم نے آخری بار اسے دیکھا تو اس کے پاس کون سی گاڑی تھی؟“

”سبز رنگ کی پک اپ۔“

”اور اس کے ٹول بکس کا رنگ؟“

”سرخ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ایک بات اور بتادو کیا وہ لنگڑا کر چلتا ہے؟“

”نہیں لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟“

”اس لیے کہ جس فنز کو میں نے تلاش کیا ہے، وہ لنگڑا کر چلتا ہے۔“

مجھے شبہ تھا کہ وہ فنز نہیں بلکہ بہیسپر روز ہے۔ اس کا لنگڑا پن، سانتا کلاز کا حوالہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فنز اور ٹمن ایک گہرے رنگ کی پک اپ چلا رہے تھے جبکہ کلارا نے اس کا رنگ سبز رنگ بتایا تھا۔ یہ ساری باتیں شبہات کو جنم دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ مکان کے مشرق میں تازہ مٹی کا ڈھیر بھی میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

یقیناً روز نے فنز کو قتل کردیا ہوگا تاکہ اس کی جگہ لے کر وارثت کا دعویٰ کرسکے اور وہ ٹمن کون تھا جس سے میں ملا۔ کیا وہ بھی فرضی تھا یا اصلی ٹمن کو اپنے بیٹے کے مقابلے میں روز کے ساتھ معاملہ کرنے میں زیادہ فائدہ نظر آیا ہوگا۔

ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ میں نے کلارا سے کہا۔ ”کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے ساتھ تم کچھ دن گزار سکو مثلاً تمہارا بوائے فرینڈ یا پھر میں تمہارے لیے یہاں سے دور کسی موٹیل میں رہائش کا انتظام کردوں۔“

وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟“

”یہ ایک عارضی انتظام ہے جب تک یہ تصدیق نہیں ہوجاتی کہ یہ دونوں وہی ہیں جو اپنے آپ کو ظاہر کررہے ہیں۔“

”لیکن میرا اس معاملے سے کیا تعلق؟“

”اگر وہ جھوٹے ہیں تو تم ان کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتی ہو کیونکہ تم روز سے بھی مل چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے مشکل ہوگا لیکن حفاظتی نقطہ نظر سے ایسا کرنا

ضروری ہے۔''

اسی وقت دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا اور وہ دونوں شاٹ گن لیے اندر داخل ہوئے۔ ٹمن آگے تھا، مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''یہ وہی سراغ رساں ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے مار ڈالو۔ اس وقت ہمارے پاس اچھا موقع تھا۔''

''ہم ہر ایک کو کسی وجہ کے بغیر نہیں مار سکتے پاپا۔'' فٹز بولا۔

''ٹھیک ہے، اب تو ہمارے پاس اسے مارنے کی معقول وجہ موجود ہے۔''

''ہاں، اب ہم اسے مار سکتے ہیں۔'' فٹز نے کہا۔

اس کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ کلارا نے پستول نکالا اور دونوں پر گولی چلادی۔

اس واقعے کے کئی دنوں بعد میری زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ میں اپنی ماں کے چھوٹے سے لونگ روم میں بیٹھا مما اور سام کو ان واقعات سے آگاہ کر رہا تھا جو بوبی فٹز کے میرے دفتر آنے کے بعد پیش آئے تھے۔

''کیا آپ کو واقعی معلوم نہیں تھا کہ کلارا کے پاس پستول ہے؟'' سام نے پوچھا۔

''واقعی مجھے معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے پستول نکالتے اور ٹریگر دباتے دیکھا۔''

سام نے پوچھا۔ ''کیا انہوں نے مکان کے صحن میں کسی کو دفن کیا تھا؟''

''ہاں، وہ بدنصیب فٹز جیرالڈ مچل تھا۔ انہوں نے اس کی لاش کو بوری میں لپیٹ کر گڑھے میں رکھ دیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زمین برابر کردی۔ ان کا خیال تھا کہ بعد میں اسے کہیں اور منتقل کردیں گے۔''

''پھر وہ لنگڑا کون تھا؟'' سام نے پوچھا۔

''جیسپر روز لیکن وہ بوڑھا واقعی ٹمن مچل تھا۔''

مما کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ غصے سے بولیں۔ ''یہ کیسے ممکن ہوا کہ روز نے مچل کو اس کے بیٹے کے قتل پر آمادہ کرلیا؟''

''یہ معاملہ کچھ مختلف ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ٹمن مچل، روز کے پاس رہ رہا تھا۔ جب جیسپر روز نے سنا کہ فٹز بار میں بیٹھا شیخی بگھار رہا تھا کہ اسے ورثے میں بہت ساری دولت ملنے والی ہے تو اس نے یہ بات ٹمن کو بتائی۔ ٹمن کے دل میں لالچ آگیا اور اس نے بیٹے سے دوبارہ تعلق استوار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے لیکن جب وہ سب روز کے گھر گئے تو فٹز کے دل میں دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی اور اس نے ٹمن پر الزام لگایا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس پر ٹمن کو غصہ آگیا اور اس نے کچن میں پڑے ہوئے چاقو سے اس پر حملہ کردیا۔''

اس دوران بوبی بھی ہماری گفتگو میں شریک ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس نے اپنے بیٹے کو مار ڈالا۔ اس طرح تو اس نے اپنا ہی نقصان کر ڈالا۔ شروع شروع میں جیسپر روز کے ساتھ رہنا کتنا مشکل لگا ہوگا۔''

''بالکل نہیں کیونکہ وہ اس کا بھی باپ تھا۔''

''اس کا بھی باپ تھا۔'' سام کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''مجھے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ اس کے کتنی عورتوں سے تعلقات تھے۔ اس واقعے کے بعد ٹمن نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے روز کو قائل کرلیا کہ وہ فٹز بن جائے۔ وہ اس کے لنگڑے پن کے بارے میں کوئی بھی کہانی گھڑ سکتا تھا لیکن فٹز کا وزن روز کے مقابلے میں بیس پاؤنڈ زیادہ تھا لہٰذا ٹمن اس کے کھانے پینے پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تاکہ اس کا وزن بڑھ جائے اور سرائے میں کسی کو شک نہ ہو۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' سام نے پوچھا۔

''یہ بات روز نے پولیس کو بتائی، وہ بچ گیا تھا۔ اس بات کو لے کر کلارا کے بوائے فرینڈ نے اسے خوب مذاق کا نشانہ بنایا اور کہا کہ اسے مزید نشانہ بازی کی مشق کی ضرورت ہے۔''

''روز کا اس پورے معاملے کے بارے میں کیا کہنا ہے؟'' سام آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''وہ یہی کہتا ہے کہ ڈیڈی نے اسے اس کے لیے اکسایا تھا۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ روز نے فٹز پر چاقو سے وار کیا ہو تاکہ اس کے حصے کی دولت اسے مل جائے لیکن میرا شبہ ٹمن پر ہے۔'' میں نے بوبی سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ فٹز پر چاقو کے پے در پے وار کیے گئے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ٹمن پر دیوانگی طاری ہوگئی تھی اور وہ فٹز کی اشتعال انگیزی برداشت نہ کرسکا۔ دوسری بات یہ کہ وہی شخص کلارا کے دروازے پر پہلے داخل ہوا تھا۔''

''بے چاری کلارا۔'' بوبی نے تاسف بھرے لہجے

میں کہا۔ ''اسے اپنے باپ کو مارنا پڑ گیا۔''

''اس نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ورنہ وہ اسے مار ڈالتا۔''

''لیکن وہ اس کا باپ تھا۔ اسے اپنے نئے بھائی پر گولی چلانا پڑ گئی اور پرانے بھائی سے بھی محروم ہوگئی۔''

''ممکن ہے کہ کسی روز تصویر کا اصل رخ اس کے سامنے آجائے لیکن فی الحال اسے اپنے باپ سے محروم ہوجانے کا کوئی افسوس نہیں ہے جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔''

بوبی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لیکن بوبی، اب ایک اور بات سامنے آئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق فٹز کی موت کلارا کے گھر پیش آنے والے واقعے سے دو سے چار ہفتے پہلے واقع ہوئی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری ماں کی وفات سے پہلے مارا جاچکا تھا۔ اس طرح اب ساری جائداد تمہیں مل جائے گی لیکن اسٹیٹ کو خود بھی اپنے طور پر حقائق کا تجزیہ کرنا ہوگا تاکہ فٹز کے رشتے داروں کی اہلیت کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔''

''کیا اس کا کوئی رشتے دار بھی ہے؟''

''تم کلارا اور روز کو کیوں بھول رہے ہو۔ وہ سوتیلے ہی سہی لیکن اس کے بہن بھائی تو ہیں اور ممکن ہے کہ مزید دعوے دار بھی سامنے آجائیں۔''

''یہ فیصلہ تو قانونی ماہرین ہی کرسکتے ہیں کہ اس کی کیا پوزیشن ہے۔'' اس نے مایوسی کے انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ سب کچھ تمہارے ہی حصے میں آئے گا۔''

''واقعی؟''

''ہاں کیونکہ تم دل کے اچھے ہو اور اس دولت کو بھی اچھے کاموں میں استعمال کرو گے۔ تمہاری نیت صاف تھی اسی لیے تم نے مجھے فٹز کی تلاش پر مامور کیا تھا۔''

''کاش فٹز مجھے مل جاتا۔ میں خاندان کے بغیر کتنا ادھورا ہوں۔'' اس نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔

''کلارا کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس سے تمہارا خونی رشتہ نہیں لیکن فٹز کے حوالے سے ایک تعلق تو بنتا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اسے بہت کچھ دے سکتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''خاندان کے بغیر آدمی اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا ہے۔''

بوبی کے جانے کے بعد مما نے کہا۔ ''تمہیں اس کام کا معقول معاوضہ ملنا چاہیے۔ تم نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا۔ اس کے علاوہ عدالتی کارروائی میں بھی تمہارا بہت سا وقت ضائع ہوگا۔''

''بوبی کا کہنا ہے کہ مجھے اس کام کا معقول معاوضہ ملے گا۔ اگر یہ بہت زیادہ نہ ہوا تب بھی میں اسے قبول کرلوں گا۔''

مما نے برا سا منہ بنایا اور سام کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ تم نے ان سے اپنے دادا کے بارے میں بات کی تھی؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ ڈیڈی ان کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتے۔''

''اس کی بھی کچھ وجوہات ہوں گی۔'' مما نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' سام بولی۔

میں اور مما حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ لوگوں نے کبھی انٹرنیٹ کا نام نہیں سنا۔ میں جان گئی ہوں کہ وہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ انہوں نے خودکشی کی تھی۔ وہ اچھے کاریگر نہیں تھے۔ ان کے بنائے ہوئے مکانات اتنے ناقص تھے کہ اس کے ملبے میں چند لوگ مرگئے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ ڈیڈی اس لیے ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔ ان کی موت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن آپ ان کی پوری زندگی کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ دادی، آپ نے ان سے محبت کی اور شادی کرلی۔ ڈیڈی وہ آپ کے باپ تھے۔ میں آپ کی زبان سے ان کے بارے میں سننا چاہتی ہوں۔''

یہ سن کر مما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہم دونوں نے ایک طویل عرصے تک اس بوجھ کو سینے میں دفن رکھا اور کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔ ممکن ہے کہ ہم بھی انہیں معاف نہ کرسکیں لیکن اس لیے میرا دل چاہا کہ سام کو اپنے باپ کے بارے میں سب کچھ بتادوں۔ میں اسے اس احساسِ محرومی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا جس کا شکار بوبی نشر ہوچکا تھا۔ ہر شخص اپنے خاندان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے پھر میں کیوں سام کو اس کے حق سے محروم رکھوں۔ رشتوں کی ڈور کو کاٹنا اتنا آسان تو نہیں۔

وصیت

عکسِ فاطمہ

انتظار... تھکا دینے والے لمحات کا نام ہے... کوفت... بیزاری اور افسردگی کی کیفیات ہر طرف سے انسان کو محصور کرلیتی ہیں۔ صبر... استقامت... مفاہمت اور تحمل... رفتہ رفتہ کہیں دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بے صبرے کا احوال... وہ برداشت کی آخری حد پر کھڑا تھا۔ جو ہونا تھا... فوری رونما ہو جائے... مگر گھڑی کی ٹک ٹک ختم نہیں ہو رہی تھی...

ایک شخص کا قصہ..... عجلت پسندی نے اسے کامیابی سے دور پاتال میں دھکیل دیا

پہاڑی پر واقع اس تاریک مکان میں جیمس دو سال سے اپنی دادی کے مرنے کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ ڈاکٹر یہ بات کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ دادی کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اب معاملہ صرف چند دنوں کا ہے لیکن وہ چند دن ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وکٹوریا ایس ڈاکٹرز کی تمام آرا کو رد کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ وہ موت کو دور رکھنے کے لیے اسی عزم اور پائداری سے جنگ کر رہی تھی جیسے کہ وہ زندگی سے

جنگ کرتی چلی آئی تھی۔

جیمس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا لیکن وہ وقت کا انتظار کررہا تھا۔ دادی وکٹوریا کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کا برتاؤ کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن دوسری طرف اسے ولیم فوسٹر کی فکر بھی لاحق تھی جو اسی مکان میں رہتا تھا۔

ولیم فوسٹر دادی وکٹوریا کی بہن کا بیٹا تھا جس کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔

جیمس کو اس بات کی پریشانی نہیں تھی کہ دادی وکٹوریا کے مرنے کے بعد ولیم کو اس ڈھیروں جائداد میں سے حصہ دینا پڑے گا جو دادی وکٹوریا کی ملکیت تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ولیم نرا احمق اور بالکل بے عقل تھا۔

ولیم کو بات کرنے میں مشکل پیش آتی تھی، وہ ڈھیلے پن سے حرکت کیا کرتا تھا اور بات سمجھ نہیں پاتا تھا۔

جیمس ایسی مزید ایک سال انتظار کرلیتا اگر دادی وکٹوریا اچانک اپنا وصیت نامہ تبدیل نہ کرتی۔ جیمس نے وصیت نامے میں تبدیلی کی بات خود دادی وکٹوریا کے منہ سے سنی تھی، جب ایک رات وہ اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا، البتہ دادی نے یہ راز افشا کرنے سے انکار کردیا تھا کہ وہ تبدیلی کیا تھی۔

وصیت نامے میں تبدیلی کا ذکر سن کر جیمس خوف زدہ ہوگیا۔ وہ اگلے روز ہی دادی وکٹوریا کے وکیل لیون میکالے کے پاس جا پہنچا۔

”نہیں جیمس!“ میکالے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ دادی نے تمہیں بتایا ہے، انہوں نے وصیت نامہ تبدیل کردیا ہے اور اس تبدیلی کے وقت وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھیں۔“

”لیکن جائداد کسے ملے گی؟“ جیمس نے وکیل کی خوشامد کرتے ہوئے پوچھا۔ ”خدا جانتا ہے میکالے کہ میں نے ان کی زندگی کے آخری ایام کو آرام و تسکین سے گزرنے اور انہیں راحت پہنچانے میں اپنی زندگی کے دو سال قربان کردیے ہیں۔ اس خدمت گزاری کے صلے میں میرا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جس حالت میں ہیں، اس میں انہوں نے کیا کیا ہوگا۔“

وکیل میکالے نے بے بسی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔ ”کاش میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا، جیمس! تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک وکیل ہونے کے ناتے میں تمہیں اس قسم کی کوئی بات بتا نہیں سکتا۔ یہ رازداری کے اصولوں کے خلاف ہے۔“

”تم مجھے کوئی ہلکا سا اشارہ تو دے سکتے ہو۔“ جیمس نے التجا کی۔ ”صرف یہ جاننے کے لیے کہ میں دادی کی نظروں میں کس مقام پر ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ تم یا کوئی اور کس مقام پر کھڑے ہو۔“ میکالے نے قدرے بدمزاجی سے کہا۔ ”یہی تو قانونی سقم ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تم یا ولیم فوسٹر تمام تر جائداد کے حق دار بن سکتے ہو اور ممکن ہے کہ تم دونوں ہی حق دار ٹھہرو۔“

”تمہارا مطلب ہے۔“ جیمس کے لہجے سے خوف عیاں تھا۔ ”کہ ولیم تمام جائداد کا واحد حق دار قرار دیا جاسکتا ہے؟“

”ہاں، یہ ہوسکتا ہے، تم بھی تنہا حق دار قرار دیے جاسکتے ہو یا کوئی بھی! لیکن تم دونوں کے امکانات زیادہ ہیں۔ میں تمہیں خفیف سا اشارہ دے رہا ہوں جیمس! دادی کے زیادہ سے زیادہ قریب رہو۔“

”لیکن میں تو گزشتہ دو برسوں سے ان کے قریب ہی رہ رہا ہوں۔“ جیمس نے جواب دیا۔

میکالے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس سلسلے کو جاری رکھو۔ یہ تمہارے لیے بہترین چانس ہے۔“

جیمس سرد آہ بھرتے ہوئے وکیل کے دفتر سے نکل آیا۔ اسے دادی وکٹوریا کے پاس ایک اور طویل شب بیداری کرنا ہوگی۔

جب گھر واپس پہنچ کر اس کی نگاہ ولیم کے تاثرات سے عاری اور ہنستے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ولیم اور اتنی ڈھیر ساری جائداد کا وارث؟ اس خیال نے اسے خوف زدہ کردیا۔ دولت پانے کے بعد اس احمق کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اسے اس دولت کا کیا کرنا ہے اور جیمس نے تو دولت اور جائداد کے حصول کے بعد بہت سے منصوبے بنائے ہوئے تھے۔

اس وصیت پر سبقت لے جانے اور اس پیچیدہ معاملے کو حل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اگر دادی وکٹوریا کی موت واقع ہوجاتی ہے تو وصیت نامے کی قانونی توثیق ہوگی اور اگر ولیم تمام تر دولت و جائداد کا وارث قرار پایا اور اس کی بھی موت واقع ہوگئی تو یہ گویا طے ہوگا کہ اس کے بعد یہ تمام دولت اور جائداد جیمس کے حصے میں آجائے گی۔

اور یقیناً اس بات کا امکان بھی تھا کہ دولت اور جائداد اس کے نام نکل آئے۔ لیکن فی الوقت جیمس کوئی خطرہ

مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے ولیم کو نیچے چھوڑا اور خود دادی وکٹوریا کو دیکھنے کے لیے اوپر چلا گیا۔

دادی وکٹوریا سو رہی تھیں۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ دادی کے رخساروں کی جھریاں نمایاں تھیں اور بائیں کنپٹی کی رگ پھڑ پھڑا رہی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد جیمس نے ایک کاغذ پر اپنے منصوبے کو لکھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک پرفیکٹ پلان ہوگا۔ تمام تر منصوبے کا انحصار اس کی بے عیبی پر ہوگا۔

وہ سہ پہر تک اس منصوبے پر مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی پنسل ایک طرف رکھ دی اور اپنے منصوبے کو دوبارہ پڑھنے لگا۔ وہ ہر طریقے سے اپنا اطمینان کر لینا ضروری سمجھتا تھا۔

اس شام سات بجے جیمس ایس نے اپنے پلان پر عمل شروع کر دیا۔ رات کا ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد اس نے کچن کی دراز میں سے برف توڑنے کا سُوا نکالا اور اسے ولیم کو دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ کند ہو رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم آج رات اس کی نوک تیز کر دو۔''

ولیم نے ہنستے اور سر ہلاتے ہوئے وہ سُوا لے لیا۔

ولیم کے چہرے پر ہمیشہ چھائے رہنے والے وہ مبہم سے تاثرات جیمس کو ہمیشہ ڈسٹرب کر دیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ کپکپی لے کر رہ گیا۔ گو کہ وہ ایک گرم رات تھی لیکن جیمس نے اپنا کوٹ پہنا اور اندرون شہر روانہ ہو گیا۔

ایک مقامی سینما گھر پہنچ کر اس نے شو کا ٹکٹ لیا اور ٹکٹ آفس پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے جو اسے پہچانتی تھی، خیر و عافیت دریافت کی۔ پھر وہ گیٹ کی جانب بڑھا اور نوجوان ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ تھما دیا۔ اس نوجوان نے جیمس سے خوش دلی سے بات کی اور دادی وکٹوریا کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ پھر جیمس تھیٹر میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر جیمس نے اپنا کوٹ اتار دیا اور اسے ایک گولے کی شکل میں لپیٹ کر مردانہ اسموکنگ روم کے ایک نچلے صوفے کے نیچے چھپا دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد جیمس تھیٹر کے بغلی دروازوں میں سے ایک کے راستے تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ البتہ اس نے جاتے ہوئے اس بغلی دروازے کے نیچے ایک لمبی سی پنسل پھنسا دی تھی تا کہ خود کار دروازے کا تالا بند نہ ہو جائے۔

پھر وہ تیزی سے گھر کی جانب چل دیا۔

اسے گھر جاتے ہوئے راستے میں کسی نے نہیں دیکھا۔ جب وہ پہاڑی پر واقع اندھیرے مکان پہنچا تو وہاں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

وہ گھر میں عقبی دروازے کے راستے اندر داخل ہو گیا۔ عقبی دروازے کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے پہن لیے جو اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ کچن میں پہنچ کر اس نے دراز کھولی جس میں چمچے، چھری، کانٹے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دراز میں سے برف توڑنے والا وہ سُوا نکال لیا جس کی نوک ولیم نے تیز کر دی تھی۔

پھر وہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ولیم اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔

جیمس نے اس بات کی پروا نہیں کی۔ ولیم کبھی باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ گھر کے اندر ہی کسی جگہ ہوگا، جیمس نے سوچا اور اس وقت اس کی کمرے میں غیر موجودگی ضروری بھی تھی۔

دادی وکٹوریا کے کمرے میں پہنچ کر جیمس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے خود کو سنبھالا اور ان کے بیڈ کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ وہ سو رہی تھیں۔ ان پر نیند کا وہی عجیب سے غلبہ طاری تھا جیسے ...کوما کی کیفیت میں ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ اس نیند سے بیدار ہو جاتی تھیں۔ جیمس اس بات کا تصور ذہن میں آتے ہی اپنے دانت پیسنے لگا۔

اس نے برف توڑنے والے سوئے کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور قدم جماتے ہوئے سُوئے کی نوک دادی کے سینے میں بائیں جانب پوری قوت کے ساتھ گھونپ دی۔ وار ہونے پر دادی کا جسم اکڑ گیا لیکن ان کے منہ سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ صرف ان کے ہونٹ خاموشی سے حرکت کر رہے تھے، البتہ آنکھیں مکمل بند تھیں۔

ان کے سینے سے خون تیزی سے ابلنے لگا جو بیڈ کی سفید چادر کو داغ دار کر رہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں ان کا جسم پُرسکون ہو گیا۔

جیمس سمجھ گیا کہ وہ مر چکی ہیں۔

جیمس کے دستانے خون میں لت پت ہو چکے تھے۔

اس نے وہ خون آلود دستانے اتار لیے۔ پھر دادی کا ... بایاں ہاتھ پکڑا جس کی کلائی میں ایک چھوٹی سی رسٹ واچ بندھی ہوئی تھی۔ جیمس نے گھڑی کے شیشے کو ایک جھٹکے سے بیڈ کے سرہانے پر دے مارا تو شیشہ کرچی کرچی ہو گیا اور گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔

اس وقت گھڑی میں آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

اس نے خون آلود دستانے اٹھائے اور دادی کے کمرے سے نکل کر ولیم کے کمرے کے باہر پہنچ گیا۔ اس نے ایک خون آلود دستانہ ولیم کے کمرے کے دروازے کی ناب سے پونچھ لیا اور پھر نیچے اتر آیا۔ اس نے باہر نکلنے کے لیے ایک بار پھر عقبی راستہ اختیار کیا اور وہ دوبارہ اندرونِ شہر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے خون آلود دستانے راستے میں ایک کوڑے دان میں پھینک دیے۔

وہ بہ حفاظت سینما گھر تک پہنچ گیا۔ اس نے وہی راستہ استعمال کیا اور دروازے کے نیچے اٹکی ہوئی پنسل ہٹا کر اندر داخل ہوگیا پھر اسموکنگ روم کے صوفے کے نیچے چھپایا ہوا ٹاپ کوٹ نکال کر پہنا اور تھیٹر میں داخل ہونے کے بعد ایک سیٹ سنبھال لی۔ پھر وہ آخر تک بیٹھا رہا اور پورا شو دیکھنے کے بعد وہاں سے اٹھا۔

سینما کا شو مکمل دیکھنے اور ٹکٹ ٹیکر سے الوداعی ہیلو ہائے کرنے کے بعد جیمس ایک بار پھر گھر واپس پہنچ گیا۔

وہاں وکیل میکالے اس کا انتظار کررہا تھا۔ باقی تمام گھر ویران پڑا تھا۔ میکالے نے تیزی کے ساتھ اسے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔

”ولیم کو حراست میں لینے کے بعد وہ وکٹوریا کی لاش یہاں سے لے گئے ہیں۔“ میکالے نے کہا۔ ”برف توڑنے والے سوئے پر ہر جگہ ولیم کی انگلیوں کے نشانات تھے اور اس کے کمرے کے دروازے پر خون بھی لگا ہوا تھا۔“

جیمس یہ سن کر دہشت زدہ سا ہوگیا۔ ”کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ ولیم......“ اس کی آواز میں کھوکھلا پن نمایاں تھا۔

”اب تم سنو، جیمس۔“ وکیل میکالے نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ولیم نے دادی وکٹوریا کو قتل نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں جانتا ہوں کہ انہیں تم نے قتل کیا ہے۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت ہے جسے غیر مؤثر قرار نہیں دیا جاسکتا اور تم نے یہ سب کامیابی کے ساتھ کس طرح کیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔“ جیمس نے وکیل کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”بکواس مت کرو۔“ میکالے نے سختی سے کہا۔ ”سنو جیمس! میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ تمہارا منصوبہ جو کچھ بھی تھا، تم نے اس پر ایک گھڑی کی طرح کام کیا ہے۔ تم شبے سے پاک ہو۔ لیکن بائی گاڈ، تمہیں ندامت اٹھانی پڑے گی۔ تم کسی کی عداوت میں اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہو۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ جیمس نے جواب دیا۔

اور یہ معاملہ یوں ہی رہا۔

وکیل میکالے نے پوری کوشش کی کہ ولیم پر مقدمے کی کارروائی میں تیزی رہے اور جب تک مقدمہ ختم نہیں ہو جاتا، اس نے دادی وکٹوریا کی وصیت نامے کی شرائط جیمس ایمس کو پڑھ کر سنانے سے صاف انکار کردیا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران میں جب استغاثہ کا وکیل ولیم فوسٹر کے خلاف کیس کو مضبوط کررہا تھا تو جیمس کے چہرے پر فتح مندی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شہادتوں کی کڑیاں اتنی زیادہ مضبوط تھیں کہ انہیں توڑنا ناممکن تھا۔ پھانسی ولیم کا مقدر دکھائی دے رہی تھی۔

اور اس تمام کارروائی کے دوران وہ ایڈیٹ ولیم فوسٹر یہ سمجھے بغیر کہ اسے کس سزا کا سامنا کرنا پڑے گا، مسلسل مسکراتا رہا۔

مقدمے کے آخر میں جیمس بے چین سا ہوگیا۔

وکیل میکالے، ولیم کا دفاع کررہا تھا اور ثبوت کے جال کے باوجود قطعی طور پر پریشان نظر نہیں آرہا تھا۔ جیوری کے لیے استغاثہ کے دلائل کا خلاصہ کرنے سے عین قبل میکالے نے ڈاکٹر کونراڈ کی شکل میں ایک حیرت انگیز گواہ پیش کردیا۔

ڈاکٹر کونراڈ شہر کا وہ میڈیکل افسر تھا جو وکٹوریا ایمس کی بیماری کے تمام عرصے اس کا علاج کرتا رہا تھا۔

ڈاکٹر کونراڈ نے اس بات کی قانونی شہادت دی کہ اس رات جب وکٹوریا ایمس کا قتل ہوا تھا تو وہ رات پونے آٹھ بجے سے آٹھ بجے تک ایمس ہاؤس میں ولیم سے ٹیلی فون پر باتیں کرتا رہا تھا۔

یہ گواہی سننے کے بعد جیمس کو اپنی دنیا ڈگمگاتی محسوس ہونے لگی۔

اسے یاد آیا کہ جب وہ سینما سے چھپ کر نکلنے کے بعد گھر واپس پہنچا تھا تو ولیم اسے کیوں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ٹیلی فون بیرونی ہال میں رکھا ہوا تھا۔ دادی وکٹوریا کو قتل کرنے کے لیے وہ مکان کے عقبی زینے سے ہوتا ہوا اوپر پہنچا تھا اور جس وقت وہ جرم کا ارتکاب کررہا تھا تو اس تمام عرصے کے دوران ولیم، ڈاکٹر کونراڈ سے فون پر بات کررہا تھا۔

دادی وکٹوریا کی کلائی کی ٹوٹی ہوئی گھڑی میں قتل کا جو وقت سیٹ تھا اور جس پر گھڑی کی سوئیاں رک گئی تھیں، اس وقت

ولیم نیچے ہال میں فون پر ڈاکٹر سے گفتگو میں مصروف تھا۔

یہ ایک مختصر سی حقیقت تھی لیکن جیوری کے ارکان ڈاکٹر کونراڈ سے بہ خوبی واقف تھے اور اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جیوری نے آپس میں مشورہ کرنے اور فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

بیس منٹ بعد میں وہ کمرائے عدالت میں واپس آئے تو انہوں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ولیم کو بے قصور قرار دے دیا۔

☆☆☆

بعد میں وکیل میکالے اپنے دفتر میں سامنے بیٹھے ہوئے جیمس کو دیکھ کر پُراسرار انداز میں مسکرانے لگا۔

''تم ناکام ہو گئے ہو۔'' وکیل نے کہا۔ ''تم مکمل طور پر ناکام ہو گئے ہو، جیمس! گو کہ وہ کبھی تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کر سکیں گے، دادی وکٹوریا نے خود تمہیں سزا دے دی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔''

جیمس سہم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہاں ولیم فوسٹر بھی موجود تھا۔ حسبِ معمول اس کے چہرے پر احمقانہ ہنسی تھی اور اسے قطعی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ دانت نکالے وکیل میکالے کو تکے جا رہا تھا۔

وکیل میکالے اٹھ کر اپنی الماری تک گیا اور وہ فائل اٹھا کر لے آیا جس میں دادی وکٹوریا کی وصیت موجود تھی۔ اس نے وصیت کے لفافے پر ثبت سیل توڑ دی اور لفافہ کھول کر اس میں سے وصیت نامہ باہر نکال لیا۔ پھر ان دونوں کو متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز سے وصیت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''میں، وکٹوریا، درست اور صحت مند ذہن اور جسم کے ساتھ یہ وصیت کرتی ہوں کہ میری موت کے وقت جیمس ایبس اور ولیم فوسٹر میں سے جو بھی میرے سرہانے موجود ہو، وہ میری تمام دولت اور جائداد کا وارث ہوگا۔''

یوں لگا جیسے جیمس ایبس کے چہرے سے تمام کا تمام خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وکیل میکالے نے پڑھنے کے بعد وصیت نامہ میز پر رکھ دیا۔

''اب کیا کہو گے جیمس؟ کیا تم اب دولت و جائداد کا دعویٰ کرو گے؟ کیا دادی وکٹوریا کی موت کے وقت تم ان کے پاس موجود تھے؟'' وکیل میکالے نے کہا۔

''اس... اس طرح تو میں قاتل قرار دیا جاؤں گا؟'' جیمس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا ہے۔'' وکیل نے میز کی سطح پر اپنی انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''اب میں تم سے سرکاری طور پر ایک سوال پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم دولت و جائداد کا دعویٰ کر رہے ہو؟ کیا تم موت کے وقت ان کے پاس تھے؟''

''نہیں۔'' جیمس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کوئی اور بھی اس کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ میکالے! کم از کم مجھے اطمینان تو رہے گا کہ یہ بات میرے علم میں ہے۔''

میکالے نے جیمس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس پر ترس آ گیا ہو۔

''تم یہ بھی غلط کہہ رہے ہو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کوئی ہے جو اس کا دعوے دار ہو سکتا ہے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ یہ دولت اور جائداد اسے مل جائے۔ دادی وکٹوریا کی دولت و جائداد کا وارث ولیم فوسٹر ہے۔''

''وہ وارث ہرگز نہیں ہو سکتا۔'' جیمس چیخ پڑا۔ ''وراثت کا دعویٰ اس پر قاتل ہونے کا ٹھپا لگا دے گا۔''

اس بات پر وکیل میکالے نے شانے اچکا دیے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بادی النظر میں ایسا ہی ہے۔ لیکن وہ دعویٰ کر سکتا ہے جیمس، وہ کہہ سکتا ہے کہ دادی وکٹوریا کی موت کے وقت وہ ان کے پاس تھا۔''

اس بات پر جیمس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''اسے دعویٰ کرنے دو۔ اگر اس نے ایسا کیا تو عدالت اسے پھانسی پر لٹکا دے گی۔ اس سے ایسی ہی حماقت کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''نہیں، وہ اسے پھانسی پر نہیں لٹکا سکیں گے۔'' وکیل میکالے نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''تمہیں معلوم ہوگا جیمس کہ اس ملک میں کسی شخص پر کسی ایک جرم کے الزام میں دو مرتبہ مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے...... ولیم فوسٹر پر دادی وکٹوریا کی ہلاکت کے جرم میں پہلے ہی مقدمہ چل چکا ہے اور اسے اس الزام سے بری قرار دیا جا چکا ہے، اب بتاؤ کیا کوئی طاقت اسے دادی وکٹوریا کی دولت و جائداد کا دعویٰ کرنے سے روک سکتی ہے؟ ویسے بھی وہ دادی کی موت کے وقت ان سے قریب تر تھا۔ تم بے چارے تو بہت دور تھیٹر میں فلم دیکھ رہے تھے۔''

وکیل میکالے کے لہجے کا زہر جیمس کے دل و دماغ میں اترتا چلا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اب وہ بے بسی سے اپنا سر پیٹنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

قسط :8

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں

ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

ایڈووکیٹ خانم شاہ کی بات سے مجھے ہی نہیں زبیر خان کو بھی سخت اختلاف تھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی نفی میں اپنا سر اور ہاتھ بیک وقت ملاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں.... ہرگز نہیں، شہزاد کی از خود گرفتاری ایک بے وقوفانہ عمل ہوگا۔ مجھے حیرت ہے، آپ یہ.... غیر دانشمندانہ مشورہ دے رہی ہیں؟“ زبیر خان کی حیرت میں تلخی کا عنصر بھی تھا۔ اسی اثنا میں اس نے پاس بیٹھی نیلی کو مخصوص اشارہ کر کے وہاں سے چلتا کر دیا۔

”بعض حالات و معاملات میں ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں خان صاحب۔“ خانم شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بھی متانت سے بولا۔

”اور بعض حالات و معاملات میں اس طرح کی گرفتاری خود اپنے ہی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔“

خانم شاہ کے جواب میں زبیر خان خود ہی میرا دفاع کر رہا تھا۔ اس لیے سر دست میں خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ تاہم میں بظاہر خاموش چہرے اور بھانپتی نظروں سے خانم شاہ کی گفتگو سے کچھ اندازہ بھی اخذ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے لگتا تھا کہ اپنی بہن آسیہ کے اس بہیمانہ قتل پر وہ بہت رنجیدہ اور مضطرب الحال ہو رہی تھی، میرا تجربہ تھا کہ ایسی کیفیات میں انسان کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے حالانکہ زبیر خان سے زیادہ خانم شاہ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ میرا پولیس کے ہتھے چڑھنا بالخصوص سپرنٹنڈنٹ روشن خان کے، کس قدر بھیانک نتائج کا حامل ہوسکتا تھا۔ زبیر خان اس خطرناکی کو مدنظر رکھتے ہوئے خانم شاہ کے مشورے کی سختی سے نفی کر رہا تھا۔

”دیکھیے خان صاحب! قانونی معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے آپ سے زیادہ میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اس میں کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی یوٹرن لینا پڑتا ہے۔“

خانم شاہ کی اس بات نے بالآخر مجھے بولنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اس کے بہ ضد رہنے اور اپنے کمزور.... مگر خود غرضانہ موقف پر ڈٹے رہنے اور اپنی وکالت کا ہم پر دانستہ رعب جھاڑ کر.... قائل کرنے کی روش نے مجھے بھی تلخ بنا دیا۔ لہٰذا میں نے خانم شاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”خانم صاحبہ! کم از کم میرے معاملے میں کوئی قانونی پیچیدگی یا باریکی سرے سے ہی نہیں نظر آتی ہے۔ میرا معاملہ تو سیدھا اور صاف ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ کی بات پر کہ آپ کو تو ساری حقیقت کا علم ہے کہ پولیس مجھے قانون کی خاطر نہیں بلکہ اپنے راتب نوازوں کی خوشنودی کی وجہ سے گرفتار کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ روشن خان کے عزائم سے آپ بھی واقف ہیں۔ ممتاز خان پولیس اور قانون کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دو بار جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کی مذموم کوشش کر چکا ہے۔“

میرے لب و لہجے میں جوش عود کر آیا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اب خانم شاہ کی خود غرضانہ ہٹ مجھ پر اچھی طرح واضح ہونے لگی تھی۔

میری دو ٹوک اور مدلل گفتگو نے شاید خانم شاہ کو.... باور کرا دیا تھا کہ وہ مجھے آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتی۔ نیز یہ بھی کہ مجھے بھی اس کی خود غرضانہ سوچ کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے اندر کا دبا ابال بالآخر امڈ آیا۔

”شہزی! میری معصوم اور بے گناہ بہن آسیہ صرف تمہاری وجہ سے ایک دردناک موت سے ہمکنار ہوئی ہے۔ وہ اپنا آرام و سکون تج کر محض تمہاری مدد کی خاطر آخری دم تک پرعزم رہی تھی اور جب اس نے تم پر اپنی عزت اور جان... بڑی جاں کنی کے عالم میں قربان کر ڈالی ہے تو تم اتنے خود غرض ہو گئے ہو کہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے ایک ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتے، مجھے تم سے اتنے گھٹیا رویے کی توقع نہ تھی۔“

کوئی چارہ کار نہ پاتے ہی خانم شاہ اب اس نہج پر اتر آئی تو مجھے مجبوراً اسے آئینہ دکھانا ہی پڑا۔ اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے متانت سے بولا۔ ”میں تو اب تک دانستہ کسرِ نفسی سے کام لے رہا تھا۔ کیونکہ اس حقیقت سے آپ کو بھی آپ کی بہن آسیہ میرے سامنے اپنی بھیانک غلطی کا اظہار کرتے ہوئے آگاہ کر چکی تھی کہ وہ میری مدد نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی خاطر وہ میرے ساتھ اس مہم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک غلط ویڈیو کلپ نے ہی درحقیقت میرے لیے اَن گنت مسائل کھڑے کر دیے تھے، جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے پھر بھی آسیہ کی اس غلطی کو معاف کرتے ہوئے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ ایک باضمیر اور باغیرت لڑکی تھی۔ وہ ضمیر کا قیدی بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی، اب رہی بات آپ کا میری سوچ کو گھٹیا کہنے کی تو... خانم صاحبہ! مجھے خود آپ کی اس گھٹیا سوچ پر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ ان تمام پیش آنے

والے حالات سے ناواقف نہیں ہیں۔‘‘

میری جچی تلی جوابی کارروائی نے ایک ایسی پروفیشنل عورت کو گنگ سا کرکے رکھ دیا تھا جسے اپنے آپ پر بڑا زعم تھا کہ وہ عدالتی دنیا میں اپنی دھواں دھار بحث سے سینئر وکیلوں کو لاجواب کردیتی ہوگی۔ وہ میری صورت میں بہ ظاہر ایک عام جذباتی نوجوان کو بے نام سی غیرت کا جوش دلا کر قائل کرلے گی۔ اس کا سارا زعم ناک کے راستے بہہ نکلا تھا۔ زبیر خان مجھے اپنے موقف کے حق میں مدلل اور جامع گفتگو کرتا پاکر... دانستہ طمانیت بھرے انداز میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

خانم شاہ فوراً اپنی اصلیت پر اتر آئی اور مارے طیش کے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’ٹھیک ہے شہزی! اگر تم میرے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنے کو تیار نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھی کسی قسم کی امید نہ رکھنا... اور یہ بھی تم سن لو... اپنی بہن کے قاتلوں کو تختۂ دار پر چڑھانے تک میں پُرعزم رہوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کسی کو بھی تختۂ مشق بنانا پڑے... بائے...‘‘

وہ بھنائے ہوئے انداز میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہوگیا۔ مجھے اس کی بالکل پروانہ تھی کہ جو اس نے مجھ سے تعاون کے سلسلے میں کہا تھا۔ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد میرے لیے مسائل کھڑے کرسکتی تھی۔ وہ بے وقوف تھی، انتقامی روش میں وہ آسیہ کے سفاک قاتلوں کو کیفرِکردار تک کیا پہنچائے گی... بلکہ الٹا میرے خلاف ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ درحقیقت مجھے اس کی نہیں اُسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ مگر جوشِ انتقام میں جلد بازی کا مظاہرہ کررہی تھی اور یہ عین وہی حرکت کررہی تھی جو اس کی چھوٹی بہن آسیہ نے کی تھی۔

میں نے فکرمندی سے سامنے صوفے پر بہ ظاہر آرام سے بیٹھے ہوئے زبیر خان کی طرف دیکھا۔ یقیناً اسے بھی ادراک ہونا چاہیے تھا کہ بپھری ہوئی خانم شاہ کا نیلی کوٹھی سے اس طرح نکلنے کا مطلب... اس جگہ کو بھی پولیس اور دشمنوں کی نظروں میں مشکوک بنانے کے مترادف ہے۔

تب میں نے دیکھا۔ زبیر خان نے اپنے سیل پر کسی سے گمبیر لہجے میں تحکمانہ کہا۔

’’ایک باؤلی کتیا یہاں سے نکل رہی ہے۔ گیٹ پار کرنے سے پہلے اسے دبوچ کر اندر کمرے میں پہنچادو۔ اور اس کے منہ پر پٹی بھی باندھ لو۔‘‘ یہ حکم دینے کے بعد وہ زہرخند انداز میں مسکرایا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

’’مجھے ایسا مجبوراً کرنا پڑا۔ ورنہ اس کے یوں جانے کے بعد یہ کوٹھی تمہارے لیے محفوظ نہیں رہتی۔‘‘ مجھے اس کی بات درست لگی مگر مجھے یہ بھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

’’میں خانم شاہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔‘‘

’’چند گھنٹے گزر جانے دو۔ کبھی کبھی انسان کا ابال دماغ سے نیچے اترنے لگتا ہے تو تب ہی اسے بات سمجھ میں آتی ہے۔‘‘ وہ بولا۔ اسی دوران گارڈ اندر داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔

’’خان جی! خاتون کو اندر پہنچادیا گیا ہے۔‘‘

’’اس کی گاڑی بھی اندر کرلی ہے؟‘‘

’’جی خان جی...‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ہاں... وہ ذرا نیر کو بھیج دو سامان کے ساتھ۔‘‘

’’جی بہتر۔‘‘ گارڈ نے مؤدبانہ کہا اور چلا گیا۔ زبیر خان نے کسی نیر نامی آدمی کو نجانے کون سا سامان لانے کو کہا تھا۔ مگر جب ذرا ہی دیر بعد ایک چھریرے جسم کا آدمی ہاتھ میں درمیانی سائز کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تو بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔

نیر نامی اس آدمی نے جو ٹرے درمیان میں بچھی شیشے کی ٹاپ والی میز پر سجائی تھی، اس میں ’’لوازمات آوارہ‘‘ کا سامان سجا ہوا تھا۔

اعلیٰ برانڈ کی انگلش وسکی، دو بلوریں پیگ، ایک چیوڑے اور بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں کی پلیٹوں کے علاوہ، آئس کیوب کا باؤل بھی تھا۔ جس کے اندر چند آدھ کٹے لیموں رکھے ہوئے تھے۔

’’کیوں نوجوان! شغل تو کرتے ہوگے...؟‘‘ زبیر خان نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میں نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

’’جی بالکل نہیں... آپ کیجیے۔‘‘

میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ ذرا تنہائی چاہتا تھا اور زبیر خان نے خود ہی یہ مسئلہ حل کردیا۔ گارڈ کو آواز دے کر بلایا پھر مجھ سے بولا۔

’’تم ذرا اندر جاکر کچھ دیر آرام کرلو، پھر باتیں کرتے ہیں۔‘‘ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ گارڈ ہولے سے میرے سامنے خم ہوا، میں... اس کے عقب میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے کمرے تک چھوڑ کے گارڈ پلٹ

گیا۔ میں آرام دہ بیڈ پر نیم دراز سا ہو کر سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

حالات عجیب رخ اختیار کر رہے تھے، دوست دشمن ہو رہے تھے، جانے میری تقدیر میں آگے کیا لکھا تھا۔ میں جتنا حالات سدھارنے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر... دگرگوں ہوتے چلے جاتے۔ میرے بازو کا زخم اب قدرے بہتری کی جانب مائل تھا۔ یہاں بھی میری پٹی کی گئی تھی۔

میرے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ پھر شاید ہوا سے یا اپنے جھول میں وہ تھوڑا سا مزید کھل گیا۔ دری بچھا روشن کوریڈور مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ میں یونہی وہاں غیر مرئی نقطے پر اپنی نظریں جمائے سوچ میں غرق تھا کہ معاً وہاں میں نے کسی کی جھلک دیکھی۔ پھر ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور ہلکی مخصوص خوشبو سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نیلی خاتون تھی۔ اسے میں نے کچھ ثانیے کے لیے اپنے کمرے کے سامنے رکتے دیکھا تھا اور اندر جھانکتے ہوئے بھی۔ میرے دل کو پھر بے چینی سی کھانے لگی۔ وہ آگے بڑھی، میں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ہلکی موسیقی کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کا کمرا میرے کمرے کے برابر میں تھا یا پھر وہ دانستہ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی، کوٹھی بڑی تھی اور وہ اس کی مالک تھی۔ اچانک ایک گانے کے بول کچھ واضح اور اونچی آواز میں سنائی دیے۔ یہ ایک انڈین موی کا مشہور گانا تھا۔

گلی گلی میں پھرتا ہے... تو کیوں بن کے بنجارہ
آ... میرے دل میں بس جا... میرے عاشق آوارہ

مجھے یہ بات اور نیلی خاتون کا یہ فلمی گیت سننا عجیب اور عامیانہ سا محسوس ہوا اور اس سے بڑھ کر اس کی یہ حرکت بھی... کہ وہ دانستہ دو تین بار ری وائنڈ کر کے گانے کے یہی بول مجھے سنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہرحال... مجھے ان خرافات سے کب دلچسپی تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ موسیقی کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر گزری۔ شاید موسیقی بھی بند کر دی گئی۔ اب خاموشی طاری تھی۔

میں... سوچنے کے لیے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آیا تھا۔ نیلی خاتون کی ٹین ایج لڑکیوں جیسی حرکت مجھے ناگوار گزری تھی۔

میں ایک بار پھر سوچ میں محو ہو گیا۔ میں زبیر خان کے متعلق سوچنے لگا کہ وہ میری مدد کے سلسلے میں آخر کس حد تک سنجیدہ ہے؟ اور کس قدر کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ جبکہ ادھر ایڈووکیٹ خانم شاہ نے بھی ایک نیا مسئلہ... بالفاظِ دیگر شوشہ چھوڑ دیا ہے۔

مجھے اپنے کمرے میں آئے نصف گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ میں خیالات کے بھنور سے چونک کر ابھرا اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولا...

"کون...؟ آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ زبیر خان نے "شغل" فرمانے کے بعد مجھے بلانے کے لیے کسی کو میرے کمرے میں بھیجا تھا مگر جب دروازہ کھلا تو میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے نیلی خاتون کھڑی تھی۔

☆☆☆

پُرکشش اور حسین کتابی چہرہ، دراز قامت، لمبے ریشمی بال، متبسم ہونٹ اور گہری بولتی ہوئی سی دلکش آنکھیں... نیلی کو دیکھ کر میں فوراً بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"آ... آپ... یہاں... کیسے؟"

"کیوں؟ کیا میں یہاں نہیں آسکتی؟" وہ اٹھلائے ہوئے لہجے، رمزیہ مسکراہٹ اور معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ساتھ میں چند قدم چلتے ہوئے اندر بھی آگئی... اور اک ادائے دل آرا کے ساتھ صوفے پر براجمان... ہو گئی، مجھے گھبراہٹ نے آن لیا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ نیلی نے ہلکے پنک کلر کی چکیلی گولڈن لیس والا بیش قیمت شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ باریک ریشمی مہین لباس میں اس کا وجود ہر قدم پر تھرکتا ہوا بھی لگتا تھا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ وہ حسین ہی نہیں بلکہ بہت دلربا اور پُرشباب جسم کی مالک بھی تھی۔

اس کے حسن و شباب کی رعنائی دیکھ کر دل میرا بھی بے طرح دھڑکا تھا مگر میں خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"زبیر صاحب میرے منتظر ہوں گے مجھے ان کے پاس جانا چاہیے۔" مقصد اس حسین قاتلہ سے جان چھڑانا تھا میرا۔ اس کا یوں میرے کمرے میں آنا اور پھر بیٹھ بھی جانا مجھے معیوب سا لگ رہا تھا اور بارِ خاطر بھی۔ وہ زبیر خان کی بیوی تھی۔ دوسری یا تیسری ہی سہی، مجھے اس سے کوئی غایت نہیں تھی، کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا... اس کے کسی آدمی کی نظر پڑ سکتی تھی، وہ کیا سمجھتا۔

"وہ دو تین گھنٹے سے پہلے اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔" اس نے مترنم سی آواز میں کہا۔ اس کی بولتی آنکھوں

کی سرگیں چمک میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہونے لگی۔

''میں انہیں ہلانے جھلانے نہیں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں میکانیکی انداز میں رک گیا۔ ایک بار پھر اس کا دلکش حسین چہرہ ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی کی زد میں تھا پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''ٹھہرو، ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم خان صاحب کے آدمیوں میں شامل ہوگئے ہو؟'' اس کا سوال مجھے عجیب لگا۔

بہرحال میں نے فوراً جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''وہ دوست تو کسی کو کم ہی بناتے ہیں۔ اپنا غلام بنانے میں وہ کسی کو دیر نہیں لگاتے۔''

''میں کسی کا آلۂ کار یا غلام بننا پسند نہیں کرتا۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں بہت جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنا آلۂ کار بنانے کا ہنر بہ خوبی جانتے ہیں۔'' اس کی بات پر مجھے چونکنا پڑا... پھر وہ مجھے اسی طرح سوچتا چھوڑ کر پلٹ گئی۔ عجیب شخصیت تھی اس عورت کی بھی، کبھی مجھے اس کی حرکتیں عامیانہ قسم کی لگتی تھیں اور کبھی ایک دم بردبار اور رکھ رکھاؤ والی مدبر عورت کے روپ میں نظر آنے لگتی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سرِدست کمرے سے نکلنے کا ارادہ بدل دیا اور دوبارہ بیڈ پر جا بیٹھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر خانم شاہ اپنا رویہ درست رکھتی تو اس کے ذریعے میں شوکی وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ مدد لینے کی کوشش کرتا مگر معاملہ اب الٹی آنتیں گلے پڑنا جیسا ہوگیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مجھے خانم شاہ سے ملنا چاہیے تھا۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ جوش اور انتقامی رویے سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ میری بات سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرے... کہ اسی میں سب کی بھلائی تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنے بھائی، اپنے دوست، اپنے غمگسار، جاں نثار ساتھی اول خیر کے بارے میں بھی فکرمند تھا اور اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زبیر خان ان سارے معاملات میں میری کیا مدد کرسکتا تھا؟ لہٰذا جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنے ''شغل'' سے تقریباً فارغ ہوچکا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں پنسل نما سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں سیل فون، جسے وہ اپنے کان سے لگائے کسی سے اختتامی گفتگو کررہا تھا... میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔

''میں نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے جاننے والے سینئر وکیل سے بات کی ہے۔ وہ کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

میں نے ہولے سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا معاملہ طوالت اختیار کرسکتا ہے مگر میری کوشش ہوگی کہ پہلے... میرے ساتھیوں کو پولیس کی حراست سے چھڑانا از بس ضروری ہوگا۔ کیونکہ ان کے ذریعے مجھے بلیک میل کیا جاسکتا ہے یا کسی دباؤ کا شکار کیا جاسکتا ہے۔'' میری بات سن کر زبیر خان نے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔

''خان صاحب! اگر ممکن ہوسکے تو پہلے آپ پولیس کی حراست میں موجود میرے تین ساتھیوں ارشد، شوکت حسین اور شکیلہ کی ضمانت وغیرہ پر رہائی کا بندوبست کردیتے تو مجھے زیادہ تسلی اور خوشی ہوتی۔'' میری بات پر اس نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا اس دوران نہ جانے کیوں نیلی کے الفاظ میرے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں سنائی دینے لگے۔

''تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے... خان صاحب کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا آلۂ کار بنانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔''

میں نے سر جھٹک دیا۔ یہ اپنی جگہ ایک یقینی امر تھا... اگر زبیر خان میرے کسی کام آرہا تھا تو پھر مجھے بھی اس کے کسی کام آنے میں عار نہیں محسوس کرنا چاہیے تھا۔ اس میں آلۂ کار بننے والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ اب تک زبیر خان کا میرے ساتھ دوستانہ رویہ ہی تھا۔ اس میں کسی تحکم کا دخل کب تھا۔ لہٰذا میں نے دل ہی دل میں نیلی خاتون کی بات رد کرڈالی۔

''تمہیں خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی بڑی فکر رہتی ہے نوجوان!'' کچھ سیکنڈ کے وقفے کے بعد زبیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''بات ہی ایسی ہے خان صاحب! کیونکہ وہ میرے دوست ہیں۔ مصیبت کی گھڑی میں میرے کام آتے رہے ہیں اور اب میری ہی وجہ سے وہ خود مصیبت کا شکار ہیں۔ مجھے تو فی الحال فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے مگر وہ خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔''

''ابھی حیات مرزا آنے والا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کا ایک سینئر وکیل ہے۔ میرے پرانے شناساؤں میں سے ہے۔ تمہارے سلسلے میں مشورے کے بعد میں اس سے یہ

بات بھی کروں گا۔''

''بہت شکریہ... خان صاحب آپ کا۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ وہ بہ غور پُرسوچ نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ماحول میں یکطرفہ دم بہ خود سا سناٹا طاری رہا۔ میں اب بے چینی سے منتظر تھا کہ زبیر خان کب اپنے مطلب کی بات مجھ سے کرتا ہے جس کا اظہار اشارتاً وہ فون پر مجھ سے کرتا رہا تھا۔ مزید کچھ ثانیے اور بیت گئے تو میں نے ہی زبیر خان سے کہا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو... میں خانم شاہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''ایسی عورتیں ٹیڑھی کھیر ہوتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھے گی تمہاری بات، اسے سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔'' زبیر خان نے کہا۔

''شاید آپ صحیح کہہ رہے ہوں، ممکن ہے اب ان کا جوش کچھ کم ہوگیا ہو اور وہ میری بات سمجھ لیں۔''

''گارڈ!'' زبیر خان نے بلند آواز میں پکارا۔ گارڈ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔ زبیر خان نے اسے مجھے خانم شاہ سے ملانے کا کہا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور گارڈ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ایک چوڑی راہداری سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر میری مڈبھیڑ نیلی سے ہوگئی، اس نے اپنے ریشمی گھنے بالوں میں ہیئر برش پھنسا رکھا تھا۔ میری طرف اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے دیکھا تھا اور مسکراہٹ میں مجھے طنز کی کاٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

خانم شاہ کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں یرغمال بنا کے رکھا ہوا تھا۔ گارڈ دروازے پہ رک گیا جبکہ میں اندر داخل ہوگیا۔

اندر روشنی تھی۔ کمرا بہتر تھا۔ ایک بیڈ اور دو کرسیاں دھری تھیں۔ واش روم بھی تھا، ایک کھڑکی تھی، جو باہر بنجر ویرانے میں کھلتی تھی۔ اس کے اوپر گول روشندان تھا۔ خانم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیڈ پر بٹھا رکھا تھا۔ منہ پر اسکاچ ٹیپ تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ذہنی خجالت کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی متورم نظر آتی تھیں۔ اسے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوا تھا اگرچہ وہ بلاوجہ کا رخنہ نہ ڈالتی تو اس کا آج یہ حال نہ ہوتا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت آمیز درشتی کے تاثرات ابھرے تھے۔ وہ کسمسائی بھی تھی، میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب آیا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں پہ چسپاں اسکاچ ٹیپ اس طرح ہٹا دیا کہ ہونٹوں سے ہٹ گیا مگر باچھوں میں اٹکا رہا۔... بہ وقتِ ضرورت میں اسے بہ آسانی دوبارہ اپنی جگہ چسپاں کرسکتا تھا۔

''... تت... تم... ذلیل...! کمینے... احسان فراموش... میرا یہ حشر کرانے، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی...'' وہ جیسے پھٹ پڑی۔

میں برداشت سے کام لیتے ہوئے نہایت تحمل سے بولا۔ ''ایسے گالم گلوچ والے الفاظ آپ کو زیب نہیں دیتے محترمہ! افسوس ہے مجھے کہ آپ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی خاتون ایسے الفاظ بھی استعمال کرتی ہوں گی۔''

''زیادہ مہذب بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ پھر بپھری۔ ''مجھے اس طرح یرغمال کیوں بنایا ہے تم نے...؟ وحشی انسان۔''

''اس میں میرا کوئی دخل نہیں، یہ عمل کسی اور کا ہے۔''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں، مجھے نکالو یہاں سے، جانتے ہو اس طرح ایک خاتون وکیل کو حبسِ بے جا میں رکھنا کتنا بڑا سنگین جرم ہوتا ہے؟''

''محترمہ! اگر قانون کی تشریح اتنی سادہ ہوتی تو آج میں بے گناہ ہونے کے باوجود ایک ایسے قانون سے کیوں منہ چھپاتا پھر رہا ہوتا جسے محض دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر سنگین اور نرم بنانا ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش تو بالکل نہ کریں۔ میں آپ سے مفاہمت کے سلسلے میں بات چیت کرنے آیا تھا۔ زبیر صاحب سے خصوصی اجازت لے کر... اگر یہ موقع آپ نے گنوا دیا تو پھر وہ جانیں اور آپ... میں درمیان سے نکل جاؤں گا۔''

میری اس بات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوتے ہوتے بے چارگی جیسے تاثرات میں بدل گیا۔ اس نے بے اختیار حلق سے ایک گہری سانس خارج کی جیسے خود کو پُرسکون کر کے اعصاب زدگی سے چھٹکارا پانا چاہتی ہو اور اسی لہجے میں بولی۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

''فقط اتنا کہ... خدارا...! ہسٹریائی جوش اور غصے کی عینک اتار کر ٹھنڈے دل و دماغ سے بات سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔'' میں نے قدرے رسانیت سے کہا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ مجھے آسیہ کی موت کا دکھ نہیں... یا اس کے قاتل اور دشمن کوئی اور ہیں۔ ہرگز نہیں، میں تو خود بھی انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم کیے بیٹھا ہوں اور ان

چاروں بھیڑیا صفت افراد کو بھی موقع پر واصلِ جہنم کر چکا ہوں جنھوں نے چوہدری ممتاز خان کے ایما پر آسیہ کے ساتھ یہ بھیانک اور شیطانی کھیل کھیلا تھا۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو کر ایک بار پھر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا جس میں مثبت اشارہ پایا جاتا تھا۔

''بہن کی اچانک اور اس طرح کی سنگین موت کا سن کر آپ کا ردِعمل فطری تھا... لیکن پلیز! اب تو آپ سمجھنے کی کوشش کریں... تو خود آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا کہ میری از خود گرفتاری میرے لیے نقصان دہ اور دشمنوں کے لیے کس قدر سودمند ثابت ہوگی۔ آپ بھی اچھی طرح یہ تلخ حقیقت جانتی ہیں کہ میرے ساتھ اگر صحیح معنوں میں معاملہ قانون کا ہوتا تو اس کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا لیکن یہاں معاملہ ہی الٹا ہے۔ دشمن مجھے قانون کی آڑ لے کر ہی اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔''

''شاید میں غلطی پر تھی۔'' معاً ہی خانم شاہ کے لرزتے ہونٹوں سے برآمد ہوا — میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں اسے مزید آگے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے خاموش رہا تو وہ اسی لہجے میں دوبارہ بولی۔ ''تم نے صحیح کہا شہزی! شاید آسیہ کی موت کی خبر نے مجھے اعصاب زدہ کر دیا تھا اور میں تمھیں دیدہ و دانستہ مصیبت میں دھکیلنا چاہ رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ ہمارے دشمنوں کا مقصد ہی یہی ہے کہ قانون کی آڑ لے کر تمھیں راستے سے ہٹایا جاسکے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ آپ کو میری بات سمجھ آگئی۔'' میں نے کہا۔

وہ خجالت آمیزی سے بولی۔ ''شہزی! سوری، میں نے تمھیں غلط سمجھا اور برا بھلا بھی کہا۔ میں اپنے نازیبا الفاظ واپس لیتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو پردہ پوش حقائق کا بالآخر ادراک ہو ہی گیا...'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ بولی۔

''مگر شہزی!... کیا اس طرح مجھے یرغمال بنا کر یہاں رکھنا ایک درست عمل ہوگا؟ آخر کب تک تم... میرا مطلب ہے، یہ زبیر خان مجھے اس طرح حبسِ بے جا میں رکھ سکتا ہے؟''

''میں ان سے بات کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے جواب میں کہا اور پھر یہی وہ لمحات تھے جب اچانک میرے ذہن میں خانم شاہ کی طرف سے ایک کھٹک نے سر اٹھایا تھا۔ یعنی... ''مکاری۔''

کہیں یہ عورت میرے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہی تھی؟ پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں کون سا اسے ابھی یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ یہ فیصلہ یقیناً میرے اور زبیر خان کی باہمی مشاورت سے ہی طے پاسکتا ہے۔ تاہم میں نے اس سے ازراہِ تشفی کہا۔

''اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اس سلسلے میں ابھی زبیر خان سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے دیکھا... میری بات پر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے الجھن سی تیر گئی تھی۔

''شاید تم بھی مجبور ہو، میں سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری، تمھیں زبیر خان نے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ظاہر ہے اس سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔'' مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ شاید وہ اب صورتِ حالات کو سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں ذہن میں ابھرنے والی میری تشکیک کچھ کم ہونے لگی تو میں نے مسکرا کر اسے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں زبیر خان سے بات کرتا ہوں، یہاں آپ کے ساتھ کوئی بھی نازیبا حرکت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ کم از کم میرے یہاں ہوتے ہوئے یہ سب ناممکن ہے۔'' کہتے ہوئے میں جانے کے لیے بیڈ سے اٹھا۔ میں نے اسکاچ ٹیپ اتار کر پھینک دیا۔ اس پر خانم شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر بولی۔

''ذرا ایک منٹ...'' میں رک کر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''واش روم تو یہاں ہے مگر اس کا فائدہ؟'' میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے اب اس رسن بستہ حالت میں رکھنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی ساری بندشیں کھول دیں۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور واش روم کی جانب بڑھی اور بند دروازے پر زور آزمائی کرنے لگی۔ میں اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے واش روم کے دروازے کو دھکا لگایا تو وہ بہ آسانی کھل گیا۔ مجھے کھٹک آمیز حیرت ہوئی، اسی وقت مجھے عقب سے خانم شاہ نے زوردار دھکا دیا اور پلٹ کر دوڑی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کمرے کے باہر گارڈ تاج دین عرف تاجا موجود ہے۔ ادھر میں بھی فوراً سنبھل کر پلٹا۔ تب تک خانم شاہ پھرتی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر۔ دوڑ لگا چکی تھی اور اس کے تعاقب میں گارڈ کی غصیلی چیختی آواز سنائی دی تھی۔ میں بھی دوڑا۔

خانم شاہ کا رخ زینے کی طرف تھا۔ وہ جوش میں دو دو، تین تین قدم پھلانگتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ اسی وقت میں نے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے گارڈ کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھی۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ گولی چلانے کی جرأت نہیں کرے گا اور اگر چلائے گا بھی تو محض خانم شاہ کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر۔

مگر جیسے ہی خانم شاہ بیرونی دروازے کی طرف دوڑی، گارڈ نے رک کر اس کا نشانہ لیا۔ میں حلق کے بل پیچھے سے چلایا۔

”نہیں گارڈ۔“

”ڈز...“ ایک دھماکا ہوا اور میری نظروں نے خانم شاہ کی پشت سے خون کا فوارہ ابلتے دیکھا۔ وہ ایک بھنچی بھنچی چیخ سی خارج کر کے ڈھیر ہو گئی۔ میں نے گارڈ کی اس سفاکانہ حرکت پر جنونیوں کی طرح اسے جالیا۔

”ذلیل... اکتے! یہ تو نے کیا کر دیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے ایک زوردار گھونسا گارڈ کی ٹھوڑی پہ رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اسی اثنا میں دو افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ تھوڑی دیر میں زبیر خان بھی تشویش زدہ چہرے کے ساتھ وہاں آ گیا۔

”خان صاحب... اس نے... اس درندے نے... اس پر گولی چلائی تھی... وہ مر رہی ہے۔ اسے بچا لو۔“ میں نے دونوں تنومند آدمیوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی پیشانی پہ ان گنت سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔ گارڈ منہ سنبھالے میری جانب خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے معاندانہ چمک تھی۔ زبیر خان نے اپنے آدمیوں سے تحکمانہ کہا۔

”عورت کو اٹھا کر اندر لے جاؤ، اور اسے سنبھالو۔“

مجھے چھوڑ کر دو آدمی بے سدھ پڑی خانم شاہ کی جانب لپکے۔

”اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا، خان صاحب...“ میں نے زبیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر اس نے میری بات نظرانداز کرتے ہوئے غصے سے گارڈ کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”اسے گولی مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ ہمیں جل دے کر بھاگ رہی تھی، خان جی۔“ گارڈ نے کہا۔

خانم شاہ کی حالت تشویشناک تھی۔ میں نے ایک بار پھر زبیر خان کے سامنے اپنی بات دہرائی تو وہ جھلا کر بولا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے شہزی؟ مجھے کچھ سوچنے دو... تم ذرا خاموش رہو۔“ اس کے بعد اس نے گارڈ سے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا۔

زبیر خان نے معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”دھیرج رکھو، ابھی ڈاکٹر پہنچ جاتا ہے...“

مگر میری تسلی نہ ہوئی، میں اس کمرے میں موجود رہا جہاں خانم شاہ نزع کے عالم میں ایک بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ خانم شاہ کی حالت زار دیکھ کر میری تشویش لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خانم شاہ کو کسی کلینک یا اسپتال نہیں لے جایا جا سکتا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ ایک انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑتے مرتا ہوا دیکھا جائے... یہ بے رحمی اور بے حسی کی انتہا تھی۔ نہ جانے کس طرح اور کتنی دیر میں اپنی ابلتی جلتی کیفیات پر قابو پائے رہا۔ کچھ وقت بیت گیا تو گارڈ اور اس کے ساتھی ایک ڈاکٹر کو لے آئے۔ اس بے چارے کو شاید زبردستی اس کے کلینک یا گھر سے اٹھا کر لایا گیا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ زبیر خان نے مجھے کمرے میں جانے سے روک دیا... خود بھی نہیں گیا۔

”ڈاکٹر کو زبردستی لایا گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا مجھے یا تمہیں وہ دیکھ پائے۔ میرے ساتھی صورت حال قابو کر لیں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ایک لحظہ بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر گارڈ کی اس سفاکانہ حرکت پر غضب ناک طیش چڑھ رہا تھا۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ اسی پستول کی ایک عدد گولی اس درندے کے بھیجے میں بھی اتار دوں۔

”اس میں خانم شاہ کی اپنی غلطی تھی۔ گارڈ نے سب بتا دیا ہے کہ وہ تمہیں کس طرح جل دے کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ شاید میرے چہرے سے ذہنی تناؤ کا اندازہ کرتے ہوئے زبیر خان نے کہا۔

”گارڈ نے یہ اچھا نہیں کیا خان صاحب...! خانم شاہ بہرحال ایک کمزور اور نہتی عورت تھی۔ اس پر گولی چلانا گارڈ کا ایک بے رحمانہ فعل تھا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا... تم ذرا خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ میں گارڈ سے باز پرس کروں گا۔“ زبیر خان نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

لگ بھگ کوئی نصف گھنٹا گزرا ہوگا کہ گارڈ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرے چہرے پر سخت ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے۔اس نے کہا۔

''خان جی! ڈاکٹر کہہ رہا ہے اسے بڑے آپریشن کی ضرورت ہے۔ گولی بہت اندر تک گھس گئی ہے اس نے ایک گردے کو نقصان پہنچایا ہے۔اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''
اس کی بات سن کر زبیر خان کی پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بن گیا، خود مجھے خانم شاہ کی طرف سے گہری تشویش لاحق ہونے لگی اور میں بے چینی سے منتظر تھا کہ اب زبیر خان کون سا قدم اٹھاتا ہے۔

''تم کسی بڑے ڈاکٹر کو اٹھا لاتے۔ جو ادھر ہی اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دیتا۔ یہ کس کو پکڑ لائے تم لوگ؟'' زبیر خان نے غصیلے لہجے میں گارڈ سے کہا۔

''خان جی! ہم نے اپنی طرف سے بڑے ڈاکٹر کو ہی اٹھایا تھا مگر... مجھے لگتا ہے وہ کوئی چالاکی چل رہا ہے۔'' گارڈ اپنی صفائی میں بولا... ''ابھی اس کو کنکا شنکا لگاتے ہیں... وہ ادھر ہی بڑا آپریشن کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔''

''نہیں...'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہر ڈاکٹر ہر علاج نہیں کر سکتا۔ جہاں تک اس کی اہلیت ہوتی ہے وہ اسی حد تک مریض کی جان سے کھیلتا ہے۔ اس سے زیادہ رسک نہیں لیتا۔ میرا خیال ہے وہ ڈاکٹر صحیح کہہ رہا ہے... خانم شاہ کی حالت بہت نازک ہے خان صاحب! اسے کسی طرح بھی فوراً سے پیشتر ہاسپٹلائز کرنا ضروری ہوگا۔''

''اسے اسپتال لے جانا اتنا آسان اور معمولی بات نہیں ہے۔ شہزاد احمد خان...'' زبیر خان نے گویا میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تھوڑی دیر خاموش رہو، اور ہمیں کچھ کرنے دو۔''
مجھے زبیر خان کے یوں ڈپٹنے کا انداز انتہائی ناگوار گزرا تھا مگر مجبور تھا مصلحتاً خاموش رہا۔ زبیر خان نے گارڈ کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کو اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر جہاں سے لایا گیا تھا وہیں چھوڑ دیا جائے۔ حکم پاتے ہی گارڈ پلٹ گیا۔ زبیر خان کچھ سوچتا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں اور زبیر خان اس کمرے میں پہنچے جہاں زخمی خانم شاہ کو رکھا گیا تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ ڈاکٹر نے فرسٹ ایڈ کے طور پر اوپری زخم کی ڈریسنگ وغیرہ کر دی تھی اور شاید کوئی ٹیکا بھی لگا دیا تھا۔ اس کے چہرے پہ سخت نقاہت طاری تھی۔ رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا... سانسیں بھی وہ اکھڑی اکھڑی لے رہی تھی ہر سانس پر اس کے اوپری وجود کو ہلکا سا جھٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے خانم شاہ بہ زبانِ خاموشی مجھ سے التجا و فریاد کر رہی ہو۔ ''شہزی... کیا میں بھی اپنی چھوٹی بہن آسیہ کی طرح بے موت ماری جاؤں گی؟ اس کی طرح میرا بھی پرسانِ حال کوئی نہ ہوگا؟ کیا تم اب بھی اپنی کھلی آنکھوں سے محض تماشا دیکھتے رہ جاؤ گے؟'' ان سوچوں کی یلغار سے میرا دماغ اٹنے لگا۔ ایک بار پھر میرے اندر فطری جی داریاں انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگیں جو دیوانہ وار مجھے آتشِ نمرود میں کودنے پر اکسا رہی ہوں۔ غم و جوش سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے قریب کھڑے زبیر خان کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولا۔ ''اپنے کیے کی سزا اب اسے خود ہی بھگتنی چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے میں اب میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ ایک انسان کی زندگی بچانے کی خاطر میں ہر خطرے کی دیوار کو پاٹنے کا عزم صمیم کر چکا تھا۔ برق جیسی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خانم شاہ کی اپنی گاڑی نیچے کار پورچ میں کھڑی ہوگی مگر چابیاں...؟ وہ یقیناً اس پرس میں ہوں گی جس کے اندر اس کا سیل فون بھی ہوگا مگر پرس کہاں ہے اور کیسے وہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ سرِدست مجھے اس کا حصول ناممکن ہی نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اس کی تلاش کا وقت تھا۔ یوں بھی اول خیر جیسے ساتھی نے مجھے ہر کام میں طاق و مشاق کر دیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی سن گن لی اور پھر خانم شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر کمرے سے نکلا۔ زینے کی طرف بڑھا تو ایک آدمی سے میرا ٹکراؤ ہوا۔ وہ پہلے تو بھونچکا رہ گیا۔ پھر مجھے روکنے کی کوشش کی، اسی وقت میری ایک لات حرکت میں آئی جو اس کے سینے پر پڑی۔ وہ زینے سے نیچے لڑکھڑاتا چلا گیا۔ میں بے ہوش خانم شاہ کو اٹھائے دیوانہ وار زینے اترتا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں دو آدمیوں سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں ان کے خان جی کا مہمان ہوں۔ قیدی نہیں، اس لیے انہیں تھوڑی دیر کے لیے بے وقوف بنانا آسان تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ انہوں نے ہی مجھے اسے لے جانے کا کہا ہے۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ پھر آگے کھسک گئے۔ شاید وہ اپنے خان جی کے پاس جا کر اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہوں گے۔ میرے

لیے اتنا موقع کافی تھا۔ پورچ میں خانم شاہ کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ شکر تھا کہ دروازے لاک نہ تھے اور ہوتے بھی کیوں، بھلا خانم شاہ کو کیا پتا تھا کہ مہمان کی حیثیت سے یہاں آنے کے بعد اس بے چاری کا یہ حشر ہونا تھا۔

میں نے پھرتی کے ساتھ عقبی دروازہ کھول کر خانم شاہ کے بے سدھ وجود کو بہ آہستگی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود بہ سرعت ڈرائیونگ سنبھال لی۔ جیسے ہی کار اسٹارٹ ہوئی، مجھے کچھ چلاتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ گیٹ پر تعینات دو گن بردار گارڈز ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ میری کار گولی کی رفتار سے ان کے قریب سے زناٹے دار آواز سے گزرتی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ عقب میں مجھے گولیاں چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی مگر میں اب کہاں رکنے والا تھا۔ شکر ہے کہ بھولی بھٹکی گولی نے کار کو نہیں چھوا تھا۔

سیدھی سڑک پہ آکر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ یہ علاقہ قدرے نواح میں ہونے کے باعث روڈ سنسان تھی۔ میرا رخ شہری آبادی کی طرف ہی تھا۔ میں نے ایسے ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ چھوڑا تھا جس میں میری اپنی جان پر بھی بن آسکتی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اس وقت صرف یہی سودا سمایا... ہوا تھا کہ اللہ کے حکم سے ایک بے گناہ انسان کی زندگی ہر حالت میں بچانا تھی۔ جلد ہی میں گنجان آبادی میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے تعاقب کا کچھ زیادہ خدشہ نہ تھا۔ ایک بڑے اسپتال کے احاطے میں آکر میں نے کار روک دی... پھر خانم شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایمرجنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ آج کل بڑی بڑی شخصیات کی ٹارگٹ کلنگ کے واقعات عام تھے۔ اس لیے اس طرح کی ایمرجنسی کو فوراً توجہ ملتی تھی۔

کاؤنٹر پر میں نے یہی بتایا کہ یہ ایک مشہور خاتون وکیل ہیں اور دو موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے ان کی کار پر فائرنگ کی تھی۔ میں ایک عام راہ گیر ہوں۔ محض اللہ کے واسطے اور انسانیت کے ناتے اسے یہاں لے آیا ہوں... وغیرہ۔

اسپتال کا عملہ فوراً حرکت میں آگیا اور خانم شاہ کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ جبکہ مجھے محکمہ اور ضروری قانونی کارروائی کے لیے وہیں استقبالیہ کاؤنٹر پہ موجود رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں ایسی کسی قانونی کارروائی کا سرے سے متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میں خود قانون کا ایک مفرور مجرم تھا۔ محض اس وقت تک میں وہاں رک گیا تھا کہ ڈاکٹری عملہ خانم شاہ کی طرف متوجہ ہو جاتا، اور میرا یہ کام ہو چکا تھا، لہٰذا اب میں خود یہاں سے نکلنے کے لیے پر تولنے لگا۔

جہاں ایمرجنسی کا استقبالیہ کاؤنٹر تھا، اس کی لابی خاصی کشادہ تھی۔ یہ کسی این جی او کی سرپرستی میں چلنے والا یہ بڑا اسپتال تھا اور اسے سرکاری معاونت بھی حاصل تھی۔ یہ غالباً پانچ چھ منزلہ تھا۔ لفٹ لگی ہوئی تھی۔ برابر میں زینے بھی تھے۔ اوپر یقیناً مختلف وارڈز بنے ہوں گے۔ لابی کے دائیں جانب بھی کشادہ ایمرجنسی وارڈز بنے نظر آرہے تھے۔ چونکہ یہ ایمرجنسی کا حصہ تھا جسے عام فہم میں "لال بتی" کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں متعلقہ عملے کے علاوہ مریضوں اور ان کے واسطے داروں کی خاصی چہل پہل نظر آتی تھی۔

مجھے کاؤنٹر کے بائیں جانب ایک اسٹول پر بٹھایا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک موٹی سی گوری استقبالیہ لڑکی خصوصی یونیفارم میں رجسٹر کھولے کچھ اندراج کرنے میں منہمک تھی۔ ایک پختہ عمر کا ساتھی بھی وہاں موجود تھا جو کاؤنٹر کے دراز میں کچھ تلاشنے میں مصروف تھا۔ دو میری طرح ینگ لڑکے یونیفارم میں ملبوس سرنج اور انجکشن کے ایمپول تھامے کھڑے آپس میں بیزار کن انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ یہاں کام کا دباؤ زیادہ نظر آتا تھا۔ مرکزی دروازہ شیشے کا تھا۔ وہاں بھی اسٹاف کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ ان ساری چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہاں سے اپنے کھسکنے کی کوشش کچھ زیادہ مشکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا ابھی میں اسٹول سے اٹھا تھا کہ اچانک میری نظروں نے جو پہلے ہی سامنے گیٹ نما مرکزی دروازے پہ جمی ہوئی تھیں، ایک تھرا دینے والا منظر دیکھا۔

شیشے کے پار احاطے میں ایک کار دندناتی ہوئی نہ صرف اندر داخل ہوئی بلکہ وہ سیدھی ایمرجنسی کے بند شیشے کے دروازے کے بالکل قریب ایک جھٹکے سے آن رکی، باہر تعینات عملے کے لوگ اسے روکتے ہی رہ گئے۔ کار کے دروازے کھلے اور پھر جیسے یکدم میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ میں نے چار پانچ مسلح افراد کو بڑی تیزی سے کار سے اترتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ ان سب کا رخ داخلی سمت تھا۔ دروازے پر تعینات شخص ان مسلح افراد کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہوگئی اور دل گویا سائیں سائیں کرتا کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پہلا شبہ میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ یہ زبیر خان کے آدمی ہو سکتے تھے جو میرے اس طرح خانم شاہ کو نیلی کوٹھی سے لے جانے پر اس نے میرے تعاقب میں

روانہ کیے تھے۔ مگر فوراً ہی مجھے اپنے اس خدشے کو رد کرنا پڑا۔ اس کے امکانات کم تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر... کیونکہ مجھے نہیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اس کے لیے اتنا سنگین ہوگا۔

وہ پانچوں بھاری اسلحے کے زور پہ شیشے توڑ کے اندر داخل ہوئے تو ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ جہاں تھے وہیں فرش بوس ہو گئے۔ جسے جہاں چھپنے کی جگہ ملی، وہ کونوں کھدروں میں دبک گئے۔ ایک نقاب پوش نے ہوائی برسٹ بھی چلایا۔ میرے وجود کا رواں رواں مرتعش تھا۔ میں نیچے جھک گیا اور موٹی لڑکی میرے ساتھ چپک گئی۔ خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس کا پختہ عمر کا ساتھی بھی وہیں کہیں دبک گیا تھا۔ ''جو جہاں ہے... وہیں دبکا رہے... ورنہ گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔'' نقاب پوش کی دھمکی آمیز اور غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ مگر اس آواز نے سر سے پاؤں تک میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی۔ سفاکی اور درندگی کا شائبہ دیتی یہ آواز میرے لیے غیر شناسا نہ تھی۔ اس مکروہ اور شیطانی آواز کو تو میں لاکھوں افراد کے ہم ہمے (شور) میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ صفت ابلیس... چوہدری ممتاز خان کے مقرب خاص کار پرداز جنگی خان کی آواز تھی... مگر میرے لیے اس وقت اہم اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ مردود و معلون یہاں کسی کو خون میں نہلانے کی غرض سے آیا تھا؟ بہت سی باتیں ذہن میں آتی تھیں۔ مگر اس وقت ان پر غور کرنے اور توجیہات تلاشنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر کے عقب سے ذرا سرک کر تھوڑا سر ابھارا اور اسے اپنے ساتھیوں سے کہتے سنا۔

''تم دونوں میرے ساتھ آؤ، وہ دونوں اوپر دوسری منزل کے جنرل وارڈ میں ہیں۔ آؤ۔''

میں نے اسے قد کاٹھ سے پہچان لیا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ لفٹ کے ساتھ بنے زینے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں کون تھے؟ جنہیں یہ درندہ اپنی خوف ناک بربریت کا نشانہ بنانے آیا تھا؟ میں شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ یہ لوگ میرے بھی دشمن تھے۔ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ ان کے دشمن میرے دوست بھی ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے میرے اندر بے چینی اور تشویش کی لہر دوڑا دی۔ پہلے تو میرا ارادہ ادھر ہی دبکے رہنے کا تھا۔ لیکن اب نہیں... مجھے فوراً سے بیشتر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا اور جھکے جھکے کاؤنٹر کی اوٹ سے دیکھا، جنگی اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ زینے طے کرتا اوپر غائب ہو چکا تھا۔ نیچے اس کے دو نقاب پوش ساتھی موجود تھے۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھا جہاں ایک سلوپ نما راستہ اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔ یہ سلوپ نما سپاٹ راہداری سی تھی جو خاصی چوڑی تھی اور یقیناً بہ وقتِ ضرورت اس کے ذریعے کسی مریض یا معذور شخص کو اسٹریچر یا وہیل چیئر سے نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے لایا جاتا تھا۔ ایسے سلوپ نما سپاٹ راستے جو درحقیقت زینے کا ہی کام کرتے تھے اسپتالوں میں عام طور پر نظر آتے تھے۔

میں کسی دبکے ہوئے چیتے کی سی پھرتی سے پلٹا۔ میرے ساتھ جڑی بیٹھی موٹی لڑکی نے میرے کان میں خوف زدہ سی سرگوشی بھی کی تھی۔ شاید وہ مجھے کسی خطرناک حرکت سے روکنے کا مشورہ دینا چاہتی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کون تھا اور ان خطرناکیوں کو حالات نے میری کمین گاہ بنا دیا تھا۔

اس سلوپ نما زینے پر آتے ہی جیسے میرے پورے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ میں جتنی تیز رفتاری سے دوڑ سکتا تھا دوڑتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا۔ یہاں بھی شور و غوغا مچا ہوا تھا۔ اور میں نے ان تینوں مسلح آدمیوں کو ایک وارڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس وقت راہداری میں مجھے ایک ایسا اسٹریچر نظر آیا جس پر سفید رنگ کی چادر اس طرح بچھائی گئی تھی کہ وہ نچلے خلا تک کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کر لیا۔ اسٹریچر کو تیزی سے دھکیلا اور پھرتی سے اس کے نچلے خلا میں دبک گیا۔ اسٹریچر اب چکنے کوریڈور پر رینگتا ہوا ان تینوں مسلح افراد کے قریب سے گزرتا چلا گیا اور سیدھا مطلوبہ وارڈ کے دروازے سے ٹکرایا۔ میں اچھل کر باہر آ گیا۔ وہاں بھی ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی اور میں نے کھوجتی نظروں سے بستروں کو دیکھا تو، 9 نمبر والے بیڈ کے مریض پر نظر پڑتے ہی سناٹے میں آ گیا۔ وہاں کمیل دادا کو پایا۔ اس کے جسم کے کچھ حصوں پر پٹیاں بندھی نظر آ رہی تھیں اور اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حالت کچھ زیادہ نازک نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور اس کے قریب والے بیڈ پر اس کا وہ ساتھی بھی موجود تھا جسے میں بیگم ولا میں دیکھ چکا تھا۔ مگر مجھے اس کا نام نہیں یاد آ رہا تھا۔

''کمیل دادا...! ہوشیار... دشمن آ رہے ہیں۔''

میں وہیں سے اسے پکار کر چلایا۔ اس نے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا۔ شور وغل کی آواز پر وہ بھی بے چین نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو اسے سانپ سونگھ گیا پھر فوراً ہی اس نے اپنے ایک ہاتھ کی نس میں لگی ڈرپ کی سوئی کھینچ دی۔ وہ اور اس کا ساتھی بیک وقت بیڈ سے لڑھکنی کھا کر اترے۔

ٹھیک اس وقت جنگی خان اپنے دونوں مسلح ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوا۔ میں ان کے قریب تھا مگر دروازے کے پیچھے۔ ان تینوں کو اپنے مطلوبہ بیڈ نمبرز بھی یاد تھے... یہی سبب تھا کہ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مطلوبہ بیڈ کی طرف دیکھا اور گنیں سیدھی کرلیں۔ انہوں نے بالکل آخری وقت میں شاید کبیل دادا اور اس کے ساتھی کو بیڈ سے لڑھکنی کھاتے ہوئے پناہ لینے یا چھپنے کی غرض سے نیچے رینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب میرے حرکت کرنے کی باری تھی۔ ورنہ یہ تینوں ان دونوں کو بھون کر رکھ دیتے۔ میں نے عقب سے نکل کر پہلے جنگی خان کو زبردست ٹھوکر اس طرح رسید کی کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ٹکرایا تب تک وہ اپنی گنوں کے برسٹ فائر کرچکے تھے مگر نشانہ خطا گیا تھا۔ وارڈ میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ نے دہشت کی فضا پیدا کردی۔ نرسیں اور مریض موت کے خوف سے اپنی جانیں بچانے کے لیے ادھر ادھر کونوں کھدروں میں چھپنے دبکنے لگے۔ میری پیچھے سے مداخلت ان تینوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے۔ وہ تو بس اپنے شکار کو تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ ان کی خراب قسمت نے مجھے ان کے پیچھے لگا دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ تینوں اس اچانک لگنے والی ٹھوکر سے نہیں سنبھل پائے اور اپنے قدموں پر ہی بری طرح لڑکھڑا گئے۔ یہ میری ایک ''سہ رخی'' کوشش تھی جس میں مجھے کامیابی نصیب ہوئی تھی اور کبیل دادا اپنے ساتھی سمیت فوری خطرے سے بچ گئے تھے۔ مگر اب میں اپنے زہریلے دشمن کی خطرناک نظروں میں آچکا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے ایک ساتھی کے ہاتھ سے گن گری تھی۔ دوسرے نے سنبھلنے کی کوشش چاہتے ہوئے میری جانب پلٹا کھایا۔ جبکہ میری ٹھوکر کا ہدف بننے والا جنگی خان تو بالکل ہی سنبھل نہ پایا تھا اور سیدھے ہاتھ کے خالی بیڈ پر جا پڑا تھا۔ جس کا مریض شاید خوف کے باعث پہلے ہی نیچے جا دبکا تھا۔ اس وقت میرے وجود کا روم روم جوش سے تنا ہوا تھا۔ کیونکہ میں اب براہِ راست یقینی موت سے ہمکنار کرنے والے سنگین خطرے سے دوچار تھا۔ بہ الفاظِ دیگر میں نے خو کو بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا تھا۔

جب تک باقی دو سنبھلتے، میں نے فرش پر سے تیسرے حملہ آور کی گری ہوئی گن اٹھالی۔ اسی وقت جنگی کے دوسرے ساتھی نے اپنی گن سے مجھے وارڈ کے چکنے فرش پر ہی نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر میں پھرتی کے ساتھ اپنی گن سمیت لڑھکنی کھاتے ہوئے الٹے ہاتھ کے بیڈ کی آڑ میں چلا گیا اور لڑھکنی کھانے کے دوران مجھ سے غیر ارادی حرکت بھی ہوئی، کیونکہ اس حرکت کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر سنبھلتے ہوئے پہلے ساتھی کی ٹانگوں سے اپنی دونوں ٹانگیں زور سے ٹکرا بھی دی تھیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دوبارہ تیورا کر گرنے لگا۔ برسٹ چلنے کی گھن گرج کے ساتھ ہی چکنے فرش کے سنگ ریزے ادھڑ کر بارش کی شکل میں بکھرے۔ ہم ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ مگر فوقیت میرے دشمنوں کو حاصل تھی۔ ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے گولیاں چلیں۔ ایک دشمن کو میں نے کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ فرش بوس ہوتے دیکھا۔ شاید یہ کبیل دادا اور اس کے ساتھی کی حرکت تھی۔ انہیں شاید اب تک سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ جگہ کی تنگی میں، میں ابھی اپنی گن کی آتشی پیاس بجھانے کی سعی میں تھا کہ جنگی خان خطرہ بھانپتے ہی باہر کو دوڑا۔ جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا، وہ نہتا تھا۔ میں نے بیڈ کی آڑ سے اس کا نشانہ لے کر لبلبی دبادی۔ گولیوں کی خوف ناک آتشی باڑ نے اس کا چشم زدن میں تعاقب کیا اور اس کی ساری کمر ادھیڑ کر رکھ دی۔

میں سیدھا ہوا۔ کبیل دادا اور اس کا ساتھی دوڑتے ہوئے میری جانب لپکے... پستول، کبیل دادا کے ہاتھ میں تھا۔

''بہت حیرت ہے مجھے، آؤ۔'' وہ مجھ سے صرف اتنا ہی کہہ پایا اور باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں وارڈ سے باہر آگئے۔ میں نے اسے بتایا نیچے ایمرجنسی کی لابی میں جنگی خان کے دو ساتھی موجود ہیں مسلح... لہٰذا میں نے انہیں سلوپ والے ڈھلانی راستے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے میں اوپر آیا تھا۔

ہم اس جانب بڑھے ہی تھے کہ باہر پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہم تینوں بری طرح ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

''بچو...!'' یکدم کبیل دادا کا ساتھی چیخا اور ساتھ ہی اس نے کبیل دادا کو دھکا دیا۔ اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ چھلنی ہو کے گرا۔ میں نے ایک دیوار کی آڑ لی

اور پلٹا۔ لفٹ والی دیوار کے زینے پر مجھے وہ مسلح آدمی دکھائی دیا جو جنگی خان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ اس نے نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً برسٹ مارا۔ اس نے خود کو پیچھے گرا دیا۔ شاید اسے میری طرف سے اتنی جلدی جوابی فائرنگ کی توقع نہ تھی۔ وہ اگلا نشانہ باندھنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ میری گن کے نشانے پر آگیا، اس کے پاس پیچھے سرکنے یا چھپنے کا موقع نہ تھا ماسوائے اس کے کہ وہ خود کو زینے کی طرف گرا دیتا۔ میں نے اس سمت اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ جنگی خان تب تک لڑھکتا ہوا نیچے جا چکا تھا اور پھر شاید سنبھلتے ہی اس نے نیچے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ کبیل دادا اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ تھا۔ پھر شاید اس کی زندگی سے مایوس ہو کر وہ میری طرف دوڑا۔ میں زینے طے کرنے لگا۔ گراؤنڈ فلور تک زینے کے دو موڑ آئے تھے۔ دوسرے موڑ کی دیوار کی آڑ سے میں نے جھانکا تو وہاں مجھے پولیس نظر آئی اور اس دوران فائرنگ بھی ہوئی۔ مجھے نیچے لابی کے فرش پر جنگی خان کے ایک ساتھی کی خون میں لت پت لاش بھی نظر آئی۔ جس کے گرد خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ شاید پولیس نے اسے ''ہٹ'' کر دیا تھا۔ دوسرا ساتھی کہاں تھا، نہیں پتا۔ اس دوران کبیل دادا کی مجھے ہانپتی آواز سنائی دی۔ ''واپس پلٹو... نیچے خطرہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔ میں بھی اپنی گن جو دشمن سے چھینی تھی، سنبھالتا ہوا پلٹا۔ ہم دوبارہ اوپر آگئے۔ کچھ لوگ ہم سے بھی خوف زدہ نظر آنے لگے۔ وہ مجھے ہی دہشت گرد سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں بھی اسلحہ تھا۔ نیز مختلف مقامات پر لگے کیمروں پر ہماری ویڈیو بھی بن رہی تھی۔ میرے لیے یہ زیادہ تشویش کی بات تھی۔ گویا تقدیر ایک بار پھر میری کشاکشی اور مصیبتوں کی زمین کو وسیع کرنے پر آمادہ تھی۔

ہم دوسری منزل سے مزید ایک منزل اوپر آگئے۔ پولیس کے نرغے میں ہم بھی آسکتے تھے۔ پولیس کے ہتھے چڑھنا میرے لیے کتنی مصیبت کا باعث بن سکتا تھا، یہ میں ہی جانتا تھا۔

تیسری منزل پر بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی مریض اور عملے کے آدمی لوگ ہمیں دیکھ کر خوف سے چیخنے لگے۔ کچھ سراسیمہ ہو کر دبک گئے اور ہماری جانب سہمی ہوئی نظروں سے تکنے لگے۔

تیسری منزل پر پہنچ کر ہم محتاط تھے۔ کیا خبر نیچے پولیس کی موجودگی کے باعث جنگی خان نے بھی ادھر کا ہی رخ کیا ہو۔

ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں فوراً اس دیوار کی طرف لپکا جس کی کھڑکی سے اسپتال کے بیرونی گیٹ اور احاطے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ وہاں سے میں نے نیچے جھانکا تو میرے چہرے پہ گہری تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ نیچے پولیس کے ساتھ رینجرز کی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں پلٹا اور کبیل دادا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی رینجرز والوں کی موجودگی پر پریشان ہو گیا۔ وہ خود کلامیہ انداز میں بولا۔ ''پولیس سے تو مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر رینجرز... یہ کہاں سے ٹپک پڑی ہے؟''

''ان سے مقابلہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر جنگی خان کو ان کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے۔''

''جنگی خان؟...'' وہ سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ وہ نقاب میں تھا اس لیے کبیل دادا اسے ابھی تک نہیں پہچان سکا تھا۔ جبکہ میں نے آواز سے اسے پہچانا تھا۔

''ہاں! وہ جنگی خان ہی تھا جو اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ہمراہ تمہیں نشانہ بنانے آیا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔'' پھر میں نے مختصراً اسے تفصیل بتا دی۔ بیگم صاحبہ اور اول خیر کے بارے میں اس سے استفادہ کرنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر جوشِ غیظ سے بولا۔

''تو یہ جنگی خان تھا۔ اسے کسی بھی صورت میں پولیس یا رینجرز کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے۔''

''میں خود اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں مگر افسوس وہ بچ نکلا۔''

''خبردار!... جنگی خان کو ہلاک مت کرنا، اسے زندہ پکڑنا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس سے ہمیں بیگم صاحبہ کے بارے میں اگلوانا ہے۔''

میں چونکا۔ ابھی میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ نیچے برسٹ چلنے کی آواز کے ساتھ ہی چیخنے چلانے کی آوازیں ابھریں۔

''یہاں سے ہٹ جاؤ اس طرف... آؤ...'' کبیل دادا ایک طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں زینے سے ہٹ کر راہداری میں آگئے۔ پھر ایک خالی کمرا پا کر اس کے اندر چلے گئے۔

''پولیس اور رینجرز کے اہلکار کسی بھی وقت اوپر آسکتے ہیں...'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

یہ کوئی وی آئی پی وارڈ تھا جو خالی تھا۔ ہم دونوں

دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ اور ادھ کھلی جھری سے کوریڈور پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں سے ہمیں زینے اور لفٹ نظر آرہی تھی۔

''میرا خیال ہے جنگی خان اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے کی سرتوڑ کوشش کرے گا۔'' کبیل دادا میری طرف دیکھ کر بولا۔

''کیونکہ تمہاری بروقت مداخلت نے نہ صرف اس کا خون ریز منصوبہ چوپٹ کر ڈالا ہے بلکہ اسے مشکل میں بھی پھنسا دیا ہے۔''

''مشکل میں تو ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا بھول گیا دوست!... تم نے عین وقت پر میری جان بچالی۔ مگر مجھے... صدیقی کے مرنے کا افسوس ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے متعلق بولا جو جنگی خان کے کسی ساتھی کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

''آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ تم یہاں اسپتال میں کیسے اور بیگم صاحبہ کا کیا ہوا؟... وہ کہاں غائب ہیں؟ اول خیر بھی بیگم ولا سے اچانک کہیں نکل گیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بیگم صاحبہ کی کار پر فائرنگ کی گئی تھی؟'' میری بات پر کبیل دادا نے ایک گہری سانس لی۔ ٹھیک اسی وقت زینے سے ایک نقاب پوش دوڑتا ہوا دوسرے کوریڈور کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر یکلخت میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ وہ جنگی خان تھا۔ پھر میں نے دو تین پولیس اہلکاروں کو بھی اس کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ ان میں ایک رینجرز کا وردی پوش اہلکار بھی تھا۔ ''ہوشیار...'' میں ہولے سے بڑبڑایا۔ کبیل دادا نے بھی جھری سے جھانکا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے دو پولیس والوں کو چکنے فرش پر گرتے دیکھا۔ ایک پولیس مین اور رینجرز کے اہلکار نے فوراً دیوار کی آڑ لے کر سنگل فائر کیا۔

''ہمارا شکار اسی منزل پر آگیا ہے۔ اب کیا کریں؟'' میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ گوگو سے لہجے میں بولا۔ ''جنگی خان شاید ان کی نظروں میں آگیا ہے ورنہ وہ ہتھیار پھینک کر اور نقاب اتار کر بہ آسانی نکل سکتا تھا۔ خیر دیکھتے ہیں... ذرا باہر نکلو۔''

ہم کمرے سے کوریڈور میں آگئے۔ مختصر سی فائرنگ کے بعد اب ایک دم سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ پھر دفعتاً کسی کی چیخ ابھری۔ یہ کسی عورت کی چیخ تھی۔ اس وقت کچھ مزید پولیس اور رینجرز کے اہلکار اوپر آگئے۔

''شہزی! ہمیں اپنی گنیں اس کمرے میں چھوڑنا ہوں گی... لگتا ہے جنگی گیا ہاتھ سے۔ اب ہمیں باہر نکلنا ہوگا۔'' کبیل دادا نے سرگوشی کی۔ میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔ پولیس اور رینجرز کی مداخلت کے دوران ہمارا جنگی خان پر ہاتھ ڈالنا ازبس مشکل تھا اور خود ہم ہی پھنس سکتے تھے۔ لہٰذا ہم نے اپنی گنیں... اس وی آئی پی وارڈ کے اندر کہیں چھپا دیں۔ اس وقت پولیس اور رینجرز اہلکار اسپتال میں دندناتے فائرنگ کرتے دہشت پسندوں کو ٹارگٹ کیے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمیں باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔

ہم راہداری کے موڑ پر پہنچے تو یہاں کچھ ڈرے سہمے اور دبکے ہوئے افراد دکھائی دیے۔ ان میں اسپتال کے عملے کے بھی چند لوگ شامل تھے۔ ٹھیک اسی وقت ہمیں عقب سے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم ٹھٹک کر رکے اور پلٹ کر دیکھا۔ رینجرز کے چند مسلح اہلکار اس طرف دوڑے آرہے تھے۔ میں یکدم سناٹے میں آگیا۔ اس وقت کبیل دادا نے سرسراتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔

''خبردار...! بھاگنا مت۔ یہ مجرموں کے پیچھے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ میں نے فوراً اس کی تقلید کی اور ہم بھی ان ڈرے سہمے لوگوں میں شامل ہوگئے۔ یہاں مجھے کبیل دادا کی ذہانت اور احتیاط پسندی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑا۔ کیونکہ گنوں کی ہمارے پاس عدم موجودگی نے ہمیں مصیبت سے بچالیا تھا اور رینجرز کے اہلکار آگے دوڑتے چلے گئے۔ ہم سب پر انہوں نے سرسری نگاہ البتہ ڈالی تھی۔

اسی وقت لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔

''لگتا ہے پولیس اور رینجرز نے دہشت گردوں کو پکڑ لیا ہے۔''

''ہاں! کچھ مارے بھی گئے ہیں...'' ایک اور بولا۔

''ان کا سرغنہ باقی بچا ہے۔'' عملے کے ایک وردی پوش آدمی نے کہا۔

''آخر یہ معاملہ کیا ہے...؟''

''میرا خیال ہے رینجرز کے افسر کی بیگم اور اس کے بیٹے کو یہ دہشت گرد ہلاک کرنے آئے تھے...''

اس بات پر میرے اور کبیل دادا کے کان کھڑے ہوگئے۔ شکر ہے کہ ان کا تعلق ان لوگوں سے نہیں تھا جو اس وارڈ میں داخل تھے جہاں ہمارا جنگی خان اور اس کے

ساتھیوں سے خون ریز مقابلہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ ہمیں بھی پہچان جاتے۔ لہٰذا میں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں کسی رینجرز کے افسر کی فیملی بھی موجود تھی؟'' میرا مخاطب عملے کا وہ فرد ہی تھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''اس لیے رینجرز کی آمد متوقع تھی۔ البتہ... پولیس کہیں قریب ہی موجود تھی۔ فائرنگ اور شور شرابے پر.... متوجہ ہوئی۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے سے، جس طرف رینجرز کے وہ دو تین اہلکار دوڑتے گئے تھے، ایک موٹی سی نرس اور جوان لڑکا جو وارڈ بوائے ہی لگتا تھا آ کر ہم میں شامل ہو گئے۔

''دہشت گردوں کے سرغنہ نے میجر باجوہ کی بیوی اور بیٹے کو یرغمال بنا رکھا ہے اور دباؤ ڈال رہا ہے کہ اسے باہر نکلنے دیا جائے۔'' موٹی نرس نے... ہانپتے ہوئے بتایا۔

''میجر باجوہ...'' اس نام پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ کہیں یہ لوگ میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہے... جو محکمہ گیراتی کے اسپیشل انویسٹی گیشو ڈپارٹمنٹ کا انچارج تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کہیں تم میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہی ہو... سسٹر؟''

اس موٹی نرس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ خاصی دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں! وہی ہیں۔ ان کے بیٹے کا ٹائیفائیڈ بخار بگڑ گیا تھا۔ آنتوں میں سوراخ ہو گیا تھا... کل صبح ہی اسے داخل کیا گیا تھا ایمرجنسی میں۔ میری اسی وارڈ میں ڈیوٹی تھی۔ سرغنہ نے اسے ہی گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔ میں اور امجد بڑی مشکلوں سے وہاں سے بھاگے ہیں۔'' امجد اس کا وہ نوجوان ساتھی تھا۔

اب بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ میجر صاحب یقیناً یہاں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے آئے ہوں گے اور یہاں یہ معاملہ آن پڑا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ اگر میجر ریاض باجوہ وہی تھے جو میں سمجھ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا صورت حال واقعی گمبھیر تھی۔ ان لوگوں کو بھلا کیا معلوم تھا کہ درحقیقت دہشت گرد یعنی جنگی خان وغیرہ یہاں علاج کی غرض سے پہلے سے داخل کبیل دادا اور اس کے ساتھی کو ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ ممکن ہے اب تک ان لوگوں نے جس وارڈ میں ہمارا جنگی خان وغیرہ سے خون ریز ٹکراؤ ہوا تھا اصل بات بتا دی ہو۔ لہٰذا ہم بھی تفتیش کی زد میں آ سکتے تھے۔

مگر ریاض باجوہ... میرے محسنوں میں سے تھا۔ پولیس انتظامیہ میں یہی وہ واحد فرد تھا جو ابتدا ہی سے میرے مسائل کو غیر جانبدارانہ سے دیکھتا آیا تھا اور مجھ سے پورا پورا تعاون کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ مگر تقدیر نے اب تک مجھے اتنا موقع ہی نہ دیا تھا کہ میں اس سے کوئی خاطر خواہ مدد لے سکتا۔

میں نے اس نرس سے پوچھا۔ ''وہ وارڈ کس طرف ہے جہاں میجر صاحب کا بچہ داخل ہے؟''

''اس طرف... اس راہداری کے اختتام پر۔'' اس نے سامنے دائیں جانب جہاں یہ راہداری ختم ہوئی تھی اشارہ کر کے بتایا۔

''دہشت گردوں کا سرغنہ ابھی وہیں موجود ہے؟''

''ہاں۔''

میں نے فوراً مذکورہ سمت قدم بڑھا دیے تو عقب سے کبیل دادا نے مجھے پکارا۔

''کدھر چل دیے...؟'' اس نے دانستہ میرا نام لینے سے گریز کیا تھا... باقی لوگ بھی میری طرف عجیب عجیب نظروں سے تکنے لگے۔

''تم ادھر ٹھہرو... میں ابھی صورتِ حال کا تھوڑا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

مگر کبیل دادا نہ رکا۔ وہ میرے پیچھے ہی چلا آیا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرا دل بے طرح انداز میں دھڑک رہا تھا۔

''تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟... پاگل ہو گئے ہو شہزی...؟'' پیچھے سے کبیل دادا کی پھر آواز سنائی دی مگر میں آگے بڑھتا رہا۔ سرے پہ پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہاں گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں فوراً راہداری کی دیوار سے چپک گیا۔ عقب میں ذرا دور موجود ڈرے سہمے لوگ چیخیں مار کر آگے کو دوڑ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے رینجرز کے دو اہلکار گرے تھے۔ ایک ساتھی انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہیں شاید گولیاں لگی تھیں جو یقیناً جنگی خان نے ہی چلائی ہوں گی۔ میری دانست میں جنگی خان بری طرح پھنس گیا ہے۔ میں آگے بڑھا۔ ایک اہلکار کے پیٹ میں گولی لگی تھی جبکہ دوسرے کے پہلو میں۔ ان کا تیسرا ساتھی جو انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا... اپنے ہاتھ میں پکڑے وائرلیس سیٹ پر کسی کو جلدی جلدی ہدایت دے رہا تھا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھے روکنے کا اشارہ

کیا اور مجھ سے بولا۔ ''آگے مت جاؤ۔ ریڈ زون ہے۔''
مگر میں نہیں رکا۔ وہ یکدم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ پر گن
تان کر تحکمانہ درشتی سے بولا۔ ''خبردار! رک جاؤ، یہ میرا حکم
ہے... وہاں میجر صاحب کے بیوی بچے خطرے میں
ہیں۔''

میں نے سرد نظروں سے اہلکار کی طرف دیکھا اور
سخت لہجے میں بولا۔ ''میجر ریاض باجوہ میرے دوست ہیں
اور دہشت گردوں کے اس سرغنہ کو میں اچھی طرح جانتا
ہوں۔ میں صرف صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''
میرے پُراعتماد لہجے سے وہ مرعوب نظر آنے لگا۔ میں آگے
بڑھ گیا۔ کمیل دادا میرے پیچھے ہی تھا۔ وہ بھی میری بات پر
یقینا چونکا ہوگا۔ دفعتاً میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ایک غراتی
ہوئی شناسا سی آواز ٹکرائی۔

''مجھے یہاں سے نکلنے دیا جائے... ورنہ میں لڑکے
کے سر میں گولی اتار دوں گا۔''

یہ صفتِ رذیل... جنگی خان کی خوف ناک آواز تھی۔
میں نے راہداری کے سرے والی دیوار کی آڑ سے اپنا ذرا سا
سر ابھار کر دیکھا۔ سامنے مختصر سی لابی تھی جس کے دائیں
بائیں... کچھ اسپیشل وارڈ روم بنے ہوئے تھے۔ ایسے ہی
ایک کمرے کے سامنے مجھے جنگی خان کھڑا نظر آ گیا جس نے
پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا
تھا... قریب ایک خوب صورت عورت کھڑی روتے ہوئے
اس کی منتیں کر رہی تھی جو یقینا میجر باجوہ صاحب کی بیوی تھی
اور لڑکا... ان کا بیٹا۔ وہ بھی خوف و دہشت سے پیلا پڑا ہوا
تھا۔ وہاں میں نے چکنے فرش پر ایک رینجرز اہلکار کی خون
میں لت پت لاش بھی پڑی دیکھی۔ باقی تین مسلح رینجرز اہلکار
دائیں بائیں چوکس کھڑے تھے۔ بلکہ پوزیشن لیے ہوئے
تھے اور اپنی گنوں سے جنگی خان کو ٹارگٹ کیے ہوئے تھے۔
ان کے درمیان میں میجر ریاض باجوہ کھڑے تھے۔ وہ نہتے
تھے۔ کچھ پولیس کے جوان بھی موجود تھے۔

''دیکھو... تم اس طرح خود کو مزید خطرے میں ڈال
رہے ہو۔ نیچے بھی پولیس اور رینجرز نے پورے اسپتال کو
گھیرے میں لے رکھا ہے۔'' میجر ریاض باجوہ اس کے
ساتھ ''کاؤنسلنگ'' میں مصروف تھے۔ جنگی کے سر پر خون
سوار تھا۔ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں
سفاکی مترشح تھی۔ وہ غراہٹ آمیز درشتی سے بولا۔

''کچھ نہیں میجر! نہیں... مجھے بے وقوف بنانے کی
کوشش مت کرو۔ جب تک تمہارا بیٹا میرے رحم و کرم پر
ہے، میرے راستے خود ہی آسان ہوتے چلے جائیں گے۔
اب تم آگے سے ہٹ جاؤ... اور مجھے نکلنے دو... یہ میرا
آخری حکم ہے ورنہ میں اس لڑکے کے سر میں سوراخ کر دوں
گا۔''

اس اثنا میں قریب کھڑی، لڑکے کی بدنصیب ماں اور
میجر کی بیوی خوف سے چیخ کر ملتجی لہجے سے بولی۔
''نہیں... نہیں... خدا کے لیے میرے بیٹے کو مت
مارنا...'' پھر وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹی۔
''پلیز...! رضی... اسے جانے دو... ورنہ... یہ
ہمارے بیٹے کو ہلاک کر دے گا۔''

میں نے میجر صاحب کے چہرے کے تاثرات کا بھی
جائزہ لیا۔ فرض اور قرض کے درمیان... وہ ایک زبردست
کشمکش و پیچ کا شکار نظر آ رہے تھے۔ وہ پھر شاید آخری حربے
کے طور پر جنگی خان کی طرف بہ غور تکتے ہوئے بولے۔
''تم میرے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔
مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... اور میں تمہیں پہچان چکا
ہوں۔''

ان کے اس انکشاف پر نہ صرف میں چونک گیا تھا
بلکہ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی جنگی خان کی سفاک آنکھوں
میں بھی مجھے الجھن تیرتی محسوس ہوئی تھی... میجر باجوہ آگے
بولا۔ ''تم یقینا بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کے آدمی ہو...
اور ضرور اسی نے تمہیں یہاں میرے بیٹے کو اغوا کرنے کے
لیے بھیجا ہے۔''

یہ نام میرے لیے ہی نہیں بلکہ شاید کمیل دادا کے
لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ مگر مجھے افسوس ہوا کہ میجر جنگی خان کے
بارے میں ایک غلط اندازہ قائم کیے ہوئے تھا۔ جو خطرناک
بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ معاملہ اتنا زیادہ سنگین نہ تھا جیسا
کہ باجوہ صاحب سمجھ رہے تھے۔ جبکہ میرے نزدیک
معاملہ فقط اس قدر تھا کہ جنگی خان کا سرے سے ایسا کوئی
ارادہ ہی نہ تھا۔ نہ وہ ان کے نوعمر بیٹے کو اغوا کرنا چاہتا تھا نہ
ہی اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہوگا۔ وہ تو محض ان
کے بیٹے کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار چاہتا تھا۔ پھر میں
نے جنگی خان کو کہتے سنا۔

''نہیں میجر... تم مجھے بالکل نہیں جانتے میں کون
ہوں۔ میں یہاں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا۔ مگر افسوس وہ
ناکامی سے دوچار ہوا۔ اب میں محض یہاں سے زندہ
سلامت نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں
تمہارے بیٹے کو چھوڑ دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ میں نے اس

لیے یہ صفائی بیان کرنی ضروری سمجھی ہے کہ تم کوئی مشکل پیدا کرنے اور چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بس! اتنا کافی ہے۔ اب مجھے راستہ دو۔"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے تشویش ہورہی تھی کہ کہیں میجر صاحب کسی مغالطے کا شکار ہوکر صورت حال کو سنگین نہ بنادیں۔ مگر شکر ہوا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ ممکن ہے کسی بدر اقبال عرف بابن ڈکیت نامی آدمی سے ان کی کوئی پرانی دشمنی ہو... بہرحال جنگی خان کو نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ میں نے سناٹے دار نظروں سے دیکھا جنگی خان لفٹ کی طرف سرک رہا تھا اور ساتھ ہی محتاط نظروں سے گردوپیش کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ میں اس سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے دائیں بازو والی سمت میں کوریڈور کی اختتامی دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

"خبردار... میرے پیچھے آنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔" لفٹ کی طرف سرکتے ہوئے اس نے دہاڑ کر کہا۔

"میجر... نیچے فون کرکے ہدایات دے دو... ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کی مہم جوئی آپ کو مہنگی پڑ جائے۔"

"ٹھہرو... مم... میں بھی تمہارے ساتھ نیچے چلتی ہوں۔" اچانک میجر صاحب کی بیوی نے جنگی خان سے کہا۔ وہ ماں تھی۔ اپنے لختِ جگر کو ایک خونی شخص کی گرفت میں پاکر بے چین تھی اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ خود کو بھی ایک خطرناک مجرم کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔ ماں تجھے سلام... مجھے اپنی ماں کا مہربان چہرہ یاد آنے لگا... میرا دل جیسے کٹنے لگا۔ میں نے جنگی خان کی عیار آنکھوں میں بڑی خبیثانہ مسکراہٹ چمکتے محسوس کی۔ وہ مکاری سے چہکا۔

"ہاں، اس سے زیادہ اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ مگر خبردار... میرے سامنے رہنے کی کوشش کرنا۔ میری نظروں سے ہٹنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔" اس نے آخر میں تنبیہ کی۔

میرا دل ایک خطرناک مزاحمتی خیال کے پیشِ نظر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دیوار کی آڑ سے میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلے اپنے سامنے شدید شش وپنج کا شکار کھڑے میجر صاحب سے نیچے فون کروایا۔ پھر ان کی طرف سے اشارہ پاتے ہی وہ آگے بڑھا۔ میں سمجھا تھا وہ نیچے جانے کے لیے لفٹ استعمال کرے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنا رخ بدل لیا۔ یہ اس کی مکاری تھی۔ کیونکہ مجھ سمیت اس نے بھی میجر صاحب کو نیچے والوں کو ہدایت دیتے ہوئے لفٹ کا تذکرہ کرتے سنا تھا۔ اس نے زینے کی راہ لی اور نیچے اترنے لگا۔

یکلخت میرے خون کی گردش تیز ہوگئی اور پھر میں تیزی کے ساتھ میجر صاحب کے سامنے آگیا۔ پولیس کو میں بھی مطلوب تھا۔ اور میجر باجوہ مجھے بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ لہٰذا مجھے اچانک سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے تھے۔ میں نے ان سے ملتجی لہجے میں کہا۔

"میجر صاحب! وقت کم ہے اور صورت حال خطرناک... خدا کے لیے میرے ساتھ تھوڑا تعاون کریں۔ میں اس درندہ صفت آدمی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ خونی چوہدری ممتاز خان کا گماشتہ ہے اور یہ ہمیں ہلاک کرنے آیا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میں اس پر قابو پالوں گا۔ بس! آپ ایک کام کیجیے، نیچے موجود پولیس سمیت اپنے اہلکاروں سے کہہ دیجیے، وہ ہمارا راستہ نہ روکیں... میرے ساتھ میرا ایک ساتھی بھی ہے۔ جلدی کیجیے میجر صاحب... ہم نیچے جارہے ہیں اس خونی کے پیچھے۔"

باجوہ صاحب کے ساتھ میری پرانی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ جب وہ اس سے پہلے سول پولیس انتظامیہ میں تھے تو یہ واحد شخصیت تھے جو میرا کیس سمجھتے تھے اور آخر تک میری مدد کرنے کے خواں بھی۔ لہٰذا انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی اور میں ان سے پُرامید تھا۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ میں اور کبیل دادا سلوپ نما راستہ تیزی کے ساتھ طے کرتے ہوئے دوسری منزل پر آن پہنچے۔ "تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟..." کبیل دادا جھلا کر بولا۔

"بچوں والی باتیں مت کرو دادا... تم اچھی طرح جانتے ہو میں کیا کرنا چاہتا ہوں..." میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

وہ فوراً سنبھل گیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ پھر ہم دونوں اس زینے کی دیوار کے دائیں بائیں چھپ کر گھات لگائے کھڑے ہوگئے جہاں سے جنگی خان نمودار ہونے والا تھا۔ بلاشبہ میں نے یہ ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے ایک سنہری موقع دیا تھا تو وہی میری دستگیری بھی فرمائے گا۔

مجھے زینے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ میں اور کبیل دادا نہتے تھے۔ جبکہ وہ موذی مردود جنگی خان مسلح تھا۔ لیکن ہمیں اس پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ ہمیں اس سے پہلے

گھات میسر آگئی تھی۔ جس سے جنگی خان واقف تھا اور جنگ کا یہی اصول ہوتا ہے جسے پہلے گھات مل جائے تو مدمقابل کی مات مقدر ٹھہرتی ہے۔ سب سے پہلے میجر باجوہ صاحب کی بیگم زینے سے نمودار ہوئی، اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ ذہین ثابت ہوئی اس نے کوئی تاثر اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس وقت جنگی نوعمر لڑکے کو گن پوائنٹ پر لے کر نمودار ہوا۔ اپنے گرد و پیش سے غافل وہ بھی نہ تھا۔ مگر بات وہی تھی، ہم گھات میں تھے۔ اس کا رخ یوں تھا کہ دوسری منزل کا آخری قدمچہ طے کرتے ہی اس کی پشت لمحے بھر کے لیے میری طرف ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے کا رخ دوسری جانب کھڑے کمیل دادا کی طرف ہوا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، میں نے اس کے ٹھٹکنے کا فائدہ اٹھایا اور پھر جیسے میری رگوں میں لہو شل پارا بن کے دوڑا۔ میں نے سب سے پہلے اس کی گن والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ جمایا۔ گن کی نال نوعمر لڑکے کی کنپٹی سے ہٹی۔ یہ حرکت جنگی خان کے سان گمان میں بھی نہ تھی۔ میری دوسری حرکت اسے کھدیڑنے کے عمل سے مشروط تھی۔ نتیجتاً وہ لڑکھڑا گیا۔ کمیل دادا نے اس نازک ترین لمحات میں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور جنگی خان کے گن والے بہکتے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ گن اس کے ہاتھ سے کیا نکلی... باجوہ صاحب کی بیوی شیرنی کی طرح اپنے نوعمر بیٹے کو اپنے دونوں بازوؤں سے ڈھانپنے کو لپکی۔

جنگی خان اب نہتا ہو چکا تھا اور اپنے دشمن دیرینہ کو اس حالت میں دیکھ کر میں بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر کے، بے حال کر دیا۔ کمیل دادا نے میرا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس وقت میری نظر سامنے دیوار کے کونے پہ لگے سی سی کیمرے پہ پڑی۔ میں نے جنگی خان کا نقاب چہرے سے کھینچ لیا اور اس کے سر کے بالوں کو اپنے آہنی ہاتھ کی مٹھی میں دبوچ کر مکروہ چہرہ سی سی کیمرے کی طرف کر کے میں چلا کر بولا۔

''لوگو! پہچان لو اچھی طرح اس درندے صفت انسان کو، یہ جنگی خان ہے۔ چوہدری ممتاز خان کے چہرے کا دوسرا مکروہ رخ... اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اسپتال میں دہشت مچائی اور میجر باجوہ صاحب کے بیٹے کو گن پوائنٹ میں لے کر اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میڈیا سے تعلق رکھنے والی معصوم لڑکی آسیہ کی اجتماعی عصمت دری کر کے اسے جان سے مار ڈالا جو اس کیمرے کے ذریعے لائیو... چوہدری ممتاز خان سمیت ان سب کے بھیانک چہرے بے نقاب کرنا چاہتی تھی۔''

مجھ پر جیسے وحشیانہ جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا اب تک اسپتال میں لگے سی سی کیمروں نے یہ سب کارروائی اپنی شیشے کی آنکھوں میں محفوظ کر لی ہوگی۔ کمیل دادا نے جنگی خان کی گن پر قبضہ جما لیا تھا۔ مجھے سنبھالا دیتے ہوئے کہنا چاہا۔

''... شہزی... کیا کر رہے ہو؟ اسے لے کر نکل چلو...''

میں اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔

''لوگو! دیکھو، اسے پہچان لو... یہ ممتاز خان کا گرگا ہے.... ایک اہم درندہ صفت حواری ہے۔ ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو بھی میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی اپنی بیٹی نوشابہ کی غلطی سے چلائی جانے والی گولی سے ہوا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ میں ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو صرف اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر کسی تاوان کے لیے نہیں بلکہ اسے وہی اذیت دینے کے لیے جو اذیت اس نے میری عابدہ کو اس خونی انسان جنگی خان کے ذریعے اغوا کر کے اور اس معصوم کو زبردستی شراب پلا کر مجھے دوچار کیا تھا۔ نوشابہ پولیس کو اپنا بیان دے چکی ہے جو سچ پر مبنی ہے... مگر ممتاز خان اسے ذہنی مریضہ قرار دے کر عام لوگوں اور میڈیا کے لوگوں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ ممتاز خان کی قانونی سپورٹ کرنے والی قانون کی ایک کالی بھیڑ... ماضی کا ایس ایچ او اور ڈپٹی روشن خان... ماورائے قانون مجھے ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ ملتان کے نواح میں واقع اس کا نجی ٹارچر سیل ہے جہاں اس نے مجھے غیر قانونی طور پر حبس بے جا میں رکھا اور اس لیے مجھے وہاں انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنایا کہ میں اس کی مرضی کے ایک پہلے سے تیار شدہ بیان پر اپنا انگوٹھا لگا دوں۔ کھلاں والی کے ایم این اے راجا زبیر خان کے بیٹے راجا شفقت کے قتل کا جھوٹا الزام بھی میرے سر لگایا گیا مگر جلد ہی زبیر خان کو اپنے ذاتی ذریعے سے علم ہو گیا کہ یہ قتل اس کے بعض سیاسی دشمنوں کے ہاتھوں ہوا، اور میرے حق میں ان کا بیان بھی جاری ہوا۔ ملتان کی سیشن کورٹ میں چوہدری ممتاز خان کے خلاف میں ایک کیس پہلے ہی جیت چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملتان کے معروف ادارے ''اطفال گھر'' کو مجرموں اور تخریب کاروں کا اڈا... بنانے اور اس کے سرپرست حاجی اسحاق خان کے قتل کو حادثاتی رنگ دینے کا راز آشکارا

ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایس ایچ او روشن خان کے خلاف بھی کورٹ نے تادیبی کارروائی کا حکم جاری کیا اور اسے لائن حاضر کر کے کوارٹر گھاٹ کیا گیا۔ نیز محکمہ گیرائی کی ایک اسپیشل اینٹی کرمنل برانچ کے افسر ریاض باجوہ کو تفتیشی افسر مقرر کیا گیا جو اب رینجرز کے میجر ریاض باجوہ ہیں۔ ان کے ریکارڈ میں یہ ساری باتیں موجود ہیں مگر افسوس کہ ایک بار پھر طاقت اور اثر و رسوخ، دولت اور اقربا پروری کے زور پر اس کڑوے اور کھلے سچ کو ایک میٹھے جھوٹ میں بدل دیا گیا۔ مجھے انصاف چاہیے... قانون سے نہیں... آپ سے... عوام سے... اہل علم و دانش اور صاحبِ دل لوگوں سے... لیکن اگر تم لوگوں نے بھی بے حسی، بے بسی اور مصلحت کوشی کی عینک چڑھا رکھی ہے تو ایسے مجرم تمہارے سماج میں ہی نہیں، تمہارے اپنے گھر میں پیدا ہوتے رہیں گے اور تمہارے لیے دردِ سر بنے رہیں گے۔ خدارا! اب تو بے حسی کو خیرباد کہہ دو، کب تک شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دبا کر بیٹھے رہو گے؟ بس! مجھے یہی کہنا تھا۔“

ٹھیک اسی وقت بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ میں جنگی خان کو دبوچ کر پلٹا۔ وہ میری آہنی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچلا۔ کمیل دادا نے فوراً اُسے گن پوائنٹ پہ رکھ کر دھکا دیا۔ ہم اسے لے کر گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ ہمارا ارادہ جنگی خان کو ساتھ لے جانے کا تھا اور مجھے کچھ امید تھی کہ ہم نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں پہلے ہی میجر باجوہ کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ مگر اب معاملہ اور تھا۔ ان کا بچہ جنگی خان کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی ماں یقیناً اسے لے کر اوپر پہنچ چکی ہوگی اور یوں عین ممکن تھا کہ باجوہ نے دوبارہ فون کر کے نئی ہدایات دی ہوں۔

لہٰذا وہی ہوا۔ نیچے پہنچتے ہی رینجرز اور پولیس نے ہمیں گھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد میجر باجوہ بھی نیچے آ گئے۔ ہم تینوں کو ہی گرفتار کر لیا گیا۔ مگر میں نے باجوہ صاحب سے گزارش کی ہمیں وہ پولیس کی تحویل میں دینے کے بجائے اپنی تحویل میں لیں۔ ہمیں باہر لایا گیا۔ یہاں احاطے میں میڈیا اور نجی ٹی وی چینل والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن کی چھتوں پر بڑے بڑے ڈش انٹینا نصب تھے۔ وہ ہماری تصویریں لے رہے تھے۔ ویڈیو بنا رہے تھے۔ ان کے سامنے بھی میں نے چیخ چیخ کر وہی کچھ دہرایا جو اوپر سی سی کیمرے کے سامنے دہرا چکا تھا۔ نیز انہیں بتا بھی دیا کہ وہ دوسری منزل کی لابی کے سی سی کیمرے سے وہ فوٹیج حاصل کر سکتے ہیں جو اب تک کے ابتدا سے، اس سارے سنسنی خیز ڈرامے کی کوریج کر چکا تھا۔

کمیل دادا اس سارے قصے سے مطمئن اور خوش نہ تھا۔ مگر میں مطمئن تھا۔ مجھے میجر باجوہ صاحب سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔

☆☆☆

ہمیں ہیڈ کوارٹر لا کر ایک بیرک میں بند کر دیا گیا جبکہ جنگی خان کو کسی اور جگہ لے جایا گیا تھا۔

ذرا تنہائی ملتے ہی کمیل دادا نے اپنی عادت کے مطابق میرے لتے لینا شروع کر دیے۔

”تمہیں یہ جوش بھری تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارے اس تقریری مقابلے نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ہم بہ آسانی جنگی خان کو یرغمال بنا کر یہاں سے لے جا سکتے تھے۔“

”میں نے وہی کیا جو ان حالات میں مجھے کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ پھٹ پڑا۔

”شہزی! تم بہت خودغرض انسان ہو۔ تمہیں نہیں پتا کہ بیگم صاحبہ کس حال میں ہوں گی؟ ہم جنگی خان سے ان کے بارے میں اگلوا سکتے تھے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟“ جب میں نے قدرے چونک کر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا جس کے مطابق بیگم صاحبہ جب ایک دوسرے اسپتال سے اپنے بیمار باپ چوہدری الف خان کی عیادت کے بعد واپس لوٹ رہی تھیں (ان کے جانے کے بعد الف خان کی موت واقع ہوگئی تھی) تو ان کی کار پر نامعلوم مسلح حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے ٹائر برسٹ کر ڈالے تھے۔ وہ بھی قریبی کار میں سوار تھے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ کمیل دادا عقبی نشست پر موجود تھا۔ انہوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ کمیل دادا بیگم صاحبہ کو بچا کر نکل بھاگنا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خود زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ دشمن اسے مردہ سمجھ کر بیگم صاحبہ کو اغوا کر کے لے گئے۔ کمیل دادا نے بیگم ولا فون کر کے اول خیر کو بمشکل ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اس کے ساتھی اسے اور ایک دوسرے زخمی ساتھی کو اٹھا کر اسپتال لے گئے تھے۔ لہٰذا کمیل دادا کے مطابق... ان مذکورہ مسلح افراد کا تعلق ممتاز خان سے ہی تھا اور جنگی خان ان میں شامل تھا۔ بعد میں اسے ان دونوں کے بارے میں پتا چلا ہوگا کہ وہ زندہ ہیں اور ایک اسپتال میں

داخل ہیں تو وہ انہیں ختم کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ مگر میری اتفاقی اور بروقت مداخلت نے جنگی خان کا منصوبہ ناکام بنادیا اور کبیل دادا کی جان بھی بچ گئی۔

بہرحال کبیل دادا کی زبانی یہ ساری صراحت سننے کے بعد میں نے اس سے ازراہِ تشفی کہا۔

''اگر بیگم صاحبہ چوہدری ممتاز خان کے قبضے میں ہے تو خاطر جمع رکھو... وہ کبھی بھی ایک بہن کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے گا۔'' میری بات سن کر کبیل دادا کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔

''تم کس بھول میں ہو شہزی؟ اپنے جواں سال بیٹے فرخ کی موت یا قتل پر ممتاز خان کسی لحاظ کے بغیر بیگم صاحبہ کی جان کا دشمن بن چکا ہے۔ روئے زمین پر اس وقت بیگم صاحبہ کا اس سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں... اس نے بیگم صاحبہ کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہوگا... یہ بھی تم نہیں جانتے... اس لیے کہ تم بیگم صاحبہ کے ماضی کے حوالے سے اس خوف ناک داستانِ الم سے واقف ہی نہیں ہو۔ حیرت ہے... تمہارے دوست اول خیر نے بھی تمہیں اب تک یہ نہیں بتایا کہ بیگم صاحبہ اور چوہدری ممتاز خان کے درمیان سگے بہن بھائی والا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔''

اس انکشاف پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اگرچہ مجھے اول خیر سے ہی صرف اس قدر معلوم ہوسکا تھا مگر اس سے زیادہ پوچھنے کا اب تک موقع مل سکا نہ اسے مجھے ان سے متعلق کوئی صراحت بتانے کا۔ اول خیر کو شاید اس لیے ہی تنظیم میں نمبر دو کی حیثیت حاصل تھی۔ کسی کبیل دادا کی طرح وہ بھی بیگم صاحبہ کے ماضی سے واقف تھا۔

کبیل دادا پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے بیرک کے اندر ٹہلتا رہا۔ شکر تھا کہ بیرک کی حالت عام تھانوں کے لاک اپ جیسی نہ تھی۔ ان سے نسبتاً بہتر ہی تھی، ایک دیوار کے ساتھ لمبی سی سنگی بینچ بنی ہوئی تھی۔ میں اس پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ کبیل دادا کو بیگم صاحبہ کی طرف سے بے چینی کھائے جارہی تھی۔ اور خود مجھے بھی بیگم صاحبہ اور بالخصوص اول خیر کی جانب تفکیر آمیز تشویش لاحق تھی۔ کبیل دادا مجھے بار بار کوسے جارہا تھا۔ وہ اس کا ذمے دار مجھے ہی ٹھہرانے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اس کی بڑبڑ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تو میں نے بھی اسے سنادی۔

''ہم ویسے بھی پولیس وغیرہ کی گرفت میں آسکتے تھے۔ مگر شکر کرو کہ رینجرز نے ہمیں اپنی کسٹڈی میں لے لیا۔''

''ایک بات بتاؤ شہزی۔'' میری بات پر وہ بولا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ میجر باجوہ تمہارا شناسا نظر آتا ہے۔ یقیناً تمہارے ماضی میں بھی اچھے تعلقات ہوں گے اس سے۔ اور پھر تم نے اس کے بچے کو ایک خونی مجرم کی گرفت سے بھی بچایا۔ تم بھی اس سے اب تعاون کی درخواست کرسکتے ہو۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ شکر کرو... ہم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے۔'' میں نے تشفی آمیز انداز میں اپنی بات دہرائی۔ ''باجوہ صاحب سے مجھے اچھی توقعات ہیں... وہ مجھے ملنے کا موقع دیں گے، تو میں ان سے تعاون کی درخواست کروں گا۔ بیگم صاحبہ اور اول خیر کی طرف سے تشویش و تفکر کا شکار میں بھی ہوں۔''

میری بات سن کر وہ چپ تو ہوگیا مگر اندر سے پھر بھی پریشان اور غیر مطمئن سا تھا۔ اس نے پھر مضطربانہ انداز میں ٹہلنا شروع کردیا۔ میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں ایڈووکیٹ خانم شاہ کس حال میں ہوں گی؟ اس ہڑبونگ اور مارا ماری میں نجانے ڈاکٹر ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں اس کا آپریشن کر بھی پائیں ہوں گے کہ نہیں۔ تاہم کچھ تسلی تو تھی کہ خانم شاہ کہیں اور جگہ نہیں، بلکہ ایک اسپتال میں ہی ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ایک نیا پریشان کن خیال میرے ذہن کو بے چین ضرور کررہا تھا کہ اگر خدانخواستہ خانم شاہ کو کچھ ہوجاتا ہے تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔ میرے سلسلے میں پولیس کے ہاتھ ایک نیا کیس آسکتا تھا۔ بہ صورتِ دیگر اگر اس کی جان بچ بھی جاتی ہے تو بھی وہ پولیس کو سب سے پہلے زبیر خان اور میرے خلاف بیان دے سکتی ہے۔ میں تو اس کی زندگی کے بچ جانے کی دعائیں مانگ رہا ہوں، اور اس کی بھی کہ کاش خانم شاہ غصے اور انتقام کی روش سے ہٹ کر ہوش مندی سے کام لے کر معاملے کو دبانے کی کوشش کرے تو یہ ہم سب کے لیے بہتر ہی ہوگا۔

وقت گزرتا رہا... شام ہوگئی اور پھر رات کبیل دادا کی تشویش و پریشانی فزوں تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ تو اب باجوہ صاحب کی طرف سے بھی مایوس ہوگیا تھا کہ وہ کسی قسم کا تعاون ہم سے کریں گے، خود مجھے بھی حیرت تھی کہ آخر ابھی تک باجوہ صاحب نے مجھ سے ملاقات کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ ایک ڈر بھی تھا دل میں کہ کہیں رینجرز کے حکام ہمیں پولیس کے حوالے نہ کردیں۔ اس طرح معاملہ خطرناک اور سنگین ہونے تک بگڑ سکتا ہے۔ مجھے بار بار اول

خیر اور بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی تشویش ستا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ اول خیر کی طرف سے تو کسی حد تک یہ تسلی تھی کہ وہ بہر حال اس وقت تک جب وہ بیگم صاحبہ وغیرہ کی مدد کو نکلا تھا، دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ مگر اب کہاں اور کس حال میں تھا؟ اس کا ہمیں کوئی علم نہ تھا۔

رات کا کھانا لانے والے سے میں نے میجر صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے یہی بتایا کہ وہ آج دوپہر سے ہی کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے اور پھر کہیں چلے گئے تھے۔

میں نے اور کھبیل دادا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا... بھوک ہی ہماری اڑی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹا مزید بیت گیا تو ایک سنتری نے آ کر کہا۔ ''تم دونوں میں سے شہزاد احمد کون ہے؟''

''میں...'' میں نے فوراً دھڑکتے دل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''چلو، میجر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا پھر بیرک کا سلاخ دار بغلی دروازہ کھولا۔ میں نے ایک نظر کھبیل دادا کے چہرے پر ڈالی اور سنتری کے ساتھ ہولیا۔

ایک طویل اور دوسری نسبتاً چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ خاصا کشادہ کمرا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر میجر ریاض باجوہ براجمان تھے۔ ان کے جسم پر مخصوص وردی تھی۔ سینے پر ڈپارٹمنٹل ٹیگ کے علاوہ... شولڈرز پر رینجرز کے مونوگرام چسپاں تھے۔ ان کے چہرے پر گمبھیرتا طاری تھی۔ مجھے انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور سنتری کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔

اب کمرے میں صرف میں اور میجر صاحب رہ گئے تھے۔ وہ ہولے سے کھنکھار کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''... شہزی! تم نہیں جانتے کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہاری وجہ سے کس قدر شدید دباؤ کی زد میں رہا ہوں اور تمہارے لیے ہی اب ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔'' یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوئے۔ میری دھڑکتی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''پولیس مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔'' جو وہ کہہ رہے تھے اس کا مجھے خود بھی پہلے سے اندیشہ تھا۔ بہرحال میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔

''مگر میں جانتا ہوں اس وقت تمہارا پولیس کے قبضے میں جانا شاید انصاف کے مفاد میں نہ ہو۔'' وہ محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مفاد کے سلسلے میں انہوں نے میرا نام لینے کے بجائے ''انصاف'' کہا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود بھی قانون کے رکھوالوں میں سے تھے۔ ''مجھے تمہارا پہلے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے بچے کی زندگی بچائی۔ مگر شہزی! قانون بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کبھی کبھی ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاہم انسانی ہمدردی کے حوالے سے تمہارے اس قابل لحاظ عمل کو آن دی ریکارڈ لانے کی کوشش کروں گا۔ مگر پولیس انتظامیہ اس واقعے کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ایسا تم نے اپنے فرار اور اپنے مفاد کی خاطر کیا... اور اس سچویشن میں بظاہر ایسا ہی نظر آ رہا تھا مگر میں تمہیں مبارک باد پیش کروں گا کہ ملک کا نوے فیصد میڈیا اس وقت تمہارے حق میں ہے۔ اس وقت ملک کے ہر نجی و سرکاری ٹی وی چینلز سے اسپتال سے حاصل کردہ سی سی فوٹیج نشر ہو رہی ہیں۔ وہ والی بھی جس کے سامنے تم نے ایک جوش بھری تقریر کی تھی... جس کے تحت اعلیٰ حکام سمیت صوبائی وزیر اعلیٰ نے بھی اس بات کا سختی سے نوٹس لیا اور خصوصی تحقیقاتی کمیشن بھی قائم کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ اپوزیشن جماعتیں بھی تمہارے حق میں راہ ہموار کر رہی ہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے اس بات پر پُرسکون کی سانس لی تھی کہ وہ خصوصی فوٹیج میڈیا کے ہاتھ لگ چکی تھی... اور میں سمجھتا تھا کہ جنگی خان اور ممتاز خان سے میں نے یہ بہترین انتقام لیا ہے۔

''میجر صاحب! میں بھی آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں... مگر... جنگی خان کو بھی پولیس کی تحویل میں نہیں جانے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آپ بھی اس سے تفتیش کر کے آسیہ کی لاش کے بارے میں اگلوا سکتے ہیں۔ جو تابوت کی آخری کیل ثابت ہو سکتی ہے۔''

''یقیناً ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔'' میجر باجوہ... نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے جنگی خان کو الگ رکھا گیا ہے۔ اس سے اور بھی کئی حوالوں سے تفتیش کی جا رہی ہے۔ مگر...'' وہ اتنا کہہ کر کے پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، میں بے چین سا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اپنی کرسی کے عقب میں جا کھڑے ہوئے اور ہونٹ بھینچے پُرسوچ انداز میں چند ثانیے خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔

’’مگر... شاید... یہ سب کچھ میں زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکوں۔‘‘ ان کے لہجے کی شکست خوردگی اور افسردگی نے مجھے پریشان کردیا۔ بے اختیار میرے منہ سے سوالیہ نکلا۔

’’کیا مطلب، میجر صاحب؟‘‘

وہ بولے۔ ’’... سیاسی مداخلت ہمیں بے بس بنا ڈالتی ہے۔ ہمارے سسٹم کی خرابی کی بڑی وجہ یہی ناسور ہے۔ ہمیں اوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں کہ یہ معاملہ سول انتظامیہ یعنی پولیس کے سپرد کردیا جائے... اور تم سمیت جنگی خان کو بھی پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔‘‘

’’یہ ناانصافی اور زیادتی ہے سر...!‘‘ میں یکدم بھڑک کر بولا۔ ان کی ابتدا سے خوش امیدی کی گفتگو اب یک دم مایوسی کی جانب گامزن ہوتے دیکھ کر میں چیخ اٹھا تھا۔ وہ مجھ سے ازراہِ تشفی بولے۔

’’تم فکر نہ کرو... اب معاملہ اور ہے۔ باہر کی دنیا تمہارے ساتھ ہے۔ کالی وردی والی پولیس اب تمہیں کالے اندھیروں میں نہیں رکھ سکیں گے... مجھ پر بھروسا رکھو... میرا وعدہ ہے۔ جب تک تحقیقاتی کمیشن قائم نہیں ہوجاتا میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا، ویسے بھی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ہر جگہ ڈپٹی روشن خان جیسے لوگ نہیں ہوتے، فرض شناس پولیس آفیسر بھی ہوتے ہیں۔‘‘

میں خاموش رہا۔ مگر اندر سے پریشان اور بے چین ہوگیا تھا... اگرچہ ان کی بات بھی صحیح تھی کہ اب مجھے کالے اندھیروں میں مار دیے جانے کا خدشہ کم ہوگیا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ آنکھیں بند کرلی جاتیں۔ جانے کیوں ... پچھتاوے کا بھی احساس ہونے لگا کہ مجھے قانون کی گرفت میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ دیکھا جاتا کہ... میری ممتاز خان جیسے بااثر آدمی کے سامنے ... کیا حیثیت ہے۔ باہر کی دنیا میرے حق میں کتنی ہی چیختی رہے، کب کس کے سر پر جوں رینگتی ہے۔ یہ بعد کی بات تھی، ایسے میں مجھے ایڈووکیٹ خانم شاہ کا خیال آیا۔ کاش... خدا اسے عقل دے کہ وہ اس صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اپنی انتقامی روش سے باز آجائے اور مصلحت اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کرے۔

بہرحال میں نے ایک تھکی تھکی سی گہری سانس خارج کرتے ہوئے میجر باجوہ...... سے پوچھا۔ ’’تو پھر اب میرے سلسلے میں آپ نے آخری فیصلہ کیا کیا ہے؟‘‘ میرے استفسار پر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہوگئے اور اچانک بڑے ڈرامائی انداز میں بولے۔

’’... میں تمہیں کبھی بھی پولیس انتظامیہ کے حوالے نہیں کروں گا۔‘‘ ان کا جواب... ان کی بات میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ جس نے مجھے خوش کن انداز سے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ یکلخت میرا دل بے پایاں طمانیت اور مسرت سے دھڑکنے لگا۔ گویا ان کا میرے بارے میں اپنا یہ ذاتی اور آخری فیصلہ تھا... تاہم میں پھر بھی ان کی وضاحت چاہنے کی غرض سے کچھ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

’’میجر صاحب! ان ساری باتوں اور سیاسی دباؤ کے باوجود آپ کا میرے بارے میں یہ ذاتی فیصلہ میرے نزدیک قابلِ تحسین ہے مگر... سر! صرف آپ کے اپنے ذاتی فیصلے سے بھلا کیا ہوسکتا ہے؟‘‘

’’یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ نہیں ہے شہزی!‘‘ میجر ریاض باجوہ نے عجیب سے لہجے میں اور ایک انکشاف کیا۔

’’ہر معاملے میں سیاسی دباؤ کی مداخلت اب ملک کو تیزی سے کھوکھلا کر کے کرپشن کی جانب دھکیل رہی ہے... اور ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے یہ ابن الوقت قسم کے طالع آزما... ملک و قوم کے مستقبل سے زیادہ اپنے اقتدار اور اپنی خرمستیوں کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ یہ عاقبت نااندیش یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ... یہ ملک ہے تو یہ لوگ بھی ہیں، ان کا جاہ و حشم بھی وطنِ عزیز کے باعث قائم ہے۔ خدانخواستہ یہ نہ رہا تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟‘‘

’’باہر۔‘‘ میں زہر خند مسکراہٹ سے بولا اور میجر ریاض باجوہ قدرے چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

’’جی ہاں سر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ایسے حالات اور مواقع پر یہ لوگ یہی تو کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں

آوارہ گرد

فرق

نیویارک کے ایک اسکول میں استانی نے ایک شاگرد سے قتلِ عام اور جنگ کا فرق بیان کرنے کے لیے کہا۔

لڑکے نے بلاتردد کہا۔ ’’جب کوئی ریڈ انڈین قبیلہ دو چار سفید فاموں کو پکڑ کر مار دیتا ہے تو اسے قتلِ عام کہتے ہیں اور اگر دو چار سفید فام مل کر پورے ریڈ انڈین قبیلے کو مار ڈالتے ہیں تو اسے ہم جنگ کہتے ہیں۔‘‘

کراچی سے عبداللہ کا انکشاف

گے۔ اس لیے تو ان لوگوں کے پاس پہلے ہی سے دو، دو ملکوں کی نیشنلٹی ہوتی ہے۔ اپنا روپیا باہر کے ممالک میں صرف کیا ہوتا ہے۔ جس طرح گندی مکھی گندگی میں ہمیشہ اپنا ایک پر بچا کر بیٹھتی ہے، اس طرح یہ لوگ بھی سیاست کے گندے جوہڑ پر اپنی ایک ٹانگ بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک میں صرف سیاست سیاست کھیلتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ جواری ہیں۔ انہیں عوام سے عوام کی بنیادی سہولتوں، ضرورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ فضول ایشوز میں کئی کئی مہینے ضائع کر ڈالتے ہیں۔ بسا اوقات سالوں کے سال بھی۔ مگر عوامی مفادات کے ایک بھی ایشو کو یہ ایک دن میں اعلان کر کے اور پھر اسے انتظار کا لیبل لگا کر دبا دیتے ہیں۔''

اپنی تھوڑی بہت اخباری حد تک سیاسی سوجھ بوجھ کے مطابق میں نے تلخی سے کہا تو میجر باجوہ...... بھی تلخی سے مسکرائے۔

''ہاں! تم صحیح کہتے ہو۔ اب سیاست میں نیا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ جسے عام سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔''

گفتگو کہاں سے کہاں چلی گئی تھی مگر میری غیر معمولی اور فطری ذہنی فراست مجھے باور کروا رہی تھی کہ ضرور میجر ریاض باجوہ مجھ سے کچھ نہ کچھ شیئر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کوئی خفیہ اہم نوعیت کا راز میرے سامنے آشکارا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بیل دے کر کسی کو اندر بلایا اور اسے چائے لانے کا کہا۔

چائے آنے تک اسی نوعیت کی گفتگو ہمارے درمیان ہوتی رہی۔ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری اس جنگ نے مجھے اب تک ہر طرح کی سوجھ بوجھ عطا کر دی تھی۔ کچھ میری اپنی فطری زود فہمی کا بھی دخل تھا۔ تھوڑے نتیجے سے بہت کچھ اخذ کر لیا کرتا تھا۔ اس میں میری طبیعت اور مزاج میں شامل وجدانی ادراک کی کیفیات بھی گویا میری فطرت کا حصہ تھیں۔ جس کا مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری یہ جنگ ابھی کوئی اہم موڑ یا رخ اختیار کرنے والی تھی۔ یا پھر ادھر ہی اس کا ''دی اینڈ'' ہونے والا تھا۔

چائے آگئی۔ سادہ سے دو مگ تھے۔ جو ایک سنتری چھوٹی سی ٹرے میں اٹھائے اندر داخل ہوا تھا اور خاموشی سے ایک ایک مگ ہمارے سامنے رکھ کر لوٹ گیا تھا۔

''شہزی! کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟'' میجر باجوہ اچانک میری طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئے۔

میں جواباً محتاط انداز میں اور ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''سر! لگتا ہے آپ مجھے کسی بڑے اعزاز سے نوازنا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں میں آپ کے اعتماد پر پورا اترتا بھی ہوں کہ نہیں۔'' میجر باجوہ مجھے بہ غور گہری اور پُرسوچ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے۔

''شہزی! تم شاید نہیں جانتے کہ میں تم میں ابتدا سے ہی خصوصی دلچسپی لیے ہوئے ہوں اور جب سیشن کورٹ کے جج نے مجھے تمہارے سلسلے میں تفتیشی افسر مقرر کیا تھا تب سے اب تک میں تمہاری ایک ایک ہسٹری پر نظر رکھے ہوئے ہوں... میں نے اندازہ لگایا کہ تم نہ صرف ایک پُرعزم دلیر انسان ہو بلکہ ایک دردمند جذباتی دل و دماغ کے حامل بھی ہو اور اس سے زیادہ حقیقت پسند۔ تمہارے اندر نہ صرف سماجی ناسوروں کے خلاف بیخ کنی کرنے کا جذبہ کروٹیں لیتا رہتا ہے بلکہ وطنِ عزیز کے لیے یہ تمہارا پُرعزم دل دھڑکتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے، چائے کی چند چسکیاں لیں پھر قدرے دھیمی آواز میں بولے۔

''ملک تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ تبدیلی منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ یہ سب ملک کی سیاسی بساط پر بار بار ایک ہی طرح کے مہروں کی آمد کی وجہ سے ہے مگر... اس میں مثبت تبدیلی کا کوئی رخ دور تک نظر آتا دکھائی نہیں دے رہا ہے... اور اس وجہ سے ملک کے کچھ خفیہ اداروں کی ملکی مفاد کے پیشِ نظر ایک انفرادی سوچ نے بہت خاموشی سے جنم لیا ہے... جسے باضابطہ طور پر POWER کا نام دیا گیا ہے یوں سمجھو یہ ''پاور'' ایک روبوٹ ہے... ایسا روبوٹ جس کے اندر ایک حتمی نوعیت کی پروگرامنگ فیڈ کر دی گئی ہے... جس کا فقط ایک ہی مقصد ہے..... یعنی وطنِ عزیز کی سلامتی اور اس کی بقا۔ کسی نظریے کا پرچار کیے بغیر یہ بہت خفیہ طریقے سے اپنی تیسری آنکھ کے ذریعے ایسے عوامل پر نظر رکھے ہوئے ہے جو ملکی سلامتی کے مفادات سے متصادم ہوں۔ پاور کی اس تیسری آنکھ نے جان لیا ہے کہ ملک کی سیاسی قوتوں نے اب تک ملک اور عوام کے مفادات کی خاطر کچھ نہیں کیا بلکہ ان باہمی رسہ کشی والی روش نے ملک کو انارکی، تخریب کاری اور بے سکونی کی جانب ہی دھکیلا ہے۔'' وہ ذرا سانس لینے کو رکے۔ میری نظریں ان کے چہرے پر جمی

ہوئی تھیں، وہ پھر بولے۔

"پاور کا ایک اپنا مخصوص نظریہ ہے جو۔ عوام کے عمومی بنیادی نظریے سے ہی میل کھاتا ہے۔ یعنی امن، سکون... آزادی اور خوشحالی۔ پاور اس کاز پر کام کر رہی ہے۔ کیونکہ پاور سمیت مذکورہ عوام کو اس ملک کی اس دھرتی کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دھرتی ہے تو ہم ہیں۔ ورنہ ہم کدھر جائیں گے۔ پاور بہت خفیہ طریقے سے اپنے ممبر اپنی تیسری آنکھ سے چنتی ہے اور مجھے بھی انہوں نے ہی چنا ہے اور یہ ایک "سائیکل" ہے کیونکہ اب مجھے ایک ممبر چننا ہے اور میرا چناؤ تم ہو۔"

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ بظاہر میں گومگو کی کیفیات سے گزر رہا تھا مگر اندر میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل کی سی کیفیات طاری تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری زندگی ایک نیا رخ ایک نیا موڑ اختیار کر رہی تھی۔ میں یکلخت جیسے اپنے ماضی سے بے خبر اور کٹ سا گیا اور میرے سامنے وہی کچھ تھا جو میں سن رہا تھا اور میجر صاحب کی باتوں کے تناظر میں ایک تصوراتی ماحول دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں میری باتیں عجیب اور اچھوتی لگ رہی ہوں گی مگر حقیقت یہی ہے کہ ہر ثبات کو ہے تغیر کا سامنا۔ یہ انسان کی فطرت ہے وہ زیادہ عرصہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ مثبت راستہ اختیار کرتا ہے یا منفی روش پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ خیر و بد یہیں سے جنم لیتے ہیں۔ نئی نئی طاقتیں ادھر ہی سے جنم لیتی ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم بھی اس کا نتیجہ تھی۔ اندر ہی اندر پنپنے والی ایک خفیہ "پاور" جو منفی سوچ کی حامل تھی۔ اس نے دنیا کو دو بڑی عالمی جنگوں کی طرف دھکیلا... اور اب پھر وہی منفی نظریہ خودرو پودے کی طرح جنم لے رہا ہے... یعنی انسان زیادہ عرصہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ ایک ایسی ہی خفیہ منفی پاور دنیا کو ایک "تیسری عالمی جنگ" کی طرف دھکیل رہی ہے۔" وہ ذرا رک کر مجھ سے مستفسر ہوئے۔

"شہزی! تم یہ ساری باتیں سمجھ رہے ہو ناں؟"

"بہت اچھی طرح سے سر!" میں نے فوراً جواب دیا۔ مجھے اپنی آواز میں جوش کا ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔

"میں جس پاور کی بات کر رہا ہوں، وہ ہمارے وطن اور اس کے عظیم تر سلامتی مفادات کے لیے کام کر رہی ہے۔ بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کے ممبران یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ کہاں بیٹھے ہیں؟ ان کی لیڈر شپ کس کے ہاتھ میں ہے، وغیرہ۔ بس اس کے ٹاسک اس کے کاز کو آگے بڑھانا ہے، کامیابی سے خاموشی سے۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔"

میں خاموش تھا۔ کمرے میں دھڑکتی خاموشی طاری تھی۔ ماحول اور وقت تک رکا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ میجر صاحب کی گفتگو اور لہجے میں مجھے ایک عجیب طرح کا ٹرانس محسوس ہو رہا تھا جو دھیرے دھیرے میرے دل و دماغ کو کسی سحر میں جکڑ رہا تھا۔

وہ بولے۔ "شہزی! جب میری میجر کے عہدے پر ترقی ہوئی اور مجھے رینجرز فورس کا چارج سونپا گیا تو سب سے پہلا مشن مجھے اینٹی ڈکیت اسپیشل ٹاسک فورس کے انچارج کی حیثیت سے سونپا گیا اور میں نے جنوبی پنجاب کے ایک بڑے ڈاکوؤں کے گروہ کا بالکل قلع قمع کر کے رکھ دیا اور اس کے سرغنہ بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کو گرفتار کرلیا... اور پھر "پاور" کے ایما پر میں نے اس کے ساتھ ایک خفیہ ڈیلنگ کر کے اسے ایک خاص مقصد کے لیے چھوڑ بھی دیا اور اس کا یہ فرار بالکل ڈرامائی اور خفیہ رکھا کہ مجھ پر بھی کوئی آنچ نہ آسکی۔"

بدر اقبال کے نام پر میں چونکا تھا۔ بلاشبہ یہ نام میرے لیے اجنبی ہی تھا مگر... میں نے اسپتال کے سنسنی خیز ڈرامے کے دوران میجر باجوہ ...... کے منہ سے اس کا تذکرہ سنا تھا جو انہوں نے جنگی خان سے کہا تھا کہ کیا تم بدر اقبال کے آدمی ہو؟ بہر حال میں خاموشی سے میجر صاحب کی اختتامی گفتگو سنتا رہا۔ وہ آگے بتانے لگے۔

"بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کے ساتھ ہمیں خفیہ ڈیلنگ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ تھی۔ بابن ڈکیت نے اپنے سے کئی گنا بڑے اور خطرناک مجرم کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا تھا اور اس کا نام تھا وزیر جان۔ وزیر جان بظاہر ایک مشہور صنعت کار ہے۔ بابن ڈکیت نے اس کی دو کنال پر پھیلی ہوئی عالیشان کوٹھی میں نقب لگائی تھی۔ اس جیسے ڈاکو کو صرف مال و دولت کی حرص ہوتی ہے جو ڈکیتی کے دوران اس کے ہاتھ بھی لگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پرائز بانڈز اور شیئرز وغیرہ پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ وزیر جان کی خواب گاہ کے ایک خفیہ لاکر میں رکھی ہوئی فائل پر بھی اس کی نظر پڑی۔ بابن ڈکیت کچھ زیادہ پڑھا لکھا انسان تو نہیں تھا مگر فائل کی مخصوص کوَر شیپ اور اس پر چسپاں ایک عجیب سے مخصوص مونوگرام نے بابن ڈکیت کے دل میں ایک تجسس سا پیدا کیا۔ وہ فائل "باکس"

نما تھی۔ وہ اسے ہیروں کا باکس سمجھا۔ کیونکہ ایک تو وہ باکس ہی کی شکل میں تھی دوسرے، اس کے کھلنے کا کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اسے ہلانے جلانے سے اندر کوئی چیز کھڑکتی سی اسے محسوس ہوئی تھی۔ بابن ڈکیت نے اسے بھی تھیلے میں ڈال لیا تھا۔

''ڈکیتی کی یہ کامیاب واردات کرنے کے بعد وہ اپنی خفیہ کمین گاہ یعنی جنگل ڈیرے پر پہنچا تو اس عجیب فائل کے بارے میں اس کا تجسس جاگا اور اسے کسی طرح کھول ہی دیا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ اس کے اندر سے ہیرے جواہرات کے برآمد ہونے کی توقع کیے بیٹھا تھا مگر اندر کاغذوں کے پلندے کے سوا کچھ نہ برآمد ہوا۔

''اس ڈکیتی کی خبر ہمیں موصول ہوئی تو ہم اپنے تربیت یافتہ جاسوس بوگیر کتوں کے ذریعے بابن ڈکیت کا سراغ لگاتے ہوئے بالآخر اس کی خفیہ کمین گاہ جا پہنچے اور اس کے جنگل ڈیرے پر زبردست ریڈ کیا جو اس کے خونی گروہ کے خاتمے کے لیے بھی تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔

''اس کے گروہ کے کئی ساتھی مقابلے میں مارے گئے، کچھ گرفتار ہوئے ان میں بابن ڈکیت بھی تھا۔ لوٹا ہوا مال و اسباب بھی ہاتھ آ گیا اور وہ فائل بھی۔ یہ فائل میرے لیے اہم ثابت ہوئی۔ فائل کا تفصیلی مطالعہ اور جائزہ لینے کے بعد ہی مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ بلاشبہ بابن ڈکیت نے نادانستگی میں خود سے کئی گنا بڑے اور خطرناک و سنگین مجرم کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ پاور والوں کے علم میں یہ بات آئی تو فیصلہ کیا گیا کہ وزیر جان کو ابھی گرفت میں لینے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جبکہ دوررس نتائج اور وسیع تر مفادات کے حصول کے لیے اسے اندھیرے میں رکھ کر پس پردہ اس کی ڈوریاں ہلانے والوں کو بے نقاب کرنا زیادہ اہم تھا کیونکہ وزیر جان کی اہمیت صرف ایک کٹھ پتلی کی تھی۔ اس کے لیے ہم نے ایک چال چلی اور کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ وزیر جان سے صرف اس مقصد کے لیے رابطہ کیا کہ وہ مال خانے سے آ کر برآمد کیا ہوا مال مسروقہ لے جائے۔ ابتدا میں تو اس نے حسب توقع کوئی دلچسپی نہ دکھائی، کیونکہ وہ یقیناً شدید شش و پنج کا شکار ہوگا۔ کیونکہ اسے اپنے چوری شدہ مال و دولت سے زیادہ اس خفیہ اور اہم نوعیت کی باکس فائل کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی مگر اس کے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔۔۔ والی صورت حال تھی۔ اگر وہ مذکورہ فائل کی ملکیت جتانے کی کوشش کرتا تو پھنستا تھا، نہ کرتا تو بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔

ابتدا میں اس نے کوئی دلچسپی یا تشویش ظاہر نہ کی ہم بھی انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ ادھر بیرک میں قیدی کی حیثیت سے موجود بابن ڈکیت کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس نے نادانستگی میں۔۔۔ کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تب تک ہم نے بابن ڈکیت کی ہسٹری کھنگالنا شروع کر دی اور صرف اس قدر ہی معلوم ہوسکا کہ وہ ملتان کے نواح میں واقع ''نئے پنڈ'' کے جاگیردار چوہدری الف خان کا نمک خوار رہ چکا تھا۔۔۔ پھر وہ اس کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان کا خونی ہرکارہ بن گیا، مگر پھر جانے کیا ہوا کہ وہ اس سے بھی برگشتہ ہوگیا اور ڈاکوؤں کے ٹولے میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گروہ کی بھی داغ بیل ڈال لی۔'' باجوہ صاحب اتنا بتا کر تھوڑا خاموش ہوئے۔ میں چوہدری الف خان اور ممتاز خان کے ذکر پر تھوڑا چونکا۔

پھر وہ مزید گویا ہوئے، میں دھڑکتی سماعتوں سے ان کی گفتگو بہ غور سن رہا تھا۔ ''ہم نے وزیر جان کے خلاف خفیہ جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے انتظار کا کھیل کھیلنا ہمارا ایک اہم ترین خفیہ مقصد تھا۔ ہم اسے اس شش و پنج میں مبتلا کیے رکھنا چاہتے تھے کہ آیا اس کے چوری شدہ مال و دولت کی برآمدگی کے بعد کیا وہ فائل بھی ہمارے ہاتھ لگی تھی یا اسے بعد میں بابن ڈکیت نے غیر اہم سمجھ کر ضائع کر دیا تھا۔۔۔ لہٰذا جب وزیر جان نے دیکھا کہ اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی تو اس نے کچھ دنوں بعد خود ہی ہم سے رابطہ کیا اور اپنے چند آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آن دھمکا۔ ہم جانتے تھے اگر ہم فائل کے سلسلے میں اسے گرفت میں لیتے یا پوچھ تاچھ کرنے کی کوشش کرتے تو وہ نہ صرف صاف مکر جاتا بلکہ محتاط بھی ہو جاتا جبکہ ہم ابھی اسے اندھیرے میں رکھ کر اس کی مکمل ''ریکی'' کرنا چاہتے تھے۔ ہم اس کے سامنے یوں بن گئے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ وہ بھی بظاہر ہمارے سامنے پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے آدمی حساب و اعداد و شمار میں مصروف ہوگئے۔ ہماری عقابی نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد جب وہ مطمئن ہو کر لوٹنے لگا تو ہم نے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔۔۔ بعد میں ایک خفیہ منصوبے کے تحت ہم نے پہلے ہی سے یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ بابن ڈکیت کی گرفتاری کے دوران اس کے چند ساتھی، کچھ چوری شدہ مال و اسباب اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہوگئے تھے یہی سبب تھا کہ ہم نے وزیر جان کو

بھی اس کا چوری شدہ مکمل سامان اس کے حوالے دانستہ نہیں کیا تھا... اور اس پر یہی باور کیا تھا کہ بابن ڈکیت کے چند فرار ہونے والے ساتھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مقصد وزیر جان پر یہی باور کرانا تھا کہ وہ سمجھے وہ فائل بھی یقیناً بابن ڈکیت کے فرار ہونے والے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کسی ایک کے پاس ہوگی۔

''اس کے بعد ہم نے بابن ڈکیت کو سول پولیس انتظامیہ کے سپرد کردیا تھا... مگر اس کی فل ریکی کرتے رہے۔ ہماری سو فیصد توقعات کے مطابق کچھ دنوں میں ہی بابن ڈکیت کو ضمانت پر رہا کرالیا گیا اور رہا کرانے والا تھا، وہی صنعت کار وزیر جان... ہم جانتے تھے کہ اس نے یہ کیوں کیا تھا... مگر بابن ڈکیت کے لیے یقیناً یہ بات حیران کن ہی رہی ہوگی کہ اس نے جس گھر میں نقب لگائی اس کے مالک نے اس کی ضمانت بھی کروائی۔

بابن ڈکیت جیسے خطرناک ڈاکو کو ہمارا دانستہ پولیس انتظامیہ کے حوالے کرنے کا مقصد وطنِ عزیز کے وسیع تر مفادات میں تھا۔ کیونکہ وزیر جان جیسے خطرناک ملک دشمن عناصر اور اس کے پورے ملک میں پھیلے نیٹ ورک کو بے نقاب کرنا زیادہ ضروری تھا۔ ہمارا ایک مقصد پورا ہوچکا ہے یعنی ہم وزیر جان پر مکمل طور پر یہ حقیقت باور کرانے میں کامیاب ہوچکے تھے کہ وہ فائل ہمارے ہاتھ سرے سے لگی ہی نہیں۔ اس نے بابن ڈکیت کی ضمانت کرانے کے بعد اپنے ساتھ لے جاکر اس سے باز پرس کی تھی۔ ہم دو خفیہ ایجنٹ اس کی ریکی پر لگا چکے تھے۔ وزیر جان، بابن ڈکیت پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے مفرور ساتھیوں کو یکجا کرے اور ان سے فائل دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اس کے ساتھ باقاعدہ سودے بازی بھی کر ڈالی تاکہ لالچ میں آکر بابن ڈکیت اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوجائے... مگر موقع ملتے ہی بابن ڈکیت اس کی گرفت سے نکل بھاگا اور معاملہ یہیں دب گیا۔ یوں گویا ہمارا مقصد بھی پورا ہوگیا۔''

میجر ریاض باجوہ اپنی بات ختم کرکے سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان جاری رہنے والی یہ بہت خفیہ میٹنگ اہم نوعیت ہی کی تھی۔ ''میرا خیال ہے اب مجھے مقصد کی بات پر آنا چاہیے۔'' وہ آخر میں ایک گہری سانس خارج کرکے بولے۔

میں ان کی آخری بات پر یہی مطلب اخذ کرپایا کہ مجھے بھی کہیں ''پاور'' کے ایما پر میجر ریاض باجوہ دانستہ پولیس کے حوالے کرکے اپنا کوئی اہم خفیہ مقصد تو نہیں حاصل کرنا

چاہ رہے ہیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ میرے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا۔ ایک تو میں بابن ڈکیت کی طرح کوئی خطرناک مجرم نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ پولیس میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر باجوہ صاحب نے مجھ سے ایسی کوئی ڈیلنگ کرنا چاہی تو میں ان کی اس بات سے شدید اختلاف کا اظہار کروں گا۔

باجوہ صاحب بولے۔ ''شہزی! تم ایک بہادر اور باعزم نوجوان ہی نہیں بلکہ فطرتاً شریف اور باضمیر انسان بھی ہو۔ ایک ایسے انسان جو اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی سودا کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمہاری شرافت کے پیچھے ایک ولولہ انگیز جوش و جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ جو تمہیں معاشرے کے ناسوروں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے اکساتا ہے۔ مگر شہزی! کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ جب یہی معاشرے کے ناسور جو ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہوں اور اس کا اغیار کے ساتھ سودا بھی کرنے کے لیے پرتول رہے ہوں تو تمہاری کیا رائے ہوگی ایسے عناصر کے خلاف؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''میجر صاحب! میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ میرے بارے میں اچھے جذبات و خیالات رکھتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ہر سچے پاکستانی محب وطن کی طرح میری رگوں میں بھی حبِ وطن کا جذبہ دوڑ رہا ہے..... میں سمجھتا ہوں یہ ہر اس انسان کا فطری جذبہ قرار پاتا ہے جس کا خمیر ہی اس دھرتی سے اٹھا ہو جو یہاں پیدا اور پلا بڑھا ہو... میجر صاحب!... مجھے بھی اپنے وطن سے محبت ہے اور یہ وہ لاشعوری محبت ہے جو مجھے ہمیشہ ایسی جنگ پر اکساتی رہتی ہے کہ میں سماج کو درندہ صفت عناصر سے پاک کروں جنہوں نے وطن عزیز کے عام لوگوں کی زندگی اپنے اثر ورسوخ اور دولت و طاقت کے شکنجے میں اجیرن کررکھی ہے اور جو اپنے مکروہ مفادات و مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر مجبوروں اور بے کسوں کو ظلم و جبر اور ناانصافی کی چکی میں پیسنے سے گریز بھی نہیں کرتے۔''

''گڈ...'' میجر باجوہ توصیفی لہجے میں بولے۔ ''جیسا کہ میں نے بتایا کہ مجھ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ تمہیں پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جائے مگر ہم ایسا نہیں چاہتے... اگرچہ ہم مجبور بھی ہیں، اس کا پاور والوں نے ایک آسان حل تجویز کیا ہے۔ جب تم دونوں کو پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جارہا ہوگا، تو منصوبے کے مطابق پولیس وین پر حملہ کردیا جائے گا۔ تم دونوں فرار ہوجانا۔''

میجر صاحب کی اس بات پر میرا دل خوشی سے دھڑکا۔ تاہم ایک الجھن تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''میں آپ کا مشکور ہوں میجر صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اتنی اہم نوعیت کی گفتگو اور ''پاور'' وغیرہ جیسے خفیہ راز سے مجھے ہی آگاہ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟'' وہ جواباً مسکرا کر بولے۔

''اس لیے کہ پاور والوں کا انتخاب تم جیسے ہی نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کی تیسری آنکھ کبھی دھوکا نہیں کھاتی، تم خود کو خوش نصیب سمجھو کہ اب تم بھی پاور میں سردست عمومی نوعیت کی شمولیت اختیار کرچکے ہو۔ نیز یہ ساری باتیں تمہیں بتانے کا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ تم اپنے جن دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو، وہ ہمارا بھی ٹارگٹ ہیں اس لیے تمہارے علم میں یہ سب لانا ازبس ضروری تھا کیونکہ آج کل وزیر جان تمہارے دشمن دیرینہ ممتاز خان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کررہا ہے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ وزیر جان... ممتاز خان کو بھی اپنی ملک دشمن سرگرمیوں میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ تم نے آج کل ممتاز خان کو بری طرح زچ کررکھا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ وزیر جان کا حلیف بننے کے بعد وہ اس کی مدد سے تمہیں شکست سے دوچار کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں، تم مجھ سے کسی بھی لمحے مدد یا راہنمائی کے لیے رابطہ کرسکتے ہو۔''

''آخر وزیر جان کس قسم کی ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہے...؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بات کو ابھی رہنے دو۔ کوئی اور بات؟'' وہ میری طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''ہمیں جنگی خان بھی چاہیے... اس سے ہمیں کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اگر پولیس انتظامیہ کے حوالے کردیا گیا تو دوسرے دن وہ باہر ہوگا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ طویل میٹنگ نما گفتگو اختتام کو پہنچی تھی۔ میں نے آخر میں باجوہ صاحب سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ اگر میرے تین ساتھیوں، ارشد، شوکی اور شکیل کے سلسلے میں بھی کچھ کرسکیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔

مجھے واپس بیرک میں چھوڑ کر سنتری لوٹ گیا۔ گبھیل دادا اونگھ رہا تھا۔ کھڑبڑ کی آواز پر چونک کر بیدار ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دیوار گیر سنگی بنچ سے یکدم اٹھ بیٹھا۔

میں نے اسے ساری بات بتادی۔ البتہ ''پاور'' سے متعلق میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی وزیر جان سے

متعلق کوئی بات بتائی۔ صرف اس قدر بتایا کہ باجوہ صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے اور پھر موجودہ حالات سے ان کے بیٹے کو جنگی خان کی خونی گرفت سے آزاد کرانے پر وہ مجھ سے ہر طرح کے تعاون کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

بہر حال کبیل دادا کے لیے بھی یہ بات مسرت انگیز تھی کہ نہ صرف ہمیں ایک ڈرامے کے تحت آزاد کر دیا جائے گا بلکہ ہمارا شکار جنگی خان بھی ہمارے حوالے کر دیا جائے گا۔

چنانچہ باقی سب کچھ تیزی سے ہوا تھا۔ پولیس کی تین گاڑیاں جن میں بند وین بھی شامل تھی ہمیں لینے کے لیے رینجرز کے ہیڈ کوارٹر آن پہنچیں۔ ہم تینوں کو بند وین میں سوار کرایا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں باندھی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا جنگی خان کے مکروہ چہرے پر حسبِ توقع طمانیت اور بشاشت کے آثار تھے۔ وہ رینجرز سے پولیس کے ہتھے چڑھنے پر یقینا خوش تھا۔

یہ کس قدر المیے اور دکھ کی بات تھی کہ ایک خطرناک خونی مجرم... جسے قانون سے خوف کے بجائے ''تحفظ'' کا احساس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی پشت پناہی کرنے والے ''ڈان'' اسے قانون کے شکنجے سے بہ آسانی چھڑا لیں گے۔ یہ سب غیر جمہوری سیاست گری کے بل بوتے پر ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے ''پاور'' جیسی خفیہ طاقت نے جنم لیا تھا جو زہر کو زہر سے اور لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی قائل تھی۔ مجھے میجر ریاض باجوہ کی بات بالکل درست معلوم ہو رہی تھی کہ یہ روش اب ایک ناسور بن کر ہمارے سماج میں کیا بلکہ ملک کی جڑوں میں دیمک کی طرح گھس آئی تھی اور دھیرے دھیرے چاٹ رہی تھی۔ لہٰذا ملکی اور قومی سلامتی کے وسیع تر مفادات اور بقا کے لیے ضروری تھا کہ زہریلی روش کو زہر ہی سے ختم کیا جائے۔''

پولیس کی تینوں گاڑیاں رینجرز کے ہیڈ کوارٹر سے نکلیں اور طوفانی رفتار سے سڑک پر آ کر دوڑنے لگیں۔

میں اور کبیل دادا ایک ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ہمارے سامنے والی سیٹ نما بینچ پر جنگی خان براجمان تھا۔ وہ مجھے بھی زہریلی نظروں سے گھورنے لگتا تو کبھی فاتحانہ نظروں سے۔ اس کے بدنیت ہونٹوں پر بھی بڑی زہر خند مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ بڑی خار دلانے والی تھی تا ہم مجھے بھی تسلی تھی اور میں برماتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے اندر ہی اندر اپنا ابال کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خوش ہو لے بیٹا، جو تو سمجھے ہوئے ہے، وہ تیری محض خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں اور جو تیرے ساتھ عنقریب ہونے والا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

ابھی ہمیں رینجرز ہیڈ کوارٹر سے نکلے ایک اندازے کے مطابق بہ مشکل پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز ابھری۔

''پاور''

یکلخت میرے ذہن میں ابھرا۔ یقینا میری طرح کبیل دادا بھی سمجھ گیا ہوگا۔ ہمارے بچاؤ کے لیے ہمارے بہی خواہ حرکت میں آ گئے ہیں۔ اگرچہ اسے تو میں نے ''پاور'' کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف جان کاری کی غرض سے اتنا بتایا تھا کہ میجر صاحب کو میں اعتماد میں لے چکا ہوں، وہ ہماری مدد کریں گے۔ تاہم میجر صاحب نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ''پاور'' بے گناہ کشت و خون کے بازار گرم نہیں کرتی جبکہ ہمیں پولیس کے قبضے سے چھڑانے کے لیے ''پاور'' کے خفیہ اور تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ بغیر پولیس اہلکاروں کا خون بہائے ہمیں ان کے قبضے سے آزاد کرانے والے تھے۔

ایک دھماکے کے محض چند سیکنڈوں بعد دو دھماکے اوپر تلے ہوئے۔ ہماری وین کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رک گئی اور اسی وقت گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اور یہ بھی مسلسل چند منٹوں تک جاری رہی۔ آتشیں قہقہوں کے دوران مجھے انسانی چیخوں کی بھی آوازیں سنائی دیں۔ ہماری وین کے ڈرائیور سمیت محافظ پولیس والے بھی جگر پاش چیخوں کے ساتھ ڈھیر ہو رہے تھے۔ کیونکہ ڈرائیونگ کیبن کی جالی دار دیوار سے ہم انہیں تڑپتا گرتا اور ان کے جسم سے خون اچھلتا دیکھ رہے تھے۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا اور چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ کیونکہ یہ سب میجر صاحب کے پاور ایجنٹوں کے منافی ہو رہا تھا اور یہاں تو کشت و خون کا بازار گرم کیا جا رہا تھا۔ یکلخت ہماری وین کے بند دروازے پر کسی نے برسٹ مارا اور پھر اک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ میری سنسناتی نظروں نے تین چار مسلح نقاب پوشوں کو دیکھا۔ انہوں نے ہم پر نظر ڈالی... پھر جنگی خان کی طرف دیکھ کر ایک نے اسے مخصوص اشارہ کیا۔ میری نظروں نے جنگی خان کے چہرے کا جائزہ لیا اور پل کے پل میرے رگ و پے میں سنسنی کی پھریری دوڑتی چلی گئی۔ وہ میری طرف بڑی استہزائیہ مسکراہٹ سے گھور رہا تھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا چکی تھی۔ معاملہ کچھ اور ہی... محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ نقاب پوش

اندر آئے اور سب سے پہلے انہوں نے جنگی خان کو اس کی ہتھکڑیوں سے آزاد کیا جبکہ مجھے اور کبیل دادا کو گن پوائنٹ پر لے کر بازو سے دبوچے وین سے نیچے لے آئے۔

یہاں مجھے پولیس کی دو گاڑیاں تباہ شدہ دکھائی دیں اور ان کے قریب اور اندر پولیس والے خون میں نہائے مردہ حالت میں نظر آئے۔ کبیل دادا الجھن آمیز تفکر سے میری طرف تکنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہوں۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

مجھے اب تک اندازہ ہو چکا تھا کہ بازی الٹ ہو گئی ہے... یا ور سے پہلے دشمنوں کا بھی یہی منصوبہ ہوگا... اور وہ میرا ''کھڑاگ'' بالا ہی بالا نمٹا دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ بات حقیقت تھی تو اب میری اور کبیل دادا کی زندگی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔

یہ ہمارا ادھر ہی قصہ پاک کر سکتے تھے۔

ان کے اور بھی نقاب پوش مسلح ساتھی مجھے نظر آئے، ایک کار اور ایک جیپ بھی دکھائی دی جو یقیناً انہی کے زیرِ استعمال تھی۔ جنگی خان آزاد ہو چکا تھا، جبکہ میں اور کبیل دادا ایک قید سے نکل کر دوسری بدترین قید میں جا چکے تھے۔

ہمیں رائفلوں کے کندے مار کے جیپ کی طرف دھکیلا جانے لگا... اور عقبی دروازہ کھول کے اندر دھکیل دیا گیا۔

''یہ سب کیا ہے شہزی؟'' کبیل دادا نے ہولے سے پوچھا۔ اس کا چہرہ ہونق سا ہو رہا تھا۔

''معاملہ الٹ ہو گیا ہے دادا!'' میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔ ''جن لوگوں کو آنا تھا، ان سے پہلے دشمن نے شب خون مار دیا۔ ان کا بھی منصوبہ یہی تھا شاید۔''

''مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ میجر صاحب...''

''کہا ناں... معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی، اور پھر اچانک ہی جیسے میرے تاریک پڑتے دل و دماغ میں خوش آئندہ امید کا ایک جگنو ٹمٹمایا... وقت یہی تھا اور راستہ بھی... شکاری بدل بھی سکتے تھے۔

جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اور اس کے عقب میں کار روانہ ہو گئی۔ جنگی خان ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کے عقب والی سیٹ پر تین مسلح افراد جنھوں نے اب اپنے چہروں سے نقاب کھینچ لیے تھے۔ وہ جنگی خان کے ساتھی ہی تھے یعنی چوہدری ممتاز خان کے کارندے۔ شاید قانون کی بازی میرے حق میں پلٹتے ہوئے اس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس لیے اس نے یہ چال چلی تھی۔

''جی چوہدری صاحب... سب منصوبے کے مطابق ہو گیا تھا۔ دونوں شکاری ہمارے قبضے میں ہیں... جی... اچھا جو حکم... ابھی بات کرواتا ہوں۔''

اچانک میں نے جنگی خان کی آواز سنی۔ وہ یقیناً ممتاز خان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ گھما کر عقبی سیٹ پر بیٹھے آدمی کی طرف سیل فون بڑھایا۔ اس کا اسپیکر وائیڈ کر دیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھی نے سیل فون کو ایسے ہی میری طرف بڑھا کر ہاتھ روک لیا۔ وہ میرے چہرے کے قریب تھا۔

چند ثانیوں بعد مجھے ممتاز خان کی کھڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔

''ایک بار پھر خوش آمدید... شہزاد احمد خان المعروف شہزی۔ حالات کا یہ پلٹا تمہیں یقیناً ناگوار گزر رہا ہوگا۔'' ایک پُرامید اور خوش آئند وقت کے سو فیصد طمانیت بخش قیاس نے مجھے کافی حد تک سنبھالا دیا تھا۔ اس لیے میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ممتاز خان یہ ایک جنگ ہے۔ اس کی بازی الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔ آج تمہارے حق میں تو کل میرے حق میں۔''

''ہا... ہا... ہا... رسی جل گئی... مگر بل نہیں گیا۔ تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا، شہزی کہ تم نے اسپتال میں جو ڈراما سی سی کیمرے کے سامنے رچایا تھا، اس کا پھل اتنی آسانی سے کھا لو گے، کیونکہ ایک ایسا ہی ڈراما تمہارے جواب میں ہم نے بھی رچا لیا ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے قانون کے رکھوالوں کے ساتھ خون ریزی کے دوران چھڑانے والے میرے ساتھی تھے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ تمہارے ساتھیوں نے ہی قتل و غارت گری کا یہ بازار گرم کیا ہے۔''

اس کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میری سماعتوں کو چھلنی کرنے لگے۔ ایک ظالم اور بے حس انسان نے بے گناہ پولیس اہلکاروں کے خون کی ہولی کھیلی تھی، جس کا مجھے بھی شدید دکھ تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم جیسے بے حس اور درندہ صفت انسان سے ہر قسم کی توقع رکھی جانی چاہیے ممتاز خان! مگر یاد رکھنا... تمہارے یہ اوچھے ہتھکنڈے ایک دن تمہیں ہی لے ڈوبیں گے اور وہ وقت دور نہیں رہا۔''

جواب میں سیل فون کا وائیڈ اسپیکر اس کے کریہہ قہقہوں سے گونجنے لگا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

دونوں گاڑیاں ایک ذیلی سڑک سے مین روڈ کی طرف موڑ کاٹنے لگیں۔ دفعتاً تھکی ہوئی فضا میں تلے اوپر ایسی آوازیں ابھریں جیسے پھسپھسے غبارے پھٹے ہوں۔ ہماری جیپ سے ایسی ہی آوازیں ابھریں اور اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور سڑک کے موڑ پر اوور ہیڈ برج کی ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ مجھے ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے اور شیشے بکھرنے کی آوازوں کے ساتھ کچھ انسانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ بالکل عقبی سیٹوں میں درمیانی نشست کی پشت گاہ نے مجھے اور کمبیل دادا کو جھٹکا لگنے پر اتنا سہارا دے دیا کہ ہمیں زیادہ چوٹ نہ آئی۔ پھر سب کچھ جیسے تیزی اور میکانیکی انداز میں ہوا تھا۔ جن چند لوگوں کی جھلک مجھے نظر آئی تھی وہ اپنی وضع قطع میں ایک مخصوص ساخت کے حامل تھے۔ جسم چست لباس میں ملفوف تھے۔ آنکھوں پر ننجا (Ninja) اسٹائل کے نقاب تھے، ہاتھوں میں بھی عجیب ساخت کے اسٹیل والے پسٹل نظر آرہے تھے۔ جن سے دھماکوں کے بجائے زٹ... زٹ... کی آواز... برآمد ہورہی تھی۔ وہ شاید نیم بے ہوش کرنے والے ڈاٹس (Dots) فائر کررہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے، جن کا میں منتظر تھا۔ ان کے انداز و اطوار اور کام نمٹانے کے طریقۂ کار میں مجھے ایک میکانیکی عمل محسوس ہوا۔ ایک ایک ساعت کی جیسے انہوں نے کیلکولیشن کررکھی تھی اور تیزی سے اپنا کام نمٹایا تھا۔ پہلے مجھے اور کمبیل دادا کو جیپ سے نیچے اتارا۔ اس کے بعد ہمارے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھولی گئیں صرف ایک ننجا ٹائپ آدمی نے مجھ سے سوال کیا۔ اس کے بولنے کا انداز بھی مجھے کسی روبوٹ جیسا لگا تھا۔ ''تمہارا شکار کدھر ہے؟''

''اگلی سیٹ پر... ڈرائیور کے برابر۔'' میرے منہ سے بھی بے اختیار جواباً میکانیکی الفاظ برآمد ہوگئے۔

''اوکے... اپنا شکار لے کر نکل جاؤ... ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''پولیس پر ان کے حملے کے باعث صورتِ حال مخدوش ہوگئی ہے۔ لہٰذا یہاں سے نکل جاؤ۔'' اپنی بات ختم کرکے وہ پلٹا۔ پھر وہ سب قریب کھڑی ایک سفید رنگ کی ہائی روف میں سوار ہوگئے۔ سڑک پر بچھی آہنی میخوں والی فولادی پٹی کھینچ کر انہوں نے ہائی روف کے پچھلے حصے میں لپیٹ کر رکھ دی تھی۔

میں اور کمبیل دادا چند ثانیے ہکا بکا سے رہ گئے۔ پھر جب ''ننجا ٹولے'' کی گاڑی حرکت میں آئی تو ہمیں بھی جیسے چابی بھرگئی۔ گویا انہیں بھی پولیس پر حملے کا علم ہوچکا تھا۔

میں تیزی سے جیپ کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو جنگی خان کا بے سدھ وجود لڑھک کر باہر آگیا۔

''یہ سب بے ہوش ہیں۔ ہمیں نکلنا ہوگا اس جگہ سے...'' میں نے کمبیل دادا سے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دشمنوں کی دوسری گاڑی یعنی کار ٹائر برسٹ ہونے کے باعث بے قابو ہوکر پلر کے ایک خلا میں جا گھسی تھی۔ سڑک پر بچھی آہنی میخوں نے دونوں گاڑیوں کے ٹائر برسٹ کرڈالے تھے۔

میں نے جنگی خان کو کاندھے پر ڈال لیا۔ جبکہ اس دوران کمبیل دادا نے ایک بے ہوش دشمن کی جیبوں کی تلاشی لے کر سیل فون اچک لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پہلے گردوپیش کا جائزہ لیا... روڈ پر چلنے والی ٹریفک کی آوک جاوک کچھ زیادہ نہ تھی۔ کچھ راہ گیر بھی تھے۔ چند لوگ اس طرف متوجہ بھی ہوئے تھے کہ اس طرف کچھ ہوا ہے۔ اس لیے میں اور کمبیل دادا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور نسبتاً محفوظ جگہ پر آگئے۔ یہ سڑک سے قدرے دور بنجر علاقہ تھا۔ اس دوران کمبیل دادا نے سیل فون پر بیگم ولا رابطہ کرکے اپنے کچھ ساتھیوں کو باٹا پورہ والی روڈ پر آنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے پہلے بیگم ولا جانے پر اعتراض ہوا، مگر حالات ایسے تھے کہ اور پھر کہاں جاتے؟ بقول کمبیل دادا کہ بیگم ولا اب محفوظ جگہ ہے۔ وہاں دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہوسکتا پھر اب میجر باجوہ صاحب کی مدد بھی شامل ہوچکی تھی۔ اور اسپتال والے سنسنی خیز واقعے کے بعد ڈپٹی سپر روشن خان کی چیرہ دستیوں کو بھی بریک لگ چکے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ بے ہوش کرنے والی ڈاٹس کا نہ جانے کب تک اثر زائل ہونا تھا۔ جنگی خان دوبارہ ہوش میں آکر مسئلہ کھڑا کرسکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے ہمارے پاس ایسا کوئی بندوبست نہ تھا۔ تاہم یہ ہمارے لیے کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ میں اکیلا بھی جنگی کی درگت بنا سکتا تھا۔ مگر مسئلہ ظاہر ہے شور شرابے کا تھا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر بھاگ سکتا تھا۔

کچھ دیر اور بیت گئی، ایک کار میں دو آدمی ہمیں لینے کے لیے باٹا پورہ کے اس روٹ پر آگئے جہاں ہم ایک روڈ سائنڈ پر چھپے کھڑے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مضبوط رسی بھی لائے تھے۔ جنگی خان کو ہوش آنے لگا تھا۔ کمبیل دادا کے دونوں ساتھیوں نے مضبوطی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے۔ اس کے بعد ہم سب کار میں سوار ہوکر بیگم ولا کی طرف روانہ ہوگئے۔

کچھ سکون آور لمحات میسر آئے تو کمبیل دادا میری

توصیف کیے بنا نہ رہ سکا۔ ''یار شہزی! تم نے مجھے بہت حیران کیا... بے شک اول خیر کی صحبت نے تمہیں ایک استاد ٹائپ آدمی بنا دیا ہے مگر اس میں تمہاری اپنی بھی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں اور فطری دلیری کا دخل ہے۔''

کمیل دادا جیسے کڑوے کسیلے اور ہر وقت مجھ سے خار کھائے ہوئے انسان کے منہ سے میرے لیے ایسے الفاظ معمولی بات نہ تھی۔ میں نے کہا ''دادا! اول خیر کا تو میں احسان مند رہوں گا ہی ساری عمر... مگر حقیقت یہی ہے کہ وقت اور حالات کی بھٹی میں صرف ہمت والے باعزم لوگ ہی کندن بنتے ہیں۔ بے حوصلہ لوگ تو جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔ ویسے اس میں ہماری خوش نصیبی کا بھی دخل تھا۔ کہیں تقدیر کی یاوری کام آتی ہے تو کہیں ذہنی صلاحیت اور بروقت قوتِ فیصلہ... خیر... اب یہ بتاؤ، بیگم ولا پہنچ کر ہم نے پہلا کام اس خبیث جنگی خان کا منہ کھلوانا ہوگا۔ مجھے بیگم صاحبہ اور اول خیر کی طرف سے شدید فکر کھائے جا رہی ہے۔''

وہ بولا... ''فکر نہ کرو، بس ذرا بیگم ولا پہنچنے دو، پھر دیکھنا یہ جنگی خان کس طرح فر فر بولتا ہے۔'' اس نے دانستہ اس کا نام بگاڑا۔ میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لو کمیل دادا، اب کیا ہمارا بیگم ولا کا رخ کرنا مناسب رہے گا؟''

میری جرح سے کمیل دادا چپ جایا کرتا تھا... مگر اس بار ایسا نہ ہوا... وہ ٹھنڈے دماغ اور نارمل لہجے میں بولا۔ ''ابھی اور کوئی ٹھکانا قابلِ عمل نہیں رہا۔ ہمیں بیگم ولا ہی جانا ہوگا۔ وہاں ہمارے اور ساتھی بھی موجود ہیں۔ یہ رذیل جنگی خان اتنی آسانی سے اپنا منہ بھی نہیں کھولے گا... مگر بیگم ولا کے ٹارچر سیل میں یہ ناک سے بھی بات کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا۔ کمیل دادا نے دشمن سے حاصل کیا سیل فون آف کر دیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا پہنچ گئے۔

کمیل دادا نے وہاں موجود اپنے ساتھیوں کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ اس کے بعد میں اور وہ بے ہوش اور نیم مردہ سے جنگی خان کو لے کر ایک تہ خانہ نما کمرے میں آ گئے۔ اول خیر کی طرف سے بیگم ولا کے لینڈ لائن نمبر پر یا موجود کسی ساتھی کے سیل فون پر ابھی تک کوئی اطلاع وغیرہ نہیں آئی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں تھا، کچھ پتا نہیں تھا۔

تہ خانے کی ہیئت دیکھ کر مجھے بادی النظر میں سلاٹر ہاؤس کا ہی گمان ہوا تھا۔ ایک سے ایک تشدد کرنے والے آلات اور آہنی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ کمرا مستطیل شکل کا اور قدرے کشادہ تھا۔ دو کرسیاں ایک چوبی بینچ بھی تھی۔

کمیل دادا نے مجھے بتایا تھا کہ بیگم صاحبہ جب ایک دوسرے اسپتال سے اپنے بیمار باپ چوہدری الف خان کی عیادت کے بعد واپس لوٹ رہی تھیں تو ان کی کار پر نامعلوم مسلح حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے ٹائر برسٹ کر ڈالے تھے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ میں بھی عقبی نشست پر موجود تھا۔ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بھی ہمارا ایک آدمی موجود تھا۔ ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ میں بیگم صاحبہ کو بچا کر نکل بھاگنا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خود زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ دشمن مجھے مردہ سمجھ کر بیگم صاحبہ کو اغوا کر کے لے گئے۔ میں نے بیگم ولا فون کر کے اول خیر کو بمشکل اس ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو مجھے ساتھی یہاں اسپتال داخل کرا چکے تھے۔ میرے ہمراہ زخمی ساتھی بھی تھا۔

جنگی خان کی احتیاطاً جامع تلاشی لینے کے بعد اسے وہیں چھوڑ کر ہم اوپر نسبتاً آرام دہ اور بہتر کمرے میں آ گئے۔ ہمارے اعصاب شل تھے، کچھ کھا پی کر خود کو پُرسکون کیا اور اس دوران میں نے بیگم صاحبہ کی کار پر حملے سے متعلق ایک سوال کمیل دادا سے کیا۔ ''تمہیں کس طرح یقین ہے اس بات کا کہ یہ حملہ ممتاز خان نے ہی کروایا ہوگا؟''

''اس لیے کہ اپنے جواں سال بیٹے فرخ کی موت پر ممتاز خان کسی لحاظ کے بغیر بیگم صاحبہ کی جان کا دشمن بن چکا ہے اور اس وقت روئے زمین پر اس کے سوا بیگم صاحبہ کا اور کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔'' کمیل دادا نے جواب دیا۔

''حیرت ہے... دونوں سگے بہن بھائی ہونے کے باوجود اس قدر جانی دشمن؟'' میں نے ایک تکلیف دہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سگے بہن بھائی؟''

''کیوں...؟ میں نے غلط کہا؟''

''کیا تمہیں اول خیر نے اب تک بیگم صاحبہ اور چوہدری ممتاز خان کے بارے میں ماضی کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا؟''

''صرف اس قدر کہ دونوں بہن بھائی ہیں اور کچھ

زیادہ نہیں، نہ ہی پھر بعد میں بھی ایسی کوئی صراحت بتانے کا موقع ملا اسے۔ نہ میں نے... دوبارہ پوچھا۔"

"اور..." کمیل دادا کے منہ سے نکلا۔ "...زن، زر اور زمین کے معاملات میں سگے رشتے بھی دشمن ہو جاتے ہیں... مگر ممتاز خان اور بیگم صاحبہ... آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں مگر ممتاز خان تو اسے اپنی سوتیلی بہن بھی نہیں مانتا۔ وہ اسے سرے سے اپنی بہن ہی نہیں تسلیم کرتا۔"

اس دوران کمیل دادا نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے، ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کر دیا۔ حسبِ توقع مختلف نجی ٹی وی چینلز پر بار بار مذکورہ اسپتال کے سنسنی خیز واقعے کی فوٹیج دکھائی جا رہی تھیں اور شاید یہ سلسلہ کل سے ہی جاری تھا۔ اب کچھ نشر و اشاعت میں کمی آ گئی تھی۔ مگر وقتاً فوقتاً دکھائی جا رہی تھی۔ کچھ اینکر پرسن اور سینئر تجزیہ کار اس پر بحث و مباحثہ بھی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ فوٹیج ان کے ہاتھ لگ چکی تھی جس میں جنگی خان کو میں نے ممتاز خان کے ایک خونی ہرکارے کی حیثیت سے بے نقاب کیا تھا وغیرہ... اس کے ساتھ آج والے تازہ ترین واقعات پر بھی خبریں دکھائی جا رہی تھیں۔

کمیل دادا نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر دی۔ مجھے اول خیر کی فکر ستانے لگی جس کا میں نے اظہار بھی کیا۔

"نہ جانے اول خیر کا کیا ہوا...؟ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟ ابھی تک اس سے رابطہ کرنے کا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہمارے پاس۔ بجز اس کے... وہ خود ہم سے رابطہ کر کے بتا سکے کہ..."

"وہ یہاں کے نمبر پر رابطہ کر سکتا ہے مگر..." کمیل دادا میری بات کاٹ کر بولا۔ "میرے خیال میں اسے اب تک رابطہ کر کے خیریت سے متعلق اطلاع دینی چاہیے تھی ہمیں۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا۔" میں نے گومگو سے لہجے میں کہا تو کمیل دادا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ... ذرا اس کی تو نیچے خبر لیتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔" اس کا اشارہ تہ خانے میں موجود جنگی خان کی طرف تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں تازہ دم ہو کر نیچے آ گئے۔

جنگی خان کو ہوش آ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر ہم نے باندھ رکھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ زہرخند ہنسی کے ساتھ بولا۔

"مجھے اس طرح بے بس کر کے تم دونوں کسی خوش فہمی میں مت رہنا... کیونکہ جنگی خان ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلتا ہے۔" اس کے پُرغرور لہجے کی طمانیت نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی اور میں دانت پیس کر ترکی بہ ترکی اس سے بولا۔

"...تم نے بالکل ٹھیک کہا... حرام کے جنے... اس لیے کہ تم جیسے زرخرید کتے مرتے ہی رہتے ہیں سڑکوں پر... اس لیے موت بھی تمہاری خباثتوں کا علاج نہیں، میں تمہاری موت کو تمہارے لیے بھیک بنا دوں گا... جنگلی کتے...!"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ صاف لگتا تھا وہ میرے اندر کے کھولتے ہوئے ابال اور ایک بے نام سی بے چینی کو بھانپ کر حظ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بلاشبہ چوہدری ممتاز خان کا ایک تربیت یافتہ اور بہت سدھایا ہوا کتا تھا۔ کھل کر... بڑی دلیری سے بھونک رہا تھا۔ اس بار کمیل دادا نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہمیں بیگم صاحبہ کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا ہے... بتا دو تو ایک رعایت تمہیں مل جائے گی کہ تمہاری موت آسان کر دی جائے گی۔"

"بیگم صاحبہ کو تم اب بھول جاؤ، کمیل دادا!" وہ ایکا ایکی خون رنگ لہجے میں بولا۔ "تم سب کا سورج اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔" میں نے طیش ناک انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اور اپنے بوٹ کی ٹھوکر اس کے چہرے پر مار کے غرایا۔

"خبیث کتے! سورج ازل سے غروب ہو کے طلوع ہوتا آ رہا ہے۔ صرف تم جیسے کتوں کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ جایا کرتا ہے۔... مجھے بھی تمہارے منہ سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔"

میرے بھاری بوٹ کی ٹھوکر سے اس کی باچھیں پھٹ گئیں... اور وہاں سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں... مگر وہ نسلِ خنزیر بہ دستور زہرخند انداز میں مسکراتا رہا اور میرے اندر کی غیظ ناک آتشِ انتقام کو مزید بھڑکاتا رہا۔ ایسے میں یکلخت میرے ذہن میں جھماکے سے ایک خیال ابھرا۔ اس خبیث کو اچھی طرح... بالخصوص میرے اندر سلگتی بھڑکتی آتشِ انتقام کا اندازہ ہوگا اور شاید اسی لیے یہ خبیث مجھے طیش دلا کر اکسانا چاہتا ہے کہ ہم جلدی سے اسے موت کی نیند سلا دیں۔

کمیل دادا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ بوسیدہ سی لمبی میز رکھی تھی۔ جس کے چوبی تختے کے سرے پر لوہے کی "بونگ" نصب تھی۔ یہ آہنی سریے اور پائپ موڑنے کے کام آتی ہے جو عموماً لیتھ مشینوں کے کاریگروں کے زیرِ استعمال ہوتی ہے۔

میں کبیل دادا کا اشارہ سمجھ گیا اور بونگ کا ایک لیور تیزی سے گھماتا چلا گیا۔ بونگ کے دو آہنی سرے جو پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے، وہ کھلنے لگے۔ ایک خاص حد تک انہیں کھول کر میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے جھک کر جنگی خان کو کسی بکرے کی طرح ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا۔ پھر میں نے بھی اس کی مدد کی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کا گریبان پکڑ کر نصف دھڑ تک اسے اوپر اٹھایا کہ اس کا بایاں بازو بونگ کے کھلے ہوئے دونوں سروں کے درمیان اٹک جائے۔ اس کے بعد دوسرے ہاتھ سے میں نے بہ سرعت لیور گھما کر جنگی خان کا بازو پھنسا دیا۔ اب وہ ایک بازو کے سہارے پر اپنی دونوں رسن بستہ ٹانگوں پر جھول رہا تھا... میں نے غور کیا۔ وہ تھوڑا ہانپ رہا تھا۔ تب پتا چلا کہ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا بالآخر ہنس پڑا۔ ایک ہذیانی قہقہہ اس کے حلق سے بلند ہوا تھا۔ وہ ہمارے قبضے میں تھا۔ ہمارے رحم و کرم پر تھا مگر مسلسل ہماری اس فتح کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور ہماری فتح کو ہماری خوش فہمی قرار دے رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک مضبوط اعصاب کا ہی نہیں زبردست قوت برداشت کا حامل بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کبیل دادا نے لیور کو آہستہ آہستہ گھما کر اس کا بازو اچھی طرح کس دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مزید کون سا حربہ تشدد کے طور پر جنگی خان پر آزمانا چاہتا ہے؟

کبیل دادا نے مجھے دیوار پر جھولتی ایک مخصوص ساخت کی ہتھوڑی اٹھانے کا کہا۔ اس ہتھوڑی کے پچھلے سرے پر میخ اکھیڑنے والے تین کانٹے دار کھانچے بنے ہوئے تھے۔ کبیل دادا نے اس سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''شہزی! ہتھوڑی کے پچھلے سرے کو جب تم زور سے اس کے آہنی کھانچے میں جکڑے ہوئے بازو کی کہنی پر مارو گے تو پل بھر میں اس کی نہ صرف کہنی کی ہڈی چکنا چور ہو جائے گی بلکہ اس کے ناپاک وجود کو بھی سر سے پاؤں تک ایک ایسا کرنٹ دوڑا دے گی جس کی اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ اس کے بعد جب تک یہ اپنا منہ نہیں کھولے گا اس کی ہر ہڈی کے جوڑ کے ساتھ یہی حشر ہوتا رہے گا۔''

کبیل دادا کی بات درست تھی... اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ بازو کی کہنی پر ذرا سی بھی چوٹ لگتی تو پورے بدن کو ایک جھٹکا لگتا تھا جیسے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ہتھوڑی تھامے میں جب جنگی خان کی طرف بڑھا تو اس پر کبیل دادا کی بات کا مطلق اثر نہ ہوا تھا، وہ ایسے ہی میری جانب خون خوار سی نظروں سے گھورے اور مسکرائے جا رہا تھا... جس نے میرے دماغ میں آگ سی بھر دی اور میں نے ہونٹ بھینچ کر ابھی ہتھوڑی والا اپنا ہاتھ سر سے بلند کیا ہی تھا کہ جنگی چیخ کر بولا۔

''ٹھہر جاؤ شہزی...''

میرا ہتھوڑی والا ہاتھ سر سے بلند ہی رہ گیا۔ کبیل دادا کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ ابھری۔ میں بھی پہلے یہی سمجھا تھا کہ جنگی خان کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری تھی، اس میں رحم یا شکست خوردگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''تم ایک باپ کی اولاد ہو تو میرے ساتھ دوبدو مقابلہ کرو... شہزی! تم میرے ایک بہادر دشمن ہو، اس طرح کی حرکت تمہیں زیب نہیں دیتی... تم نے مجھے زیر کر دیا تو میرا وعدہ ہے، جو پوچھو گے سچ سچ بتا دوں گا۔ پھر چاہے میرا جو حشر ہو۔''

''باپ''... کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ دو حرفی لفظ میرے لیے، میری ذات، زندگی اور میری شناخت کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا تھا۔ یہ وہ سوالیہ نشان تھا جو ایک آنکڑے کی طرح ازل سے میرے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ اور میں خود کو تختۂ دار پر جھولتا ہوا محسوس کرتا آیا تھا۔ باپ... بیٹے کا مان اور باپ کا فخر و غرور... جس نے مجھے اس وقت خود سے دھتکار دیا، خود سے جدا کر دیا... جب میں لفظ ''باپ'' کے عنوان سے آشنا ہوا تھا۔ جنگی خان نے میری کمزور رگ کو چھیڑ دیا تھا اور میں چند ثانیوں کے لیے جیسے اپنے گرد و پیش سے ہی بے خبر ہو گیا تھا۔

جنگی میرے لیے قابلِ نفرین شخص تھا۔ اس مردود کی ناپاک شکل پر جب بھی میری نظریں پڑتیں تو آسیہ کا معصوم چہرہ میرے چشم تصور میں گردش کرتا رہتا۔ عابدہ کو بھی اغوا کرنے کا اس نے ناقابلِ تلافی جرم کیا تھا۔ ایسے بدترین دشمن سے دوبدو مقابلے کی تو میری بھی خواہش تھی، اب جو اس نے مجھ سے چیلنج کے انداز میں یہ بات کہی تھی تو اس نے جیسے میرے جوشِ جنوں خیزی کو فزوں تر کر دیا تھا۔ اس کا گھمنڈ اس کا غرور توڑ کر خاک چٹانا اب میرا مقصد ہو گیا تھا۔

یکلخت میں نے بونگ کے لیور پر ہاتھ مارا اور اسے الٹا گھما دیا۔ جنگی خان کا بازو آزاد ہو گیا۔ اس کا بازو پھنسانے سے پہلے کبیل دادا اس کے دونوں ہاتھوں کی رسی پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ باقی پیروں کی رسی میں نے کھول

ڈالی۔ جنگی خان اب ہاتھوں پیروں سے آزاد ہو چکا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہا تھا۔ جیسے اسے مجھ سے یہ توقع ہی نہ تھی۔ کبیل دادا نے اگرچہ اس درمیان مجھے ٹوکنے روکنے کی سعی چاہی تھی مگر میں نے اسے خاموشی سے ایک طرف کھڑے رہنے کا کہہ دیا تھا۔

''اب کیا کہتے ہو جنگی خان؟'' میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر تن کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی جیسے یک دم لڑنے کی مخصوص پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔

بلاشبہ جنگی خان کا قد مجھ سے ذرا دبتا ہوا تھا۔ مگر اس کی جسامت کسی موٹی کھال والے گینڈے جیسی ہی تھی، جبکہ میں کسرتی جسم کا مالک تھا۔ میری مونچھوں کی بناوٹ بھی مخصوص اسٹائل کی تھی اور سر کے گھنے کرلی بالوں سے کانوں کی طرف قلمیں میں نے خاصی بڑھا رکھی تھیں۔ میں اس وقت چست ..... بلیک جینز اور لائٹ کلر کی ٹی شرٹ میں تھا۔ جنگی خان کے بدہیئت ہونٹوں پر صرف ایک لمحے کے لیے بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں درندگی کی چمک لہراتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کا بھاری گینڈے جیسا جسم میرے جمے کھڑے آہنی وجود سے ٹکرایا اور میں نے فقط اتنا کیا کہ بہ سرعت دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ کر اسی کی جھوک میں اور کچھ اپنے وجود کی مخصوص حرکت سے کام لیتے ہوئے اسے عقب کی دیوار پر دے مارا۔ وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پلٹا تو میں نے اس کی سیاہ رو پیشانی پر سرخی کا نشان ابھرتے دیکھا، جو یقیناً تہ خانے کی دیوار سے ٹکرانے کا .... تحفہ تھا.... اس بار وہ گھونسا تان کر میری جانب لپکا اور میں نے کھڑے کھڑے اپنی ٹانگ کو حرکت دے ڈالی، میری ٹانگ اس کے پیٹ سے ذرا بلند سینے اور پیٹ کی درمیان نازک جگہ پر پڑی تھی۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ اوغ کی ہلکی آواز غراہٹ کی صورت میں اس کے حلق سے خارج ہوئی، اس کا سر آگے کو تھوڑا جھکا، دوسری حرکت میرے ہاتھ کے گھونسے نے کی اور اس کا جبڑا ہل کر رہ گیا۔ اس نے وحشتِ خون رنگ انداز میں ادھر اُدھر دیکھا اور لپک کر ایک آہنی اوزار سے مشابہ سریا اٹھا لیا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں اپنے ناپاک بھاری بھرکم وجود پر بڑا غرور ہے۔ اب تم نے لوہے کے اس پرزے کا سہارا لے لیا؟'' میں نے اس کے غرور پر ایک کاری لفظی وار کیا۔ جس نے اسے بلبلا کر رکھ دیا اور پھر گھورتے ہوئے وہ سریے سمیت مجھ پر پل پڑا۔ اس نے میرے سر پر ضرب لگانی چاہی تو میں نے سر بچاتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے سریے والے ہاتھ کی کلائی دبوچ لی اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس کی کلائی بھی موڑ ڈالی، تڑخنے کی ہلکی آواز تہ خانے کے محدود ماحول میں ابھری اور ساتھ ہی جنگی خان کی کریہہ چیخ بھی، سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور جنگی خان بھی خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں بھینچ کر اپنے ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال پکڑ لیے... اس نے غراتے ہوئے اپنے سر کی ٹکر میری ناف سے ذرا نیچے رسید کر دی۔

میں اسے خاصا مضروب کر چکا تھا لہٰذا مجھے اس کی طرف سے ایسی جارحانہ حرکت کی امید کم ہی تھی اس لیے میں تھوڑا مار کھا گیا.. ٹکر خاصی زوردار ثابت ہوئی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ وہ غراتا ہوا اپنے قدموں پر اٹھ کر پھر میری طرف لپکا... ادھر میں ابھی اپنی ٹانگوں پر سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے دوسرے ہاتھ کا گھونسا میری تھوڑی پر رسید کر دیا۔ لڑکھڑانے کے دوران تھوڑی پر لگنے والی اس فوری ضرب نے میرے قدم فرش سے اکھیڑ ڈالے، میں پشت کے بل گرا۔ کلائی چٹخنے کے باعث جنگی خان وحشی سا بن گیا تھا۔ پھر میں نے اسے میز سے کوئی بھاری آہنی شے اٹھاتے دیکھا اور میں نے حواس قابو میں رکھتے ہوئے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک اوزار چمکا جو اس نے میری طرف کھینچ مارا۔ میں اگر بروقت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے نہیں جھک جاتا تو یقیناً بھاری لوہے کا وہ ٹکڑا میرے سر یا چہرے سے ضرور ٹکراتا۔ ہلکی 'شائیں' کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی، میں نے اٹھتے ہی اسے دبوچ لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بری طرح بھڑ گئے۔

کبیل دادا ایک طرف کھڑا سینے پر ہاتھ باندھے، یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی دلچسپی کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ جنگی خان کی کلائی ٹوٹنے پر اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ مجھے بھی ایسا کوئی کاری وار جواب میں ضرور دے... یہی سبب تھا کہ مجھ سے لڑنے کے دوران اس کی خوف ناک نظریں بھی تیزی سے تہ خانے میں موجود ٹارچر کے لیے استعمال ہونے والے مختلف اوزاروں کو تلاش کر رہی تھیں، مگر اب میں اسے ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس جنگ کا خاتمہ میں نے مزید دس منٹوں کے اندر اندر اسے پیٹ کے بل فرش بوس کر کے کیا۔ اس کے دونوں

ہاتھ میں نے پشت کی طرف موڑ کے رسی سے جکڑ ڈالے۔ اور پھر اسے فرش پر کمر کے بل لٹا دیا۔ پھر کھڑے ہو کر اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ ''بس اجنگی خان... میں نے تجھے تیری اوقات دکھا دی۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر... ہم نے تیرے ساتھ بہت وقت ضائع کر لیا۔''

میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا تو وہ ہذیانی قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اگر بتا بھی دیا تو تم کون سا تیر مار لو گے؟''

''اپنا منہ کھولتا ہے... یا نہیں؟'' میں نے بوٹ کا دباؤ اس کی موٹی تہ والی گردن پر بڑھاتے ہوئے غرا کے کہا۔

''بیگم صاحبہ کی کہانی اب تمام ہونے والی ہے... شہزی!... اور تمہاری بھی۔'' وہ ہذیانی انداز سے بولا۔ میں نے طیش ناک انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے مگر مجھ سے پہلے کبیل دادا کو اس کی لغو بیانی پر غصہ آ گیا اور جنونی انداز میں اس نے جنگی خان کو لاتوں، مکوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے سر پر جیسے خونی سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ جنگی خان کو پیٹنے کے دوران مغلظات کی بھی بوچھاڑ کرتا رہا۔ اور اس کے گرو گھنٹال چوہدری ممتاز خان کو بھی انتقامی سبق سکھانے کے عزائم کا بھی اظہار کرتا رہا۔ کبیل دادا ہانپ گیا۔ اس سے جنگی خان کے منہ سے بیگم صاحبہ کے بارے میں ایسے خوفناک الفاظ برداشت نہیں ہو سکے تھے۔ وہ مجھ سے بولا۔

''یہ ایسے منہ نہیں کھولے گا... شہزی... اسے الٹا کر میز پر لٹاؤ۔ پھر دیکھو میں اس رذیل کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

ہم دونوں نے رسن بستہ جنگی کو اٹھا کر میز پر پٹخ دیا... پھر کبیل دادا نے مجھے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کبیل دادا کو جنگی خان پر تشدد کے گر آزماتے دیکھنے لگا۔ میرے نزدیک یہ سب عمومی نوعیت کے گر تھے۔ جس میں آہنی شکنجے اور ماؤتھ گیج کے اوزار بھی شامل تھے۔ وہ نوز پلاس کی مدد سے اس کے ہاتھوں پیروں کے ناخون بھی کھینچ رہا تھا۔ ماؤتھ گیج اس کے منہ میں گھسیڑ کر اس کا منہ پھاڑ ڈالنے کی حد تک کھول ڈالا تھا۔ اور اس کے منہ کے اندر اوپری تالو کو آہنی برمے سے چھید رہا تھا۔ غرضیکہ جنگی خان کی حالت پل بھر میں اس نے قابل رحم حد تک زبوں کر ڈالی۔ وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ پانی کے چھینٹے مار کر کبیل دادا اسے دوبارہ ہوش میں لے آیا... مگر جنگی خان نے اپنا منہ نہیں کھولا۔ وہ تو بات تک کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل بے حس کر ڈالا تھا۔ ہر درد اور اذیت ناک تکلیفوں سے وہ بے نیاز پڑا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اکھڑی اکھڑی چل رہی تھیں۔

ناکامی کے احساس تلے کبیل دادا کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس جنون خیز طیش میں آ کر جب اس نے ایک نوکیلا آہنی سریا اس کی گردن میں گھونپنے کا ارادہ کیا تو ٹھیک اس وقت تہ خانے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ساتھی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا اور چہرے پر جوش کے سے آثار تھے۔ وہ اندر داخل ہوا اور کبیل دادا کی طرف اپنا سیل فون بڑھاتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔ ''استاد... چھوٹے استاد اول خیر کا فون ہے۔''

اول خیر کے ذکر پر میں بری طرح چونکا تھا۔ کبیل دادا نے جھپٹ کر سیل فون لے کر اپنے کان سے لگا لیا اور بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، اول خیر! میں کبیل دادا بول رہا ہوں۔ تم کہاں ہوں؟ بیگم صاحبہ کیسی ہیں؟'' میری دھڑکتی نظریں کبیل دادا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دوسری جانب سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ درمیان میں کچھ ایسے سوالات بھی کیے جس نے مجھے چونکا دیا۔ کچھ شناسا سا نام اس کے منہ سے دہرانے کے انداز میں ادا ہوئے تھے۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ اول خیر سلامت تھا۔ میں خود بھی اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔

''تم پھر اتنی دیر تک کیا کرتے رہے؟ تمہیں بہت پہلے ہمیں مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ تم بھلا تن تنہا اتنا اہم اور خطرناک کام کیسے کر سکتے تھے۔ کیا خود کو سپرمین سمجھتے ہو تم... کیا تمہیں احساس نہیں کہ اس طرح تم نے بیگم صاحبہ کو مزید خطرے میں ڈال دیا ہے؟''

میں نے کبیل دادا کو غصے سے یہ کہتے سنا۔ وہ اول خیر کی کسی حرکت پر بری طرح برہم ہو رہا تھا اور اس کی کوئی بات بھی اب سننا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے غصے میں فون میرے حوالے کیا۔ ''تم بات کرو... میں اوپر جا رہا ہوں۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

فون میرے حوالے کر کے اس نے آنے والے ساتھی کو ہدایات کی کہ جنگی خان کو ہلاک کر کے اس کی لاش ٹھکانے لگا دو۔ مگر میں نے سختی سے اسے یہ کام کرنے سے منع کر دیا۔

''ابھی نہیں، یہ ہماری قید میں ہی ہے۔ اس کی مرہم پٹی کروانے کا بندوبست کرو، میرے ذہن میں اس کا منہ کھلوانے کا دوسرا طریقہ ہے۔ میں اب وہ اس پر آزمانا چاہتا ہوں۔'' میری بات پر کبیل دادا نے حسبِ توقع اختلاف کرتے ہوئے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔

''اب اس کا منہ کھلوانے کی ضرورت نہیں رہی... کیا

تم بہرے ہو؟... اول خیر نے رابطہ کر کے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"میں بہرا نہیں ہوں۔ تم عقل سے پیدل ہو۔" میں نے اس سے ترکی بہ ترکی کہا۔ "میں اس سے آسیہ کی لاش کے بارے میں اگلوانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی اس مردود جنگی کا ابھی زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ اب میرا شکار ہے۔ لہٰذا اس کی مرہم پٹی کا بندوبست کرو، میں تب تک اول خیر سے بات کرتا ہوں۔"

کمبیل دادا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس وقت اسے جلدی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ نہ الجھ سکا۔ اس نے آئے ہوئے ساتھی کو وہی ہدایت دے ڈالی جو میں نے کہی تھی۔ اس کے بعد وہ نکل گیا۔ میں ایک دوسرے کمرے میں آگیا اور اول خیر سے بات کی۔

میری آواز سن کر وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "او خیر... کاکے! تیری آواز سن کر تو مجھ میں نئی جان پڑ گئی۔ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا۔ "اول خیر تم پہلے اپنی بتاؤ۔ کیسے ہو؟ کہاں ہو۔ ٹھیک تو ہو نا؟ بیگم صاحبہ کا کوئی سراغ ملا؟"

"کاکا! بڑی ٹیڑھ پڑ گئی ہے۔ ایک نئی "پھنج" سے واسطہ پڑنے والا ہے۔" وہ بولا۔ وہ بھی کبھی مجھ سے ٹھیٹھ پنجابی کے مخصوص الفاظ بول لیتا تھا۔ "پھنج" سے اس کی مراد... ایک نئی مصیبت سے تھی۔

"آگے بتا... کیا صورتِ حال ہے۔ تو ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت کھلاں والی کے ایک قریبی دیہات چک نواں میں ہوں۔ چوہدری ممتاز نے اپنے کچھ پرانے مہروں کو حرکت دی ہے۔ کاکا اب کچھ لگتا ایسا ہی ہے کہ چوہدری بیگم صاحبہ والا معاملہ مکانا چاہتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس نے اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ بیگم صاحبہ اس کے ایک آدمی کی قید میں ہے۔"

"کیا بیگم صاحبہ کی جان کو خطرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ اپنا ایک اہم اور دیرینہ مقصد پورا کرنا چاہتا ہے۔ تب تک وہ بیگم صاحبہ کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"کون سا مقصد؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"یہ لمبی کہانی ہے۔ اس کو چھوڑو اور دیکھو کمبیل دادا ابھی تھوڑی دیر میں روانہ ہونے والا ہے۔ مجھے معلوم ہے، تم بھی اس کے ساتھ نکلنا چاہو گے مگر کمبیل دادا تمہیں کبھی بھی اپنے ساتھ اس مہم پر لے کر نہیں نکلے گا۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے کاکے...! نہ ہی خود تجھے آنے کی، تو جہاں ہے وہیں آرام سے بیٹھا رہ۔ یہ ہمارا اپنا ایک پرانا سیاپا (مسئلہ) ہے... ہم خود اسے حل کر لیں گے۔ بس تو دعا کرنا۔"

اس کی بات سن کر میں بے چین ہو گیا۔ ایسے حالات میں، میں اول خیر کے ساتھ ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے لیے ہر وقت ایک بھائی اور سچے جاں نثار ساتھی کی طرح پریشان اور فکرمند رہتا تھا تو میں بھی اس کی طرف سے تشویش زدہ رہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور ہو کر نہ جانے کس مصیبت کا شکار ہو بیٹھا ہے۔ ہم دونوں کے دل اور دماغ تک... سچے ساتھ اور پکے غم گساروں کی طرح ایک ساتھ سوچتے تھے، ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں تڑپ کر بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا میرے یار... میں کمبیل دادا کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہیں مانا تو پھر اپنے طور پر تمہاری طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مگر... کچھ بتا تو سہی۔"

"نا کاکے... نا... تو نے اس طرف نہیں آنا، خود میں اس وقت جہاں ہوں، ادھر ہر لمحے مجھے موت کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے... کہا نا یہ ہمارا اپنا ایک پرانا معاملہ ہے... جو شاید اب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب تخت یا تختہ ہوگا، یا ہم رہیں گے یا یہ چوہدری ممتاز خان... کیونکہ اس نے بیگم صاحبہ کو یرغمال بنا کے اپنی قبر کھودی ہے یا پھر..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر یکدم بولا۔ "اچھا کاکے سب رب رکھا... اپنے یار کی کامیابی کے لیے دعا کرنا... زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ میں خود تو سے رابطہ کروں گا... تو اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بھی ممکن ہے دوبارہ اس نمبر پر میں نہ ہی ملوں... یہ میرا نمبر نہیں ہے۔"

میں اسے پکارتا رہ گیا۔ مگر دوسری جانب سے وہ رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ میرے اندر شدید دھکڑ پکڑ سی ہونے لگی، نہ جانے اب آگے کیا ہونے جا رہا تھا؟ چوہدری ممتاز نے واقعی ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا... بیگم صاحبہ کو یرغمال بنانا معمولی بات نہ تھی۔ یقیناً اول خیر نے بیگم صاحبہ کا سراغ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ہی لگایا ہوگا اور اس کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ نہ جانے چوہدری ممتاز اور بیگم صاحبہ کا آپس میں کیا معاملہ تھا؟ بظاہر تو ایسا ہی لگتا تھا کہ زمین یا جائداد کا ہی کوئی بکھیڑا ہوگا دونوں بہن بھائیوں کے بیچ... مگر مجھے ایک پُراسراری وجہ اور بھی محسوس ہوتی تھی اس دشمنی کی... جس کا ابھی مجھے شبہ ہی تھا کہ

لیق شاہ کا اس میں اہم رول رہ چکا تھا شاید... جو پتا نہیں زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔ اول خیر کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اس بار بیگم صاحبہ کے آدمیوں اور چوہدری ممتاز کے درمیان گھمسان کا اور فیصلہ کن رن پڑنے والا ہے۔ اور اس میں کئی قیمتی جانوں کے ضیاع کا بھی اندیشہ تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اول خیر جیسے یار نے مجھے اس متوقع اور خوفناک جنگ سے دور رکھنا چاہا تھا۔ یہی بات میری سمجھ میں آتی تھی کہ وہ مجھے اس رن میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں یہاں بیگم ولا میں ہاتھ دھرے بیٹھا خدانخواستہ کسی افسوسناک تماشے کے انجام کا منتظر رہتا۔ اول خیر کی ہی نہیں بیگم صاحبہ کی جان بھی خطرے میں تھی اور اول خیر تو میرا یار تھا اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں اس سے زیادہ اول خیر کو اپنا سگا سمجھتا... اس نے ہی مجھے جینا سکھایا تھا۔ اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کس طرح دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اس سے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ اس نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ وقت پڑنے پر کیسے ایک سچے جاں نثار دوست، ساتھی اور غمگسار کی طرح اپنی جان کی بھی پروا کیے بغیر دوسرے قابلِ قدر دوست کے کام آیا جاتا ہے۔ کئی ایسے مواقع پر میری طرف بڑھتی یقینی موت کا رخ اس نے اپنی جانب موڑ لیا تھا اور مجھے زندگی کے راستے پر ڈالا تھا۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ اور اب وہ خود کو بیگم صاحبہ کی وفاداری میں خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے وہاں آنے سے روک رہا تھا۔ جبکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ میرا معاملہ عمومی نوعیت کا ہے... مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی... یا پھر یہ بیگم صاحبہ کی دلکش شخصیت کا سحر تھا کہ اسے ممتاز خان کی قید میں پا کر مجھ سے بھی چین سے رہا نہ جا رہا تھا۔ وہ بھی تو میرے کئی ایسے آڑے وقتوں میں کام آتی رہی تھیں۔ اداول خیر نے آج تک میرے ساتھ جو بھلائی کی تھی، اس میں کسی نہ کسی زاویے سے بیگم صاحبہ کا ہی ہاتھ اور سپورٹ شامل تھی۔

یہ ساری باتیں گزرتے چند ثانیوں میں میرے دل و دماغ میں گھوم گئی تھیں... اور مجھے اول خیر سے ایک طرح کا گلہ بھی ہونے لگا کہ اس نے میرے بارے میں اپنے تئیں اندازہ لگایا کہ میں اتنا خود غرض ہوں گا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے زندگی اور موت کی اس خون ریز جنگ کو تماشے کے روپ میں دیکھتا رہوں گا۔ یہ ناممکن تھا۔

مجھے افسوس تھا کہ اس نے مجھے اپنے ٹھکانے کی تفصیل نہیں بتائی تھی کہ وہ کہاں تھا... اور بیگم صاحبہ کس کے قبضے میں اور کس جگہ مقید تھیں۔ ان کا یہ فیصلہ کن ٹکراؤ کس مقام پر ہونا متوقع تھا؟ اس نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کمیل دادا مجھے کبھی بھی اس مہم میں شامل نہیں کرے گا، اور نا ہی اس کے لیے مجھے اس سے الجھنے کی کوئی ضرورت تھی۔ یہ اول خیر نے مجھے نصیحت کی تھی، اور درست کی تھی۔ کمیل دادا ابھی بھی مجھے اتنی بڑی حیثیت نہیں دے سکتا تھا، وہ ابتدا سے ہی مجھے بیگم صاحبہ سے متعلق ایسی مہمات سے دور رکھنے کی کوشش بھی کرتا آیا تھا۔ مگر اول خیر کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو پایا تھا مگر اب اول خیر تھا یہاں نہ بیگم صاحبہ... اور ظاہر ہے بیگم صاحبہ کے بعد کمیل دادا ہی کو اپنے گروہی ساتھیوں کی کمانڈ کرنا تھی، کیونکہ تنظیم میں اسے ''بڑے استاد'' کی حیثیت حاصل تھی۔

ابھی میں انہی سوچوں کے بھنور میں ڈوب اُبھر رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک ساتھی داخل ہوا، میں ذرا چونکا۔ وہ مجھ سے بولا۔

''آپ کو بڑے استاد بلا رہے ہیں۔ جلدی آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں چونکا۔ کمیل دادا کا اس وقت بلاوا کیا معنی رکھتا تھا؟ یکلخت ایک خوش آئند امید بھری مسرت سے میرا دل زور سے دھڑکا تھا اور میں ایک پل... ضائع کیے بغیر اس کے پیچھے ہو لیا۔ کمیل دادا کے پاس پہنچا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے اس قدر ان کی جلد تیاری کی توقع نہ تھی، لیکن پھر معاملے کی نزاکت اور حالات کا تقاضا محسوس کر کے ان کے پہلے سے الرٹ رہنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

کمیل دادا اپنے کم و بیش پندرہ مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور باقی دو تین غیر مسلح ساتھی تھے، جنہیں... غالباً بیگم ولا میں ہی رہنا تھا۔ ان کے پاس ہر قسم کا اسلحہ تھا۔ نائن ایم ایم پستولوں سے لے کر A-K سینتالیس اور اسالٹ رائفل تک تھیں۔ باہر گاڑیوں میں بھی یقیناً بلاسٹنگ ایمونیشن موجود ہوگا۔ ایسی ہی ایک رائفل اور پستول کمیل دادا نے میری طرف بھی اچھال دی۔ اس ہتھیار کی کھنک نے میرے اندر کے پُرجوش ولولہ انگیز نوجوان کو انگڑائی لے کر بیدار کر دیا۔

فولادی ہتھیار کا بوجھ محسوس کرتے ہی میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑتی چلی گئیں اور میں دل ہی دل میں کمیل دادا کا مشکور ہوئے بنا نہ رہ سکا تھا جب اس نے یہ سب تھمانے کے بعد تحکمانہ انداز میں مجھ سے فقط اتنا کہا تھا۔

''شہزی... اس مہم میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔'' اور میں نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

دو تیز رفتار جیپوں اور ایک کار میں ہمارا کارواں بیگم ولا سے سرِشام روانہ ہوا تھا اور یہ سفر تھا ملتان روڈ پر تینوں گاڑیاں قادر پور تک ساتھ محوِ سفر تھیں، اس کے بعد ایک طے شدہ منصوبے کے تحت تینوں گاڑیاں الگ ہو گئیں۔ دونوں جیپیں ایک ساتھ دائیں جانب قادر پور کی طرف جانے والی ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھیں، آگے جا کر ان دونوں نے بھی اپنی الگ الگ راہ پر آگے ہو لینا تھا۔ دونوں کا ٹارگٹ ایک ہی تھا۔ یعنی انہیں چک نواں پہنچنا تھا جبکہ میری اور کمبیل دادا کی منزل اور تھی یعنی ساہیوال۔ وہاں ہم نے وزیر جان نامی آدمی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

کمبیل دادا نے مجھے ساری تفصیل دورانِ سفر کار میں بتادی تھی۔ کار میں ہم صرف چار افراد تھے، ڈرائیور، اس کے برابر میں ہمارا ماجد نامی ساتھی، عقبی سیٹ پر میں اور کمبیل دادا ساتھ بیٹھے تھے۔

اول خیر سے حاصل شدہ صراحت کے مطابق چوہدری ممتاز خان کے جواں سال بیٹے فرخ کی حادثاتی موت یا قتل کی ذمے داری بیگم صاحبہ اور مجھ پر ڈالتے ہوئے ممتاز خان نے انتقاماً یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اس خطرناک اقدام پر عمل کرنے کی ایک بڑی وجہ چوہدری الف خان کی اچانک طبعی موت بھی سمجھ میں آتی تھی۔ کیونکہ کمبیل دادا کی گفتگو کے مطابق مجھے یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ... جب تک ممتاز خان اور بیگم صاحبہ کا باپ الف خان زندہ تھا، ان دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی... چنانچہ جب بیگم صاحبہ باپ کی عیادت کے بعد مذکورہ اسپتال سے کمبیل دادا کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھیں تو الف خان کا انتقال ہو گیا۔ بیگم صاحبہ سے پہلے یہ اطلاع ممتاز خان تک پہنچ چکی تھی۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی اپنے مقرب خاص کار پرداز... جنگی خان کو بیگم صاحبہ کے پیچھے لگا چکا تھا۔ جنگی خان اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کی کار پر کامیاب حملہ کر کے اسے یرغمال بنا کر سیدھا گرائیں نگر پہنچا تھا۔ ممتاز خان اگرچہ بیگم صاحبہ کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا مگر نہ جانے درمیان میں ایسا کیا ہوا تھا کہ اسے ہلاک کرنے کے بجائے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت اس نے بیگم صاحبہ کو پُراسرار طور پر غائب کر دیا۔ اول خیر نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بیگم صاحبہ کے پُراسرار ”غیاب“ کا پتا چلانے کی کوشش کی تو اس سلسلے میں بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کا نام سامنے آیا۔ بابن ڈکیت اب ساہیوال کے ایک صنعت کار وزیر جان کی پشت پناہی میں آچکا تھا۔ شنید تھی کہ اس نے پھر اپنا وہی پرانا پیشہ اپنا لیا تھا... مگر بابن ڈکیت کا وزیر جان سے ملاپ ابھی تک الجھن کا باعث تھا اور میرے لیے تو زیادہ حیرت و الجھن کا باعث تھا۔ کیونکہ میں پہلے ہی سے ان دونوں ناموں سے آشنا تھا۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ کی زبانی میں نے ان دونوں افراد کا تذکرہ سنا تھا۔ مگر انہوں نے مجھے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے بیچ ہونے والی جس کشمکش کی کہانی سنائی تھی، وہ موجودہ حالات کے تناظر میں کسی طرح بھی میرے نزدیک ”فٹ“ نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ بقول میجر صاحب کے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے درمیان ایک خفیہ ”وِنسل“ تھی جس کی بابن ڈکیت کے سامنے تو کوئی اہمیت نہ تھی، مگر وزیر جان کے لیے بابن ڈکیت بہت خاص حیثیت رکھتا تھا... جس کی تفصیل میجر ریاض باجوہ مجھے ہیڈ کوارٹر میں مجھ سے ون ٹو ون ملاقات میں بتا چکے تھے۔ اور وہ میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اب یہی بات میرے ذہن میں آتی تھی کہ آخر بعد میں ایسی کیا وجہ ہوئی تھی کہ وزیر جان نے بابن ڈکیت کو بالآخر اپنا زیردست کر دیا تھا۔ ایک اور بات پر مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں کے اس خفیہ گٹھ جوڑ سے ”پاور“ والے کیوں کر ابھی تک لاعلم تھے؟ جبکہ بقول میجر صاحب کے وہ وزیر جان کی اپنی تیسری آنکھ سے مکمل ریکی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں کئی سوالات اور بھی میرے ذہنِ رسا میں آئے تھے... مگر سردست کمبیل دادا کی تازہ ترین جاری مہم کے حوالے سے یہ تھی کہ ایک خاص مقصد کے لیے ممتاز خان نے بھی وزیر جان سے پینگیں بڑھالی تھیں۔ ان کی معلومات کے مطابق وزیر جان، ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان مرحوم کا قریبی دوست بھی رہ چکا تھا۔ مگر بعد میں وہ دوستی پھیکی پڑنے لگی تھی... تاہم اب اچانک ممتاز خان نے اپنے باپ کے دوست سے مراسم بڑھانے شروع کر دیے تھے تو اس میں کوئی راز تھا... کوئی گہرا راز۔ جبکہ میری اپنی ذاتی معلومات کے مطابق جو میجر باجوہ صاحب سے حاصل کردہ ہی تھیں، ماضی میں بابن ڈکیت ممتاز خان کا بھی آدمی رہ چکا تھا۔ تو گویا اول خیر کی بات بھی درست تھی کہ ممتاز خان اپنے بعض وسیع تر خفیہ مقاصد کی خاطر پرانے مہروں کو نئی بساط پر واپس لا رہا تھا۔ وہ مفادات کیا تھے؟ یہ سب ابھی اندھیرے میں تھا۔

بہر طور... قصہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کی بازیابی کے لیے اول خیر نے سرتوڑ کوشش کی تھی... مگر ابھی تک وہ اس بات کا پتا نہ چلا سکا تھا کہ اسے یرغمال بنا کر کس مقصد کے لیے اور کہاں رکھا گیا تھا۔ تاہم اول خیر نے اتنا ضرور پتا چلا لیا تھا کہ اسے چک نواں کے کسی آس پاس دیہات میں رکھا گیا

ہے۔ وہ بابن ڈکیت کی تحویل میں تھی۔ نیز وزیر جان کے آدمیوں کی، بابن ڈکیت کو مکمل سپورٹ حاصل تھی جبکہ ممتاز خان خود بھی وہیں تھا۔

جنگی خان کو ممتاز خان نے بیگم ولا کی دیگر سرگرمیوں پر نظر رکھنے پر مامور کر دیا تھا.... اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ کمبیل دادا مرا نہیں بلکہ زخمی ہوا تھا تو اس نے اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ مذکورہ اسپتال میں ہلا بول دیا تھا۔ مگر میری وجہ سے جنگی خان بُری طرح ناکام ہو کر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چنانچہ اب بیگم صاحبہ کے اغوا اور یرغمال بنانے والے محرکات کا ماسٹر مائنڈ وزیر جان سمجھا جا رہا تھا۔ اول خیر کی کمبیل دادا کو فراہم کردہ مستند معلومات آخری یہی تھیں۔

یہی سبب تھا کہ اول خیر کی معلومات کے مطابق کمبیل دادا نے اپنی اس اہم ترین فیصلہ کن مہم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اپنے ساتھی اول خیر کی طرف روانہ کر دیے تھے جہاں انہوں نے بابن ڈکیت پر حملہ کرنا تھا... اور دوسرے مرحلے میں ہم نے وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

ہم نے سب سے پہلے وزیر جان کی رہائش گاہ ”کنال لاج“ پر شب خون مار کر وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنا تھے اور بیگم صاحبہ کی باعزت بازیابی کے لیے اسے تختۂ مشق بنانا تھا۔

کمبیل دادا کو ابھی میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پہلے سے ہی وزیر جان اور بدر اقبال المعروف بابن ڈکیت کے ناموں اور حیثیت سے واقف ہوں۔

ہم رات سے پہلے ساہیوال پہنچ چکے تھے۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں وزیر جان کی محل نما کوٹھی ”کنال لاج“ عین وسط میں واقع تھی اور جس بلاک میں تھی اس طرف جانے والے راستے پر بھی وردی پوش مگر بظاہر غیر مسلح چوکیدار ٹائپ محافظ نظر آتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بلاک میں اعلیٰ سرکاری افسر اور ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے چند گنے چنے کاروباری شخصیات کی رہائش بھی تھی۔ اور ذاتی پروٹیکشن کی خاطر انہوں نے اپنی سیکیورٹی بھی الرٹ کر رکھی تھی۔ گویا کنال لاج میں داخلے کی تو دور کی بات تھی... پہلے مذکورہ بلاک میں داخل ہونے کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔

ہم ساہیوال پہنچ کر ایک ہائی فیک ریسٹورنٹ کے ٹی ہال میں موجود تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم ایک چکر وہاں کا لگا چکے تھے اور جائزہ بھی لے چکے تھے۔

میں نے کمبیل دادا کو تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ”دادا میرا خیال کنال لاج میں نقب لگانے کا رسک لیے بغیر اگر ہم وزیر جان کو باہر سے ہی یرغمال بنانے کی کوشش کریں تو اپنا مقصد جلد حاصل کر سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے میری تجویز سے اختلاف کیا۔ ”یہ لمبا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ پورے ساہیوال کی پولیس انتظامیہ ہمارے پیچھے پڑ جائے گی، پھر ہمارا یہاں کوئی خفیہ ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ وزیر جان کو یرغمال بنا کر ہم کہاں کہاں لیے پھریں گے۔“

ماجد میری تجویز سے کچھ اتفاق کرتے ہوئے دادا سے بولا۔ ”استاد! ہمیں شہزی کی بات پر تھوڑا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم وزیر جان کو اغوا کر کے چک نواں کی طرف نکل سکتے ہیں، کیونکہ ہماری اگلی منزل اسی طرف ہی ہے۔ چھوٹے استاد (اول خیر) نے وہاں اپنے چھوٹے ٹھکانے کا بندوبست تو کر رکھا تھا۔“ دادا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا لائحہ عمل ہے؟“

وہ بولا۔ ”اس کی رہائش گاہ میں ہی اسے یرغمال بنایا جائے۔ پھر وہاں تشدد کے ذریعے اس سے بابن ڈکیت اور بیگم صاحبہ کے بارے میں اگلوایا جائے۔ ہمیں چوبیس گھنٹے وہاں گزارنا ہوں گے کم از کم... اور اسے وہیں سے ہی ڈوریاں ہلانے پر مجبور کرتے رہیں گے۔“

میں نے غور کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ تجویز یہ بھی بری نہ تھی۔

بالآخر طے پایا کہ مذکورہ بلاک سے قدرے پہلے کسی نسبتاً ویران جگہ پر کار چھوڑ کر صرف میں اور کمبیل دادا کنال لاج کی طرف بڑھیں گے، جبکہ ہمارے باقی دو ساتھی بہ شمول ڈرائیور کار میں ہی ہماری کسی فوری ہدایت کے منتظر رہیں گے۔

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت گزاری اور رات گہرے ہوتے تک ہم نے کچھ کھایا پیا... اس کے بعد روانہ ہو گئے۔

مذکورہ بلاک کے جس خصوصی راستے پر ہر ڈل راڈ لگا کے گارڈز کھڑے تھے، اس کے عقب میں بیشتر پلاٹ خالی پڑے تھے۔ جدھر جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ وہاں کا راستہ ایک سپاٹ دیوار سے بند کیا گیا تھا۔ میں اور کمبیل دادا اس سمت میں آئے تو ایک نو تعمیر شدہ کوٹھی کا ڈھانچا ہمیں دکھائی دیا۔ جو کنال لاج کی جنوبی دیوار سے متصل تھا۔ تفصیلی جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ مذکورہ کوٹھی کی کنسٹرکشن کا کام ابھی جاری تھا اور آخری مراحل پر تھا۔ یہ خالی تھی، تاہم یہ بات

میں ممکن تھی کہ اندر ایک سے زائد چوکیدار موجود ہو سکتے تھے... مگر ہمیں تسلی تھی کہ وہ ایک خالی انڈر کنسٹرکشن عمارت میں کس قدر "چوکس" ہو سکتے تھے۔ اس کی چھت یا بالکونی سے ہم کنال لاج میں داخلے کی راہ بہ آسانی نکال سکتے تھے۔

ہمارے پاس نقب زنی کا مختصر ضروری سامان موجود تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ آسمان روشن تھا۔ آخری تاریخ کا چاند کہیں پرے جھکا ہوا تھا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ سے لبریز جس خالی پلاٹ پر موجود دبکے ہوئے تھے اس سے پار ایک سڑک تھی اور پھر چٹیل میدان تھا۔ وہاں سے آتی ہوئی مرطوب ہوا سائیں سائیں کی آواز پیدا کر رہی تھی۔

ہم دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے مطلوبہ کوٹھی کی عقبی دیوار سے آن لگے۔ یہاں سے ساتھ ملحقہ کنال لاج کی طرف ایک نظر ڈالی یہاں ون پلس سے زیادہ بلند عمارت کوئی نہ تھی۔ اوپری منزل میں ہلکی روشنی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ اس طرح کی عالیشان کوٹھیوں میں عموماً عجیب سی پُرسکون خاموشی پائی جاتی ہے۔ جبکہ ان کا سیکیورٹی الارم سسٹم آن ہوتا ہے جو اس قدر حساس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اگر ایک پرندہ بھی کسی اندرونی چھت یا دیوار سے ٹکرا جاتا تو گارڈز کیبن میں اس کی خبر ہو جاتی۔

بہرطور ہم نے مناسبت سے سیاہ لباس ہی پہن رکھا تھا۔ تاکہ تاریکی کا حصہ ہی معلوم ہو۔ ایک آنکڑے دار رسی نکالی گئی۔ جس پر ہر ایک گز پر موٹی گانٹھ باندھی گئی تھی۔ تاکہ اس کے سہارے رسی پر مضبوطی کے ساتھ گرفت جما کر راستہ پاٹا جا سکے۔ بہت ہولے سے آنکڑا عقبی دیوار کے سرے پر نصب خم دار آہنی بریکٹوں میں پھنسایا گیا اور پھر ہم دونوں باری باری اوپر پہنچ گئے۔

یہ کوٹھی ادھوری اور خالی ہونے کے باعث بادی النظر میں بھوت بنگلے کا تاثر پیش کر رہی تھی۔ مگر اس وقت یہی پُراسرار خاموشی اور ویران ماحول ہمارے تحفظ کی ضمانت بھی تھا۔

نقب زنی کے معاملے میں، کبیل دادا کی مہارت، پھرتی اور چابکدستی کا مجھے قائل ہونا پڑا تھا۔ حالانکہ میں نے اول خیر کو بھی یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ مگر بلاشبہ کبیل دادا کی بات اور تھی... محض اگلے چند منٹوں میں ہم کوٹھی سے کنال لاج کی "پلس منزل" کی بالکونی پر پہنچ چکے تھے۔

اندر کا محلِ وقوع کیا تھا اس سلسلے میں ہماری معلومات صفر تھی، اول خیر سے جو ممکن ہو سکا تھا، اس نے معلومات کبیل دادا تک پہنچائی تھی۔ وہی فی الحال کافی تھی۔

ہمیں یہ کوٹھی بھی ویران لگی تھی، تاہم ہم گربہ قدمی اختیار کرتے ہوئے پہلے اوپری منزل کا جائزہ لیتے رہے۔ یہاں چند ہی کمرے تھے۔ گراؤنڈ کا رقبہ نسبتاً زیادہ تھا... ایک بالکونی کے تاریک گوشے کی آڑ سے جھانک کر ہم نے نیچے بھی نظر ڈالی تھی۔

سیاہ رنگ کے سلائڈنگ گیٹ کے دائیں جانب اندرونی سمت میں گارڈ کیبن نظر آتا تھا۔ درمیان میں پختہ روش تھی۔ دائیں بائیں وسیع لان تھا، وہاں ذرا ذرا فاصلے سے آہنی پائپ نصب تھے کہ جن پر گلوب روشن تھے، کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دی تھی، پھر خاموشی چھا گئی۔ نیچے پورچ میں دو تین بیش قیمت بھاری گاڑیاں کھڑی دکھائی دی تھیں۔

مرکزی داخلی دروازہ ساگوان کی لکڑی کا تھا، وہ دلکش محراب کی صورت میں تھا۔ ہم نے اوپر سے بیرونی جائزہ لینے کے بعد اندر کا رخ کیا۔ مرکز میں ہال نما کمرا تھا یہاں سے ایک چکردار دلکش ریلنگ والا زینہ نیچے جاتا تھا۔

وزیر جان کا حدود اربعہ کیا تھا، اس کی خبر نہ تھی۔ اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس کی فیملی مختصر سی ہے۔

ہال کمرے کا دروازہ کبیل دادا نے کھول لیا تھا۔ اندر ماربل کے چکنے سلوپی فرش پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا جو خاصا دبیز اور نرم تھا۔ دائیں بائیں فینسی اسٹینڈ پر سنگِ مرمر کے بڑے بڑے گلدان دھرے تھے۔ کبیل دادا نے پنسل ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ یہاں دو مختصر راہداریاں تھیں۔ ایک سیدھی تھی۔ دوسری درمیانی کمروں سے گزر کر عقبی سمت کی دیوار تک جا کر دائیں بائیں تقسیم ہو کر گھوم رہی تھی۔ یہاں احتیاطاً کبیل دادا نے دو تین کمروں کو کھول کر دیکھا بھی تھا، وہ خالی اور تاریک پڑے ہوئے تھے۔ باقی کمروں کے دروازے کے نچلے باریک خلا سے تاریکی دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی خالی ہوں گے۔ بہ صورتِ دیگر نیچے سے زیرو پاور کے بلب کی روشنی تو ضرور دکھائی دیتی۔

ہم دبے پاؤں نیچے آ گئے۔ یہ اوپن ہال تھا۔ یہاں بھی بیش قیمت قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔

یہاں ایک چوڑی راہداری اور دائیں بائیں رخ پر دو نشست گاہیں نظر آتی تھیں۔ ہلکے پاور کے دو بلب یہاں بھی روشن تھے۔ گہری خاموشی میں ہلکی ہلکی گھررر... کی آواز سنائی دے رہی تھی، یہ شاید اے سی کے کمپریسر کی تھی۔

اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ ہم دونوں بُری طرح ٹھٹک گئے۔ کبیل دادا شاید شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا کہ آیا پنسل ٹارچ روشن کرے یا نہیں... اچانک لائٹ آ گئی، اور

یہ واقعی لائٹ ہی تھی، یعنی زیرو پاور کے بلب نہیں تھے، تیز بلبوں کی روشنی تھی اور ہمارے اردگرد پانچ مسلح افراد ہم پر گنیں تانے کھڑے تھے۔

''خبردار... اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرلو... ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

ایک نسبتاً دراز قامت شخص نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔

میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا اور کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوگئیں۔

میں نے اور دادا نے ان کے حکم کی تعمیل کی، دو افراد پھرتی کے ساتھ آگے بڑھے، اور ہمارے ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہم چوہے دان میں آن پھنسے تھے اور ہماری اندر داخلے تک کی ہر کارروائی کسی اسکرین پر دیکھی جارہی تھی۔

اس کے بعد دراز قامت نے اپنے ایک ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ ''باس کو بتادو جاکر... ہم انہیں ریڈ روم میں لے جارہے ہیں۔''

بڑی عجیب اصطلاح کا استعمال کیا گیا تھا ایک رہائشی جگہ کے لیے۔ بہرطور ہمیں گن پوائنٹ پر جس کشادہ کمرے میں لایا گیا تھا، وہ کسی بھی ''ریڈ'' شے کا گمان نہیں ہورہا تھا... بظاہر عام سا کمرا تھا اور برائے نام فرنیچر۔ ہم دونوں کو بیٹھنے نہیں دیا گیا تھا بلکہ سامنے دیوار کی جانب سیدھا کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔

''باس آرہے ہیں۔'' ایک نے اندر داخل ہوکے دراز قامت شخص سے کہا۔ باس سے ان کی مراد یقیناً وزیر جان ہی ہوسکتا تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ بیش قیمت سلیپنگ ریشمی گاؤن میں ایک شخص بڑے کروفر سے پشت پر ہاتھ رکھے اندر داخل ہوا۔ قد درمیانہ تھا، سر کے بال سفید تھے، چہرہ بھاری تھا، آنکھیں چھوٹی تھیں۔ عمر ساٹھ سے کم نہ تھی، مگر قابلِ رشک صحت نے اسے ساٹھا پاٹھا بنا رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ہمارے ذرا قریب آیا تو اچانک جیسے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں سر سے پاؤں تک پتھرا گیا۔ اگر سکتے کی کیفیات اسی کو کہتے ہیں جس میں پورا وجود سن ہوکر بے جان محسوس ہونے لگتا ہے، مگر آنکھوں سے سب دیکھا اور دماغ سے سمجھا جاتا ہے تو میں یقیناً سکتے میں ہی آگیا تھا۔ دماغ میں شور کی سی آوازیں سماعتوں کو چھلنی کیے دے رہی تھیں۔ پورا وجود سائیں سائیں کررہا تھا۔ دل میں بیک وقت کئی کیفیات تھیں جن سے میں دوچار تھا۔ شناسائی کے ایک ہلکے شائبہ نے یہ غور اسے دیکھتے رہنے پر ایک مکمل آشنائی کو ظاہر کیا تھا۔ یقین و بے یقینی کے متلاطم بھنور نے گویا ایک طوفانی بگولے کی شکل میں مجھے لپیٹ لیا اور ماضی کے سولہ برس پہلے کے اس اطفال گھر میں مجھے پھینک دیا... اور پھر جیسے میری نظروں کے سامنے پیش منظر نہ رہا۔ اب میں پس منظر کو باطنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا... جب میرا باپ مجھے یعنی ایک آٹھ، نو سال کے بچے کو اطفال گھر والوں کے حوالے کرکے لوٹ رہا تھا، اور میں معصومانہ حیرت اور پریشانی سے باپ کو آواز دے رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''ابو...! یہ کون سی جگہ ہے؟... مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے کیوں چھوڑ کے جارہے ہو؟''

تو باپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مرتعش اور دکھی آواز میں کہا تھا۔ ''بیٹا... اب تو یہیں رہے گا... تیرے لیے یہی بہتر ہے اور صحیح بھی کہ تو اب ادھر ہی رہے۔ میں تیرے پاس آتا رہوں گا۔''

وہ افسردہ بھی نظر آرہا تھا۔ دکھی بھی، مگر اس سے زیادہ مجبور بھی... کیوں؟ باپ تو اولاد کو سینے سے لگاتا ہے۔ اولاد تو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے دل کا قرار ہوتی ہے۔ فخر ہوتی ہے۔ پھر کیوں میرا باپ ایسا قدم اٹھا رہا تھا۔ ایک سوال تھا... جس نے برسوں سے بے چین کر رکھا تھا۔ میرے جسم کو ہی نہیں میری روح تک کو جھنجھوڑ کیے دے رہا تھا۔ آج اس کڑے سوال کا جواب میرے سامنے تھا۔

میں جب پس منظر سے پیش منظر میں آیا تو ایک اور کیفیت نے مجھ پر غلبہ پایا۔ یہ جوشِ محبت تھی یا پھر ایک بے نام سے صدمے کی مار تھی... یا شاید کسی ازلی مگر گم گشتہ رشتے سے تعلق کا انسیت بھرا دباؤ کہ مجھے چکر سا آگیا۔ میں جو شہزاد احمد خان عرف شہزی... آہنی اعصاب اور مضبوط قد و کاٹھ کا حامل چھ فٹ کا جوان تھا... ماضی کے ایک دردناک و جاں گسل حوالے کی تلوار کے ایک ہی وار سے ڈھے گیا۔ اور گرتے گرتے بھی بصری شہادت کے بعد سماعی تصدیق ہوگئی... جب میں نے اپنے باپ کی آواز سنی۔

''ارے... اسے کیا ہورہا ہے... یہ گر رہا... ہے۔''

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

صلہ

جمال دستی

ذہانت اور خوب صورتی خدا کی ودیعت کردہ خوبیاں ہیں... جو اس دولت سے مالا مال ہوتے ہیں... وہ اس پر غرور اور فخر بھی محسوس کرتے ہیں... مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ تیسری چیز جذبۂ محبت ہوتی ہے... جو کسی کو بھی اپنا بنا سکتی ہے... اور اس بے بہا دولت کا کوئی متبادل نہیں...

دو بھائیوں کے درمیان پائی جانے والی عداوت اور محبت کی عجب کتھا...

میرا دوست اسکائلر ہابس ہمیشہ عورتوں کی موجودگی میں بے آرامی محسوس کیا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے ان کے ساتھ بُرا رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے اس عورت سے اس انداز میں بات کرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارا یہاں آنا... بیکار ہی گیا۔'' وہ آتش دان کے پاس رکھی آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہارا کیس لینے میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' وہ عورت دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں دستی بیگ تھا اور وہ اپنے نازک فریم والی عینک سے اسے گھور رہی تھی۔ ''ابھی تو میں نے اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا۔''

میں ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے اس عورت سے بولا۔ ''تم میرے دوست کی باتوں کا برا نہ منانا۔ اس کا منگل کے روز ایک چھوٹا سا آپریشن ہونے والا ہے۔''

''میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میری طرف سے معذرت کرو۔'' ہابس منہ بناتے ہوئے بولا۔

''میرا نام وائلڈر ہے۔'' میں نے اس عورت سے کہا۔ میسن وائلڈر۔''

اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سنہرے بال تراشے ہوئے تھے اور اس نے برائے نام میک اَپ کر رکھا تھا گو کہ وہ بدصورت نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنی وہ اسکول ٹیچر یاد آگئی جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا جس کی زندگی کا واحد مشن یہ تھا کہ وہ مجھے ایک ذہین طالب علم بنا دے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس میں ناکام رہی۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی میسن۔'' وہ عورت جیسے انداز میں ہابس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام لینا ہے۔'' وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ بُو کیسی ہے؟''

ہابس نے میگزین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''میں مختلف اقسام کے پانچ سو سے زائد پرفیوم کی خوشبو پہچان سکتا ہوں لیکن تمہارے لباس کی مہک میرے لیے اجنبی ہے۔''

''مجھے تو یہ کسی تمبا کو کی بُو لگ رہی ہے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ہابس جو تمبا کو استعمال کرتا تھا اس کی ناگوار مہک بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی میں نے اس عورت کو کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''یہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ ہابس نے کہا۔ ''یہ میرے نام نہاد بھائی کی طرف سے آئی ہے اور مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

یہ سن کر ہم دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے اور میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟''

''یہ سچ نہیں ہے۔'' لینا نے کہا۔ ''میلاچی نے مجھے نہیں بھیجا بلکہ اس نے تو مجھے تم سے ملنے سے منع کیا تھا لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم دونوں ساتھ کام کرتے ہیں۔''

ہابس نے ایک گہری سانس لی اور میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے بولنے کے انداز اور رکھ رکھاؤ سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم سرکاری ملازم ہو۔ تمہارے پیروں اور ٹانگوں کی سوجن بتا رہی ہے کہ تم گھنٹوں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر کام کرتی ہو اور تمہارے ہاتھوں پر لگے سیاہی کے دھبے ظاہر کرتے ہیں کہ تمہارا تعلق پوسٹ آفس سے ہے جہاں میرا بے وقوف بھائی اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔''

لینا کی آنکھوں میں ایک چمک اُبھری اور وہ ملتجی انداز میں بولی۔ ''اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے مسٹر ہابس ورنہ اس کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔''

ہابس نے کہا۔ ''بہت عمدہ۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس فضول ملازمت سے اس کی جان چھوٹ جائے۔''

لینا اور میں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں ہابس کے قہقہے کا منتظر تھا۔ شاید وہ کہہ دے کہ یہ محض ایک مذاق تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہابس نے دوبارہ میگزین اٹھا لیا اور مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

میں نے اس عورت سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ اگر میں مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔''

''مسٹر ہابس ٹھیک کہتے ہیں۔''

''میں کرسٹین برانچ آفس میں کاؤنٹر کلرک ہوں اور ان کا بھائی میلاچی میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے اور مسٹر ہابس کے برعکس وہ بہت ہی پیارا انسان ہے۔''

ہابس نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس پر الزام ہے کہ وہ ڈاک لے جانے والی لڑکی امبر کو تنگ کر رہا ہے اور اسے اپنی جانب مائل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔''

''کیا میں اس کی تفصیل جان سکتا ہوں؟''

''اس لڑکی نے شکایت کی ہے کہ وہ اسے پھول، چاکلیٹ اور ای میلز وغیرہ بھیجتا رہتا ہے۔''

"اور تمہارا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتی البتہ میلاجی کو ضرور جانتی ہوں۔ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"اور خود میلاجی کیا کہتا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ اس سے انکار کر رہا ہے۔"

"تم اس لڑکی کے الفاظ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہو؟"

"کیونکہ ہمارے باس نے تحقیقات کا حکم دے دیا ہے اور اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آگئی ہے کہ وہ تحائف میلاجی کے کریڈٹ کارڈ سے خریدے گئے تھے اور ای میلز بھی اسی کے کمپیوٹر سے بھیجی گئی ہیں۔ لہٰذا میلاجی کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ایک اور واقعہ ہوگیا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔"

بظاہر یہ کیس بہت سیدھا سادہ تھا۔ وہ شخص ایک لڑکی کی خاطر بے وقوف بن رہا تھا۔ ایسی کہانیاں میں ہمیشہ سے سنتا آیا ہوں اور اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ یہ بات واضح تھی کہ لینا اس کے لیے گہرے جذبات رکھتی تھی اور میلاجی کے لیے اس کی دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

"اب بتاؤ مسٹر میسن۔" ہابس طنزیہ انداز میں بولا۔ "کیا تم یہ کیس لینے کے لیے تیار ہو؟"

میں نے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ پوری بات سننے کے بعد اس عورت کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن وہ لاتعلق بنا بیٹھا رہا۔

"میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔" میں نے کن انکھیوں سے اس عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

لینا کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ہابس اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے مینٹل پیس پر سے تمباکو کا پیکٹ اٹھایا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

"چلو، میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔"

لینا اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ہابس نے ماچس نکال کر پائپ سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر فضا میں دھواں چھوڑ دیا۔

"اوہ.... اب میں سمجھی کہ وہ بو کیسی تھی۔" لینا برا سا منہ بناتے ہوئے بولی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک گیا اور بولا۔

"مجھے افسوس ہے لیکن وہ عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔"

"مجھے بھی اس سے یہ امید نہیں تھی۔" لینا بولی۔

"میں اس کے بھائی کے لیے ضرور کچھ کروں گا۔ کیا میلاجی نے کبھی بتایا کہ یہ دونوں بھائی آپس میں کیوں نہیں ملتے؟"

"وہ اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا لیکن جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں کہ وہ اپنے بھائی کی حرکتوں سے نالاں ہے جو وہ اپنے آپ کو شرلاک ہومز ثابت کرنے کے لیے کرتا رہتا ہے۔"

"کیا تم اس بارے میں جانتی ہو؟"

"میں نے اسے کریدا تو تم لوگوں کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ میلاجی کو اسی بات کی شرمندگی ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ کہیں لوگ اس کے خاندان کے بارے میں غلط رائے نہ قائم کر لیں۔"

"کیا تم بھی ہابس کو خبطی سمجھتی ہو؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک اچھا سراغ رساں ہے اور اسی لیے میلاجی کو اس کی ضرورت ہے۔"

"کیا میلاجی مجھ سے بات کرنا پسند کرے گا۔"

"بالکل نہیں۔ اس نے مجھے یہاں آنے سے منع کیا تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہوگیا تو شاید وہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گا۔"

"اور تم ایسا نہیں چاہو گی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ جانے کے لیے مڑی اور اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔" اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور شوخ لہجے میں بولی۔ "میں ایسا نہیں چاہوں گی۔"

دوسری صبح میں انتظار کرتا رہا کہ ہابس ناشتے سے فارغ ہو جائے تو اس سے بات کروں۔ دو کپ کافی اور ایک سلائس کھانے کے بعد میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ بولو کیا بات ہے؟

میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ "گویا تمہارا ایک بھائی بھی ہے۔"

وہ کچھ کہے بغیر اٹھا اور پورچ سے صبح کا اخبار اٹھا لایا۔ پھر اس نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے اخبار کھولا اور اپنا چہرہ اس کے پیچھے چھپالیا۔

"میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام شرلاک ہومز اسمارٹر برادر تھا۔ مجھے تو یہ کہانی بھی بالکل ویسی ہی لگ رہی ہے۔ وہ تم سے زیادہ اسمارٹ ہے اور تم اس سے حسد کرتے ہو۔"

ہابس نے اخبار تھوڑا سا ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے بھائی سے حسد نہیں کرتا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ سچ ہے کہ میلاجی مجھ سے زیادہ ذہین ہے اور اسی وجہ سے میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔''

''مایوس، وہ کیسے؟''

''اس کا ذہن بہت اچھا ہے لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو ڈاکخانہ جیسی معمولی ملازمت میں ضائع کر رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی ذہانت کو قوم اور ساری دنیا کے مسائل حل کرنے میں استعمال کرے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اخبار سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ واقعی اس ڈاک لے جانے والی لڑکی امبر کو ہراساں کر رہا ہے۔''

اخبار کے پیچھے سے ایک ایسی آواز آئی جو گھوڑے کی ہنہناہٹ سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں اس کا مطلب نہیں سمجھوں۔''

''میں اور میرا بھائی ایک ہی میٹریل کے بنے ہوئے ہیں۔'' ہابس نے کہا۔ ''اور اگر اس کے ساتھ کچھ غلط ہوا تو وہ جذباتی اور ذہنی اعتبار سے اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

''کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اسے ایک ایسے جرم کی پاداش میں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔''

''میری خواہش ہے کہ وہ اس ملازمت سے فارغ ہو جائے، چاہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے تاکہ وہ مجبور ہو کر کوئی بہتر ملازمت تلاش کرے۔''

''کیا تم نے کبھی کسی ملازمت کے لیے درخواست دی ہے۔ ہر جگہ گزشتہ ملازمت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ پہلے والی ملازمت کیوں چھوڑی۔ ذرا سوچو اس وقت کیا ہوگا جب وہ یہ بتائے گا کہ اسے ایک لڑکی کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کیا گیا تھا۔''

ہابس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اخبار میں مشغول رہا۔

''وہ خوش قسمت ہوگا اگر اسے کسی کفن دفن کی دکان پر رات کی شفٹ میں کام مل جائے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟''

ہابس نے اخبار نیچے کیا اور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے ایسی باتوں سے نفرت ہے۔''

تقریباً دو گھنٹے تک پائپ کے مسلسل کش لینے کے بعد ہابس نے اعلان کیا کہ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔

''تمہارے خیال میں اصل کہانی کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا امبر جھوٹ بول رہی ہے؟''

''اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر واقعی اسے تحائف موصول ہوئے ہیں جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے اور میلاجی کے کریڈٹ کارڈ سے خریدے گئے ہیں تو یہ معاملہ جھوٹ سے بڑھ کر کچھ اور لگتا ہے۔ میرے بھائی کے کمپیوٹر سے جو پیغامات بھیجے گئے۔ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس میں اندر کے کسی آدمی کا ہاتھ ہے۔''

''امبر بھی تو اندر کی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے اسی پر شبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس معاملے میں کسی تیسرے فریق کے ملوث ہونے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''گویا تم لینا پر شک کر رہے ہو؟''

''نہیں، وہ میرے بھائی سے کافی قریب دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ اسے نوکری سے نکلوانا چاہتی تو ہمارے پاس مدد کے لیے کیوں آتی؟''

''گویا ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔''

''ایسی بات بھی نہیں۔ اگر یہ کسی تیسرے فریق کی حرکت ہے تو پہلا سوال یہی ذہن میں آتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے گا؟''

''ہاں یہ سوچنے والی بات ہے۔''

''فرض کرو کہ وہ تیسرا فریق مسٹر ایکس، میلاجی کو ملازمت سے نکلوانا چاہتا ہے تو اس سے اسے کیا فائدہ ہوگا۔ میرے بھائی کی فطرت ایسی ہے کہ کوئی اس سے پیشہ ورانہ حسد نہیں کر سکتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میلاجی کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو تیسرا فریق حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''وہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟''

''وہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے لینا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شخص میلاجی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے تاکہ لینا تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔''

اس کی بات میں وزن تھا پھر بھی میں اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''وہ کوئی مس ایکس بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے ہابس اور اس دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کوئی عورت

میلا جی کو لینا سے دور کرنا چاہ رہی ہے۔''

ہابس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ امید نہ رکھنا کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔''

ہم پروگرام کے مطابق کرسٹین پوسٹ آفس پہنچے تو وہاں بیرونی برآمدے میں کئی چھوٹے چھوٹے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو مجھے لینا کے کاؤنٹر پر پہنچ کر اسے دینا تھا۔ ہابس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں لینا کو یہ گلدستہ پیش کروں گا تو یقیناً اس کے کسی ساتھی کی طرف سے حاسدانہ ردِعمل سامنے آئے گا۔

میں نے ہابس سے پوچھا کہ وہ مجھے قربانی کا بکرا بنانے کے بجائے خود یہ کام کیوں نہیں کرتا تو اس کے پاس کا جواب بھی موجود تھا۔ ہابس کو زعم تھا کہ اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہے اور اس کا کام یہ ہوگا کہ جب میں لینا کے سامنے اپنی وارفتگی کا اظہار کروں تو وہ دور رہ کر اس کے ساتھیوں کا ردِعمل دیکھے۔

میں نے اس خیال کو پسند نہیں کیا۔ ہابس کے برعکس مجھے اداکار بننے کا کوئی شوق نہیں تھا اور نہ ہی مجھے یقین تھا کہ یہ کارنامہ سرانجام دے سکوں گا۔ لینا کافی پُرکشش تھی لیکن میری پسند سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی وہ اسکول ٹیچر یاد آجاتی جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔

میرا قطار میں چھٹا نمبر تھا۔ جب لینا کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ مجھے کسی گارڈن پارٹی میں بن بلایا مہمان سمجھ رہی ہو۔ اس کے باوجود میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی کیونکہ آنے والے مرحلے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ ہابس کو پہچان لیتی تو شاید اسے زیادہ خوشی نہ ہوتی لیکن وہ بھیس بدل کر آیا تھا۔ اس نے سفید بالوں والے بزرگ شہری کا روپ دھار رکھا تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی اور ہاتھ میں چھڑی پکڑ رکھی تھی۔ میں قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے ڈبوں، لفافوں اور دوسری ڈاک کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی غیرملکی زبان میں بڑبڑا رہا تھا جس کی وجہ سے وہاں پر موجود دوسرے لوگوں کے لیے اسے نظرانداز کرنا مشکل ہو گیا۔

اس کاؤنٹر کے چار حصے تھے۔ مجھ سے قریب ترین کھڑکی پر ایک فربہ اندام عورت اپنے خشک سیاہ بالوں کو پونی ٹیل کی صورت میں باندھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر والے کاؤنٹر پر ایک چندھیائی ہوئی آنکھوں اور سپاٹ چہرے والا شخص بیٹھا ہوا تھا؟ اس کے بال مہین اور جلد اتنی زرد تھی کہ جیسے اس نے تیزاب میں غسل کیا ہو۔ اگر میرے کانوں میں اس کی آواز نہ آتی تو یہی شبہ ہوتا کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کے برابر میں لینا بیٹھی ہوئی تھی جس نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا اور خاص طور پر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلدستے کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا۔

میرے لیے ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اس وقت میری توجہ آخری کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک کی طرف تھی۔ اس کا جسم درمیانہ، سیاہ آنکھیں، لمبی ناک اور سر پر گھرے گھنے بال تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ پھرتیلا نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک گاہک سے پارسل وصول کرنے کے بعد اسے ہاتھوں سے تولا اور بولا۔ ''دو پاؤنڈ چھ اونس'' پھر اس نے پارسل پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''پارسل پوسٹ سے اس کے اخراجات 11.41 ڈالر ہوں گے اور یہ اگلی جمعرات کو مل جائے گا۔ ارجنٹ میل سے 13.05 ڈالر ہوں گے اور یہ کل تین بجے تک مل جائے گا۔''

گاہک حیرت سے منہ کھولے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا ہوگا کہ یہ انسان ہے یا کمپیوٹر جو اتنی روانی سے حساب لگا رہا ہے لیکن مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ شخص ہابس کا بھائی میلا جی تھا۔ اس کی مستعدی کی وجہ سے لائن تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ جب میں کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا لیکن میں نے کہا۔

''شکریہ، میں اس خاتون کا انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے لینا کی طرف دیکھا جو ابھی تک یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اس نے مجھے نہیں دیکھا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میلا جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''نیکسٹ۔''

میں وہاں کھڑا اپنے آپ کو احمق سمجھ رہا تھا کیونکہ قطار میں سے تین آدمی نکل کر مجھ سے آگے چلے گئے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ لینا جان بوجھ کر مجھے انتظار کروا رہی ہے۔ ان دونوں نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس دوران ہابس بھی قطار میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں۔ خدا خدا کر کے لینا کے پاس کھڑا ہوا گاہک فارغ ہوا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

میں نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کی جانب پھولوں

کا گلدستہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’کیا تم میرے ساتھ لنچ کرنا پسند کروگی؟‘‘

لینا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے ایک دفعہ میلاجی کی طرف دیکھا اور پھر سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ’’تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔‘‘

میں نے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر لکھا۔ ’’یہ بھی ہابس کے منصوبے کا حصہ ہے۔‘‘

اس کے باوجود وہ قائل نہیں ہوئی اور کہنے لگی۔ ’’میں نہیں سمجھتی کہ یہ ممکن ہوگا۔ تم دیکھ رہے ہو، ہم آج کتنے مصروف ہیں۔‘‘

میں کن انکھیوں سے کاؤنٹر پر بیٹھے دوسرے کلرکوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ تبھی میں نے موٹی عورت کے گالوں کو سرخ ہوتے دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا ہابس کا منصوبہ کامیاب ہو رہا ہے۔

میں نے لینا سے کہا۔ ’’یہ پھول اپنے پاس رکھ لو اور لنچ میں میرے ساتھ شامل ہوجاؤ۔ تمہیں اس پر کوئی افسوس نہیں ہوگا۔‘‘

وہ اب بھی میری پیشکش قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

’’یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟‘‘ عقب سے کسی کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ ’’ڈاک خانے کے ملازمین اپنے دوستوں کے ساتھ دل لگی میں مصروف ہیں جبکہ ہم لوگ جن کے ٹیکسوں سے انہیں تنخواہ ملتی ہے قطار میں کھڑے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ جب میں یہاں آیا تو جوان تھا اور اب میرا کیا حال ہوگیا ہے۔‘‘

مجھ سمیت سب لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھا شخص چھتری فضا میں لہرا کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ دوسرے گاہک مسکرانے لگے۔ لیکن ان میں سے کچھ تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ کلرک بھی اپنا کام چھوڑ کر اس بوڑھے کو دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ عملے کے کچھ اور لوگ بھی ڈاک خانے کے عقبی حصے سے نکل کر آگئے تھے۔ سب کی نظریں اس بوڑھے شخص یعنی ہابس اور لینا پر جم گئیں۔ البتہ میلاجی گردوپیش سے بے نیاز اپنے کام میں لگا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہابس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ’’تم نے میری پوری بات نہیں سنی نوجوان خاتون۔ میں پوسٹ ماسٹر جنرل اور صدر کو خط لکھوں گا۔‘‘

’’تم جانتی ہو یہ کون ہے؟‘‘ میں نے لینا سے سرگوشی میں کہا۔ ’’جلدی سے ہاں کہہ دو۔ اسے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔‘‘

اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور مٹھیاں بھینچ لیں پھر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ’’میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر تمہیں برگر کنگ میں ملوں گی لیکن وہاں تیس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔‘‘

’’اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔‘‘ میں نے کہا اور پھولوں کا گلدستہ اس کے چہرے کے سامنے کردیا جسے اس نے کاؤنٹر کے نیچے گرادیا۔

باہر آنے سے پہلے میں اس موٹی عورت کے کاؤنٹر کے سامنے رک گیا۔ اسے آزمانے کے لیے میں نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری اور پُرشوق نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ اس کا پورا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ یقینا حسد کرتی تھی لیکن میلاجی سے نہیں بلکہ لینا سے۔ اس لیے مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے میں نے اس عورت کی طرف بڑھ کر اپنے آپ کو گالی دی ہو لیکن دوسرے لمحے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ میرا مقصد صرف مشتبہ افراد کی فہرست میں سے ایک نام خارج کرنا تھا۔

میں برگر کنگ جانے کے بجائے پوسٹ آفس کے عقب میں کھڑے ہوکر لینا کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے احساس ہوجائے کہ میں اس کے ساتھ لنچ کرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ جب وہ برگر کنگ جانے کے لیے روانہ ہوئی تو میں بھی اس کے ساتھ ہولیا جس پر وہ خاصی برہم ہوئی۔ ریسٹوران پہنچ کر میں نے کھڑکی کے پاس ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جہاں سے پوسٹ آفس صاف نظر آرہا تھا۔ اگر کوئی میری جاسوسی کرتا تو وہ میری نظروں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے اسکائلر ہابس بھی صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ابھی تک بوڑھے کے روپ میں ایک بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے وہ بیک وقت ریسٹوران اور پوسٹ آفس پر نظر رکھ سکتا تھا۔

لینا نے اپنا برگر اٹھایا اور بولی۔ ’’کیا واقعی یہ کسی پلان کا حصہ ہے یا تم نے میرے ساتھ ڈیٹ پر آنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟‘‘

’’دونوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہابس کا خیال ہے کہ تمہارا کوئی ساتھی تم پر نظر رکھتا ہے اور شاید وہ اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے میلاجی کو پھانس رہا ہے۔‘‘

’’یہ محض احمقانہ بات ہے۔‘‘

''کون سا حصہ؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یعنی یہ کہ کوئی تم پر نظر رکھے ہوئے ہے یا تم نے میلاجی کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔''

اس کا چہرہ یک لخت گلابی ہوگیا اور وہ بولی۔ ''میری نظر میں دونوں ہی باتیں احمقانہ ہیں۔ اب ہم اسکول میں نہیں پڑھ رہے بلکہ بالغ ہو چکے ہیں۔''

''کیا بالغان پر پابندی ہے کہ وہ کسی میں دلچسپی نہیں لے سکتے؟''

اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور برگر کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''بہرحال، وہاں کوئی بھی مجھ میں دلچسپی نہیں لیتا، کوئی بھی نہیں۔''

''کیا میلاجی بھی نہیں؟''

''وہ دوسروں کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔'' اس کے حلق میں کچھ پھنس گیا تھا جسے اس نے کوک کا ایک گھونٹ لے کر صاف کرنے کی کوشش کی۔

میں نے کسی کو پوسٹ آفس سے آتے دیکھا تو کہا۔ ''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آرہا۔''

''کیوں؟''

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خود ہی دیکھ لو۔''

اندر آنے والا شخص میلاجی ہابس تھا۔ اس نے دروازے میں رک کر ریستوران کا جائزہ لیا۔ لینا اسے دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ ہلانے لگی۔ میلاجی کو یوں جھٹکا لگا جیسے وہ کسی چٹان سے ٹکرا گیا ہو۔ اس نے شائستگی سے سر خم کیا اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنے لیے کسی چیز کا آرڈر دیا۔ اس دوران اس کی پشت ہماری طرف رہی۔ پھر وہ اپنا مطلوبہ سامان لے کر تیزی سے واپس چلا گیا۔

ہابس ابھی تک بس اسٹاپ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میلاجی اس پر نظر ڈالے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا یا تو وہ اتنا اسمارٹ نہیں تھا جتنا ہابس سمجھتا تھا یا پھر محبت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ گوکہ پہلے دن ہمیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی لیکن ہابس کا اصرار تھا کہ اس مشق کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن میں پھر پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ اس بار میرے ہاتھ میں دل کی شکل کا بنا ہوا غبارہ اور ایک ٹیڈی بیئر تھا۔ میلاجی نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنے کاؤنٹر پر Closed کی تختی رکھ کر اندر غائب ہوگیا۔

لینا بھی کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آرہی تھی لیکن اس نے اپنا سبق یاد کر رکھا تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر میرے تحائف

روزی! آج شادی کے دس سال بعد جان مجھے ڈنر پر لے جا رہا ہے..... اف! میں کتنی خوش نصیب ہوں!

قبول کر لیے اور ایک بار پھر لنچ پر آنے کے لیے تیار ہوگئی۔ دونوں کلرک یعنی وہ موٹی عورت اور چندھیائی آنکھوں والا بھی ڈیوٹی پر تھے۔ اس بار ہابس نے اپنا حلیہ تبدیل کرلیا تھا۔ وہ ایک لمبی ڈانگری اور پرانی سی بیس بال کیپ پہنے کوئی موٹر مکینک لگ رہا تھا۔

لنچ کے دوران لینا خاموش اور بجھی بجھی سی تھی کیونکہ میلاجی نے اسے گزشتہ روز سے بالکل نظرانداز کیا ہوا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اس کے بغیر وہ مر جائے گی۔ ہابس ایک بار پھر بس اسٹاپ پر کھڑا ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ جب میں لینا کے ساتھ واپس آرہا تھا تو اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ گوکہ میں جانتا تھا کہ اس تحقیقات سے کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن ہابس کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہ رہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا لہٰذا میں نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور لینا پر یہ ظاہر کرتا رہا کہ اس کے ساتھ تیس منٹ گزار کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔

میں لینا کو چھوڑ کر واپس جانے والا تھا کہ اچانک شور اٹھا اور کاؤنٹر کے پاس سے کسی کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا تو دیکھا کہ میلاجی حیران پریشان کھڑا ہوا ہے۔ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ بے یقینی یا تردید کرنے کے انداز میں سر ہلا رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک خوب صورت لڑکی ڈاک تقسیم کرنے والے کی وردی پہنے اس پر برس رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی جیب

سے سرخ سلک کے ٹکڑوں کا ایک بنڈل نکالا اور اسے کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔ میلاجی پلک جھپکائے بغیر اس بنڈل کو دیکھ رہا تھا جیسے ابھی رو دے گا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا لیکن حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

امبر بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ ستواں ناک، چہرے کے دلکش نقوش اور متناسب جسمانی خطوط جو وردی میں بھی نمایاں تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک ڈاک لے جانے والی لڑکی میں ہونی چاہئیں۔ اگر وہ ہمارے علاقے میں ڈاک تقسیم کرتی تو میں ہر روز اس کا انتظار کیا کرتا۔ اسے دیکھ کر پہلی بار مجھے میلاجی کی بے گناہی پر شبہ ہونے لگا۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی کی خاطر دیوانہ ہوجائے تو وہ امبر ہی ہوسکتی ہے۔

اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس کا فون نمبر معلوم کروں لیکن عین اسی وقت ایک شخص سوٹ اور ٹائی میں ملبوس عقبی کمرے سے برآمد ہوا اور میلاجی کے چہرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری یہ حرکت ناقابلِ معافی ہے۔ تمہیں فوری طور پر معطل کیا جاتا ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ تم دوبارہ کہیں بھی کام نہ کرسکو۔ اپنا سامان سمیٹو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

میں ہابس کا ردِعمل جاننے کے لیے مڑا لیکن سپاٹ چہرے والے شخص پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ اس کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ جذبات سے عاری نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور مجھے یہ جاننے میں بالکل بھی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہی میلاجی کو پریشان کرنے کا ذمے دار ہے۔

میں نے ہابس کو مضطرب انداز میں بیرونی برآمدے میں ٹہلتے دیکھا تو بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے مطلوبہ شخص کو دیکھ لیا ہے۔''

اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی اور وہ بولا۔ ''مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اگر مناسب وقت دیا جائے تو ہمارا مجرم خود کو ظاہر کردے گا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے اپنے آپ کو ظاہر کردیا ہے۔''

سپاٹ چہرے والے شخص کا نام ٹیڈ فلپس تھا اور دو گھنٹے کے اندر میں نے اس کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا جتنا وہ خود اپنے بارے میں جانتا ہوگا۔ فیس بک اور دوسرے قانونی ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کی عمر تیس سال تھی اور وہ پورٹ لینڈ بینڈ کے پنک مارٹینی کا زبردست مداح تھا۔ اس کی پسندیدہ آئس کریم روکی روڈ تھی۔ اس نے پورٹ لینڈ کمیونٹی کالج میں دو سمیسٹر تعلیم حاصل کی لیکن اکنامکس اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لہٰذا اس نے پوسٹل سروس میں شمولیت اختیار کرلی اور چھ سال گزر جانے کے باوجود بھی کاؤنٹر کلرک ہی تھا اور یہ سب سے اونچی پوزیشن تھی جو وہ حاصل کرسکتا تھا لیکن وہ اس ملازمت سے مطمئن تھا۔ اس کے پاس بی ایم ڈبلیو کار تھی اور اس نے اپنے بھائی ٹاڈ کے ساتھ مل کر نارتھ ویسٹ پورٹ لینڈ کے علاقے میں کرائے پر مکان لے رکھا تھا جس کا ماہانہ کرایہ تقریباً تین ہزار ڈالر تھا۔

اس کا بھائی ٹاڈ بھی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے بینسن ہائی اسکول سے نکال دیا گیا اور وہ کئی بار جیل جاچکا تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست میں دکانوں کے تالے توڑنے سے لے کر جعلی چیک لکھنے تک ہر طرح کا چھوٹا بڑا جرم شامل تھا۔ اب یہی دونوں بھائی ہماری تحقیقات کا مرکز تھے۔ شام ساڑھے سات بجے جب اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے ہمیں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے ایسی جگہ مل گئی جو مکان سے نظر آسکتی تھی۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور پورچ کی روشنیاں بند تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ تاہم میں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر دو مرتبہ ان کا فون نمبر ملایا لیکن گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

جب ہمیں مکمل یقین ہوگیا تو دروازے کی طرف بڑھے لیکن اندر جانے سے پہلے میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور جب پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو ہابس نے اپنا چھوٹا سا تھیلا نکالا جس میں تالا کھولنے کے اوزار اور مختلف چابیاں تھیں۔ ہابس نے دو باریک تار نکال کر تالے کے سوراخ میں ڈالے اور سیکنڈ میں دروازہ کھل گیا۔ ہابس جاسوسوں والے مخصوص انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس کی نظریں باریک بینی سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے تصویروں کے فریم کے پیچھے جھانکا۔ قالین ہٹا کر دیکھے اور اپنے محدب عدسے کی مدد سے نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا جبکہ میں سیدھا کمپیوٹر کی طرف گیا۔ وہاں میز پر ایک لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں تحقیقات شروع کردیں گو کہ اس میں پاس ورڈ لگا ہوا تھا اور کوئی بھی عام انسان

اسے کھولے بغیر کمپیوٹر پر کام نہیں کرسکتا لیکن میں تو کمپیوٹر ڈاکٹر ہوں۔ میرے لیے یہ پاس ورڈ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں نے سرچ فیلڈ میں میلاجی ہابس کا نام ٹائپ کیا اور اسکرین پر کئی دستاویزات، تصویریں اور فائلیں کھل گئیں۔ میں نے تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ان میں میلاجی کا ڈرائیونگ لائسنس، دو کریڈٹ کارڈ، لائبریری کارڈ اور ایک انشورنس کارڈ اسکین کیے ہوئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ٹیڈ فلپس کس طرح یہ تحائف مثلاً پھول، چاکلیٹ اور دیگر اشیا امبر کو بھیجنے کے قابل ہوا۔

اس کے بعد میں نے میلاجی کے نام کی ایک اور فائل کھولی اور اسے دیکھ کر میرا سانس حلق میں اٹک گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حقیقت میں کیا کھیل کھیلا جارہا تھا۔

”ہابس۔“ میں نے آواز لگائی۔ ”تم یقیناً اسے دیکھنا چاہو گے۔“

میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ ہابس لونگ روم میں آیا اور ہماری نظریں الارم کی جانب اٹھ گئیں جو شاید کام نہیں کررہا تھا۔ دروازے پر دستک بدستور جاری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک آواز سنائی دی۔

”میسن! مسٹر ہابس! میں جانتی ہوں کہ تم یہاں ہو۔ مجھے اندر آنے دو۔“

یہ آواز لینا کی تھی۔ ہابس نے میری طرف دیکھ کر برا سا منہ بنایا جیسے یہ بھی میری ہی غلطی ہو۔ میں نے اس کے دیکھنے کی پروا نہیں کی اور دروازہ کھولنے چلا گیا۔

”یہاں سے چلی جاؤ۔“ میں نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔ ”ہم تمہارے لیے ہی کام کررہے ہیں اور تقریباً کیس کو حل کرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“

”میں نے تمہارا تعاقب کیا۔“ اس کی آنکھوں سے جوش جھلک رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم کس چیز کی تلاش میں ہو اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' مکان کے سامنے والے حصے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کرلیا۔ پھر میں نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بی ایم ڈبلیو ڈرائیو وے میں داخل ہورہی تھی۔

”وہ واپس آگئے ہیں۔“ میں نے ہابس سے کہا۔

”اب ہم کیا کریں؟“

”ہمارے پاس چھپنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔“ اس نے لینا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف امید کرسکتا ہوں کہ ہم سب اس عورت کے پرفیوم کی خوشبو سے نہیں پکڑے جائیں گے۔“

لینا نے زبان نکال کر اس کا منہ چڑایا اور ہم سب چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ ہابس الماری میں چھپ گیا۔ لینا رینگتی ہوئی صوفے کے پیچھے چلی گئی اور میں نے دفتر کی جانب دوڑ لگادی۔ اب سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا لہٰذا میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا اور اس کی اوٹ سے لونگ روم کی طرف جھانکنے لگا۔

ٹیڈ فلپس سامان سے بھرا ہوا تھیلا لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں اس کا بھائی تھا جو ٹیڈ کا ہم شکل ہونے کے باوجود قدوقامت میں اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ٹیڈ کچن کی طرف بڑھا اور تھیلے سے سامان نکال کر مقررہ جگہ پر رکھنے لگا جبکہ ٹاڈ نے اپنی جیکٹ اتاری اور صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔

”کچھ پینے کے لیے لاؤ بھائی۔“ اس نے کرخت آواز میں کہا۔

ٹیڈ نے حکم کی تعمیل کی اور ایک ٹرے میں دو بوتلیں اور گلاس لے کر آگیا۔ ٹاڈ نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور بولا۔ ”کاش میں بھی وہ نظارہ دیکھ سکتا۔“

ٹیڈ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ اس بار وہ نہیں بچے گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کیا کررہا ہوں۔“

”اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ کیا کررہے ہو تو وہ کبھی تمہارے بارے میں جان نہ پاتا اور تم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ بہت زیادہ عقل مند اور اسمارٹ ہو۔“

”یقیناً۔“ ٹیڈ نے کہا۔ ”اب تم مجھے الزام دے رہے ہو جبکہ میں نے سارا خطرہ مول لیا۔ جبکہ تمہیں صرف اس سامان کو فروخت کرنا ہوتا تھا اور تم پچھلے چند دنوں سے یہ کام بھی نہیں کررہے تھے۔“

ٹاڈ نے اسے ہاتھ سے خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”تم نے کوئی بو محسوس کی؟“

”کیسی بو؟“

ٹاڈ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر دونوں کمرے میں ٹہلنے لگے۔ وہ بار بار ناک سکیڑ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کررہے تھے۔ جب ٹیڈ صوفے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنی

سانس روک لی۔ شاید ہابس نے لینا کے پرفیوم کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا لیکن ٹاڈ اس سے زیادہ تیز نکلا۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا جہاں اسکائلر ہابس حیرت کے مارے پلکیں جھپک رہا تھا۔

''میں سمجھ گیا تھا۔'' ٹاڈ نے کہا۔ ''یہ کسی تمباکو کی خوشبو ہے۔'' اس نے ہابس کو گردن سے پکڑا اور الماری سے باہر کھینچ لیا اور ٹیڈ سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

ٹیڈ نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں نہیں جانتا لیکن یہ کوئی جانا پہچانا لگتا ہے۔''

دونوں بھائیوں کی پشت دفتر کی جانب تھی اور میرے لیے کارروائی کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکوں۔ مثلاً بیس بال کا بلا، آتش دان کا بیلچہ یا دیوار پر لٹکی ہوئی آرائشی تلوار وغیرہ لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون ہے لیکن یہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔'' ٹاڈ نے کہا۔

مایوس ہو کر میں نے میز پر سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور خاموشی سے لیونگ روم میں داخل ہو گیا گو کہ میں نے پوری احتیاط کی تھی لیکن قدموں کی آہٹ ان تک پہنچ گئی۔ وہ تیزی سے گھومے اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے لیپ ٹاپ اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''اس میں تمہاری حرکتوں کے بارے میں تمام ثبوت موجود ہیں اگر تمہیں اس کی ضرورت ہے تو ہابس کو جانے دو۔''

ٹیڈ نے کہا۔ ''ہابس!'' اور ٹاڈ گھوم کر اسے دیکھنے لگا۔ ہابس کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی، اس نے اپنا گھٹنا ٹاڈ کے جسم کے نازک حصے پر مارا، اور اس کے ساتھ ہی ٹیڈ کے کان پر کہنی سے وار کیا میں نے لیپ ٹاپ صوفے پر رکھا اور اس جنگ میں شامل ہو گیا لیکن ٹیڈ نے تیزی سے میرے گردے پر ضرب لگائی۔ میں نے پلٹ کر اس کے سر پر گھونسا رسید کیا لیکن اس نے جواب میں میرے پیٹ پر لات رسید کی اور مجھے لگا کہ اب میرے لیے اس جنگ میں مزید حصہ لینا مشکل ہے۔

اس دوران ہابس نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹاڈ کو گھن چکر بنا دیا۔ وہ اس کے حملوں سے بچنے کے لیے کبھی کمرے کے ایک طرف جاتا اور کبھی دوسری جانب، اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے کافی ٹیبل کا ایک کونا پکڑ لیا اور اس سے لٹک گیا۔ ممکن تھا کہ ہابس اس پر مزید وار کرتا لیکن لینا نے ٹاڈ کے سر پر ٹیبل لیپ دے مارا، اور وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ٹیڈ نے میرے جبڑے پر ایک اور مکا مارا، اس کے بعد پسلیوں پر ضرب لگائی اور مجھے بالکل بے بس کر دیا۔ اب مجھے فیصلہ کن کارروائی کرنا تھی۔ میں نے لپک کر صوفے پر سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور جیسے ہی گھوما اس نے میرے جبڑے پر ایک اور گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے لیپ ٹاپ سامنے کرلیا۔ اس کا گھونسا لیپ ٹاپ سے ٹکرایا تو کسی چیز کے چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک ضائع ہو گئی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پوری قوت سے گھونسا مارا تھا اور لیپ ٹاپ پر لگنے سے اس کے ہاتھ میں شدید چوٹ آئی ہو۔ جیسے ہی وہ لڑکھڑایا میں نے اس کی ٹھوڑی پر لیپ ٹاپ سے ضرب لگائی اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔

ہابس اور لینا حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''میں حیران ہو رہا ہوں ڈاکٹر۔'' ہابس نے کہا۔ ''میں نے کبھی تمہیں اس طرح طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

جب ہم نے دونوں بھائیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تو لینا نے ہابس پر غصہ اتارتے ہوئے کہا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ میرے پرفیوم کی خوشبو سے وہ ہم تک پہنچ جائیں گے لیکن اب کیا ہوا۔ تمہارے تمباکو کی ناگوار بو نے ہی تمہیں پکڑوا دیا۔''

ہابس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تم سے فضول بحث کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے مادام! البتہ تم سے اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بھائی کو فون کر کے فوراً یہاں بلالو۔''

''میلاجی؟ کیوں؟''

''تم صرف اسے فون کر دو۔'' ہابس نے کہا۔ ''اور اس سے کہنا کہ تم مشکل میں ہو اور اس کی مدد درکار ہے۔ جب تم فون کر چکو گی تو مزید ہدایات دوں گا۔''

لینا نے ہابس کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے بعد ہابس نے اسے کچھ ہدایات دیں۔ دس منٹ بعد ہم دونوں اپنی کار میں بیٹھے میلاجی کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ نظر آیا میں نے نو گیارہ ڈائل کیا اور فون ہابس کو پکڑا دیا۔

''میرا نام میلاجی ہابس ہے۔'' اس نے آواز بدل کر کہا۔ ''اور میں نے ابھی ابھی دو ایسے افراد کو پکڑا ہے جو

بڑے پیمانے پر چوری میں ملوث ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور بولا۔ ''یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میرے پاس ان کے جرائم کے کافی ثبوت موجود ہیں اور میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تم یہاں آکر انہیں اپنی تحویل میں لے لو۔''

اگلی شام حالات معمول پر آگئے۔ ہابس اپنی آرام کرسی پر نیم دراز جرائم سے نمٹنے کی ٹیکنیک کے موضوع پر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا جب مجھے لینا کی طرف سے ایک طویل ای میل موصول ہوئی۔ میں نے ہابس سے کہا۔

''تمہاری ہدایات کے مطابق لینا نے اس کیس میں ہماری شمولیت کے بارے میں میلاجی کو کچھ نہیں بتایا لیکن تم کیوں نہیں چاہتے کہ اسے یہ بات معلوم ہو۔''

''مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، اس میں میری اپنی غرض شامل تھی۔''

''یہ کیسی محبت ہے کہ تم دونوں بھائی آپس میں بات نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''جبکہ فلپس برادرز ایک دوسرے کو بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے ہیں۔''

ہابس نے ناک سکیڑی اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تم بقیہ خبریں سننا نہیں چاہو گے؟'' میں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولا۔ ''مجھے پہلے ہی تازہ ترین پیش رفت کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ تم تو سارا دن اس کرسی سے ہلے تک نہیں۔''

''اس صورتِ حال کا ایک ہی ممکنہ نتیجہ نکلتا تھا جو میں نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر معلوم کرلیا۔''

''تم کہہ رہے ہو تو مان لیتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس ای میل میں کیا لکھا ہے۔''

ہابس نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میرے بھائی کا باس اور اس کیس پر کام کرنے والے فیڈرل ایجنٹس میلاجی کے رول سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے پوسٹل انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دینے کی سفارش کی ہے۔''

''اور تم کیا کچھ جانتے ہو؟''

''تم تو اس کمپیوٹر کو تباہ کرنے والے تھے جس میں سارے ثبوت موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے فلپس کے بھائی کی الماری سے ای میلو کا بیگ مل گیا جن سے ان بھائیوں کی چوری ثابت ہوگئی۔''

''خوش قسمتی.....!'' میں نے طنزیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ ثبوت الماری میں چھپنے سے پہلے حاصل کیے یا بعد میں؟''

اس نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''ٹیڈ کو معلوم ہوگیا تھا کہ میلاجی نے اسے دفتر سے سامان چراتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ جب اس نے اس خدشے کا اظہار اپنے بھائی ناڈ سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ اسے کسی بھی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا بھائی واقعی ان کے جرائم سے واقف ہو چکا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی ساتھی لینا کے لیے پسندیدہ جذبات رکھتا تھا۔''

''اوہ۔ تبھی آج وہ دونوں ڈیٹ پر جا رہے ہیں۔''

ہابس کا چہرہ سفید ہوگیا اور اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میں چاہتا تو اس موضوع پر مزید بات کرسکتا تھا لیکن یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کررہا ہے کہ اس کا بھائی جسے وہ ذہانت میں اپنے سے برتر سمجھتا تھا کسی عورت کی محبت میں گرفتار ہوسکتا ہے۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہابس۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ دو مرتبہ میرے ساتھ ڈیٹ پر چلی جائے تو وہ جان لے گی کہ تمہارا بھائی کس قدر بور شخص ہے۔ ذہانت، خوب صورتی کا متبادل نہیں ہوسکتی۔''

''اور خوب صورتی۔'' ہابس نے تیزی سے کہا۔ ''یقیناً ذہانت کا بدل نہیں ہے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ جیکٹ ٹھیک کی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا جہاں اب بھی چند زخموں کے نشان تھے اور میرا ہونٹ بھی سُوجا ہوا تھا۔

''تم کہیں باہر جا رہے ہو؟'' ہابس نے پوچھا۔

''ہاں، اور تم اپنی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ سے معلوم کرسکتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔''

''اس نے میرے طنز کو نظرانداز کر دیا اور بولا۔

''یقیناً کوئی فضول سی فلم دیکھنے جا رہے ہو۔''

''کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہیں بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہوں اور آج اس ڈاک بانٹنے والی لڑکی امبر کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا ہوں۔ شاید مجھے میری محنت کا اس سے بہتر صلہ نہیں مل سکتا۔''

جوابی چال

امجد رئیس

اس نے ایک خوبصورت چال چلی... مہرہ بھی خوب چُنا تھا جس نے کوئی جرم کیے بغیر بساط پر مات سجادی... شاطر کو خبر تھی نہ مہرے کو بھنک ملی کہ جوابی چال کیا آنے والی ہے... حریف مات کھانے کے لیے آمادہ نہ تھا... اس نے بساط ہی الٹ دی۔

ایک اداکار اور اداکارہ کی مڈبھیڑ...... دونوں ہی بڑے فنکار تھے

وہ آدمی دراز قامت تھا۔ رنگت میں زردی کی آمیزش تھی۔ چہرہ پتھر یلے تاثرات کا حامل تھا۔ اگر جیک دی ریپر پر مووی بنائی جاتی تو وہ اس کردار میں فٹ ہو جاتا۔ مائرنا کلورٹ ہچکچاہٹ کا شکار تھی کہ اسے اندر آنے دے یا نہیں۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ محض ظاہری حالت کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا نا مناسب ہوگا۔

اس نے اپنا نام مور بتایا تھا۔

"مسٹر مور! اندر آجائیں۔" مائرنا نے تاثر سے عاری آواز میں کہا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے راستہ صاف کیا اور دروازہ بند کردیا۔ مور نے اداکارہ کے فرنٹ روم کی نفیس آرائش کا جائزہ لیا۔ مائرنا نے جب اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو مور کا سر غیر محسوس انداز میں نفی میں ہلا تھا۔

"میں نے یہاں آنے میں تاخیر سے کام لیا ہے۔"

وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں نے فقرہ ادا کرنے کے لیے خفیف سی حرکت کی تھی۔ ”مجھے جو کہنا ہے، کہوں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔ تاہم پہلے یہ بتا دوں کہ میں فون پر پوری طرح صاف گوئی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔“

اداکارہ مائرنا کی سبز آنکھیں سکڑ گئیں۔

”یعنی تمہارے پاس ایسی کوئی اطلاع تو نہیں ہے جو میری زندگی اور موت سے متعلق ہو؟“

”نہیں، نہیں... کچھ تو حقیقت ہے۔ ہاں میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا۔“

مائرنا کے دلکش نقوش میں تلخی نمودار ہوئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے لمبے آدمی کو گھورا۔

وہ بولا۔ ”وضاحت کرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟ میں نے تمہارا ہر ڈراما دیکھا ہے... میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ تم ایک حسین تر عورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت اداکارہ بھی ہو۔ اسٹیج پر تم جیسی فنکارہ میں نے پہلے نہیں دیکھی۔“ مور نے کہا۔

”یہ کوئی ٹرک ہے، آٹوگراف لینے کی؟“ مائرنا نے سوال کیا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم مجبوراً، مجھے اصل بات تو بتانا پڑے گی لیکن میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ تمہیں نقصان پہنچانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

اداکارہ نے اظہارِ حیرت کیا۔ ”مجھے نقصان پہنچانے کا سوال کیونکر پیدا ہو گیا؟“

”یہ میرا دھندا ہے۔“ مور کا لہجہ خشک تھا۔ میرا تعلق ایسے گینگ سے ہے جو مخصوص لوگوں کو ختم کرنے کے لیے مجھے معقول ادائیگی کرتا ہے۔“

مائرنا کی آنکھوں میں ہراس کی جھلک دکھائی دی۔

”تم کہنا چاہ رہے ہو کہ کسی نے مجھے ہلاک کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟“

”گینگ نے مجھے یہ کام سونپا ہے۔ اگرچہ میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔“

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر مائرنا نے لب کشائی کی۔ ”میرا کیا تعلق بنتا ہے تمہارے دھندے سے اور درحقیقت کون مجھے ختم کرانا چاہتا ہے اور کیوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”مجھے کام دیا گیا ہے۔ وجہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

مائرنا نے سائڈ بورڈ کے پاس جا کر سگریٹ باکس نکالا۔ ”تم مجھے تفصیل بتانے کا خطرہ کیوں مول لے رہے ہو؟“ مائرنا نے سگریٹ سلگایا۔ ”اور تمہارا اصل نام کیا ہے۔ نیز کیا یہ بات تمہارے گینگ یا ادارے کو ناگوار نہیں گزرے گی؟“

”ان کو اس کی ہوا نہیں لگ پائے گی۔“

”اگر میں پولیس کو فون کر دوں تو کیا ان لوگوں کو پتا نہیں چل جائے گا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا کرو گی۔ دوسرے میں تمہیں اس بات کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔“ مور کا چہرہ کرختگی اختیار کر گیا۔

مائرنا نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”تم یہ سب باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ تم میرے ایک بڑے مداح ہو؟“

”حقیقت کچھ اس سے زیادہ ہے، مس مائرنا۔“

”اوہ، وہ کیا ہے؟“

”میں پانچ برس سے تمہاری محبت میں مبتلا ہوں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ فاصلے کی محبت ہے، اس میں کوئی آلودگی نہیں... نہ میں نے کبھی تم سے ملنے کی کوشش کی۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تم دوبارہ میری شکل نہیں دیکھ سکو گی۔ میں تمہیں ختم کرنا نہیں چاہتا۔“

کچھ دیر مائرنا اس کے الفاظ کو تولتی رہی۔ ”میں خوشی اور خوش فہمی دونوں محسوس کر رہی ہوں اور خوش قسمتی بھی۔ لیکن تم مجھے ایک ماہر قاتل دکھائی دیتے ہو؟“

”ہاں میں ایسا ہی ہوں۔“ مور کی آواز میں پھر خشکی در آئی۔

مائرنا نے بے چینی سے ایک طویل کش لیا اور سگریٹ بجھا دیا۔ ”تمہاری ڈیوٹی ہے کہ تم مجھے ختم کر دو۔ تم بظاہر ایسا کرنا نہیں چاہتے... پھر منصوبہ کیا ہے؟“

”مجھے جو کام سونپا گیا ہے، اس میں ایک شق ہے۔“ وہ رک کر پھر بولا۔ ”اگر تم آج رات کی فلائٹ سے یورپ چلی جاؤ تو تمہیں ختم کرنے کا فیصلہ بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ڈیوٹی نبھانے پر مجبور ہوں گا۔“ اس کی آواز میں تکلیف کا ہلکا سا عنصر ابھر کر غائب ہو گیا۔ تاہم مائرنا نے محسوس کر لیا۔ اس کے ہونٹ لرز اٹھے۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

”میکس فرزنا“ مائرنا نے ناگواری سے کہا۔ ”میں

جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے متنفر ہے۔ لیکن وہ اس حد تک چلا جائے گا... وہ پاگل ہوگیا ہے۔"

"میں میکس فرزکو نہیں جانتا۔ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"تمہارے گینگ کو پتا ہوگا۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ میکس نے تمہارے گینگ کے ذریعے تمہیں ہائر کیا ہے۔"

"کیوں؟"

"میں اس کے نئے ڈرامے میں لیڈنگ رول کررہی ہوں...... جبکہ وہ لیون جورڈن کو سائن کر چکا ہے۔ اگر میکس مجھے راستے سے نہ ہٹا سکا تو لیون اس پر مقدمہ کر دے گی۔ میرا نام پہلے مشتہر ہو چکا تھا۔ میں اس کے لیے لیون سے زیادہ مصیبت کھڑی کرسکتی ہوں۔" مائرنا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں نے پڑھا تھا کہ تم فرانس میں مووی رول پلے کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔" مور نے کہا۔

"وہ رول اتنا جاندار نہیں ہے۔ میکس کے ڈرامے میں میرا لیڈنگ رول تہلکہ مچادے گا۔" میکس جانتا ہے کہ میں فرانس نہیں جارہی...... اگر اس نے آج شام تک میرے حق میں فیصلہ نہیں کیا تو میں لیون کے بارے میں اس کی بیوی کو بتاؤں گی اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا بتاؤں گی۔" مائرنا تلملا کے بولی۔

مور نے دلچسپی سے مائرنا کو دیکھا۔ "تم اسے بلیک میل کرو گی؟"

"یہ کٹ تھروٹ بزنس ہے۔ ٹاپ پر رہنے کے لیے مستعد رہنا پڑتا ہے۔ میں نے یہ مقام محنت سے حاصل کیا ہے جبکہ لیون نے کنٹریکٹ، میکس کے بستر میں حاصل کیا تھا۔ میں جو کچھ کروں یہ قطعی جائز ہوگا۔" مائرنا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "براڈوے تھیٹرز میں انسانی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے اوپر نہیں جایا جاسکتا۔ لیکن میں نے یہ کرکے دکھایا ہے۔ یہ میرا حق ہے اور میں کوئی سمجھوتا نہیں کروں گی...... اگر میکس سیدھے راستے پر نہ آیا تو اسے سبق سکھانے کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

مور نے کندھے اچکائے۔ "بہرحال اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں بہرحال میری پوزیشن سمجھنی چاہیے۔ تمہاری اصل پریشانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر میں اپنا کام سرانجام نہیں دیتا تو میرے لیے شدید مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔ گینگ ظاہر ہے رقم پکڑ چکا ہوگا۔ میں انکار کرکے خطرات خرید بھی لوں تو وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے کسی اور کو بھیج دیں گے۔" مور نے صورت حال کی وضاحت کی۔

مائرنا کے چہرے کی سرخی، زردی میں تبدیل ہونے لگی۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

مائرنا نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے کمزور آواز میں سوال کیا۔

''ایک ہی راستہ ہے جو مجھ سمیت سب کے مسئلے حل کر دے گا۔ ہاں، البتہ کیریئر کے اعتبار سے تم کسی حد تک نقصان میں رہو گی۔ لیکن یہ جان سے قیمتی نہیں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''تم فرانس کی فلائٹ پکڑ لو۔ میں اس بات کی رپورٹ گینگ کو کر دوں گا۔ تمام مسئلے ختم ہو جائیں گے۔'' مور نے سپاٹ آواز میں حل پیش کیا۔

''اور میں اس طرح، براڈوے میں لائف ٹائم چانس کھو دوں؟''

مورشانے اچکا کر رہ گیا۔ ''قبرستان میں رہ کر کوئی سپر اسٹار نہیں بن سکتا۔''

مائرنا نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے سگریٹ پھونک رہی تھی۔

اچانک وہ رک گئی۔ ''اگر میں تمہیں باڈی گارڈ رکھ لوں؟''

''صریحاً خودکشی ہوگی۔ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔'' مور نے سنجیدگی سے صاف جواب دیا۔

مائرنا نے ایک اور سگریٹ نکالا پھر رک گئی۔

''تمہارے خیال میں کوئی چانس؟''

''نو چانس۔''

''میں فلائٹ پکڑ لوں تو سب ٹھیک رہے گا؟'' وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''ہاں۔'' مور نے بے تاثر آواز میں کہا۔ ''تم فرانس جا کر موی میں حصہ لو۔ تمہارے اندر صلاحیت ہے، تم آگے بڑھ سکتی ہو۔ براڈوے، میکس اور لیون کو جہنم میں جھونکو۔ زندگی کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کرو۔''

''ہاں جہنم میں جھونکو۔'' مائرنا کے لبوں پر خفیف سی ناقابلِ فہم مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ اس کے چہرے کے نارمل تاثرات لوٹ آئے۔ آل رائٹ... اپنے آدمیوں کو بتا دو کہ میں فرانس جا رہی ہوں۔''

''مجھے تم سے اسی دانشمندی کی توقع تھی۔'' مور نے نرمی سے کہا۔ ''تمہارے فیصلے نے ہم دونوں کی پریشانی ختم کر دی ہے۔ مجھے اظہارِ تشکر میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں... یہ میری چاہت کا معاملہ تھا۔ ورنہ میں ماضی کی طرح آتا اور کام ختم کر کے چلا جاتا۔ ایک بار پھر شکریہ۔''

☆☆☆

دراز قامت، زرد رو شخص جب میکس کے دفتر میں داخل ہوا تو چکنے سر والے پروڈیوسر کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ امید و بیم کی کیفیت تھی۔

''کام بن گیا، جان؟'' میکس کا پہلا سوال تھا۔ لمبا آدمی ایک آرام دہ نشست پہ براجمان ہو گیا اور میکس کی بے قراری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟'' میکس کی بے چینی بڑھ گئی۔

جان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے وقت کا بہترین گینگسٹر اداکار تھا۔ مائرنا نے فرانس کے لیے فلائٹ پکڑ لی ہے۔''

''اس نے تمہیں پہچانا تو نہیں؟'' میکس نے دوسرا سوال کیا۔

جان نے منہ بنایا۔ ''احمقانہ سوال ہے۔ دروازہ کھلنے اور اندر جانے کے پانچ منٹ کے اندر میں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ مجھے اصلی اجرت یافتہ قاتل سمجھ رہی ہے... اور وہ پہچانتی بھی کیسے؟ اسے صرف براڈوے سے دلچسپی ہے۔ مزید یہ کہ براڈوے تھیٹر میں اسے زیادہ سے زیادہ آٹھ برس بیتے ہوں گے۔ جبکہ میں کلیولینڈ تھیٹر میں شو کرتا تھا۔ وہ بھی دس برس پرانی بات ہے۔''

میکس نے سکون کی سانس لی۔ ''وہ میری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ اس کے پاس میری اور لیون کی ٹیپس تھیں۔''

''ایسا ہے تو وہ فرانس سے بھی ریکارڈنگ تمہاری بیوی کو ارسال کر سکتی ہے؟'' جان نے کہا۔

''فی الحال تو خطرہ ٹل گیا ہے لیکن تمہاری کیا رائے ہے؟''

''تو کسی اور کے ذریعے خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔''

''نہیں...... نہیں...... یہ میرے بس میں نہیں ہے۔''

میکس نے چندیا پر ہاتھ پھیرا۔

''بہرحال میں نے جو ڈراما کیا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ یہ حرکت نہیں کرے گی۔ اسے فرضی گینگ نے خوف زدہ کر دیا ہے۔ لیکن تمہاری بھی غلطی ہے۔ اگر تم پوری بات مجھے بتا دیتے تو میں وہ ٹیپ بھی وصول کر لیتا۔'' جان نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا تم ائرپورٹ تک نہیں جا سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آخری وقت میں ارادہ بدل دے۔''

''ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔'' جان نے گھڑی دیکھی۔

''جیسے ہی مجھے اطلاع ملی کہ وہ فلائی کر چکی ہے۔ سمجھو کہ آنے والے ڈرامے میں تمہارا پارٹ پکا ہے۔ اب

براڈوے تھیٹرز کے مزے بھی لے ہی لو۔"

☆☆☆

"کس قسم کا پیغام ہے؟" میکس نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ مجھے بذاتِ خود تمہیں دینا ہے۔" اجنبی کی آواز آئی۔ "کیا میں اوپر نہیں آسکتا؟" آواز نرم اور پُرسکون تھی۔

"ٹھیک ہے، آجاؤ۔" میکس نے کہا۔

"پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں، شکریہ۔"

پانچ منٹ بعد ڈور بیل کی آواز آئی۔ میکس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک درمیانی عمر کا فربہی مائل آدمی کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ عام اور بے ضرر...

"مسٹر میکس؟"

"ہاں، تم اسمتھ ہو؟"

اسمتھ نے سر ہلا کر جواب دیا۔ میکس نے اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ اسمتھ نے کمرے کا جائزہ لیا۔

"یہاں تنہا رہتے ہو؟" اسمتھ نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"ہاں، کیا پیغام لائے ہو؟"

"کچھ پینے کو ملے گا؟" اسمتھ نے اس کا سوال نظرانداز کر دیا۔

"ہاں، بیٹھ جاؤ۔" میکس نے جیسے بادلِ ناخواستہ کہا اور فریج کی جانب بڑھ گیا۔

"ہاں، کیا پیغام ہے کس نے بھیجا ہے۔ کوئی سفارش وغیرہ؟" میکس نے جام سجا کر اسمتھ سے سوال کیا۔

اسمتھ مسکرایا۔ "مس مائرنا تمہاری حرکت سے بہت برہم ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

میکس نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تاہم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نہیں سمجھا تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟"

"تم نے اسے مارنے کے لیے ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کیں، مسٹر میکس! مائرنا کو پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ وہ محض اس لیے اسے قتل نہیں کرے گا کہ وہ اس کا پرانا مداح تھا۔ ساری کہانی تمہیں پتا ہے۔ دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے سرکل میں کسی مور نامی ہٹ مین کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم نے کس کو ہائر کیا تھا۔ بہرحال تمہارا کام ان معنوں میں تو ہو گیا کہ مائرنا، فرانس کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے..."

"تم بے معنی باتیں کر رہے ہو جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ کسی پیشہ ور قاتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" میکس نے اسی طرح سپاٹ آواز میں کہا۔

"دائیں بائیں ہونے سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ویسے بھی مجھے تمہیں قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مس مائرنا نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں بتادوں کہ وہ بھی کوئی لاوارث نہیں ہے، تم نے پگولٹی کا نام تو سنا ہوگا؟"

"تم ایک جرائم پیشہ شخص کا نام لے رہے ہو۔"

"ہاں۔" اسمتھ نے سر ہلایا۔ "پگولٹی مائرنا کے اَن گنت پرستاروں میں سے ایک ہے اور متعدد مردوں کی طرح مائرنا کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر پگولٹی کو مائرنا کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے میں خوشی ہوئی ہوگی۔ اس نے ایک ادارے کے ذریعے مائرنا کو مجھ سے ملوا دیا۔"

"تم کس ادارے کی بات کر رہے ہو؟" میکس نے خوف محسوس کیا۔ اس کی آواز کا سپاٹ تاثر ٹوٹ چکا تھا۔

"ہم ادارے کی تشہیر نہیں کر سکتے۔ اتنا سمجھ لو کہ وہ بھی ایسا ہی کوئی گینگ ہے، جیسے مور کسی گینگ کی نمائندگی کرتا ہے......کیا سمجھے؟"

"میں کسی مور کو نہیں جانتا۔" میکس کا چہرہ لٹک گیا۔

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مائرنا سخت مشتعل ہے اور وہ تمہارا اور تمہارے ہی انداز میں لوٹانا چاہتی ہے۔ ہم لوگ عموماً اپنے کام کی وضاحتیں پیش نہیں کرتے لیکن مس مائرنا کی خواہش تھی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے جا رہا ہے، اس کا بیک گراؤنڈ تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" اسمتھ کی مسکراہٹ زہرخند میں تبدیل ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔

میکس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ "میں کچھ نہیں سمجھا؟" اس نے مری مری آواز میں کہا۔

"تم سب سمجھ رہے ہو۔" اسمتھ نے گن کا سائلنسر چیک کیا۔

میکس سکتے کے عالم میں اسے گھور رہا تھا۔ اس نے مائرنا کو ڈرانے کے لیے محض ایک اداکار کو ہائر کیا تھا۔ جبکہ مائرنا نے اصل قاتل ہائر کر لیا تھا۔

اسمتھ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میکس سب سمجھ گیا تھا۔ اس کی چال اسی پر الٹ گئی تھی۔

◆

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

جواری

احمد اقبال

اٹھارھویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

بظاہر اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے مگر میں نے جھک کر اسے پھر آواز دی۔ ''رمضان۔''

قبر کی سائڈ سے مٹی کھسکی اور اس کے ساتھ ہی میرے پیر... یوں لگتا تھا جیسے قبر مجھے کھینچ رہی ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر اس بچے کو دیکھا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ وہ خاموشی سے غائب ہو گیا تھا۔

خطرے کے احساس کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ میرا ذہن ان معاملات کی پُراسراریت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ پہلے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ایک خواب جیسا منظر دیکھ کے مجھے خوف زدہ ہونے اور یوں سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہونے کی ضرورت نہ تھی لیکن خوف ایک بار پھر احساس پر غالب آرہا تھا۔ رمضان کی زندگی کا یقین کرنے کے لیے مجھے قبر کے اندر اترنا پڑتا مگر اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مرا نہ ہوتا تو قبر میں کیوں ہوتا۔ یہ تصور کرنا کہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ گھر سے بھاگا اور یہاں آکے چھپ گیا۔ چھپنے کے لیے اسے جگہ کی کیا کمی تھی۔ خود اپنی مرضی سے کون مردے کی طرح قبر کی گہرائی میں سوتا ہے۔

اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہاں گھنے درختوں میں سائے زیادہ تاریک تھے۔ چھٹی حس ایک بار پھر مجھے خبردار کر رہی تھی۔ اس معصوم بچے کا کردار بھی اب مجھے مشکوک لگنے لگا تھا۔ وہ سیدھا مجھے یہاں کیسے لے آیا جیسے یہ رمضان کا گھر ہو۔ اس کا معصوم ذہن کسی سازش میں استعمال ہوا تھا۔ گاؤں کے غریب بچے کے لیے پانچ دس روپے بھی بڑی دولت تھی۔ پھر اسے جیسا کہا گیا، اس نے وہی کیا۔ چاروں طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ خواب کا منظر مجھے یاد آرہا تھا۔ مجھے پولیس نے گھیر لیا تھا۔ یہاں ابھی تک مجھے پولیس دکھائی نہیں دی تھی۔ خطرہ بہرحال اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا۔

اچانک نیم تاریکی میں ایک پتھر اُڑتا ہوا آیا اور میری ناک کے سامنے سے گزر گیا۔ نشانہ یقیناً میرا سر تھا۔ میں نے اسی سمت میں فائر کیا تو جواب میں فائر آیا۔ بے اختیار میں قبر میں گر گیا اور تب مجھے رمضان کے وجود میں زندگی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم لاش کی طرح اکڑا ہوا سخت اور ٹھنڈا نہیں تھا۔ مجھے کہیں قریب سے انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس تین فٹ چوڑی جگہ میں یہ کام مشکل تھا مگر میں نے رمضان کو کھینچ کر بٹھایا اور خالی جگہ میں خود بیٹھ کر اسے اپنے اوپر ڈال لیا۔ وہ سو فیصد زندہ تھا۔ ورنہ کسی لاش کو ایسے اٹھانا اور لٹانا ممکن نہ ہوتا۔ اب نیچے میں تھا اور میرے اوپر رمضان۔ اس کا دبلا پتلا میرے مقابلے میں بوڑھا جسم زیادہ وزنی نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ بڑی مشکل میں گزارے۔

نیچے سے میری کمر میں کنکر چبھ رہے تھے۔ دونوں طرف قبر کی دیواروں سے مٹی جھڑ رہی تھی اور گہرائی کی خنکی میری ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ نیچے سے چیونٹے میری گردن پر چڑھ چکے تھے اور اب گریبان کے راستے سینے اور پیٹ پر چل رہے تھے۔ یہ احساس بڑی دہشت رکھتا تھا کہ میرے مردہ جسم کو ایک دن ایسے ہی قبر میں لٹایا جائے گا اور لٹانے والے میرے اپنے ہوں گے جو جلد از جلد مجھ پر مٹی ڈال کے جانا چاہیں گے۔

ایک آواز نے بہت قریب سے سوال کیا۔ ''کہاں گیا...؟''

جملے کے آخر میں جو گالی تھی، وہ غصے، حیرانی اور جھنجلاہٹ کا نتیجہ تھی۔ میں نے سانس بھی روک لی۔

جس سے سوال کیا گیا تھا، وہ کیا جواب دیتا۔ ''پتا نہیں، گولی تو لگی تھی۔''

پہلے نے اسے براہِ راست گالی دی۔ ''گولی لگی ہوتی تو یہاں مرا نہ پڑا ہوتا۔ دیکھ، خون ہے کہیں، جھک کے دیکھ۔'' پہلا شخص سخت مشتعل تھا۔

''ہاں... خون تو خیر نہیں ہے مگر تم بھی دیکھ رہے تھے اور ریوالور تو تمہارے پاس بھی تھا۔''

''یہی تو غلطی کی میں نے کہ تیرے نشانے پر اعتبار کیا۔''

''تم نے بھی تو پتھر مارا تھا سامنے سے... گولی تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔'' دوسرا منمنایا۔

بات مکمل ہونے سے پہلے اس کے جھانپڑ پڑا جس کی آواز بھی میں نے سنی۔ ''بکواس بند کر، ایک گولی تھی، وہ بھی ضائع کر دی۔''

''شیدے مارتا کیوں ہے، جو میرا کام تھا میں نے کر دیا تھا۔ میرا لڑکا اسے یہاں لے آیا تھا۔''

''اب اس اندھیرے میں وہ کہاں ملے گا، بھاگ گیا ہوگا۔ دوبارہ کیوں آئے گا اِدھر؟'' پہلا بولا جسے شیدے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا یقیناً رشید اس کا اصل نام ہوگا۔ ''یہ نہ ہو وہ کہیں چھپا بیٹھا ہو۔ الٹا ہمیں نشانہ بنالے اور دیکھ مانی... خبردار جو کسی کے سامنے کوئی بات کی۔'' شیدے کا لہجہ اب قدرے مصالحانہ ہو گیا تھا۔

''میں پاگل ہوں، میرے پانچ ہزار دے...

ابھی...‘‘

’’کس بات کے پانچ ہزار دوں؟ پاگل کے بچے... ایک لاکھ ملتے مجھے تو پانچ ہزار تجھے بھی مل جاتے... چل...‘‘

’’یہ سب میں نہیں جانتا۔ میں نے تو اپنا کام پورا کیا۔‘‘ اس کی آواز کچھ فاصلے سے آئی۔

دوسرے نے یعنی شیدے نے کیا کہا مجھے سنائی نہیں دیا۔

میں نے بڑا سخت وقت گزارا تھا۔ چیونٹے مجھے کاٹ رہے تھے۔ شاید مردہ سمجھ کے میرا گوشت چکھ رہے تھے اور خون پی رہے تھے۔ کیونکہ میں زندہ تھا، بوجھ سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میرے جسم کا ہر حصہ اکڑ گیا تھا۔ میں نے لاش کی طرح اوپر پڑے رمضان کو اٹھایا اور پھر خود بھی اٹھا۔ اتنی کم جگہ میں یہ آسان نہ تھا۔ رہی سہی قوت کی مدد سے میں نے پہلے رمضان کو باہر ڈالا اور پھر خود قبر سے نکلا اس جدوجہد میں مزید مٹی مجھ پر گری۔ مٹی کا ذائقہ میرے منہ میں محسوس ہونے لگا اور میری سانس میں دھول بھر گئی۔ باہر نکل کے کھلی ہوا میں لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے بہتر محسوس کیا تو رمضان کی طرف متوجہ ہوا۔

اب اس کا جسم مجھے کچھ سرد لگا۔ شاید یہ کھلی ہوا کا اثر تھا۔ میں نے سوچا لیکن پھر تصدیق کرنے پر میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اب رمضان زندہ نہیں تھا۔ روح کے پرواز کر جانے کے بعد اس پر موت غالب آچکی تھی۔ صدمے اور دہشت سے میرا برا حال ہو گیا۔ میری آخری امید یہی شخص تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ زندہ تھا۔ میرے نمودار ہونے کے بعد کیا ہوا کہ کسی نے اسے مار کے قبر میں پھینک دیا۔ وہ فوراً نہیں مرا تھا۔ شاید اسے زہر دیا گیا تھا یا کوئی ایسی دوا جس کا اثر کچھ دیر بعد ہوا تھا۔

رمضان کی ڈرامائی موت سے دوچار ہونا میرے لیے ایک ذہنی شاک تھا جس نے مجھے خود اپنے تحفظ کے خیال سے بیگانہ کر دیا۔ مجھے صدمہ بھی تھا کہ میرے اور فاطمہ کے درمیان یہی شخص رابطے کا ذریعہ بن سکتا تھا جو اب نہیں رہا۔ اس کی لاش کو وہیں پڑا چھوڑ دینا ایک مجبوری تھی۔ قانون کا تقاضا تھا کہ میں اس کی موت کے حالات کی رپورٹ لکھواؤں۔ یہ اس لیے ناممکن تھا کہ میں خود قانون کی نظر میں ایک مفرور مجرم تھا اور ملک سلیم اختر بن جانے کے باوجود پہچان لیے جانے سے ڈرتا تھا۔

شرافت اور انسانیت کا تقاضا تھا کہ میں قریبی گاؤں میں کسی کو بتاؤں اور گاؤں والے اس کے کفن دفن کا بندوبست کریں لیکن وہ بھی دس سوال کرتے کہ تم کون ہو؟ قبرستان میں کیا کر رہے تھے۔ وہ تو عام گزرگاہ نہیں ہے۔ یہ سب سوچ کے میں نے بوجھل دل کے ساتھ رمضان سے رخصت لی۔ اپنے حساب سے وہ بہت جی لیا اور اس جیسے شخص کو عزت کی موت نہیں مل سکتی تھی جو زندگی میں کبھی باعزت نہیں رہا تھا۔

میں نے دل کو تسلی دی کہ رمضان کا بھانجا شاید زندہ ہو جو مجھے فاطمہ یعنی نورین کے بارے میں کچھ بتا دے۔ ورنہ اس کہانی میں ابھی ابھی دو کردار شامل ہوئے تھے۔ شیدا اور مانی۔ رمضان کے ساتھ ان کی دشمنی سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن ایک نے پتھر مار کے میرا سر پھاڑنے کی کوشش کی تھی اور دوسرے نے مجھے گولی مارنے کی۔ ان کے پاس ایک ہی ریوالور تھا جو شیدے کا تھا اور اس نے نامعلوم وجہ کی بنا پر مانی کے حوالے کر دیا تھا۔ کیا اس لیے کہ بعد میں مانی کو مجرم بنا دے؟

میں واپس چل پڑا۔ اندھیرے میں واپسی کے لیے میں نے اندازے سے وہ راستہ اختیار کیا جو مجھے جنگل میں اپنی گاڑی کی طرف لے جاتا۔ یہاں بھی ٹاہلی (شیشم) کے درخت زیادہ تھے۔ اندھیرا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں ٹھوکریں کھاتا، سنبھلتا اپنے حساب سے ایک ہی سمت میں چلتا گیا۔ پھر جیسے مجھ پر پہاڑ گر گیا، کسی درخت پر سے کوئی ریچھ کی جسامت کا جانور مجھ پر آ گرا۔

میں اس ناگہانی آفت کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ گرتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی جنگلی جانور نہیں ہے۔ بھاری وجود کا میرے جیسا انسان ہے۔ میں نیچے گرا، زمین پر کنکر پتھر اور خشک ٹہنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میرے سنبھلنے سے پہلے حملہ آور کے ہاتھ میری گردن دبوچ چکے تھے۔ یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی پھر میں نے جسم کو جھٹکا دے کر کروٹ لی اور اس شخص کو نیچے گرا کے خود اس کے اوپر آ گیا۔

اپنے نادیدہ دشمن کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ شیدا ہو گا۔ میرے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے کے بعد وہ دونوں فرار نہیں ہوئے تھے۔ وہ مجھے قبرستان کے علاوہ گرد و نواح کے جنگل میں تلاش کر رہے تھے۔

مجھے صرف بس اتنی ہی مہلت ملی۔ مہلت ملتی تو نہ جانے میں کیا کرتا۔ حملہ آور کی گردن توڑ دیتا یا اسے معذور کر کے پوچھتا کہ وہ کون ہے اور کیوں میرا دشمن ہو رہا ہے۔ لیکن کسی بھی سوال کی نوبت آنے سے پہلے ہی پیچھے سے میرے

سر پر ڈنڈا پڑا اور میں وہیں گر گیا۔ میں بھول گیا تھا کہ شیدے کا ساتھی مانی بھی ہے۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو کچی دیواروں والے ایک کمرے میں پڑا ہوا دیکھا۔ میں فرش پر دیوار کے ساتھ تھا اور میرے ہاتھ پیر مضبوط رسی سے باندھے گئے تھے۔ مخالف گوشے میں دیوار سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی اور اس کے اجالے میں بان کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ مجھے یوں نظر آرہا تھا جیسے کمرے میں دھواں بھرا ہوا ہو۔ یہ چوٹ کا اثر تھا جو ہنوز پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر میں منظر واضح ہوگیا۔ وہ بھاری جسم کا شاید پچاس سال سے اوپر کا آدمی تھا جس کا پیٹ نکلا ہوا تھا اور سر گھٹا ہوا تھا۔ اس نے موٹے کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا اور کھڈی کے بنے ہوئے چارخانے کے ڈیزائن کی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ اپنے چہرے کے کرخت نقوش اور نکیلی مونچھوں کے ساتھ وہ پہلوان بھی ہوسکتا تھا اور مقامی بدمعاش بھی۔ وہ چارپائی کی پٹی سے پاؤں لٹکائے حقہ تھامے بیٹھا تھا۔ سر جھکا کے اس نے ایک کش لیا۔ حقے میں گڑگڑاہٹ ہوئی اور اس نے منہ سے بھاپ جیسا دھواں خارج کیا۔

''شیدے!'' میں نے لہجے کی کمزوری پر قابو پا کے کہا۔ ''مجھے کیوں لائے ہو یہاں؟''

وہ بری طرح چونکا جس سے تصدیق ہوگئی کہ وہی شیدا تھا مگر جواب دینے کے بجائے، وہ مجھے گھورتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے کیوں باندھ کے ڈالا ہوا ہے یہاں؟ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔''

''بکواس کرتا ہے...'' اس نے مجھے گالی دی۔ ''تو نام بھی جانتا ہے میرا۔''

''یہ نام میں نے مانی سے سنا تھا۔''

اسے حیرانی کا دوسرا جھٹکا لگا۔ ''تو مانی کو بھی جانتا ہے۔''

''اس نے قبرستان میں تمہارا نام لیا تھا اور مجھ پر گولی بھی چلائی تھی۔ ایک گولی اور ہوتی تو تم مجھے مار ڈالتے۔''

''اوئے سیانے... مارنا ہوتا تو تیرے گلے پر چھری پھیر دیتے۔'' اس نے جیب سے ایک گراری والا چاقو نکالا اور اسے کھولا تو کڑکڑ کی آواز کے ساتھ خنجر کی مدھم سی چمک نظر آئی۔ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی جو اس نے مجھے خوف زدہ رکھنے کے لیے کی مگر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔

''آخر تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

''دشمنی تو کوئی نہیں میری۔'' اس کے منہ سے یہ بات بلاارادہ نکل گئی تھی۔ اس نے رک کر کہا۔ ''فالتو باتیں مت کر۔''

''مجھے پانی تو پلا دو اور بھوک بھی لگی ہے مجھے۔''

''ادھر کچھ نہیں ہے، صبح تک چپ کر کے پڑا رہ۔''

''اچھا مجھے سیدھا بٹھا دو۔ دیوار کے سہارے، تمہیں اپنی ماں کا واسطہ... ورنہ اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔''

یہ جذباتی اپیل کارگر ثابت ہوئی۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ شاید وہ ہنس پڑتا۔ دانت پیس کر زیرِلب گالیاں دیتا وہ اٹھا اور اس نے مجھے کھینچ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ میں نے خاصا بہتر محسوس کیا اور اس سے کہا۔ ''بڑی مہربانی شیدے پہلوان۔''

وہ لوٹ کر چارپائی کی طرف جاتے جاتے رکا اور پلٹ کر مجھے گھورنے کے بعد پھر حقہ پینے بیٹھ گیا۔ حقہ شاید ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اس نے کش کے بعد منہ سے دھوئیں کے بجائے ایک اور گالی نکالی۔ میرا دوسرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ پہلوان بھی تھا۔

''صبح کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ غرایا۔ ''تیرا باپ آئے گا اور تجھے لے جائے گا۔ پراٹھے بھی کھلائے گا گرم گرم اور مکھن کے پیڑے والی لسی لائے گا۔''

میں نے سادگی سے کہا۔ ''تمہاری طرح میرے بھی ماں باپ نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے پہلے بھی ایسا کام نہیں کیا پہلوان۔''

''کیسا کام؟''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ پہلوانی کی عمر گزر جاتی ہے تو کرنے کو کچھ نہیں رہتا۔ نیا رستم آجاتا ہے کوئی تو پرانے کو سب بھول جاتے ہیں۔ گزارا مشکل ہو جاتا ہے بندے کو اور کوئی کام نہیں آتا۔ دھی، پتر جوان ہو جاتے ہیں... پتر آج کل کے نکمے مگر بیٹیوں کا کیا کرے بندہ۔ نہ انہیں گھر سے نکال سکتا ہے نہ بھوکا مار سکتا ہے۔''

میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھا۔ ''تو چپ نہیں رہ سکتا؟''

''میرا مطلب تھا، بندہ مجبور ہو کے غلط کام کرتا ہے۔ پہلوانی چھوڑ کے بدمعاشی پر اتر آتا ہے، کیا کرے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا پہلے۔''

''اور آئندہ بھی نہیں کرو گے مجھے پتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ تمہیں مجبور کر دیں گے پھر... بلیک میل

کریں گے تمہیں، بلیک میل سمجھتے ہو؟ تم سے کہیں گے کہ تم نے ان کی بات نہ مانی...''

''کون سی بات؟'' وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھا تھا۔

''فرض کرو، وہ تم سے کہیں کہ تم نے ان کے کہنے پر دوسرا غلط کام نہ کیا تو وہ پولیس کو بتا دیں گے کہ رمضان کو تم نے قتل کیا تھا۔''

وہ اچھل پڑا۔ ''رمضان کو؟ اوئے اس کی میری کون سی دشمنی تھی اور پھر وہ بڈھا آدمی...''

''تم نے اسے قتل نہیں کیا؟ چلو مان لیتا ہوں مگر جب وہ کہیں گے تو پولیس ان کی مانے گی اور تمہیں پکڑ لے گی۔ وہ گواہ بن جائیں گے۔ تم کو پھانسی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کی بات مانو گے تو وہ پھر پیسا دیں گے۔ جیسے اب دیا ہے اور تم بھی لالچ میں پڑ جاؤ گے۔ تمہاری میری بھی کوئی دشمنی نہیں مگر انہوں نے پیسا دیا۔ دس ہزار، بیس ہزار...''

''کوئی پیسا نہیں دیا ابھی...'' وہ چلایا۔

''اوہو ہو... یہ زیادہ برا ہوا۔ پیسا وصول کیے بغیر یہ کام کیا۔ واقعی بہت بے وقوف ہو پہلوان۔ اب سمجھ لو کہ مجھ سے پہلے وہ تمہارا کام تمام کریں گے۔'' میں گلے پر چھری پھیرنے کا ایکشن نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی آواز نکالی۔ ''ورنہ ایک گولی تمہارے لیے بھی... ان کا پیسا بھی بچ جائے گا۔''

''بکواس کرتا ہے تو... وہ نیک لوگ ہیں۔'' وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود چلایا۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ پہلوان میرے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ ایک قہقہہ لگا کے میں نے کہا۔ ''نیک لوگ؟ ایسے کام کراتے ہیں نیک لوگ؟ کون ہیں وہ؟''

''میں... میں نہیں بتا سکتا۔ انہوں نے قسم لی ہے... اور...''

''اور دھمکی بھی دی ہے؟ یہ کہا ہے کہ تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیں گے۔''

''کتے کی طرح مت بھونک... وہ ایسے لوگ نہیں ہیں... بہت پہنچے ہوئے بندے ہیں۔''

اچانک میرے دماغ میں جیسے کھڑکی سی کھل گئی۔ وہ منظر جو ابھی تک بے یقینی کی تاریکی میں تھا، میری نظر میں روشن ہو گیا۔ ''وہ پیر سائیں کے مرید ہیں؟ درگاہ کے مجاور جو تباہ ہو گئی؟''

وہ ہکلایا۔ ''نہیں... نہیں تو... وہ شہر کے بدمعاش ہیں۔''

میں نے یقین کی قوت کے ساتھ کہا۔ ''جھوٹ بول رہے ہو تم پہلوان... انہوں نے کہا ہو گا کہ تم نے حلف کی پاسداری نہ کی تو تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو گا۔ تمہاری بیٹی پر جن آ سکتے ہیں پھر وہ بھی اپنے گھر نہیں جائے گی۔''

پہلوان کی حالت غیر ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پکڑ لی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''دیکھو پہلوان... تم مجھے نہیں جانتے... تم کبھی شہر میں نہیں رہے، دیکھے ہوں گے تم نے ملتان اور لاہور جیسے شہر... مگر تمہاری زندگی یہاں گزری ہے جیسے تمہارے ماں باپ کی گزری تھی۔ تم پہلوان تھے۔ آس پاس کے علاقے میں تمہارے مقابلے کا کوئی نہ تھا۔ بہت دنگل جیتے ہوں گے تم نے... لوگوں نے تمہیں کندھے پر اٹھایا ہو گا اور بہت نذرانے دیے ہوں گے۔ انعام ملے ہوں گے۔ میں شہر کا آدمی ہوں۔ بہت پڑھا لکھا اور میں نے پاکستان کے باہر کی دنیا بھی دیکھی ہے۔''

''دیکھی ہو گی۔ مجھے کیوں بتا رہا ہے۔''

''اس لیے کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم جن لوگوں کے جال میں پھنس گئے ہو، وہ تمہاری مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کو تم نیک لوگ کہہ رہے ہو، میں ان کی حقیقت جانتا ہوں۔ تم کو بیٹی کی شادی کرنی ہے پیسے کی ضرورت ہے لیکن پہلوان ہو گا وہی تمہارے ساتھ جو میں نے بتایا۔ وہ تمہیں ایک پیسا نہیں دیں گے ایک گولی ماریں گے اور پھر خود سوچ لو کہ تمہاری بیوی اور بیٹی کا کیا ہو گا۔''

وہ بری طرح ڈر گیا۔ ''پھر میں کیا کروں؟ محرم کے بعد میری بیٹی کی رخصتی کیسے ہو گی اگر اس پر جن آ گئے...؟''

''کوئی جن نہیں آئیں گے۔ جنات کا وجود برحق... مگر وہ خدا کے بندوں کے دشمن کیوں ہوں گے اور کسی کو ڈرا کے حلف لیا جائے تو عذاب اس پر آتا ہے جو حلف اٹھوائے... مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو تو بتاؤ انہوں نے کتنی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا؟ اس سے دگنی رقم میں دے سکتا ہوں۔ تم سے کوئی غلط کام کرائے بغیر... دیکھو، تم مجبور ہو، تمہاری بیٹی میری بہن تو نہیں لیکن سمجھ لو کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کی رخصتی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔''

''انہوں نے... دس ہزار دینے کا کہا ہے۔'' وہ نظر جھکا کے بولا۔

''یہاں تو میرے پاس بیس ہزار نہیں ہیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟''

وہ چونکا۔ اس نے جیب میں سے ایک گھڑی نکالی

جس کی چین ٹوٹ گئی تھی۔ ''ڈھائی بجے ہیں۔''

''پھر تو بہت ٹائم ہے۔ تم نے چودھریوں کی حویلی دیکھی ہے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''یہاں سے نزدیک ہے۔''

''تم وہاں جاؤ۔ چودھری انور سے کہو تمہیں بیس ہزار ابھی دے دے۔ وہ دے دے گا۔ کہنا ملک سلیم نے کہا تھا۔''

وہ بجھنے کے قریب آتے آتے پھر مشکوک اور خوف کا شکار ہوگیا۔ ''وہ مجھے پکڑ لے گا۔''

''تم کو مجھ پر اعتبار تو کرنا ہی پڑے گا۔ نہیں کرو گے تو یہ وقت گزر جائے گا اور تمہیں بہت نقصان ہوگا پھر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کا دماغ میری باتوں سے کش کش کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک وعدہ دس ہزار دینے والوں نے کیا تھا جس پر اب اسے اعتبار نہیں رہا تھا۔ دوسرا وعدہ میں نے دگنی رقم کا کیا تھا جو صبح ہونے سے پہلے مل سکتی تھی کوئی جرم کیے بغیر۔ بس اس کو رقم ملنے کے بعد مجھے آزاد کر دینا تھا۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ بندہ ہاتھ نہیں آیا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے پہلوان... ان پر اعتبار کیا تھا تو مجھ پر بھی کر کے دیکھو... صبح ہونے سے پہلے تمہیں دگنی رقم مل سکتی ہے کوئی خطرہ مول لیے بغیر...''

''تم مائی کو بھی پانچ ہزار دے سکتے ہو؟'' وہ لہجے سے مجھے رضامند لگا۔

''اگر تم کہتے ہو تو یہ بھی ہو جائے گا۔ چودھری انور سے پچیس مانگ لینا۔'' میں نے کہا۔

''کیا ایسے کوئی بھی تمہارے نام سے کچھ بھی مانگ لے... چودھری دینے سے پہلے کوئی سوال نہیں کرے گا؟'' وہ بدستور تذبذب کا شکار تھا۔

''اچھا تم مجھے کوئی کاغذ قلم لا دو۔ میں چودھری کے نام چٹھی لکھ کر دیتا ہوں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''زبانی بھی وہی بات ہے۔ وہ مجھے پکڑ لے گا اور مارتا ہوا یہاں لائے گا۔''

میں نے اپنی کوشش جاری رکھی کہ اس کے اندیشے دور کروں اور اس کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ ''پہلوان! تم نے ان بدمعاشوں کو پہنچا ہوا سمجھ لیا۔ ان کی مان لی۔ میں شریف آدمی تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ مارے جاؤ گے تو یقین نہیں کرتے... بتاؤ میں کیا کروں؟''

''تم حلف اٹھاؤ کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور تم کو چھوڑوں گا تو مجھے پچیس ہزار ملیں گے۔ بیس میرے اور پانچ اس مائی کے... اور کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''میں آتا ہوں قرآن پاک لے کر۔'' وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ پہلوان برائے فروخت تھا۔ میں نے اسے دگنی قیمت دے کر خرید لیا تھا۔ یہ میرے نزدیک زندگی کی قیمت تھی۔ میری زندگی کی قیمت۔ شاید ساتھ ہی دوسرا کمرا بھی تھا کہ پہلوان گیا اور لوٹ آیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں سبز شنیل اور گوٹے کے غلاف میں لپٹا ہوا قرآن پاک تھا۔ اسے عقیدت سے چوم کے اور آنکھوں سے لگا کے اس نے میری طرف بڑھایا۔

''میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم اس پر دونوں ہاتھ رکھو۔'' اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے قرآن میرے سامنے کیا۔

میں نے قرآن کو گواہ بنا کے وہ سب کہہ دیا جو پہلوان مجھ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ قرآن پاک کو چارپائی پر رکھا اور میرے ہاتھ کھول دیے۔

''اب تم میرے ساتھ چلو۔''

دو منٹ بعد میں آزاد اور اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ پہلوان کا اعتماد بحال کرنے کے لیے میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم نے صحیح فیصلہ کیا اور صحیح وقت پر۔ میں حلف نہ اٹھاتا تب بھی وعدہ پورا کرتا... چلو۔''

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا۔ باہر آ کر شب کا چاند برائے نام سا اجالا پھیلا رہا تھا۔ اس کی روشنی جنگل میں دھند کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستاروں کا سفر جاری تھا۔ ساکت درختوں میں پرندے بھی خوابیدہ اور خاموش تھے۔

میں نے رخ بدلا تو پہلوان رکا۔ ''چودھری کی حویلی تو اُدھر ہے۔''

''یہاں میں نے اپنی گاڑی چھپائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں۔''

''وقت زیادہ لگے گا اور مجھے بعد میں پھر آنا پڑے گا گاڑی لے جانے کے لیے۔''

''میں گاڑی میں نہیں جاؤں گا۔'' معلوم نہیں خوف نے پہلوان کے دل میں کیا شک ڈال دیا تھا۔ فیصلہ کر لینے

کے باوجود وہ بے یقینی کا شکار تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک تھا جو اس نے پہلے دس ہزار کے لیے کیا تھا یا یہ ٹھیک ہے جو اب پچیس ہزار فوراً ملنے کی امید میں کر رہا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ ہارا ہوا جواری ہے یا جیتنے والا۔ یہ دس کے مقابلے میں پچیس کی طاقت تھی جس نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کیا۔ بکا ہوا آدمی پھر بک سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ کوئی بات اس کے علاوہ تھی جس نے پہلوان کو یہ جوا کھیلنے پر مجبور کیا۔ اس کی نظر میں وہ پہنچے ہوئے نیک لوگ میری بات سے برے نہیں بن گئے تھے۔ وہ یہاں کا رہنے والا تھا۔ کچھ نہ کچھ پہلے سے جانتا تھا یا سن رکھا تھا کہ پیر سائیں کے مرید کیا کرتے ہیں۔ اعتقاد کے باوجود کوئی بات مشہور ہوتی ہے یا سامنے آتی ہے تو اعتقاد کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ شاید پہلوان کا اعتقاد اس کی مجبوری تھی۔ سب کی طرح وہ بھی خائف اور خاموش تھا۔ میری باتوں پر اس کا یقین کر لینا بھی ثابت کرتا تھا۔

وہ آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ ہم ندی کے پل سے گزرے تو گدلا پانی سرسراہٹ کیے بغیر نیچے سے گزرتا جا رہا تھا۔ دور کہیں گیدڑ چلائے پھر کتے بھونکنے لگے۔ پہلوان مردہ قدموں سے میرے ساتھ چلتا گیا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔ شاید یہ کہ وہ پیر سائیں کے مریدوں سے کیا بہانہ کرے گا؟ کیا جھوٹ بولے گا؟ اور کیا وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب رہے گا؟ ان کو شک ہو گیا پھر؟

چودھریوں کی حویلی کے دربان نے مجھے سلام کیا اور اجنبی کی طرف ایک نگاہ ڈال کے گیٹ کھول دیا۔ میں سیدھا انور کے کمرے کے دروازے پر گیا۔ میری دستک پر انور نے غنودگی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“ اور میرا جواب سن کے لائٹ جلا دی۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے کہا۔ ”تو! اس وقت؟“ پھر اس کی نظر پہلوان کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھی۔

میں نے صوفے پر بیٹھ کر کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”پچیس ہزار نقد ہیں تیرے پاس تو نکال... ان کو دینے ہیں۔“

انور نے اتنا ہی وقت لیا جتنا میری بات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔ پھر اس نے پٹ کھسکا کے کسی تجوری کو کھولا۔ رقم نکال کے الماری پھر بند کی۔ میں پُراعتماد نظروں سے پہلوان کو دیکھ کے مسکراتا رہا۔ خاموشی کی زبان میں پوچھتا رہا کہ شک کی اب تو کوئی بات نہیں رہی۔ انور نے رقم میرے حوالے کی اور میں نے پہلوان کی طرف بڑھا دی۔ نوٹوں کی گڈی سنبھالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپتے رہے اور اس کے ماتھے پر پسینے کی نمی چمکتی رہی۔

”رقم پوری ہے۔ چاہو تو گن لو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں... اس کی ضرورت نہیں۔“ پہلوان ہکلایا۔

”اب میں جاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”تم کو گاڑی میں بھی پہنچایا جا سکتا ہے بلکہ رکو... مجھے اپنی گاڑی لینے جانا ہے... تم ساتھ چلو۔“

انور نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ ”کہاں جانا ہے؟ میں بھی ساتھ چلوں؟“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

”تمہیں جانا پڑے گا۔ واپسی پر میں دو گاڑیاں کیسے لاؤں گا۔“ میں نے اردو میں جواب دیا تا کہ پہلوان کو شک نہ ہو۔ ”تم تیار ہو کے آ جاؤ۔“

انور کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ پہلوان کی موجودگی میں کوئی سوال کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اس کے ذہن میں ایک نہیں کئی سوال ہوں گے لیکن پہلوان کے لیے اس نے میرے کہنے پر خاموشی سے پچیس ہزار نکالے اور مجھے دے دیے۔ انور کی اس ”تابعداری“ نے یقیناً پہلوان کو متاثر کیا ہو گا۔ اسے یقین آ گیا ہو گا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ اکیلا آتا تب بھی اسے رقم مل جاتی۔ اس کے سارے اندیشے مٹ گئے تھے۔ وعدے کے مطابق میں نے اپنی آزادی کی قیمت چکا دی تھی۔ میں قابل اعتماد ثابت ہوا تھا۔ اب اسے یقین آ گیا ہو گا کہ میں غلط بیانی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ جن کو وہ پہنچا ہوا یا نیک سمجھتا تھا، وہ خطرناک لوگ تھے۔ وہ اسے دس ہزار بھی نہ دیتے۔ ایک گولی خرچ کر کے اس کا کام تمام کرتے اور پھر نہ جانے اس کی بیٹی اور بیوی کے ساتھ کیا ہوتا۔

وہ میرے ساتھ چلتا ہوا پیچھے تک گیا جہاں دو کاریں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ تیسرے گیراج میں جیپ تھی اور چوتھے میں ٹویوٹا کی ڈبل کیبن پک اپ۔ پہلوان کا چہرہ تفکرات میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا۔ ”اب کیوں فکر مند ہو؟ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“

”آپ سچے اور کھرے بندے ہو۔ مجھے ان کی فکر ہے جو صبح آ کے پوچھیں گے کہ ہمارا بندہ کدھر ہے؟“

”تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ادھر آیا ہی نہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ انہیں شک ہو گیا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو وہ پتا چلالیں گے، پھر کیا ہو گا؟“

نہ میرے پاس اس کے سوال کا جواب تھا اور نہ میں اسے کسی قسم کی یقین دہانی کرا سکتا تھا۔ انور نے گاڑی کھولی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ آیا اور پہلوان پچھلی سیٹ پر متضاد جذبات کے گرداب میں گم رہا۔ جو پیدل آدھے گھنٹے کا راستہ تھا، وہ کار میں دس منٹ کی مسافت تھی۔ پہلوان کا سوال ہنوز میرے ذہن میں تھا لیکن اس وقت انور نے اس کے اترتے ہی گاڑی چلادی۔

”اب بول یہ کیا سلسلہ ہے؟“ انور نے خفگی سے کہا۔

”غصے کو پی جا... نورِ چشم۔ دیکھ وہ صبح کا ستارہ ہے۔ کیا سہانا سماں ہے۔“

”بھاڑ میں گیا سہانا سماں اور صبح کا ستارہ۔“

میں نے اسے ٹوکا۔ ”ادھر نہیں۔ میری گاڑی گاؤں کے پارکنگ ایریا میں کھڑی ہے۔ دو منٹ کا فاصلہ ہے۔ چونکہ جواب دو منٹ میں نہیں دیا جاسکتا اس لیے ریلیکس کر، مسکرا، صبح کی ہوا میں لمبے گہرے سانس لے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”یار میں کیا کروں خوامخواہ ٹینشن لینے لگا ہوں۔“

”تو شادی کرلے فوراً... ٹینشن اس میں بہت زیادہ ہوگی مگر بقول شاعر... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ بس یہاں رک جا۔“

وہ حیران ہوا۔ ”مجھے تو یہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی۔“

”نظر تو مجھے بھی نہیں آرہی مگر میں جانتا ہوں کہ گاڑی ان درختوں، جھاڑیوں میں موجود ہے۔“

دس منٹ کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چودھریوں کی حویلی میں داخل ہوئیں تو رات کی گہری تاریکی کچھ سرمئی اندھیرے میں ڈھلنے لگی تھی۔ گاؤں کی ایک مسجد سے اذان سحر سنائی دی۔ پھر مخالف سمت سے... ہم گاڑیاں چھوڑ کے درمیانی صحن کراس کر رہے تھے جب انور کی ماں فجر کی نماز کے لیے باہر آئی اور ہم دونوں کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

”تم دونوں کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟“

میں نے کہا۔ ”ذرا صبح کی سیر کے لیے گئے تھے۔ صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے۔“

”مگر جھوٹ اچھا نہیں ہوتا۔ رات بھر باہر رہے ہو تم دونوں اور تو کہاں تھا سلیم؟ سب کو پریشانی میں ڈال کے کہاں غائب ہو گیا تھا؟“

”غائب تو جن بھوت ہو سکتے ہیں۔ میں ایک کام سے گیا تھا۔ غلطی ہوئی کہ سب کو بتا کے نہیں گیا۔ جسے بتا کے گیا تھا کہ سب کو بتا دے وہ چالیس منٹ بعد فوت ہو گیا۔“

”فوت ہو گیا؟ کیا کہانیاں سنا رہا ہے؟“ ماں جی نے خفگی سے کہا۔

”ہوتا ہے ماں جی۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا... چنگا بھلا ہٹا کٹا بندہ حلوہ کھا رہا تھا۔ ادھر حلوہ ختم ادھر زندگی ختم... کھانے سے پہلے مر جاتا تو وہی حلوہ سوم کی نیاز میں کام آتا۔ دس بندے تو کھا لیتے اتنا وہ اکیلا کھا کے مرا۔“

وہ خفا ہو کے واپس چلی گئیں۔ میں اور انور ہنستے ہوئے کمرے میں چلے گئے، میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھنے سے پہلے جا خود کافی بنا کے لا یا کسی سے بنوا۔“

اس نے دروازے سے منہ نکال کے ہانک لگائی اور کسی کو حکم جاری کر کے صوفے پر بیٹھا اور سگریٹ جلالی۔

”اب بتا میرے پچیس ہزار کا حساب۔“

”تو نے یہ سگریٹ کب سے شروع کی؟“

”ابھی تو جلائی ہے تیرے سامنے... یہ نمونہ کہاں سے پکڑ کر لایا تھا اپنے جیسا؟“ اس نے اوپر منہ کر کے دھواں چھوڑا۔

”ابھی بتاتا ہوں ماں جی کو۔“

”بتا دے گا تو کیا ہوگا بھوتنی کے... کچھ نہیں... ہماری مائیں بیویاں اور حویلی کی مالک کہلانے والی عورتوں کو سب پتا ہوتا ہے۔ مرد بننے سے پہلے ہی حویلی کے کسی فرزندِ ارجمند نے کب سگریٹ شروع کی، کب شراب، کب وہ بالغ ہوا اور کس کے ساتھ سب سے پہلے اظہار مردانگی کیا۔ لیکن ملک سلیم اختر صاحب! ان تمام ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو یہ کبھی سکھانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ان کی اوقات کی حد کیا ہے۔ وہ سب خود ہی سیکھ لیتی ہیں کہ کیا برداشت کرنا ہے۔ کیا نظر انداز کرنا ہے، تو بھی مرد بن۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نامرد ہی اچھا۔ کیا شادی کے بعد ریشم کی حیثیت بھی یہی ہوگی؟ پاؤں کی جوتی والی؟“

”دیکھ سلیم! تو پڑھا لکھا بندہ ہے اس لیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے میں بھی پڑھ گیا مگر کتابوں سے موروثی خون کا اثر تو نہیں جاتا۔ میں دنیا دیکھ آیا۔ عورت

کہیں حکمراں نہیں ہے۔ خاندان کا سربراہ ہر جگہ مرد ہے۔ عورت بھی شادی کے بعد اس کا نام اختیار کرتی ہے جیسے نام کی تختی مکان پر یا قبر پر لگاتے ہیں کہ فلاں کی ملکیت ہے... تو عورت بھی ملکیت ہو جاتی ہے مرد کی۔ اولاد بھی مرد کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ مارگریٹ تھیچر وزیراعظم برطانیہ ہو یا اندرا گاندھی...'' ایک ملازمہ کافی کی ٹرے رکھنے آگئی۔

''اس بکواس کا مقصد؟'' میں نے ملازمہ کے جانے کے بعد کہا۔

''ریشم اسی گاؤں کی لڑکی ہے۔ اسے پاؤں کی جوتی بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ شادی کے بعد میرے سر کا تاج نہیں بن سکتی۔ وہ پاؤں کی جوتی ہونا خدا کی مرضی اور اپنی تقدیر سمجھتی ہے۔ بہرحال، تو زیادہ فکرمند نہ ہو۔ میں نے بہت کچھ بدل دیا ہے اور خود کو بدلنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ چل کافی پی اور بتا اس پہلوان کی بیٹی کیا بہت خوب صورت ہے؟''

''بیٹی تو ہے۔'' میں اس سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ ''مگر اسے تو میں نے دیکھا بھی نہیں۔''

''میں سمجھا کہ اس کے ساتھ رات گزارنے کے پچیس ہزار دیے۔''

''انور! تو جانتا ہے مجھے۔'' میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

''اچھا اچھا، غصہ مت ہو، سوری یار۔ مجھے پتا ہے تو میرے جیسا نہیں ہے۔'' اس نے سگریٹ کو فرش پر مسل دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا۔ ''قصور تیرا نہیں، جس ماحول میں تیری تربیت ہوئی، وہ ایسا ہی تھا۔''

پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میں نورین کے چکر میں رمضان سے ملنے گیا تھا اور وہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے اس سے اپنا خواب بھی بیان کیا۔ ''یار میں نے ایک رات میں دو خواب دیکھے۔''

''دونوں میں نورین نظر آئی مگر تیرے ہاتھ نہیں آئی۔''

''پتا نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو ان روحانیات اور نفسیات وغیرہ کے کسی ماہر سے پوچھوں گا۔ خواب مجھے حقیقت لگتا ہے۔ نیند میں چلنے والے کی طرح میری حالت ہوتی ہے۔ پہلے میں نے بھائی کو دیکھا۔ وہ کفن پہنے نظر آئے۔ سفید لٹھے کے کفن پر خون کے دھبے تھے۔ تجھے بتایا تھا میں نے کہ وہ حادثے میں مارے گئے تھے۔''

''تو نے کہا تھا کہ نادر شاہ نے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ وہ زندہ جل کے مر گئے تھے کسی عورت کے ساتھ۔''

''ہاں، حادثہ پہلے ہوا تھا جب ڈاکوؤں نے انہیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ تو میں نے ان کو خون آلود کفن میں دیکھا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نادر شاہ سے بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دوں۔ انہوں نے اپنا خون معاف کیا۔''

''ان کی روح کا مشورہ ٹھیک تھا۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں ان کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان سے ملنے بڑھا تو وہی ہوا۔ میں دروازے سے ٹکرا گیا۔ استاد گامارستم اور اس کی بیوی دھما کا سن کے آئے اور مجھے سنبھالا۔ میرے دوبارہ سونے تک بھابی وہاں رہی۔ لیکن یار پھر دوسرا خواب دیکھا میں نے۔''

''ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ ایک رات میں دو خواب۔ ایک انٹرول سے پہلے ایک انٹرول کے بعد۔''

میں نے انور کے مذاق کی پروا نہیں کی۔ ''دوسرے خواب میں رمضان تھا۔ میں اس سے فاطمہ یعنی نورین کا پوچھنے گیا۔ وہاں رمضان کا بھانجا پولیس کے ساتھ آگیا۔ میری گرفتاری پر ایک لاکھ کا انعام وصول کرنے کے لیے۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور وین میں بٹھا کر لے گئے۔ اس خیال سے کہ اب کی بار مجھے پھانسی کے تختے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میں وین سے کود گیا۔ لیکن بیڈ سے فرش پر گرا۔ جب آنکھ کھلی تو فرش پر تھا۔''

''تو اپنے دماغ کا علاج کرا۔''

''کل میں رمضان سے ملنے گیا تھا۔ خواب کو بھول گیا تھا۔ لیکن یار رمضان کے گھر پہنچا تو منظر وہی جو مجھے خواب میں نظر آیا تھا، سو فیصد وہی۔ بس اچانک مجھے خیال آیا کہ خواب تو سچ ثابت ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باقی خواب بھی سچ ہو جائے یعنی پولیس واقعی مجھے نہ پکڑ لے۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اب خیال آتا ہے کہ کیا بے وقوفی کی۔ میں وہاں چھپا رہا جہاں گاڑی تھی۔ شام تک کچھ نہ ہوا تو میں اترا اور ڈرتے ڈرتے رمضان کے گھر گیا۔ رمضان گھر میں نہیں تھا۔ باہر کچھ لوگوں سے پوچھا۔ رمضان کا ایک بھانجا بھی ماموں کے ساتھ تمام جرائم میں شریک رہتا تھا اور ماموں بھانجا جیل بھی ساتھ ہی کاٹتے تھے۔ مجھے کسی سے کچھ معلوم

نہ ہوا لیکن ایک بچے نے رہنمائی کی اور مجھے رمضان کے پاس لے گیا قبرستان... وہاں وہ ایک خالی قبر میں لیٹا ہوا تھا۔''

اختصار سے کام لینے کے باوجود میں ایک گھنٹا بولتا رہا۔ اتنی دیر میں سورج کبھی کا اوپر اٹھ چکا تھا اور باہر مجھے اجلی دھوپ نظر آ رہی تھی۔ انور نے میری ساری بات بڑے دھیان سے سنی تھی۔

میں خاموش ہوا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ ''یہ سب تُو دو گھنٹے پہلے بتا دیتا تو...''

''تو کیا ہوتا۔ پہلوان سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ نیک بندے کون ہیں جو مجھے زندہ سلامت گرفتار دیکھنا چاہتے تھے۔''

''معلوم ہو جائے گا۔ اگر پہلوان خود نہ مارا گیا۔ اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ وہ بے وقوف آدمی ہے۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ''اس کے دماغ کا خانہ خالی ہے یا اس میں بھوسا ہے۔''

انور نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دیر تو ہوئی ہے مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی، میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔''

انور کچھ اپ سیٹ تھا۔ مجھے کچھ بتائے بغیر وہ باہر نکل گیا اور دس منٹ بعد واپس آ گیا۔

''کیا بندوبست کیا تو نے؟'' میں نے کہا۔ ''ناشتے کا؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''وہ بھی کیا مگر میں نے چار بندے بھیج دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پہلوان سے تیری ڈیلیوری لینے والے اتنی جلدی نہیں آئیں گے۔ جلدی کی بات ہوتی تو وہ آدمی رات کو آ جاتے۔''

''یہ چار بندے کیا کریں گے؟''

''یہ پہلوان کے گھر کی نگرانی کریں گے اور کوشش کریں گے کہ انہیں یہاں لے آئیں۔ زندہ یا مردہ۔ پہلوان کے لیے میں نے کہا ہے کہ اسے فیملی کے ساتھ یہاں پہنچا دیں۔'' انور نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''رمضان کے ساتھ تو میرا معاملہ تھا۔ وہ اور اس کا بھانجا جرائم پیشہ بدنام لوگ تھے۔ ابھی تک وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا ہے۔ فاطمہ کے بارے میں اور نورین کے معاملے میں۔ کسی سے سچ اگلوانا آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں۔ بس پولیس والا طریقہ آزمانا پڑتا ہے۔ رمضان نے بہت مار کھائی ہو گی لیکن اب اس کی وہ عمر نہیں رہی اور وہ کمزور بھی ہو گیا ہے۔ وہ سب اگل دیتا مگر کسی نے اسے مار دیا۔''

''کس نے؟'' انور سوچتے ہوئے بولا۔ ''اور کیوں؟''

''یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ رمضان کا کچھ تعلق ضرور تھا درگاہ سے لیکن گر...دونوں آرج کے عام عقیدت مندوں... کی طرح نہیں۔ مجھے شک ہے کہ رمضان اور اس کا بھانجا بھی پیر سائیں کے ساتھی تھے۔ وہ عام لوگوں جیسے بے وقوف اور سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے۔ ان کا ایک کرمنل ریکارڈ تھا۔ وہ کئی بار جیل کاٹ چکے تھے۔ کبھی ساتھ ساتھ کبھی الگ الگ... جب میں نے فاطمہ کو دیکھا تو میں خود بھی قیدی تھا۔ فاطمہ میرے یقین کے مطابق نورین تھی۔''

انور سنتا رہا۔ ''تیرے یقین کے مطابق۔''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ اس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی۔ غالباً اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی یا اس کو دواؤں کے زیر اثر رکھا گیا تھا۔ دو بار اس نے نورین ہونے سے انکار کیا۔ لیکن ایک بار اس کے رویے سے لگتا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ خوف زدہ تھی۔ اب یہ تو بھی جانتا ہے کہ پیر صاحب یعنی تیرے تایا اپنا کاروبار کیسے چلاتے تھے۔ وہ دماغ کو متاثر کرنے والی دوائیں استعمال کرتے تھے۔ شاہینہ بھی یہ بات جان گئی تھی۔ اس نے ریشم کو زہر دیا۔ میرے پاس ہے وہ میڈیکل رپورٹ۔ ریشم اس لیے بچ گئی تھی کہ دوا پرانی ہو کے اثر کھو چکی تھی۔ بعد میں جس طرح اس نے خود میرے سامنے تفصیل سے بتایا کہ یہ کیا دوائیں ہیں جو آدمی کے دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ اعترافِ جرم کرانے والی سب دوائیں اب عام استعمال میں ہیں لیکن برین واشنگ کی مخصوص دوائیں ذہنی امراض کے اسپتالوں اور خفیہ ایجنسی والوں کی مدد سے مل جاتی ہیں۔ شاہینہ انتہائی حسین ہی نہیں ذہین اور خطرناک عورت تھی۔ کتنی آسانی سے اس نے اکبر کو ٹھکانے لگا دیا اور ہر ایک کی نظر میں مجرم کون بنا؟ تو...''

''اب تو میں کہتا ہوں کہ اچھا ہوا شاہینہ ماری گئی۔ ورنہ تجھے تو وہ چوہا بنا کے قید میں رکھتی۔ تو اس کے اشاروں پر چلنے والا روبوٹ ہوتا۔ کیا واقعی تو نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا؟ یا یہ بھی چال تھی؟''

''یہ چال نہیں تھی۔ میں واقعی اس کے ٹرانس میں تھا۔ اس نے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فاطمہ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ نورین ہی تھی اور اس سے پہلے کہ یہ

راز فاش ہوتا، پیر سائیں کے حکم پر وہ فاطمہ کے ساتھ روپوش ہوگیا۔"
"لیکن کچھ عرصے بعد وہ لوٹ آیا، فاطمہ کہاں گئی؟"
"مجھے اس سے یہی معلوم کرنا تھا لیکن میری اپنی غلطی سے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا اور پیر سائیں کے مددگاروں میں سے کسی نے اسے مار دیا۔ انہیں ڈر ہوگا کہ رمضان کچھ بک نہ دے جس سے ان کے مذموم کاروبار کا راز فاش ہو جائے۔"
"تیرا کیا خیال ہے، یہ مذموم کاروبار کیا تھا؟" انور بولا۔ "بردہ فروشی؟"
"مجھے ڈر ہے کہ دیگر جرائم کے ساتھ وہاں یہ بھی ہوتا تھا۔ عورتیں ہی وہاں زیادہ لائی جاتی تھیں۔ سب پر جن آتے تھے اور سب جوان ہی ہوتی تھیں۔ شوہروں کے یا سسرال والوں کے مظالم کا شکار یا جنسی ناآسودگی کی مریض۔ زیادہ عمر کی یا بہت کم عمر کی لڑکی یا کوئی مرد مجھے نظر نہیں آیا جس پر جن آتے ہوں۔ اب ایسی تو جوان عورتوں میں سے کچھ غائب ہو جائیں اور فروخت کر دی جائیں تو کوئی قیامت نہیں آتی۔"
انور نے اتفاق میں سر ہلایا۔ "وہ پہلے ہی سسرال میں ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہوتے ہیں کہ جنات سے کیسے نمٹیں جو اس کی بیوی پر عاشق ہو گئے۔ انسان ہوتا تو نمٹا جا سکتا تھا مگر وہ درگاہ سے غائب ہو جائے تو بات چھپی نہیں رہ سکتی۔"
"جیسا کہ تو نے کہا سسرال والے یا شوہر تو جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ پیر سائیں جن اتار دیں ورنہ ایسی عورت کو گھر میں رکھنا مشکل... فکر کرتے ہیں صرف ماں باپ یا بھائی۔ اگر انہیں بتایا جائے کہ تمہاری بیٹی یا بہن صرف ڈراما کر رہی تھی، اس کی کسی سے یاری تھی اور وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ گھر سے تو جا نہیں سکتی تھی۔ یہاں اسے موقع ملا اس کا یار بھی یہاں آیا اور دونوں نکل گئے۔"
انور بولا۔ "مگر درگاہ پر محافظ تھے۔"
"وارثوں کو کہا جا سکتا ہے کہ لڑکی کے آشنا نے گارڈ کو نشہ پلا کے مدہوش کر دیا تھا۔ اب پولیس میں رپورٹ لکھواتے ہیں تو سوچ لو تمہاری کتنی بدنامی ہوگی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ بہتر ہے خاموش ہو جاؤ یا کہہ دو جنات نے اس کی جان لے لی۔ ایک قبر بنوا دو، یہ ہو سکتا ہے کہ وارثوں کو دھمکی دے کر خاموش کر دیا جاتا ہو یا تھوڑا بہت پیسا دے کر۔"

یہاں کھانا کھا کر مجھے اپنی مرحومہ بیوی یاد آجاتی ہے۔ بالکل وہی ذائقہ ہوتا ہے
وہ بےچاری جو بھی پکاتی تھی، جلا ڈالتی تھی

"تو اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتا ہے؟"
میں نے کہا۔ "انور! میں نے جیل کاٹی ہے۔ مجرموں کے درمیان رہا ہوں۔ ان میں بردہ فروش بھی تھے۔ ایک تو بڑا خاص آدمی تھا۔ ایک مشہور پیر کے آستانے سے تعلق تھا۔ وہ بڑی بےخوفی سے بتاتا تھا ایسی ہی باتیں اور جیل کے اندر بھی اس کے ساتھ خاص مہمانوں والا سلوک ہوتا تھا۔ یہ جتنے ڈبا پیر ہیں جو اپنی روحانی طاقت کی پبلسٹی کراتے ہیں محبوب آپ کے قدموں میں، جو مانگو گے ملے گا، دشمن نیست و نابود ہوگا۔ ایسے بدمعاش پیری مریدی کو کاروبار بناتے ہیں تو انہیں قانون کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا حصہ اوپر بھی پہنچاتے ہیں۔"
"جو درگاہ تباہ ہوگئی، وہ ایسا ہی جرائم کا اڈا تھی؟"
"مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ زیادہ تر باتیں گھر کے بھیدی شاہینہ نے بتائیں۔ رمضان جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے جو جانتے بوجھتے یا انجانے میں شریکِ جرم بنتے ہوں گے۔ یہ بارہ مرید سب کو کنٹرول کرتے تھے۔ وہ سب بےروزگار ہوگئے۔ مجھے شک ہے کہ رمضان کو انہوں نے مارا۔ یہی لوگ مجھے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ پوچھ کیوں؟"
"اب تو پوچھے بغیر ہی بتا دے افلاطون۔"
"دیکھ پیر سائیں مجھے اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے

اور اس کا اعلان بھی ہو گیا تھا۔ سارے مرید یہ بات جانتے تھے۔ پیر سائیں کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ایک بیٹا تھا جو لاپتا ہے۔ بیٹے کی جگہ داماد لے سکتا تھا۔ خاندانی شجرہ یا رشتہ ہو تو جانشینی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ عام عقیدہ ہے کہ روحانی قوت باپ کے بعد بیٹے میں آجاتی ہے۔ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اکبر زندہ رہتا تو پیر سائیں کا دھندا چلتا رہتا بلکہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا۔ وہ نہیں رہا تو شاہینہ نے مجھے آگے کر دیا۔ باپ کی مرضی نہیں تھی تو ہو گئی۔ شاہینہ نے اسے قائل کر لیا اور گویا جانشینی کے لیے موزوں امیدوار مل گیا۔ پیر سائیں ایم ڈی تھے یا چیئرمین تو بارہ مرید اس کاروبار میں ڈائریکٹر کی حیثیت رکھتے تھے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا، اب وہ زبردستی تجھے گدی پر بٹھائیں گے؟"

"اوئے گدھے تو گدی پر نہیں بیٹھے گا تو لٹا دیں گے، کسی قبر میں۔"

"یہ کام گن پوائنٹ پر کیسے ہو سکتا ہے چودھری صاحب؟"

"گن پوائنٹ کلچر ہمارے ملک میں بہت عام ہے۔ استعفے لیے جاتے ہیں۔ نکاح ہو جاتے ہیں اور پھر بچے۔"

"گن پوائنٹ پر بچے؟"

"میرا مطلب تھا کہ شادی ہو گئی تو بچے آٹومیٹک... مقدمات کا فوری فیصلہ ہوتا ہے لوٹ مار تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہو گا کہ گن پوائنٹ پر کسی کو پیر بنایا جائے گا اور یہ اعزاز تیرے حصے میں آرہا ہے۔"

"یار مذاق چھوڑ۔"

"ہاں، مذاق چھوڑ، باس آگیا ہے۔ یہ بھی گن پوائنٹ پر لے جائے گا تجھے۔" انور نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

باہر ایک فور وہیل ڈرائیو جیپ سے سکندر شاہ اتر رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں واقعی بندوق تھی۔

انور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تو نے چودھریوں کی تاریخ بدل دی۔ تیری وجہ سے آج سکندر شاہ نے پہلی بار حویلی میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔"

سکندر اتنی دیر میں برآمدے تک پہنچ گیا تھا۔ انور نے اور میں نے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ "شاہ جی! آپ بڑے ہی نہیں بڑے دل والے ہیں کہ خود یہاں آگئے۔" انور نے بغل گیر ہو کے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے چودھری صاحب، اب بڑے ہو گئے ہیں چھوٹے اور چھوٹے اتنے بڑے۔"

"آپ اور شرمسار نہ کریں۔" انور نے اسے عزت سے بٹھایا۔

"دوسری بات یہ کہ تم سے ملنے نہیں، میں تمہارے یار سے ملنے اور اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔" اس نے سچ مچ بندوق کا رخ میری طرف کر دیا۔ "جان عذاب میں ہے کل سے... دو لڑکیاں تو باقاعدہ آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہیں۔"

"یعنی سولہ آنسو۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟"

"وجہ ہے تو... رات بھر یہاں بیٹھا گپ لگاتا رہا۔ میں نے بندہ بھیجا تو اسے گیٹ سے ہی ٹال دیا گیا کہ یہاں کوئی نہیں۔ صبح تیسری میری بیوی رونے والوں میں شامل ہو گئی۔ تیری کوئی ہوتی تو چار ہوتیں۔ یہ کیا مذاق ہے؟" اس نے بندوق نیچے رکھ لی۔

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔"

"میں سچ مچ گولی مار دوں گا۔ سخت چڑ ہے مجھے اس لفظ سے۔ گولی مار کے میں بھی کہہ دوں گا آئی ایم سوری۔"

"چاچا جی! یہ رات کو واقعی یہاں نہیں تھا۔ ابھی صبح وارد ہوا ہے۔ مجھے تو رشک آرہا ہے اس پر۔ کتنے لوگ ہیں اس کے لیے پریشان ہونے والے، آپ خود آگئے یہاں... اس حویلی میں، آپ میری وجہ سے نہیں آئے۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ "اچھا غلطی ہو گئی۔ چلا جاتا ہوں۔"

انور نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ "ناراض نہ ہوں چاچا جی، آپ کا حویلی میں آنا میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے۔ جیسے بھی آئے آپ نے شان کا خیال نہیں کیا۔"

سکندر شاہ نے بیٹھ کر گہری سانس لی۔ "سب ختم ہو گیا پتر انور، وہ جھوٹی انا، اونچے شملے کی بات، آن پر جان دینے کا زمانہ، وقت نے میرا بھی سر جھکا دیا ہے۔ مت یاد دلا پرانی باتیں۔"

"اچھا آپ کے آنے کا ماں جی کو بتا دوں۔" انور اٹھا اور باہر چلا گیا۔

"انور نے غلط نہیں کہا۔ رات کو میں یہاں نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا امراؤ جان کے کوٹھے پر تھا۔ یا چلہ کاٹ رہا تھا اجڑے مزار پر..."

میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا کہ سکندر سے جھوٹ بولوں یا سچ کہ انور ماں کے ساتھ نمودار ہوا۔ عمر میں انور کی

ماں یقیناً زیادہ تھی۔ سکندر شاہ کھڑا ہو گیا۔ ''سلام بھرجائی۔'' اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کے کہا۔
''اللہ خوش رکھے، بیٹھ۔'' انور کی ماں سامنے بیٹھ گئی۔
خاموشی کا ایک دکھی وقفہ آیا جس میں شاید وہ دونوں ان کو یاد کرتے رہے جو اَب نہیں تھے اور دشمنی کی بنیاد ڈال کے اسے روایت بنانے کے ذمے دار تھے۔
''مجھے افسوس ہے چودھری صاحب کا...''
''تم اس وقت نہیں آئے تھے۔'' انور کی ماں نے تلخی سے کہا۔
''آیا تھا۔ جنازے میں تھا، ہاں گھر نہیں آیا تھا۔ اب چھوڑو بھرجائی، پرانی باتیں بُھلا کے آیا ہوں میں۔ آپ بھی بھلا دو۔ ان بچوں کے لیے جو بچ گئے ہیں۔ ہم اور آپ ان کو پھلتا پھولتا پیار محبت سے رہتا دیکھ لیں۔''
''مراد کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔'' انور کی ماں نے کہا۔
''مجھے دیکھو، میں بھی تو زندہ ہوں۔'' سکندر بولا۔
''اور اس کی ماں؟''
''کہنے کو زندہ ہے مگر چلتی پھرتی لاش ہے۔ تم ریشم کو لینے تو آؤ گی، دیکھ لینا۔''
''نہیں، اس سے پہلے بھی آؤں گی میں۔''
ایک خادمہ چائے کے برتن اور دوسری ٹرے میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ گئی۔ انور نے سب کو چائے بنا کے دی جو ماحول کے بوجھل پن کا شکار تھے۔ ''اچھے ویلے اجڑ گئے شاہ جی، حویلی اجڑ گئی۔ اس کی رونقیں ختم ہو گئیں ورنہ کیا شان تھی۔ کلکٹر بھی آتا تھا۔ اس جیسے لوگوں سے مہمان خانہ بھرا رہتا تھا۔ چودھری صاحب بڑے یار باش اور مہمان نواز تھے۔ تو نے بھی کچھ تو دیکھا ہے سلیم...''
میں چونکا۔ ''جی، دیکھا تھا۔ ان کو شکار کا بڑا شوق تھا لیکن وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔''
''بس بھرجائی، یاد کر کے کیا ملے گا۔'' سکندر شاہ بولا۔
''شاہینہ سے پہلے اکبر گیا۔ اب وہاں بھی کوئی نہیں۔ انور نے مجھے بتایا کہ ڈاکوؤں نے سب کو مار دیا۔ اور درگاہ برابر کر دی۔''
''وہ تو بھرجائی، اللہ کا عذاب سمجھ۔ درگاہ کہاں تھی جرائم کا اڈا تھا۔'' سکندر شاہ نے اپنے دفاع میں کہا۔
''اس میں شک نہیں مگر دونوں بھائیوں میں رشتہ تو تھا۔''

سکندر نے اپنا جارحانہ دفاع جاری رکھا۔ ''رشتوں کی بھی کیا پروا تھی اسے... غرض تھی اس کی... تیرے بیٹے نہ ہوتے تو وہ کسی بھائی کو نہ پوچھتا۔ رشتہ میرا بھی تھا مگر کیسے بے عزت کیا اس نے مجھے... دشمن ہو گیا جان کا۔''
''چل اب چھوڑ پرانی باتیں۔ جو مر گئے ان کا حساب اللہ پر چھوڑ، میں ایک دن گئی انور کے ساتھ تو بڑا رونا آیا۔ سب اینٹ پتھر اور مٹی کے ڈھیر پڑے تھے۔ پیری فقیری جھوٹ سہی، رونق کیسی لگی رہتی تھی۔ قوالیاں اور سال کے سال عرس، لنگر...''
سکندر اس ذکر کو ختم کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا بھرجائی! میں تو آیا تھا اس کو لے جانے... ملک سلیم کو... رات سے غائب تھا۔ بتائے بغیر نکل گیا تھا۔''
''رات کا تو پتا نہیں، صبح دونوں کو فجر کی نماز کے وقت ساتھ دیکھا تھا۔ افسوس کہ میرے اور تیرے گھر میں سوگ ابھی ختم نہیں ہوا۔ ورنہ تجھے خالی ہاتھ نہ جانے دیتی۔''
سکندر نے کہا۔ ''دنیا سے خالی ہاتھ ہی جانا ہے بھرجائی، کیا رکھا ہے ان رسموں میں، کب آرہی ہو تم اپنی امانت وصول کرنے، شرع میں کوئی حکم نہیں سوگ تین دن سے زیادہ کرنے کا۔''
''لیکن ابھی تو... مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا اور تیری بہو عدت میں ہے، دنیا کیا کہے گی؟''
''اتنا خیال ہے تمہیں تو چہلم کے بعد سہی۔ میں نے سب کچھ ان کے حوالے کر دیا ہے۔'' اس نے میری اور انور کی طرف اشارہ کیا۔ ''ریشم کو لاؤ اپنا گھر آباد کرو۔ اللہ کرے گا پھر پہلے جیسی رونق ہو جائے گی، رب راکھا۔''
میں نے کہا۔ ''شاہ جی، ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔''
اب دس بج رہے تھے۔ یہ تو تھا کہ پہلوان سے مجھے وصول کرنے والوں کو اتنی جلدی نہیں ہو گی کہ نہار منہ پہنچ جائیں۔ وہ لوگ بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے جو... پہلوان کی حفاظت اور اسے خطرے کی صورت میں نکال کے حویلی پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ سکندر شاہ کی جیپ میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے مختصر الفاظ میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بیان کی۔ دس منٹ میں سوال جواب کی گنجائش بھی نہ تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں جیسے جن پھر گیا تھا۔ کوئی اپنے گھر سے باہر نہیں تھا۔
''کہاں گئے آخر سب لوگ... وہ کہاں ہیں جن کو میں نے بھیجا تھا؟'' انور بولا۔

خطرے کی بو فضا میں محسوس ہوتی تھی۔ انور نے اور میں نے اپنا اپنا ریوالور نکال لیا۔ سکندر شاہ جیپ میں سے اپنی شکاری رائفل اٹھا لایا۔ ابھی ہم گلیوں میں جا کے کسی گھر سے معلومات حاصل کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ میرے کانوں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔

میں نے انور کو متوجہ کیا۔ ”یہ آواز ادھر سے آ رہی ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔ تم لوگ ادھر ہی ٹھہرو۔ سب کا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔“

”میں تجھے کور کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور احتیاط سے خود کو کسی دیوار یا درخت کی اوٹ میں رکھتا آگے چلتا گیا۔ کراہنے کی آواز اب واضح تھی۔ انور نے کہا۔ ”کون ہے؟“

جواب میں کمزور سی آواز سنائی دی۔ ”چودھری جی... ادھر۔“

انور آواز کی سمت گیا۔ اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک کچے گھر کی شکستہ دیوار کے پیچھے ایک زخمی پڑا تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ وہ زخم کو دبا کر کسی طرح خود کو یہاں تک کھینچ لایا تھا مگر اس کا بہت خون ضائع ہو چکا تھا۔ انور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ یہ کس نے کیا؟“

وہ بڑی مشکل سے ہانپتے ہوئے بولا۔ ”وہی، دو مرید تھے۔ وہ اپنے ساتھ چار بندے لائے تھے۔“

”چار تم بھی تھے، پھر کیا ہوا، پہلوان کہاں گیا؟“

”کچھ پتا نہیں جی، وہ گھر میں نہیں تھا ہمارے آنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ ہم نے اس کے گھر میں جا کے دیکھا کوئی نہیں تھا۔ سب سامان پڑا ہے۔ وہ اندھیرے میں بیوی بچوں کو لے کر چلا گیا تھا۔“

”اور یہ لوگ کب آئے؟“

”دن چڑھنے کے بعد، اور پہلوان نہیں ملا تو انہوں نے ساتھ کے گھروں سے پوچھا۔ ان کو مارا بھی۔ ان کو پتا ہوتا تو وہ بتاتے۔ وہ ہر گھر کے اندر گھس کر دیکھتے رہے۔“

”اور تم دیکھتے رہے؟“ انور نے غصے سے کہا۔

”آپ نے بولا تھا کہ خوامخواہ بیچ میں مت پڑنا، یوسف اور اس کا بھائی یعقوب مسجد کے سامنے تھے۔ وہاں انہوں نے پیش امام کو مارا۔ اور اس کے گھر میں گھسنا چاہتے تھے۔ امام صاحب نے کہا کہ اندر پردہ دار عورتیں ہیں۔ میری بیوی اور بیٹی۔ کیا میں پہلوان کو ان کے ساتھ چھپا کے رکھوں گا' دو حجروں میں... وہ نہیں مانے اور امام کو دھکا دیا۔ اس کا سر دیوار سے لگا۔ یہ یوسف نے دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک کا راستہ روکا اور کہا کہ میری لاش پر سے گزر کے اندر جا سکتے ہو۔ اس مرید نے کہا جیسی تیری مرضی اور اس کو لاش بنا دیا۔ بس یوسف نے پیچھے سے اس کو گولی ماردی۔ اس کے بعد دوسرا مرید اندر گھس گیا۔ عورتوں نے بڑی چیخ پکار کی۔ مرید نے اندر سے حکم دیا کہ کسی کو زندہ مت چھوڑو پھر مقابلہ ہوا۔ بس میں بچا ہوں۔“

”اور وہ مرید... اس کے ساتھی؟“

”میرا خیال ہے وہ بھی مارے گئے۔ دو کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں۔ ایک کا یوسف نے مرنے سے پہلے بتایا تھا مگر مرید کا پتا نہیں، بھاگ گیا یا ابھی تک کسی گھر میں چھپا ہوا ہے۔“

انور اٹھا۔ ”اچھا ہم ابھی آتے ہیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ خون مت بہنے دو۔ میں تمہیں گاڑی میں سے کپڑا لا کے دیتا ہوں، کس کے پٹی باندھو۔“

انور کے جانے سے پہلے میں نے اپنی قمیص اتار کے درمیان سے دو حصوں میں پھاڑ دی۔ ”ہاتھ ہٹاؤ، میں پٹی باندھتا ہوں۔“

میں نے بنیان بھی اتار دی اور گولا سا بنا کے زخم کے دہانے پر رکھ کے پٹی باندھ دی۔ ”بس تھوڑا حوصلہ کرو۔ ہم تمہیں اسپتال لے جائیں گے۔“

یہ اندازہ نہ مجھے ہو سکتا تھا اور نہ انور کو کہ ان قاتلوں کی تلاش کہاں سے شروع کریں، لوگ ابھی تک خوف سے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہر گلی میں پھر کے گھر گھر کا دروازہ بجانا خود کو بھی قتل کے لیے پیش کرنا ہوتا۔ وہ کسی بھی گھر میں ہو سکتے تھے لیکن یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے اور انور نے آہٹ کیے بغیر آگے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میری بھی کوشش تھی کہ آہٹ نہ ہو۔ ہمارے کان کسی سنسان محسوس ہونے والے گھر کے اندر سے سنائی دینے والی آواز پر تھے مگر لگتا تھا گاؤں میں کوئی زندہ ہی نہیں بچا۔ جان کے خوف سے سب اندر دبکے پڑے تھے۔ اگر گاؤں کی کچھ آبادی باہر نکل کے ہمارا ساتھ دیتی تو ہم چاروں طرف سے حصار بنا لیتے۔

اس وقت قدرت نے ہماری مدد کی۔ ایک گھر کے اندر سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی جو ہم سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ کسی مرد نے گالی دی اور ایک فائر ہوا۔ عورتوں کے ساتھ بچے چیخ مار کے رونے لگے۔

میں نے انور کو اشارہ کیا اور ہم اس گھر کی دیواروں کے دونوں طرف جا کھڑے ہوئے۔ گھر کے ساتھ ایک طرف بکریاں باندھنے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف پانی سے بھرا ہوا گڑھا۔ میرا خیال تھا کہ زندہ بچ جانے والے مرید کے ساتھ ابھی تک کم سے کم ایک محافظ تھا۔ انہوں نے کسی بات پر مشتعل ہو کے ایک قتل اور کر دیا تھا۔ چیخ پکار سے وہ ڈرنے والے نہیں تھے۔ مدد کے لیے آنے کی ہمت کس میں رہی تھی۔ جو آتا وہ بھی مارا جاتا۔ مرید کی گھر گھر پہلوان کو تلاش کرنے کی بدمعاشی ابھی جاری تھی۔ اب یہ لگتا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کے کسی اور گھر کا رخ کریں گے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ پہلے مرید مست سانڈ کی طرح دندناتا باہر آیا۔ ناکامی کا غصہ اسے زیادہ تھا۔ وہ کتنے بے گناہوں کو مار چکا ہے۔ اس کا احساس نہیں تھا۔ اسے پیچھے آنے والے محافظ پر زیادہ بھروسا تھا۔ خود اپنے ہاتھ کے ریوالور کو اس نے باہر آتے ہوئے ٹخنوں سے اونچی شلوار کے نیفے میں اُڑسا۔ وہ زیرِلب کچھ بول رہا تھا جو گالیاں ہی ہو سکتی تھیں۔

تقریباً ایک ساتھ میں نے اور انور نے چلّا کے کہا۔ ”رک جاؤ، وہیں رک جاؤ۔ ایک قدم آگے پیچھے مت کرنا ورنہ سر میں سوراخ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

مرید نے سانڈ کی طرح ڈکرا کے محافظ کو گالی دی۔ ”نمک حرام... زندہ مت چھوڑ ان... کو... جہنمی۔“

محافظ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا لیکن اسے حکم کی تعمیل میں پلٹ کے دیکھنا پڑا۔ موقع ملتا تو وہ فائر بھی کرتا مگر انور کی گولی نے اسے گرا دیا۔ وہ مٹی میں گر کے پانی سے باہر آنے والی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

”سانس بھی روک لے مرید کی اولاد... ذرا ہلا تو تیرے سر کا بھیجا نکال دوں گا۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔

مرید اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ میں آہٹ کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کو بیل کی طرح اپنے سر سے ٹکر ماری۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تو میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی گردن پر پیر رکھ دیا۔ دباؤ سے اس کا سانس رکنے لگا ہو گا کہ وہ ذبح کیے ہوئے بھینسے کی طرح تڑپنے اور غرانے کی آوازیں نکالنے لگا۔ میں اگر چاہتا تو ذرا سے دباؤ والے جھٹکے سے اس کی گردن توڑ دیتا مگر میرا ارادہ اسے غیر مسلح کر کے قابو کرنے کا تھا۔ انور نے میری مدد کی اور تلاشی میں وہ ریوالور نکال لیا جو مرید نے نیفے میں اڑس رکھا تھا۔ گرنے کے بعد وہ شلوار میں نیچے چلا گیا تھا۔ میں نے وہ طریقہ استعمال کیا جو پولیس کرتی ہے۔ میں نے اسے ننگا کر دیا۔ اس کے پیٹ پر بندھے ازار بند کے ٹوٹتے ہی شلوار خود بخود اتر گئی۔ میں نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کے اٹھایا تو شلوار پیروں میں پہنچ گئی۔

عام طور پر میں نے کسی کو قابو کر لینے کے بعد اپنے غصے کو بھی قابو کیا ہے لیکن یہاں مجھے ناکامی ہوئی۔ میرا دماغ پر کنٹرول نہ رہا اور میں نے اس کے گینڈ جیسے پیٹ پر لات ماری۔ وہ ڈکراتا ہوا گرا تو میں نے دوسری ٹھوکر اس کی پسلیوں پر رسید کی۔ میں نے اس کی قمیص بھی کھینچ کر تار تار کر دی اور جب وہ بالکل مادرزاد ننگا ہو گیا تو میں چلّا کے کہا۔ ”اوئے دیکھو، باہر آؤ... اس کا ننگا ناچ دیکھو۔ جس جس کو بدلہ لینا ہو جوتا ہاتھ میں لے کر آ جائے۔ آؤ اور اس کے منہ پر پیشاب کرو۔“

”یہ تو کیا کر رہا ہے سلیم! ہوش میں آ۔“ انور نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔

”ٹھیک کر رہا ہوں میں۔ بڑی تذلیل اٹھائی ہے ان سب نے۔ آج اس درندے کی باری ہے جو ان کے گھروں کی عزت لوٹتا رہا۔“

میری آواز کافی گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے جھانک کر دیکھا اور پھر تین چار افراد نکل آئے۔ وہ سب مشتعل تھے۔ ایک نے مرید کے منہ پر تھوکا اور جوتا مار کے گالیاں بکتا رہا۔ دوسرے نے اسے ٹکر مار کے گرایا اور پھر سچ مچ اس کے منہ پر پیشاب کر دیا۔ وہ بے بس اور نیم جاں تھا۔ اچانک تقدیر پلٹ گئی تھی۔ شکاری خود شکار ہو گیا تھا۔ اس وقت اگر انور ہوش سے کام نہ لیتا تو گاؤں کے لوگ اس کو جان سے مارنے کے بعد بھی مارتے رہتے۔ جو اَب ہر طرف سے آ رہے تھے اور تماشا گاہ میں آٹھ دس خون کے پیاسے جمع ہو گئے تھے۔ دیواروں کے اوپر سے اور دروازے کھول کے عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ”چھوڑنا مت اس گنتے کمینے کو...“ وہ رو رہی تھیں اور کوس رہی تھیں۔

پھر ایک نیم پاگل بوڑھی عورت وحشیانہ انداز میں لپکی۔ اس کے ہاتھ میں سریا تھا۔ ”مجھے میری بیٹی دے۔ کہاں ہے میری بیٹی... میں خون پی جاؤں گی تیرا۔“

انور نے مشتعل ہو کے میری طرف دیکھا۔ ”اب سنبھال ان پاگل لوگوں کو۔“

مجھے ہوش آ چکا تھا۔ میں نے بوڑھی عورت کے ہاتھ سے سریا چھین لیا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ ”چلو بس، بہت ہو گیا۔ بندے کو مارنا نہیں ہے۔ سب ہٹ جاؤ پیچھے۔“

ہجوم کا ہسٹریا گولی کی آواز پر یوں سرد پڑ گیا جیسے بھڑکتی آگ کو پانی سرد کر دے۔ وہ خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سب چودھری انور کو پہچانتے تھے اور اس کے حکم کے غلام تھے۔ انور نے کہا۔ ''اس بندے کو ہم لے جا رہے ہیں۔ لیکن خبردار جو کسی نے ہمارا نام لیا اور کسی کو کچھ بتایا۔ جس جس کے ساتھ ظلم ہوا، سب کو انصاف ملے گا۔ میں پورا کروں گا نقصان۔ لیکن ظاہر ہے زندگی کا نقصان میں پورا نہیں کر سکتا۔ چلو شاباش... جو مر گئے ہیں انہیں کفن دفن دو۔''

''اگر پولیس نے پوچھا چودھری صاحب...''

''پولیس نہیں آئے گی یہ میری ذمے داری ہے، چلو...'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور لوگ واپس ہو گئے۔

میں مرید کو جنگی قیدی کی طرح بالکل برہنہ حالت میں آگے آگے چلاتا ہوا گاڑی تک لے گیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ کراہ بھی رہا تھا اور مجھ سے رحم بھی مانگ رہا تھا۔ مجھے خدا رسولؐ کے واسطے دے کر معافی کا خواستگار بھی تھا۔ میں نے اسے جیپ میں پیچھے بیٹھنے کو کہا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

انور کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ مقابلے میں مارے جانے والوں کی لاشیں اٹھا کے حویلی میں پہنچا دیں۔ وہ محافظ جس کو میں نے پٹی باندھی تھی کسی طبی امداد کے ملنے سے پہلے مر گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ پٹی محض ہمدردی کے لیے تھی۔ اگر ہم اسے فوری طور پر جیپ میں ڈال کے لے جاتے تب بھی وہ راستے میں مر جاتا۔ میں نے پتلون پہنی ہوئی تھی لیکن اس مجرم کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اس حالت میں اسے حویلی لے جانا مشکل تھا۔ انور نے کسی گھر سے ایک چادر فراہم کی جسے وہ اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ سکندر شاہ بڑے سکون سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری آوازیں سنی ہوں گی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔

''مجھے جیپ کا خیال تھا۔ ان کا کوئی شیطان زادہ اسے آگ نہ لگا دے۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرنے کے بعد کہا۔

سکندر کے ساتھ انور بیٹھا تھا۔ ''شاہ جی، میرا خیال ہے قیدی کو پوچھ گچھ کے لیے آپ لے جائیں۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ میں تم کو اتار کے ملک سلیم کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس کو چادر میں چھپا دو۔''

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ آتے جاتے لوگ انور کو بھی سلام کرتے تھے اور سکندر شاہ کے جاننے والے اسے...

ایک دو نے حیرانی سے پیچھے میرے ساتھ چادر سے ڈھکی ہوئی پُراسرار شخصیت پر بھی غور کیا جو عورت بہرحال نہیں تھی ورنہ برقع میں ہوتی۔ انور کو حویلی کے دروازے سے کچھ فاصلے پر اتار کے سکندر شاہ کے ساتھ سیدھا نکل گیا۔ اس گاؤں کا نام جہاں سکندر نے ایک نئی ٹاؤن شپ آباد کی تھی پہلے کچھ اور تھا مگر اب اس نے بدل کر بیٹے کے نام پر مراد نگر کر دیا تھا۔ پرانے نام لوگوں کی زبان سے اتنی جلدی نہیں اترتے۔ سکندر شاہ نے اس سڑک پر جو آگے جا کے ملتان کی جی ٹی روڈ سے ملتی تھی ہر جگہ مراد آباد کے زرد بورڈ لگوائے تھے جو رات کو ہیڈ لائٹس میں روشن دکھائی دیتے تھے۔ نام کاغذات میں بھی بدل گیا تھا۔ یہ ایک عام دکھی باپ کا ردِعمل تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو گیا تھا مگر اس کے نام کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

کسی وضاحت کے بغیر سکندر نے مرید کو سیکیورٹی والوں کے حوالے کیا۔ ''اسے پنجرے میں بند رکھو... اور خبردار یہ مرنے نہ پائے۔''

مرید چلانے لگا۔ اللہ رسولؐ کے واسطے دینے لگا مگر سیکیورٹی گارڈ اسے کھینچ کر لے گئے۔ میرا استقبال سب سے پہلے ریشم نے کیا۔ ''بھائی! کہاں چلے گئے تھے تم؟'' وہ دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

''لڑکی یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا پہلے میں نہیں جاتا تھا؟'' میں نے اس کے آنسو پونچھے۔

''تم بتا کے جاتے تھے۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

روبی چند منٹ بعد نمودار ہوگئی۔ ''تشریف لے آئے محترم۔'' روزینہ کو مراد کے گھر والے سب روبی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس نے بھی اسے روبی کہنا شروع کر دیا تھا۔

''یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بچہ ہوں جو گم ہو گیا تھا۔ مس ریشم آپ کی سسرال میں رات بھر اس اُلو کے پٹھے کو سمجھاتا رہا۔ تمہارے چودھری صاحب کو۔''

ریشم نے آنسو پونچھ کے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ''انور کو...؟''

''آہ... غضب خدا کا، ابھی سے ہونے والے مجازی خدا کا نام لیتی ہے۔ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اس سے۔'' روبی مسکرائی۔ ''ہونے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے مولوی صاحب؟''

میں نے اس کے شوخ لہجے پر غور کیا تو مجھے اس کے

لباس میں بھی ہوگی کے سفید رنگ پر شوخ پھولوں کے رنگ دکھائی دیے۔ مراد کی موت کو ایک مہینا ہو گیا تھا اور اب چہلم قریب تھا۔ بے شک دلی جذبات کا ظاہر داری سے تعلق لازمی نہیں لیکن یہ کوئی کراچی لاہور جیسا بڑا شہر نہیں تھا جہاں کسی کے پاس غم یا خوشی کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا اور کوئی کسی کے معاملات سے تعلق بھی نہیں رکھتا۔ لگتا تھا کہ روبی کو بھی بڑی بہن شاہینہ کی طرح کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں۔ رسم و رواج اور معاشرتی بندھنوں کی زنجیر وہ پہلے ہی توڑ چکی تھی جب اس نے مراد کے ساتھ ماں باپ کا گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ اپنی زندگی کے فیصلوں پر وہ اپنا اختیار رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا بدلا ہوا روپ بھی بغاوت کے اعلان سے کم نہ تھا۔

میں نہا دھو کے اور لباس بدل کے نکلا تو وہ مجھے کچن میں مل گئی۔ ”ایک کپ چائے کا سوال ہے۔“

”جواب ہے نو... کھانا تیار ہے بس... دس منٹ۔“

”روبی ایک بات کہوں؟“

وہ مسکرائی۔ ”یعنی آپ اجازت طلب کر رہے ہیں مجھ سے؟ بیوی حکم چلائے گی تم پر... بہترین زن مرید شوہر بنو گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ لباس بہت خوب صورت ہے تمہارا... مجھے بہت اچھا لگا۔“

وہ پتیلی میں جھانکتے ہوئے ہنس پڑی۔ ”تھینک یو... لیکن یہ کہنے کے لیے اتنا تکلف۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ مراد کے ماں باپ کو شاید اچھا نہ لگا ہو مگر اسی وقت ریشم اندر آ گئی اور اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ مجھے جتنی کوفت ہوئی اس سے زیادہ ندامت کہ نہ جانے روبی کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں۔

میں پلٹا ہی تھا کہ روبی نے روک لیا۔ ”وہ بات تو ادھوری چھوڑ دی تم نے۔“

”کون سی بات؟“ میں نے کہا۔

”چودھری صاحب کو رات بھر کیا سمجھاتے رہے؟ مسئلہ فیثاغورث؟“ وہ بولی اور پھر ہنسی۔

”پیسا غور... کیا، کون سا مسئلہ؟“ ریشم بولی۔

”شادی کے بعد اسی سے پوچھنا۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔“

میں جواب دیے بغیر کچن سے نکل گیا اور سوچتا رہا کہ راتوں رات روبی کا مزاج کیسے بدل گیا۔ مہینا بھر پہلے وہ غم سے اتنی بدحال تھی کہ لگتا تھا صدمے سے مر جائے گی۔ دن رات روتی تھی اور ہفتہ ہفتہ نہ منہ دھوتی تھی اور نہ کپڑے بدلتی تھی۔ اتنی جلدی وہ مراد کو کیسے بھول سکتی ہے۔ میرے دل میں شکوک کے جراثیم پھیل رہے تھے؟ کیا وہ ایسی ہی لڑکی تھی؟ جذبات کے کھیل میں ابھی تو ساری حدیں پھلانگ گئی۔ بظاہر مختلف نظر آنے والی مگر بالکل شاہینہ جیسی۔

اس سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مجھے شام کو پھر ملا جب وہ ٹرے میں دو مگ کافی کے رکھ کر میرے کمرے میں آئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”باقی سب گدھے گھوڑے بیچ کر سوئے پڑے ہیں۔“ اس نے ایک مگ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے کہا۔ ”تم اتنی شوخ کیوں ہو رہی ہو؟“

مگ اس کے ہاتھ میں کانپا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب تم اچھی طرح سمجھتی ہو۔ اچانک تم نے رنگین لباس پہننا شروع کر دیا۔ یہ میک اپ اور ہیئر اسٹائل، ہنسی مذاق، یہ سب کیا ہے؟“

اس نے مگ نیچے رکھ دیا۔ ”تمہیں وہ اچھا لگتا تھا۔ میرا سفید ماتمی لباس، رونا دھونا۔“

”میرے اچھا لگنے کی بات نہیں ہے روبی... لوگ کیا کہیں گے؟“

”لوگوں کو جو کہنا تھا کہہ چکے اور میری بلا سے بولتے رہیں ساری عمر... مجھے کسی کی پروا نہیں۔“

”تمہیں ان کی پروا ضرور کرنی چاہیے جو اس گھر میں ہیں، مراد کے ماں باپ۔“

”مسٹر افلاطون۔“ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ میں عقل سے بالکل پیدل ہوں۔ کسی کے جذبات کا لحاظ نہیں مجھے، میں خود غرض اور بے حس ہوں۔ چہلم سے پہلے ہی شوہر کے خیال کو دل سے نکال پھینکا ہے میں نے؟“

”ایسا کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی کون...؟ سب سے پہلے انگلی اٹھانے والے تم ہو۔ مگر ملک صاحب! یہ روپ میں نے اپنی مرضی سے نہیں بدلا۔“ وہ بولی۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”یہ پاپا کا حکم تھا۔“ وہ اپنے سسر کو پاپا کہتی تھی۔ ”انہوں نے سمجھایا مجھے... کہا کہ ہم تقدیر کے فیصلے کو بدل نہیں سکتے اور قبول کرنا ہو تو سوم، چہلم، برسی تک رو کے کرو۔ حوصلے اور صبر کے ساتھ آج کر لو۔ فرق کسی کو نہیں پڑ

سوائے خود کے... انہوں نے کہا کہ پتا نہیں کس کا دکھ زیادہ ہے۔ تمہارا، میرا یا مراد کی ماں کا۔ ایسا ترازو کوئی نہیں کہ ہم اس کا وزن کرلیں حکم ہے کہ سوگ تین دن سے زیادہ نہ کرو۔ ایک ہے زندگی کی ضرورت۔ مراد اب نہیں مل سکتا جتنا ماتم چاہو کرو۔ اس نے ایک ذمے داری چھوڑی ہے، تمہاری مجھ پر... میری تم پر... اور اس کے بچے کی ہم سب پر۔ تم مراد کو بھلادو... جیسے میں نے بھلا دیا۔ خود زندہ رہنے کے لیے مجھے بھی حوصلہ چاہیے۔ آنسو حوصلہ نہیں دیتے۔ دیکھو کس طرح میں نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ کاروبار کو سنبھال لیا ہے۔ مراد کی جگہ انور کو اور ملک سلیم کو لے آیا ہوں۔ سب کچھ ویسے ہی چلتا رہنا چاہیے کیونکہ تمہارے سامنے زندگی کے دو سفر ہیں۔ ایک اپنی زندگی کا، ایک بیٹے کی زندگی... یا بیٹی کی زندگی کا... ایک ہی بات ہے۔ تم میری بات مانو گی۔ انہوں نے کہا نارمل ہو جاؤ۔ بالکل ویسی جیسی تم مراد کے ساتھ تھیں۔ یہ اداسی کا لباس بدل ڈالو۔ زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ گھر سے غم کے اندھیرے کو نکال دو۔ اچھے کپڑے پہنو، میک اپ کرو، ہنسو کھیلو، خوش رہو، خوش نظر آؤ۔ کیونکہ یہ میرا حکم ہے۔''

''میں داد دیتا ہوں تمہاری ہمت کی اور اس سے زیادہ سکندر شاہ کی ہمت کی۔'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''دنیا چلتی رہنی چاہیے اور ہمیں دنیا کے ساتھ نہیں چلنا تو پھر دنیا کو چھوڑ دینا چاہیے۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں روبی۔'' میں نے کہا۔

''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ریشم اور انور بھی۔''

''مراد کی ماں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں اور جسمانی بھی، لیکن پتا ہے کل میں رنگین لباس میں پورے میک اپ کے ساتھ ان کے سامنے گئی تو کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟ وہ چلانے لگیں؟''

روبی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مجھے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔ ''مراد اٹھ گیا؟'' اور میں نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ''نہیں۔'' تو انہوں نے کہا۔ ''پھر تو کیوں اٹھ گئی سویرے سویرے... اچھا اب اٹھ گئی ہے تو مجھے چائے لادے۔ اور دیکھ پاپے ہیں تو وہ بھی۔ تم نے دیکھا۔ وہ ایک دم پرانے وقت میں چلی گئیں جب مراد زندہ تھا اور میں نئی نویلی دلہن تھی۔ ان کے چہرے پر شگفتگی آگئی۔ انہیں بھوک بھی لگی۔ یہ اچھا ہوا نا۔ وہ ماضی میں خوش رہ سکتی ہیں تو رہیں۔ شاید اس طرح ان کی ذہنی اور جسمانی صحت میں بہتری آجائے۔''

''مگر انہوں نے مراد سے ملنے کی ضد کی... پھر؟''

''میں انہیں بہلاتی رہوں گی۔ وہ شہر سے باہر کام کرا رہے ہیں۔ دبئی چلے گئے ہیں۔ رات کو آئے تھے جب آپ سو رہی تھیں اور یہ ڈراما چل گیا تو میں مراد کو بھی لے آؤں گی۔''

''مراد کو کہاں سے لے آؤ گی؟''

وہ ہنسی۔ ''ملک صاحب! آپ کو مراد کے میک اپ میں ان کے سامنے کھڑا کردوں گی۔''

''ہونہہ... مجھ میں اور مراد میں ذرا سی بھی مشابہت نہیں۔''

''کیوں؟ اس کی طرح تمہاری دو آنکھیں، دو کان اور ایک ناک ہے۔ قد بھی وہی ہے اور جسامت بھی... اور تم مراد کے کپڑے پہن لو اور کوئی اچھا میک اپ آرٹسٹ مل جائے جو تمہارے چہرے میں مشابہت پیدا کردے۔''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''کہاں کی سوچ رہی ہو تم... میں یہ ڈراما نہیں کرسکتا۔''

''تو نہ کرو، مل جائے گا کوئی ایکٹر... مراد کا ہم شکل... ٹی وی والے سب کے ڈپلی کیٹ تلاش کرلیتے ہیں۔'' وہ اٹھی اور ٹرے کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر رکی اور بولی۔ ''وہ ریشم پوچھ رہی تھی۔''

''کیا پوچھ رہی تھی؟''

''یہی کہ مسئلہ فیثا غورث کیا ہوتا ہے جو تم رات بھر انور کو سمجھاتے رہے۔'' وہ ہنسی اور باہر نکل گئی۔

مجھے روبی کے مذاق میں طنز محسوس ہوا۔ یوں جیسے وہ کہنا چاہتی تھی کہ رات بھر تم اور وہ جاگیردار کیا کرتے رہے۔ کون ہے جو اندازہ نہ کرسکے، مردوں کے بہانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے سخت تذلیل محسوس ہوئی اور سخت غصہ آیا۔ الو کی پٹھی، یہ کیا سمجھتی ہے اور ریشم کو بھی سمجھانا چاہتی ہے کہ میں اور انور رات کو کسی کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہے؟ اسے کیا پتا میں کہاں تھا اور کس حال میں تھا۔ خیر، پتا چل جائے گا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ نہ جانے ریشم جیسی سیدھی سادی لڑکی سے اس نے کیا کہا ہوگا اور اس نے کیا سمجھا ہوگا۔ وضاحت کے مطمئن کرتی ہے۔

رات کو مجھے سکندر شاہ نے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ ہم پچھلے حصے کی طرف سے زینہ اتر کے ایک تہ خانے جیسی جگہ میں پہنچے جہاں دیواروں کے ساتھ بہت سے کارٹن جمے ہوئے تھے۔ درمیان میں چھت کے پنکھے سے مرید الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس حالت میں بھی لباس سے محروم تھا۔ اس کی

آنکھیں بند تھیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ وہاں دو سفاک صورت افراد بڑے سکون سے کھڑے تھے۔

''یہ بندے بلائے ہیں میں نے تفتیش کے لیے۔'' سکندر بولا۔

انہوں نے ہمارے لیے دیوار کے ساتھ دو کرسیاں رکھ دیں جو ابھی تک ان کے کام آرہی ہوں گی۔ ہم ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے آنکھ کھول کے بھی ہمیں نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟''

سینئر نظر آنے والے نے سر ہلایا۔ ''جی سر، میں سی آئی ڈی کا انسپکٹر اسحاق ہوں اور یہ میرا ساتھی اسپیشل پولیس کا حوالدار شامل خان۔''

''کچھ بتایا بڑے... صاحب نے؟''

اسحاق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بڑی ڈھیٹ شے ہے جناب۔''

''تم تو کہتے تھے کہ تمہارے سامنے پتھر بھی بولنے لگتے ہیں؟''

''ایسا تو ہے جی مگر کبھی بندہ خرچ بھی ہو جاتا ہے۔ ذرا پتا چل جائے کہ کتنا دم ہے اور ابھی تو پہلا سبق ہے۔''

''یار میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے رزلٹ چاہیے۔ بے ہوش ہے؟''

اسحاق بولا۔ ''ہاں جی، ابھی ہوش میں آجائے گا تھوڑی دیر میں۔'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جو سگریٹ وہ پی رہا تھا، وہ دبے پاؤں قریب جاکے مرید کے بڑی نازک جگہ پر لگا دی۔ وہ چلا کے تڑپا۔ اسحاق نے قہقہہ لگا کے اسے گالی دے۔ ''مکر کرتا ہے۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ جان نکل سکتی ہے۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکتا۔'' وہ سخت اذیت میں تھا۔ ایک بھاری بھرکم پیٹ کے ساتھ اس کا سیدھا کھڑا رہنا بھی آسان نہ تھا۔ الٹا لٹکنا اس کے لیے سخت عذاب تھا۔ تفتیش کے ماہرین نے ہر طرح ظلم کر کے دیکھ لیا تھا۔ لیکن نتیجہ ہنوز صفر تھا۔

مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔ ''تم جاہل لوگ ہو۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''تشدد کے سب طریقے تو آزما چکے۔ مر گیا تو کیا اس کی لاش سے پوچھو گے؟''

اسحاق نے ناگواری سے کہا۔ ''سر جی! بائیس سال کا تجربہ ہے۔''

''کیا فائدہ اس تجربے کا۔ یہ ایک صدی پرانے حربے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا جی پھر آپ بتادو کیا کرنا چاہیے؟'' وہ بولا۔

''نیچے اتارو اسے اور کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کل تک اس کو ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا آیا تھا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر میرے ساتھ نکل آیا۔ ''اتنا رحم دل اور جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! یہ بندہ بہت اہم ہے۔ یہ دس دروازوں کی چابی ہے۔ ان پولیس والوں کا کیا جائے گا اگر یہ مر گیا۔ زیادہ سے زیادہ معطل ہو جائیں گے کسی افسر کے حکم سے۔ یہاں ان کی ساری کارروائی غیر قانونی ہے۔''

وہ طنز سے بولا۔ ''اور جو آج دن میں خونریزی ہوئی یا کل تمہارے ساتھ ہوا تھا، وہ قانونی تھا۔ دیکھو ملک سلیم! یہ قانون ہمارا ہے۔ ہم بنائیں یا توڑیں... میں نے سارا معاملہ دبا دیا۔ کل اخبار میں اسے بھی ڈاکوؤں کی کارروائی قرار دیا جائے گا۔''

میں اس کے ساتھ اوپر آگیا۔ ''میں سکندر شاہ نہیں ہوں۔''

''تم کو بننا ہے جس دن تم نے کمزوری دکھائی، دشمن ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے تم پر... ہم ایک جنگل میں رہتے ہیں جہاں صرف خونخوار درندے بستے ہیں۔ یہ نیچے والے کیڑے مکوڑے ہیں سب۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

باہر رات تھی مگر مراد نگر کی چار دیواری کے اندر باہر روشنیوں کا راج تھا۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ''میں نادر شاہ نہیں بننا چاہتا۔''

''پھر کیا بننا چاہتے ہو؟ پہلے کیا بننا چاہتے تھے؟''

''میں ہر نادر شاہ کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔'' مجھے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔

''اس کے لیے تمہیں سکندر شاہ بننا ہوگا یا ملک غلام محمد عرف گاما رستم۔ ایک نے تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا تھا۔ دوسرے نے بچا لیا۔ آج تم مراد نگر میں محفوظ ہو۔ کوئی تمہاری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سب جو ایک دن تمہارا ہوگا۔ یہ رشتے محبت کے، ایک محفوظ مستقبل... اس کو ٹھکرا دو گے؟ سب کچھ چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟ کہاں؟ اور کیوں؟''

''ابھی میں ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میں اس نظام کو قانون کے مطابق چلا کے دکھا دوں گا۔ ضابطے اور اصول کے مطابق اور مجھے یقین ہے کہ انور میرا ساتھ

دے گا۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”خدا تمہیں کامیاب کرے۔ مجھے یہ کامیابی ایسے نہیں ملی تھی۔ تمہیں کچھ بتانا نہیں ہے۔ جو بن چکا اسے چلانا ہے۔“

کوئی گاڑی اندر آئی۔ ظاہر ہے کسی روک ٹوک کے بغیر صرف مالکان کی گاڑیاں گزر سکتی تھیں۔ یہ انور تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ میں اور سکندر شاہ نے اسے ڈرائنگ روم میں کسی رسالے کے صفحات الٹتے دیکھا۔

”چائے کے لیے میں نے کہہ دیا ہے۔“ وہ بولا۔

ہم اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ”وہاں کیا ہوا؟“ سکندر بولا۔

انور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”کیا ہونا تھا۔ جو مر گئے تھے ان کی تدفین ہو گئی۔“

”پولیس آئی ہوگی؟“

”ہاں، سب نے ایک ہی بیان دیا۔ ڈاکو آئے تھے لیکن مخبری ہو گئی تھی۔ چودھری انور نے گارڈ لگا دیے تھے۔ مقابلے میں کچھ لوگ مارے گئے۔“

”اخبار والا کوئی نہیں پہنچا؟“

انور نے سر ہلایا۔ ”ایک پہنچا تھا۔ میں نے پانچ ہزار دے دیے۔ بہت چھوٹی سی خبر لگے گی اندر۔ ڈسٹرکٹ پیج پر۔“

”گڈ! تو سیانا بندہ ہے انور... اپنے اس دوست کو بھی سمجھا، جذباتی نہ ہو۔“

بات روبی کی مداخلت پر ختم ہو گئی۔ ”چائے نہیں مل سکتی۔“

انور نے اس کے لہجے اور حلیے کی تبدیلی کو غور سے دیکھا۔ ”پتی ختم ہو گئی یا چینی؟“

”کھانا لگا ہوا ہے۔“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”اور یہ ریشم کا حکم ہے کہ چائے بعد میں دی جائے... چلو اٹھو۔“

انور نے ماں جی کو بھی کھانے کی میز پر دیکھ کے حیرانی کا اظہار کیا۔ گاما رستم کے گھر میں اس کی بیوی رسم و رواج کا زیادہ خیال رکھتی تھی اور منگنی کے بعد ریشم کو انور کے سامنے نہیں آنے دیتی تھی۔ یہاں روبی اسے کھینچ لائی اور وہ میز کے مخالف کنارے پر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ مجھے شرم و حیا کے اس ڈرامے پر ہنسی آ گئی۔ انور کی حویلی میں یہی ریشم ہر وقت ہر جگہ انور کے ساتھ رہتی تھی۔

”مراد نہیں آیا ابھی تک؟“ سکندر کی بیوی نے کہا۔

انور چونکا لیکن روبی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔ ”ابھی کچھ دن لگیں گے انہیں ماں جی... فون آیا تھا۔“

انور نے باری باری سب کی صورتوں کو دیکھا اور سب کو خاموش دیکھ کر خود بھی خاموش رہا۔ خود مجھے یہ دکھی کر دینے والا ڈراما بہت عجیب لگ رہا تھا جس کے سارے کردار ایک جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو مر گیا اسے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر معاملہ ایک ماں کا تھا جو اس فریب کے آسرے پر جینے کے لیے تیار تھی۔

سکندر نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ ”انور! تم اکیلے کیوں آئے ہو آج بھی؟“

وہ مسکرایا۔ ”اس لیے کہ آج بھی میں اکیلا ہوں۔“

”کیا مجھے کہنا پڑے گا کہ بھرجائی کے ساتھ آؤ اور اپنی امانت لے جاؤ۔“

ریشم کھانا ختم کر چکی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سکندر نے اسے ڈانٹا۔ ”بیٹھ جاؤ، یہ شرمانے کا بے مقصد ڈراما کس لیے آخر... اگر ہم تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل کی بات کرنا چاہتے ہیں تو رائے دینے کا پہلا حق تمہارا ہے۔“

میں سکندر شاہ کی زندگی سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ اس نے کامیابی کے سفر میں صرف کامیابی کو اہم سمجھا تھا۔ اخلاقیات، شرافت، جائز ناجائز اور حرام حلال کے سارے دنیاوی ضابطے غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیے تھے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ اس نے اپنے تعلقات اور اثر رسوخ کا دائرہ پھیلایا تھا اور راستہ روکنے والوں کو ہٹانے میں دولت، بدمعاشی اور سیاست کے سارے حربے کامیابی سے استعمال کیے تھے۔ بالآخر وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس آج سب کچھ تھا۔ کم یا زیادہ... شاید کامیابی آج کی دنیا میں شرافت کے مروجہ اصولوں کو نظرانداز کیے بغیر نہیں ملتی۔

پھر اس وقت جب کامیابی کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر وہ غرور میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ دستِ قدرت نے سیڑھی کھینچ لی۔ اس سے اتنی بڑی ایمپائر کا وارث چھین لیا اور اسے احساس ہوا کہ اس کی کامیابیوں کی کہانی تو ختم ہو گئی۔ آگے کرنے کے لیے کچھ نہیں اور اس کا فائدہ بھی نہیں۔ مگر وہ ہمت ہارتا تو زندگی ہار جاتا۔ فضا کی بلندی سے گرنے والے کی طرح اس نے مجھے اور انور کو پیراشوٹ بنا دیا۔ ان رشتوں کو سہارا بنا لیا جن کو وہ بھولا ہوا تھا۔ وہ کریش ہو کے بکھر جانے سے بچ گیا۔

اب مجھے یا انور کو اس راستے پر چلنے کی حاجت نہیں تھی جس پر سکندر چلا تھا۔ ہمیں سب بنا بنایا ملا تھا اور آگے صرف اسے سنبھالنا تھا۔ میں نے سکندر سے بدترین حالات میں ہمت نہ ہارنا سیکھا تھا اور ایک ایسی فراخ دلی۔۔۔ منطقی سوچ اور نئے زمانے کی روشن خیالی سیکھی تھی۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھا۔

سکندر کی آواز پر میں چونکا۔ ''ملک صاحب! کس خواب میں چلے گئے ہو۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''اس معاملے میں میری دخل اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔''

''کیوں ضروری نہیں تھی؟ اپنی رائے تم بھی دے سکتے ہو؟''

''میرا تو خیال ہے کہ ہم سب کی رائے محض دخل اندازی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سب باہر چلے جائیں اور ان دونوں کو فیصلہ کرنے دیں، پھر جیسا یہ کہیں۔۔۔''

''یہ تو کہتا ہے کہ ابھی لے جاؤں۔'' روبی نے کہا۔

''ریشم نہیں مانتی۔''

''اگر منا سکتا ہے تو منا لے ورنہ اٹھا کے لے جائے۔'' میں نے کہا۔

''زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔'' سکندر نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی کون سی دیر ہوئی ہے۔ مولوی آجائے گا۔''

مراد کی ماں پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ریشم بالآخر اٹھ کے چلی گئی۔ سکندر نے مسکرا کے کہا۔ ''دیکھو، یہ مذاق کی بات نہیں، دونوں کام اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ تم اِدھر اُدھر کے معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑو، کاروبار کی ذمے داری سنبھالو۔ ابھی تک تو نہیں ہوا مگر کسی نے توجہ نہ دی تو نقصان ہوگا۔ میرے شروع کیے ہوئے پروجیکٹ چل رہے ہیں۔ مراد نگر کی کامیابی نے ہماری ساکھ بنا دی ہے۔ دوسرے منصوبے پر کام جاری ہے۔ ملتان روڈ پر ایک کمرشل پلازا۔۔۔ جس میں اوپر رہائشی فلیٹ ہوں گے۔''

''ملتان کی گرمی میں فلیٹ۔'' میں نے کہا۔

''سب لگژری فلیٹ ہیں۔ ائرکنڈیشنڈ، دو بیسمنٹ ہیں، ایک پارکنگ کے لیے۔ دوسرا نیچے والا پاور ہاؤس ہوگا۔ اس عمارت کی تین منزلوں کی بکنگ ہوگئی ہے۔ اوپر کے دو بھی ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد ابھی تک میرے پاس کچھ نہیں، دو سال میں یہ کام ختم ہوگا۔ اس سے پہلے نیا پروجیکٹ اناؤنس ہونا چاہیے۔''

میں نے اس باہمت شخص کو حیرانی سے دیکھا۔ ''شاہ

دغاباز

لنگڑا فقیر اپنی مجروح ٹانگ فٹ پاتھ پر پھیلائے دردناک آواز میں صدا لگا رہا تھا۔ میراجی کو اس پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے دس کا نوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تم پر اپنا رحم کرے۔۔۔ بس یہ سوچ کر اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو کہ اس نے تمھیں نابینا نہیں بنایا ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔''

''دنیا بڑی دغاباز ہے میم صاحب!'' فقیر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب میں اندھا بنا ہوا تھا تو لوگ مجھے جعلی سکے اور نوٹ دے جاتے تھے، بعض شرارتی لڑکے تو میری چادر سے اصلی سکے بھی اٹھا لے جاتے تھے۔''

کراچی سے ولید احمد کا چٹکلا

جی! اتنا تو کر لیا آپ نے۔''

وہ بھڑک اٹھا۔ ''کیا مطلب اس فضول بات کا آخر۔۔۔ اب میں چادر تان کے سو جاؤں۔ اس دن کے انتظار میں جب موت کا فرشتہ آئے اور مجھے لے جائے۔ تم نوجوان ہو، تمھیں خیال بھی کیسے آسکتا ہے کہ جدوجہد روک دی جائے؟ کیونکہ باقی عمر کچھ کیے بغیر آسائش کی زندگی گزارنے کے لیے جتنا ہے بہت ہے۔ ہڈیوں کو زنگ لگ جائے گا تمہاری۔۔۔ اگر پڑے پڑے کھاتے رہو گے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دیکھو دنیا میں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو دنیا کے امیر ترین لوگ ہیں انہیں کہاں ضرورت ہے مزید پیسے کی۔ اتنا پیسا ہے ان کے پاس کہ دونوں ہاتھوں سے لٹائیں تو بھی ختم نہ ہو مگر پیسے کی منزل سے آگے ہے شہرت اور ساری دنیا کو فتح کرنے کی لگن۔۔۔ تمہارے پاس تو ابھی کچھ نہیں۔ میرے کام کو آگے بڑھاؤ۔ عمارتوں کی جگہ پل بناؤ۔ شاہراہیں بناؤ۔'' وہ یکلخت چپ ہو گیا۔

''بالکل ٹھیک، کام ہم کریں گے۔ آپ نگرانی کریں۔ راہنمائی کریں۔ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ مجھے لگتا ہے آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہے۔۔۔ کبھی دیکھا آپ نے؟''

''مجھے دیکھے بغیر ہی معلوم ہے۔ اتنی جدوجہد اور اتنے صدمات کے بعد بلڈ پریشر میں مبتلا ہونا تو میرا حق

ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم مجھے ٹھیک دیکھنا چاہتے ہو اور خوش... تو چارج لے لو، تمہارے آفس تمہارا انتظار کر رہے ہیں یا لیگل ایگریمنٹ کا انتظار ہے تمہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' انور بولا۔

''تم بھرجائی کا بھی خیال کرو... دو چار دن میں ان کی بہو کو لے جاؤ۔''

''دو چار دن میں... ابھی تو مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا'' انور بولا۔

''یار! تم کیسے پڑھے لکھے جاہل ہو، چہلم سے پہلے نکاح سے کیا قیامت آ جائے گی؟ کہاں ممانعت ہے اس کی؟''

انور نے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے شاہ جی... لیکن لوگوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔''

''کون لوگ؟ یہی جو ساری عمر بھونکتے رہے اور میں انہیں دھتکارتا رہا لیکن چلو یہ عذر بھی قبول کر لیا جائے تمہارا تو ایک ہفتہ بعد یہ رسم بھی پوری ہو جائے گی' اس سے پہلے تو انتظام ممکن نہیں، بھرجائی کو شاید برا لگے ابھی۔''

''وہ پرانے وقتوں کی عورت ہیں۔'' انور نے تائید کی۔ ''وہ چہلم سے پہلے تو بات بھی نہیں کریں گی۔''

''دیکھو، یہ ذمے داری اب میں نے قبول کی ہے تو جلدی مجھے ہے۔ دو ہفتے بعد رخصتی... یہ میرا فیصلہ ہے اور میں بھرجائی سے بھی منوا لوں گا۔ وہ لڑکی بہت خوار ہوئی ہے۔ اسے اب اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔'' وہ بولا۔

''اتنے پریشان نہ ہوں شاہ جی۔''

وہ ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ ''یہ کیا تم مجھے شاہ جی شاہ جی کہتے رہتے ہو۔ لوگوں کی طرح... میں کیا تمہارے برابر کا ہوں؟ مراد تھا تمہاری عمر کا... انکل کہتے ہوئے شرم آتی ہے؟''

میں نے سٹپٹا کے کہا۔ ''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ تھوڑی سی جھجک تھی زبردستی رشتہ جوڑنے میں...''

انور نے تائید میں سر ہلایا۔ ''ایک رشتے سے تو انکل ہیں آپ... روبی کے ماموں ہیں اور وہ میری تایا زاد ہے۔''

اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک جاگی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولا۔ ''دنیا مجھے بہت برا آدمی سمجھتی ہے انور... اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ مجھے ہمیشہ احساس تھا اس کا... اپنی تسلی کے لیے میں نے نیک کام بہت کیے مگر ان کی پبلسٹی نہیں کی۔ برائی کی بہت پبلسٹی ہوئی۔ اپنوں نے بھی کی اور بیگانوں نے بھی۔ یہی دیکھو کہ روبی کے باپ نے مجھے رشتہ مانگنے پر کتنا ذلیل کیا اور پھر خود بھی ذلت اٹھائی۔ میں یہ سب چھوڑنا چاہتا ہوں مگر ایک دم نہیں چھوڑ سکتا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، انکل۔'' انور بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔''

اس کی یہ جذباتی کیفیت نہ جانے کب تک رہتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اچانک کیا ہوا؟ مراد کے حادثے کو ایک مہینا ہوا۔ گزر جانے والے دن کی رات ہونے تک سکندر وہی تھا۔ یہ پشیمانی اور توبہ استغفار کا خیال اس پر اچانک کیسے غالب آ گیا؟ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرم و گناہ کا بار اور احساس بڑھتا جاتا ہے پھر اچانک نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ جیسے تناور درخت کو دیمک اندر سے کھوکھلا کرتی رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو درخت ویسا ہی لگتا ہے۔ پھر ایک آندھی اسے زمیں بوس کر دیتی ہے۔ بلڈ پریشر کا زیادہ ہونا تو ایک فطری بات تھی اس عمر میں... مگر وہ ڈپریشن کی طرف جا رہا تھا۔ مزاحمت کے باوجود... یہ پچھتاوا اس کا ثبوت تھا۔

انور نے دسویں بار گھڑی دیکھ کے یہ ظاہر کیا کہ رات بہت ہو گئی ہے اور اسے جانا چاہیے۔ سکندر شاہ نے بداخلاقی کے اس مظاہرے کو بھی اہمیت نہیں دی۔ دل کی بات کہے بغیر وہ ہمیں جانے کی اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھا پھر اچانک باہر شور بلند ہوا۔

سکندر شاہ کے کان کھڑے ہوئے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

باہر سے کسی نے چلانا شروع کیا۔ ''چودھری صاحب... چودھری صاحب۔''

انور ایک دم اٹھا۔ اس کے پیچھے میں باہر نکلا۔ ایک گارڈ داخلے کے دروازے پر کھڑا واویلا کر رہا تھا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ سکندر شاہ کے محافظ اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ انور کو دیکھتے ہی وہ اپنا سر پیٹنے لگا اور دہائی دینے لگا۔

''او جی چودھری صاحب! جلدی چلو... بڑا ظلم ہو گیا۔ قیامت آ گئی۔''

انور نے اسے ڈانٹا۔ ''سیدھی طرح بات بتا۔''

''اجی کیا بتاؤں... کیسے بتاؤں؟ ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔''

''کتے کی طرح بھونکے جا رہا ہے۔ بولتا کیوں نہیں کیا ہوا؟'' انور دہاڑا۔

''وہ جی... حویلی... حویلی تباہ ہوگئی۔''

انور نے اسے جھنجوڑا۔ ''کیا بکتا ہے... حویلی کیسے تباہ ہوگئی؟''

وہ شخص زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ ''حویلی گر گئی چودھری صاحب! دشمنوں نے گرادی۔''

''کیسے گرادی۔ حویلی کوئی کچی دیوار تھی کہ گرادی؟'' انور نے کہا۔

''بم لگا دیا چودھری صاحب! بڑا دھما کا ہوا۔''

انور چیخا۔ ''دھما کا؟ ماں جی تو ٹھیک ہیں؟''

''کچھ پتا نہیں جناب عالی... آپ چلو... آگ لگی ہوئی ہے اندر تک۔''

انور اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے ڈرائیونگ خود کی۔ انور کی ذہنی اور اعصابی حالت خراب تھی۔ وہ بار بار پوچھتا تھا۔ ''آخر کس نے کیا یہ؟'' اور جواب سنے بغیر ہاتھ جوڑ کے اوپر اٹھاتا۔ ''ماں جی کو بچالے میرے مولا۔''

میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ''اللہ نے چاہا تو سب خیریت ہوگی انور۔''

آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے سلیم! میں نے ایسا کیا گناہ کیا تھا آخر... اور پھر میری ماں... اس نے تو ایک چیونٹی نہیں ماری کبھی... میں کیا کروں گا اگر انہیں کچھ ہوگیا؟''

میں نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی۔ خود میرے اندر سوالات کی یلغار تھی اور ہر امکان ایک نیا دھما کا کرتا تھا۔ بلاشبہ ماں جی کا کوئی دشمن نہیں ہوسکتا تھا۔ ظلم اور زیادتی انور کے باپ دادا کے زمانے سے جاری تھی لیکن اس کا شکار ہونے والوں کے لیے وہ نہ ظلم تھا نہ زیادتی تھی۔ اسے وہ نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کرتے تھے۔ انور بھی ان جیسا ہوتا تو احتجاج کوئی نہ کرتا۔ لیکن اس نے تو اپنا سب کچھ رعایا میں تقسیم کردیا تھا۔ مزارعوں میں ساری زمین بانٹ دی تھی۔

شعلے مجھے دور سے ہی نظر آگئے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ آگ نے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس دوزخ سے ایک بوڑھی عورت کو کس نے نکالا ہوگا؟ اسے کہاں پتا چلا ہوگا کہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ کیا کسی کو خیال آیا ہوگا یا موقع ملا ہوگا کہ چودھرائن کو اپنی جان پر کھیل کے بچالے۔

گاڑی روکتے ہی میں نے انور کو قابو کیا ورنہ وہ اپنی پروا کیے بغیر آگ میں گھس جاتا۔ آگ ابھی سامنے والے حصے تک تھی۔ گردونواح کے سارے کسان مزارع بالٹی بھر بھر کے آگ پر پانی ڈال رہے تھے لیکن ان کی کوشش لاحاصل تھی۔ عقبی حصے میں باغ تھا اور اس طرف سے اندر جانا ممکن لگتا تھا۔ کچھ دیر میں پوری حویلی کا جل کے راکھ ہو جانا یقینی تھا۔ شہر بہت دور تھا جہاں سے فائر بریگیڈ آسکتی تھی۔ انہیں کسی نے اطلاع ہی نہیں دی تھی اور دی جاتی تب بھی ان کی کارکردگی ہر جگہ ایسی تھی کہ وہ آئے بھی تو سب راکھ ہوجانے کے بعد۔

ہم پچھلی طرف سے اندر گھسے۔ شعلوں کی حرارت سے پسینا میرے سارے وجود پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ نوکروں کی رہائش گاہ سے گزر کے میں اور انور ایک ساتھ برآمدے میں پہنچے۔ آگ اب بھی دور تھی۔ دو کمرے اس کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔ ایک وہ جو بڑے چودھری صاحب کا میڈیکل یونٹ بنا ہوا تھا۔ دوسرا ساتھ والا جس میں اب ماں جی کا بسیرا تھا۔ ہم تقریباً ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انور چلایا۔ ''ماں جی...'' مگر اندر سے جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

ماں جی کمرے میں نہیں تھیں۔ فرش پر ان کی جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی چادر کی ہر شکن بتاتی تھی کہ وہ اس پر سو رہی تھیں۔ انور نے باتھ روم میں جھانکا۔ ''یہاں بھی نہیں ہیں وہ۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''وہ نکل گئی ہوں گی۔''

''نکل کے کہاں جائیں گی۔'' اس نے بدحواسی سے کہا۔

''چل باہر دیکھتے ہیں۔ باغ میں دیکھتے ہیں۔''

انور اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا اور ماں کو پکارتا رہا۔ میں نے آگ بجھانے کی لاحاصل کوشش کرنے والوں سے باری باری پوچھا۔ ان میں سے کوئی چودھرائن کو نکال کے نہیں لے گیا تھا۔ کسی نے انہیں باہر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کے ملازم مرے یا جان بچا کے نکل گئے تھے۔ دھماکے سے کتنے گارڈ جان سے گئے۔ کسی کے پاس ایک بھی سوال کا جواب نہ تھا۔

انور کی حالت غیر تھی۔ وہ دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ چیخ چلا رہا تھا۔ ''جاؤ دیکھو، گاؤں کے ہر گھر میں دیکھو، سب سے پوچھو۔''

سکندر شاہ اپنی سیکیورٹی فورس کے نصف درجن افراد کے ساتھ دو گاڑیوں میں نمودار ہوا۔ اس نے انور کو دور لے

جانے میں میری مدد کی کیونکہ آگ اتنی دیر میں پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ دھماکا کیوں ہوا۔۔۔ کس قسم کا تھا۔۔۔ کس نے کیا۔۔۔ یہ سب سوالات اب بے مقصد لگتے تھے۔

''میں نے فائر بریگیڈ والوں کو بلالیا ہے۔ پولیس بھی آرہی ہے۔''

''کیا فائدہ۔۔۔ وہ ماں جی کو نہیں لاسکتے۔'' انور بولا۔

''ایسی مایوسی کی بات نہ کر۔۔۔ اللہ نے چاہا تو وہ محفوظ ہوں گی۔'' سکندر شاہ نے کہا۔

اسی وقت جیسے زلزلہ سا آگیا۔ پوری حویلی بڑی آواز کے ساتھ زمیں بوس ہوگئی۔ ایک بہت بڑا آتش فشاں بہت سے چھوٹے چھوٹے بھڑکتے الاؤ بن گئے۔ دھوئیں اور گرد وغبار کا طوفان سا اٹھا اور خاموشی سی چھا گئی۔ آگ بجھانے کی بے سود کوشش کرنے والے بھی دور ایک حلقہ سا بنا کے کھڑے ہوگئے۔ آگ سے بجلی کی تمام تاریں جل چکی تھیں جو حویلی تک آتی تھیں۔ اب ہر سو اندھیرا تھا۔ بہت سے لوگ رو پیٹ بھی رہے تھے کیونکہ حویلی میں کام کرنے والے ان کے پیارے بھی لاپتا تھے۔

فائر بریگیڈ والے تقریباً ایک گھنٹے میں نمودار ہوئے جو میرے خیال میں اچھی کارکردگی تھی۔ یہاں سے شہر تک کا فاصلہ ہی پون گھنٹے کا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا وہ اطلاع ملنے کے پندرہ منٹ کے اندر روانہ ہوگئے تھے۔ یہ سکندر شاہ کے اثر ورسوخ کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے غیر معمولی مستعدی کے ساتھ حویلی پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ آگ کا اژدھا پانی پڑنے سے پھنکارتا تھا اور اس کی دہکتی سانس بھاپ کا مرغولہ بن کے اٹھتی تھی۔ پانی کا ٹینک خالی ہونے سے پہلے ہی آگ پر قابو پایا جاچکا تھا۔ تاہم گرم اینٹوں اور بھاپ کی حرارت کا اثر باقی تھا۔

جب پولیس آئی تو ان کے ساتھ دوسری گاڑی بم ڈسپوزل والوں کی تھی۔ انہوں نے بڑی بڑی سرچ لائٹس میں جائے حادثہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک ایس پی کو آدھی رات کے وقت نیند چھوڑ کے آنا پڑا تھا۔ وہ سکندر شاہ ۔۔۔ اور چودھری انور کے سامنے جماہیاں لے رہا تھا۔ بالآخر اس نے جھاڑ کھائی اور سیدھا ہوگیا۔

''تم جاؤ گھر اور سو جاؤ۔'' سکندر شاہ نے کہا۔ ''میں ڈی آئی جی صاحب سے کہتا ہوں کسی اور کو بھیج دیں۔''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی شاہ جی۔۔۔'' اور ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے آگے چلا گیا۔

صبح ہونے سے بہت پہلے ایس پی نے رپورٹ پیش کی۔ ''یہ بم کا دھماکا تھا سر۔''

''بم؟ وہ کہاں سے آیا؟'' انور بولا۔

''جس نے کیا وہ ساتھ لایا ہوگا۔ ایک کلو کے قریب بارود والا بم تھا۔''

انور نے کہا۔ ''کیا بم اتنی آسانی سے مل جاتے ہیں؟''

''سب ملتا ہے چودھری صاحب، افغانستان کی طرف سے بم اور کلاشنکوف ہی نہیں پیٹرانک PATRIOTIC میزائل تک آرہے ہیں۔'' ایس پی بولا۔ ''مگر یہ کام کوئی عام آدمی نہیں کرسکتا۔ آپ کا کوئی دشمن ہے؟''

''دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ دشمنی پالنا ہمارا خاندانی شوق رہا ہے مگر ایسا کوئی نہیں جو بم سے حویلی اڑادے۔''

دھیرے دھیرے روشنی نے رات کی تاریکی پر غلبہ حاصل کیا۔ منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ قدیم و جدید کا متوازن نمونہ چودھریوں کی حویلی کی جگہ اب ایک ملبے کا بے ہنگم ڈھیر تھا۔ کھڑی رہ جانے والی دیواروں پر سیاہی یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے زخم خوردہ لاش پر خون نظر آتا ہے۔ دروازوں، کھڑکیوں کے چوکھٹے کوئلہ بن کے بکھر گئے تھے اور ان کی جگہ خلا رہ گئے تھے۔ ملبے کے ڈھیر میں کہیں کہیں سے دھواں اٹھ کر فضا کی وسعتوں میں گم ہورہا تھا۔ ماحول میں ایک نامانوس بو تھی جو گرم اینٹوں پر سے گزر کر آنے والی ہوا کے ساتھ محسوس ہوتی تھی۔

انور گم صم ایک کرسی پر بیٹھا تھا جو اسے کسی نے لاکر دی تھی۔ میں اور سکندر شاہ دروازے کھولے گاڑی میں بیٹھے پولیس کی سرکاری ضابطے کی رسمی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اس کے سوا ہمارے کرنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ بم ڈسپوزل والوں کا کام پہلے ہی ختم ہوچکا تھا وہ اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ثبوت شہادت جمع کرچکے تھے۔ پولیس نے گاؤں کے لوگوں کو ملبے سے لاشیں نکالنے پر لگا دیا تھا۔ دن نکل آنے کے بعد ایمبولینس بھی پہنچ گئی تھی جس میں ایک ریٹائرمنٹ کی عمر والا بیمار صورت ڈاکٹر تھا اور ایک موٹی کالی بد دماغ نرس۔ زخمی کوئی نہیں تھا۔ چار افراد دھماکے کی نذر ہوئے تھے۔ تین جل کر مرے تھے اور دو حویلی کے مسمار ہونے سے ملبے میں دب گئے تھے۔

انور کا صدمے اور پریشانی سے پاگل نظر آنا برحق تھا۔ وہ امید اور ناامیدی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کسی

اطلاع کا منتظر تھا کہ شاید ملبے سے نکالی جانے والی کوئی لاش ماں جی کی ہو مگر دوپہر تک اس کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ پولیس تمام لاشوں کو اوپر نیچے ایمبولینس میں ڈال کے پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے لے گئی۔ اس وقت میرا دماغ گزرے وقت کی ایسی ہی وحشت ناک یادوں میں بھٹک رہا تھا جب آگ نے میرے گھر کو راکھ کیا تھا۔ اس میں میرا بھائی جل کے خاک ہوا تھا اور ایک نامعلوم عورت جو بعد میں نادر شاہ کی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ ایمبولینس میں ڈالی جانے والی ہر لاش مجھے ویسی ہی لگتی تھی۔ ان کے جلے ہوئے جسموں کی بھیانک بو بھی وہی تھی۔ میں ماضی اور حال کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ میں پیچھے رہ جانے والے وقت میں کھڑا ہوں پھر کوئی صدا مجھے حال میں کھینچ لاتی تھی۔ میرا بھائی اور انور کی ماں بربریت اور سفاکی کا ایک جیسے نشانہ بنے تھے۔ آج انور وہ محسوس کرسکتا تھا جو اس نے مجھ سے سنا تھا۔

سکندر کے گھر سے چائے اور ناشتے کی سپلائی جاری تھی۔ اس سے زیادہ تر پولیس والے مستفید ہوتے رہے۔ میرے مجبور کرنے پر انور نے ایک کپ چائے اس وقت لی جب ایمبولینس جا چکی تھی۔ ”ان میں تو ماں جی نہیں تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا۔“

”میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ نکل گئی ہوں گی۔“

”یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ کتنے گھنٹے ہو گئے۔ وہ ابھی تک لوٹ کے نہیں آئیں۔ میں نے آس پاس کے علاقے میں تلاش کرنے والے بھیجے تھے۔ وہ بھی ناکام واپس آگئے۔“

میں نے انجان بن کے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا اُن کے ساتھ... تیرا کیا خیال ہے۔“

”وہی جو تو کہنا نہیں چاہتا۔ جنہوں نے دھماکا کیا وہی انہیں اغوا کر کے لے گئے۔ یہ اتفاق نہیں ہے کہ میں باہر تھا۔ وہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھے بیٹھے تھے۔“

”وہ کون؟“

”معلوم ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یقین آتا جا رہا ہے کہ یہ اس مرید کے حامی اور ساتھی ہوں گے جو ہمارے قبضے میں ہے۔ ایک مارا گیا تھا لیکن دس ابھی باقی ہیں۔“

”شاید ایسا ہی ہے۔ ایسا ہوگا تو ان کا مطالبہ بھی بہت جلد سامنے آجائے گا۔“

سکندر شاہ بھی ایف آئی آر کی رسمی کارروائی کے لیے پولیس کے ساتھ جا چکا تھا۔ پورے گاؤں میں ماتم تھا۔ گھر گھر سے رونے پیٹنے کی دردناک آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ابھی یہ سوگ کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ جب بالآخر سوختہ تن لاشیں واپس لائی جائیں گی تو اپنے ہی ان کو روزِ حساب تک کے لیے زمین کے سپرد کریں گے۔ یہاں نہ سہی وہاں تو ان بے گناہوں کے قاتل سزا پائیں گے۔ فی الحال انہیں اسی خیال کے ساتھ صبر اختیار کرنا تھا۔ سوم، دسواں، چہلم اور برسی دنیا کے کام ہیں۔ جاری رہتے ہیں۔

دوپہر ہوئی تو میں نے انور کے ساتھ زبردستی کی۔

”اب یہاں بیٹھ کے انتظار کس کا؟ گھر چل۔“

”کون سے گھر؟ میرا تو کوئی گھر نہیں رہا۔“

”سب گھر تیرے ہیں۔ چل اٹھ، کچھ دیر آرام کر لے۔“

وہ میرے کھینچنے سے اٹھا۔ ”سلیم! بس ماں جی کا پتا چل جائے۔ اس کے بعد میں حویلی پھر بناؤں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے بنی تھی۔ کسی کو فرق نہ محسوس ہو۔“

”ایسا ضرور کرنا چاہیے تجھے مگر ابھی چل۔“ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔

وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن پھر بھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ کھلی آنکھوں سے نہ جانے کہاں کس کو دیکھ رہا ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان ان گنت اچھی یادوں کا جزیرہ تھا۔ وہی جزیرہ جس پر ہر بیٹا اپنی ماں کے ساتھ بچپن سے جوانی تک کا وقت گزار لیتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس وقت کی یادیں خواب جیسی ہو جائیں گی۔

”آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں سلیم؟“ اس نے راستے میں پوچھا۔ ”کیا منوانا چاہتے ہیں مجھ سے۔“

”یہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرید کی رہائی کا مطالبہ کریں جو اس وقت ہماری تحویل میں ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”اب تو وہی واحد ذریعہ ہے ان تک پہنچنے کا۔“

”یہ ایک بہت طاقتور مافیا تھی۔ وہ پھر اپنے قدم جمانا چاہتے ہیں یہاں۔“

انور نے کہا۔ ”یہ نہیں ہوسکتا، کبھی نہیں ہوگا۔“

”اس زمین پر تیرا کوئی اختیار نہیں۔ روبی اس کی مالک ہے۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں روبی کو... وہ اپنی بڑی بہن شاہینہ جیسی نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی اس کے خلاف تھی اور اب دوبارہ اس مکروفریب کے دھندے کو شروع کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ حالانکہ اس میں خطرات بہت

ہیں۔"

"ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ایک مکروہ کاروبار ختم ہوگیا، اب ہم کیوں اسے دوبارہ چلانے والوں کی خواہش کے آگے سر جھکائیں۔"

"میں انہیں چھوڑوں گا نہیں، اگر میری ماں کو کچھ ہوا تو میں انہیں چن چن کر ماروں گا۔ وہ جہاں بھی ہوں گے۔ میں ان کو تلاش کروں گا۔ جو میری ماں کے ساتھ ہوا، پہلے نہ جانے کتنی ماؤں اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ تب مجھے احساس نہیں تھا۔" انور بولتا رہا۔

انور کو تھکن کا احساس نہ تھا مگر ذہنی اور جسمانی دباؤ میں رات بھر جاگنا اور کھڑے رہنا انسانی قوتِ برداشت کی سخت ترین آزمائش تھی۔ اس نے پہلے میرے ساتھ تہ خانے میں جا کے اپنے قیدی کو دیکھا۔ تفتیش کرنے والوں کی حالت اس سے زیادہ ابتر لگتی تھی۔ ابھی تک وہ اپنے مقصد میں ناکام تھے۔ الٹا میرے حکم پر وہ زیرِ تفتیش ملزم کی جسمانی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اس کے زخموں پر مرہم لگا رہے تھے اور تشدد سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ خوش نہیں تھے۔ میں نے ان کی تفتیشی صلاحیت کو چیلنج کیا تھا۔

میں نے انور پر نظر رکھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ مجرم پر حملہ کر سکتا تھا۔ اسے جان سے بھی مار سکتا تھا اگر اس کے جذبات قابو میں نہ رہتے۔ "آؤ جی چودھری صاحب اور ملک صاحب! دیکھو میں زندہ ہوں۔"

میں نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم بہت جلد افسوس کرو گے کہ مر کیوں نہ گئے تھے۔ ہم نے زندہ رکھا تمہیں۔"

وہ مصنوعی طریقے سے ہنسا۔ "اوہو ہو... تم تو خدائی کے دعویدار بن رہے ہو۔ زندگی اور موت پر اختیار ہے تمہارا؟"

انور نے انسپکٹر سے پوچھا۔ "کوئی کامیابی ہوئی؟"

"تفتیش کو آپ کیا سمجھتے ہو جی؟ کرکٹ کا کھیل شرافت سے کھیلا جانے والا؟" انسپکٹر پھٹ پڑا۔ "ہم نے مُردوں کو بولتے دیکھا ہے۔"

"ہم تمہیں سکھائیں گے تفتیش۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہیں افسوس ہوگا کہ تم نے عمر گنوائی۔ اب مارنے کے بجائے تمہاری ڈیوٹی ہے کہ اس کو مرنے نہ دو۔"

انور میرے ساتھ اوپر آ گیا۔ "آخر ایسا کون سا جادو ہے تیرے پاس جس پر یقین ہے تیرا؟"

"یار مجھے یقین تو نہیں... امید ہے۔" میں نے کہا۔

کپڑے بدل کے انور نے میرے اصرار پر تھوڑا بہت کھایا اور میرے ہی کمرے میں سو گیا۔ سکندر شام تک قانونی معاملات کی الجھن سے نمٹنے میں مصروف رہا۔ روبی اور ریشم بھی رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ جو بات انہیں میں نے مختصراً بتائی اس کا اندازہ انہیں پہلے سے تھا یا انہوں نے کسی سے سن لی تھی۔ روبی نے مجھے مجبور کیا کہ "اپنی حالت ٹھیک کرو پہلے اور پھر سو جاؤ۔"

"میری حالت کو کیا ہوا ہے؟"

اس نے مجھے پلٹ کر آئینے کے سامنے کر دیا۔ میرے بالوں میں دھول اور چہرے پر دھوئیں کی کالک تھی۔ میرے چہرے پر بھی سیاہی اور مٹی کے دھبے تھے جو پسینے سے پھیل گئے تھے۔ "دیکھ لو، تم ایسے تھے کیا؟"

اب مجھے اس کی سننی پڑی، نہا دھو کے اور کپڑے بدلنے کے بعد اپنی حالت میں بہت بہتری محسوس ہوئی۔ اس وقت میں کافی پینے کے موڈ میں تھا مگر روبی ایک گلاس میں پانی لے کر آ گئی۔ "اس میں گلوکوز ہے۔ توانائی بحال کر دے گا۔"

میں نے اس کی مان لی۔ "اب زحمت نہ ہو تو ایک کپ کافی بنا کے لا دو، مجھے کچھ تھکن ہے۔" میں لیٹ گیا۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اب زحمت آپ کو نہ ہو تو آنکھیں بند کریں، میں نے گلوکوز میں خواب آور گولی ڈالی تھی۔" لائٹس بجھا کے وہ باہر نکل گئی۔ کچھ ایسی ہی حرکت میں نے بھی انور کے ساتھ کی تھی ورنہ اس کو سکون کی نیند لینا مشکل ہوتا۔ لیکن مجھے دھوکے سے گولی نہیں کھلانی پڑی تھی۔ وہ مشکل سے مانا تھا مگر پھر اس نے گولی کھائی تھی۔

مجھے شاہینہ کی یاد آ گئی۔ آخر یہ بھی اسی کی بہن تھی۔ اس نے اپنی لگن سے اسپیشلسٹ ہونے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ کیا روبی نے کچھ نہیں سیکھا ہوگا؟ باپ نے چاہے نہ بتایا ہو بڑی بہن نے سکھایا ہوگا۔ میرے سامنے ایک مشکل چیلنج درپیش تھا اور میری امیدیں روبی سے وابستہ تھیں۔ دوا کا اثر عام حالات میں چھ گھنٹے رہتا ہے لیکن اندر کی بے چینی کے باعث میں تین گھنٹے بعد جاگ گیا۔ انور کو سوتا دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا۔ اب یہ لازمی تھا کہ انور بھی اسی گھر میں رہے۔ میں نے لڑکیوں کو تلاش کیا تو وہ ایک بیڈروم کو سیٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ مراد کا بیڈروم تھا جو مہینے بھر سے بند پڑا تھا۔

روبی نے مجھے دیکھا تو ماتھے پر آنے والے بال سمیٹے۔ "اب یہ آپ کی آخری آرام گاہ ہوگی۔"

اس بے موقع مذاق کو میں نے بھی پسند نہیں کیا۔
''کیوں؟ اوپر بھی تو بیڈروم ہیں... کوئی سا انور کو دے دو اور اس کے ساتھ میں بھی رہ سکتا ہوں۔ اسی کمرے میں جہاں وہ سویا ہوا ہے۔''
''یہ امورِ خانہ داری کے معاملات ہیں۔''
''مگر... مراد کا بیڈروم تھا یہ... اب تک بند تھا۔'' میں نے احتجاج کیا۔
''میں اس کمرے کو آسیب زدہ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔''
میں نے کہا۔ ''تمہیں اس کے ماں باپ کے جذبات کا بھی احساس ہونا چاہیے۔''
''ان سے میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔ ماں جی سے... اور انہوں نے کہا کہ یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی۔ کمرا آباد رہنا چاہیے۔''
میں نے اعتراض جاری رہا۔ ''اس میں انور بھی رہ سکتا تھا۔''
''نہیں رہ سکتا تھا۔'' روبی بولی۔ ''کیونکہ ساتھ ہی میں ہوں اور بالکل سامنے دروازہ ہے ریشم کے کمرے کا۔''
''اب تم اس کی نگرانی کرو گی... خیر...''
''کافی چاہیے تمہیں... میں لاتی ہوں دو منٹ میں۔'' اس نے چٹکی بجائی۔
میں باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ ماحول پر ایک عجیب اداس کر دینے والی دھند سی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انور کی وجہ سے ریشم اداس اور پریشان ہے لیکن یہاں بھی خوانخواہ رسم و رواج کی دیوار کھڑی تھی۔ جو اس بار خود روبی نے کھڑی کی تھی۔ اگر اسے انور سے ملنے دیا جاتا تو کوئی قیامت نہ آجاتی۔ اس وقت وہی سب سے زیادہ غم گساری کا حق ادا کر سکتی تھی۔ دس منٹ بعد روبی ٹرے میں دو مگ رکھے نمودار ہوئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔
''ریشم کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے کیوں فضول میں اپنی ٹانگ اڑا رکھی ہے بیچ میں... وہ کتنا عرصہ ایک ساتھ گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا منگنی ہو گئی تو وہ غیر ہو گئے۔''
اس نے خاموشی سے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ ''وہ انور کے ساتھ کافی پی رہی ہے۔''
''یعنی آپ نے مجرم کو ریمانڈ پر چھوڑ دیا؟''
''یہ میں نے بھی کہا تھا اس سے اور یہ ضروری بھی تھا۔'' وہ بولی۔ ''مذاق کی بات الگ ہے۔ یہ مذاق کا وقت نہیں۔''
میں اسے دیکھتا رہا۔ ''کیا چیز ہو تم بھی... ایسے موڈ بدل لیتی ہو... جذبات پر ریموٹ کنٹرول ہے۔''
''رکھنا پڑتا ہے سلیم صاحب۔'' اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر کہا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے گہرے ہو گئے۔ ''میرا شوہر نہیں رہا۔ بہت محبت تھی مجھے اس سے، ساری دنیا کو ٹھکرا دیا تھا میں نے اس کے لیے... خود سے زیادہ بدقسمت مجھے کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ وقت نے کتنی کم مہلت دی ہمیں... لیکن یہ میری قسمت تھی یا خدا کی مرضی... اب میں کیا کروں؟ ایک صورت یہ تھی کہ ساتھ ہی مر جاؤں۔''
خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد میں نے سوال کیا۔
''مگر تم نے ایسا نہیں کیا؟''
''ہاں، کیونکہ مراد جانے سے پہلے مجھ پر دنیا کی سب سے بڑی سب سے مقدس اور سب سے زیادہ مسرت دینے والی ذمے داری سونپ گیا تھا۔ میں اپنے ساتھ اسے بھی ختم کر دیتی۔ پھر مراد کے ماں باپ تھے۔ جب میں نے موازنہ کیا تو اپنی بدبختی مجھے کم لگی۔ وہ میرا سہارا تھا تو ان کا بھی تھا جس کو اعتماد کے قابل بنانے کے لیے انہوں نے پچیس سال دن رات محنت کی تھی اور دعائیں مانگی تھیں۔ وہ بھی تو بے سہارا رہ گئے تھے۔''
''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی حوصلہ مند ہو۔''
وہ بولتی گئی۔ ''ایک رات میں نے خواب دیکھا جو مجھے حقیقت لگا۔ مراد میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو میں جاگ گئی۔ اس نے کہا کہ لیٹی رہو... میں ایک بات کہنے آیا ہوں جو میں کہنا بھول گیا تھا۔ بعد میں کہہ دیتا جب موقع ملتا۔ میرے ماں باپ میری ذمے داری تھے۔ اب انہیں میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ جب وہ بوڑھے ہو جائیں گے تو میرا جانشیں آجائے گا۔ لیکن اس وقت تک تمہیں ان کا غم بٹانا ہے۔ ورنہ وہ زندہ کیسے رہیں گے۔ وعدہ کرو یہ ذمے داری تم نبھاؤ گی اور میں نے کہا کہ میں نبھاؤں گی۔'' وہ خاموش ہو گئی اور پھر بولی۔ ''میں مراد سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہی ہوں۔ بوڑھے لوگوں کے پاس حوصلہ کم ہوتا ہے۔ یہ میں دے رہی ہوں ان کو۔''
''سکندر شاہ بڑی ہمت رکھتا ہے۔ اس نے خود کو بکھرنے اور ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس نے خاندان کے بکھرے اکیلے لوگوں کو اکٹھا کر لیا، ایک نیا خاندان تشکیل دینے کے

لیے۔اس میں ریشم اجنبی تھی اور میں باہر کا تھا۔کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا ہمارا۔۔۔لیکن اس نے بھی جو کیا اپنے لیے نہیں کیا، سب تمہارے لیے اور تمہارے مستقبل کے لیے کیا۔''

ابھی تک مجھے روبی سے وہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جو میرے خیال میں سب سے اہم تھی۔سکندر شاہ آیا تو سیدھا اندر چلا گیا۔روبی کے ساتھ میں بھی اندر گیا۔وہ انور کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا اسے دن بھر کی روداد سنا رہا تھا۔

میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔''پیر سائیں کے مرید تو آس پاس کے علاقے میں ہی زیادہ ہوں گے۔'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''مگر وہ روپوش ہو گئے ہیں یا ان جاں نثار مریدوں کی پناہ میں ہیں جو انہیں پل پل کی خبر پہنچا رہے ہوں گے۔ میری ملاقات ایک نوجوان اور ذہین پولیس افسر سے ہوئی۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسا نہ ہو جو یہاں کے کرتا دھرتا تھے، وہ یہاں سے مایوس ہو کے الگ الگ کاروبار شروع کر دیں۔تجربہ ہے ان کے پاس۔۔۔دو چار سال میں دکان چل جاتی ہے۔''

''یہ تو اس نے ٹھیک کہا۔شرک اور بدعت کی بیماری پھیل کے وبا بن جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس نے کہا کہ میں نے سارے علاقے میں پولیس کے مخبر اس کام پر لگا دیے ہیں جیسے ہی کہیں کوئی ملنگ فقیر کسی نئے علاقے میں روحانیت کا ڈراما شروع کرے۔۔۔مجھے بتائیں۔''

انور نے ناگواری سے کہا۔''آپ لوگ کل کی باتیں کر رہے ہیں۔آج کا دن گزر گیا، ماں جی کا کچھ پتا نہیں۔''

''اس افسر نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ وہ رابطہ کریں گے اور بدلے میں تمہارے قیدی کی رہائی مانگیں گے۔'' سکندر بولا۔

''لیکن کب؟ ان کی صحت سختی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر یہ صدمہ۔'' وہ بے چینی سے بولا۔

سکندر بولا۔''اللہ بہتری کرے گا۔کیا اس بڈھے کا اس گروہ سے تعلق تھا جسے انہوں نے قبر میں لٹا دیا تھا۔'' سکندر بولا۔

''ضرور ہوگا۔وہ بتا سکتا تھا کہ نورین یا فاطمہ کہاں ہے؟ وہ اور اس کا بھانجا جرائم پیشہ تھے۔بھانجے کا معلوم کیا جا سکتا ہے۔وہ ایک بہت بڑے گینگ کی مشین کا بہت چھوٹا اور چلتا پرزہ تھا۔اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔''

انور نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔''بس ایک بار ماں جی خیریت سے لوٹ آئیں پھر ہم سب کا پتا چلا لیں گے۔''

رات نو بجے فون آیا۔ایک ملازمہ نے کورڈلیس فون لا کے سکندر کو دیا۔''ہیلو۔'' کے ساتھ ہی میں نے سکندر کا رنگ بدلتا دیکھا، اس نے دو تین بار ہیلو کہا۔''پتا نہیں کون تھا تین بار ہنسا، بولا کچھ نہیں۔''

انور چوکنا ہو گیا۔''وہی لوگ ہوں گے پھر کال کریں گے نمبر دیکھ لیں۔''

سکندر اٹھ کے فون سیٹ تک گیا اور کورڈلیس والا حصہ اس سے منسلک کر دیا۔''اس بے وقوف نے خود ہی موقع دیا ہے۔''

سکندر نے فون کے قریب ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا اور آن کر دیا۔اس کے دو تار فون کے اسپیکر سے ملے ہوئے تھے۔ٹیپ ریکارڈ سیل سے چلتا تھا اور اب تمام گفتگو سنی بھی جا سکتی تھی اور ریکارڈ بھی ہو سکتی تھی۔انتظار میں ہمارے اعصاب جواب دینے لگے۔سب کی نظر گھڑی پر رہی جس کی سوئیاں دائرے میں حرکت کر رہی تھیں۔اپنی اپنی رفتار سے۔سکنڈ رفتہ رفتہ منٹ بن رہے تھے۔

انور اٹھ کے لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔''وہ ہمارے اعصاب توڑ رہے ہیں۔''

''لیکن اب تصدیق ہو گئی، ماں جی زندہ ہیں۔وہ پھر بات کریں گے۔'' سکندر نے کہا۔

''اور آج ہی۔۔۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ہم سب فون کے دونوں طرف صوفے پر خاموش بیٹھے تھے۔دوسرے کنارے پر کھانے کی میز تھی۔پہلے روبی نے اور پھر ریشم نے اندر جھانکا اور کھانے کا پوچھا۔سکندر نے خفگی سے کہا۔''ابھی نہیں، بتا دیں گے۔ادھر کوئی نہ آئے۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا۔

گھنٹی پھر بجی تو ہم سب تقریباً اچھل پڑے پھر سکندر نے آواز کو پُرسکون رکھتے ہوئے ہیلو کہا۔

جواب میں نے بھی صاف سنا۔''کیا خیال ہے ٹھیکے دار صاحب، بات آپ کرو گے؟''

بولنے والے کی آواز بھاری اور پُرسکون تھی۔سکندر نے کہا۔''کس بارے میں؟''

وہ ہنسا۔''اتنے بھولے مت بنو، ماں تو وہ چودھری صاحب کی ہے۔قیمت اسی سے پوچھو۔''

''وہ تمہارے پاس ہے۔بم تم نے لگایا تھا؟''

''دیکھو، چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔تین منٹ

ہیں تمہارے پاس... انور کہاں ہے؟"

سکندر نے فون انور کو پکڑا دیا۔ "بتاؤ کیا چاہیے تمہیں کتنا پیسا؟"

"اب تیرے پاس ہے نہیں... اور ہمیں ضرورت نہیں۔"

"پھر کیا چاہیے؟" انور نے کہا۔

"مریداول کو رہا کر دو۔ تمہاری ماں مل جائے گی۔ اس کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری ماں کو بھی نہیں ہوگا، باقی بعد میں۔"

فون بند ہو گیا۔ انور ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ سارا گیم سامنے آ گیا تھا۔ یہ اطلاع اہم تھی کہ ہم نے مریداول کو پکڑ رکھا تھا۔ اپنی اپنی سینیارٹی کے اعتبار سے وہ اول، دوم، سوم کہلاتے ہوں گے۔ تصدیق ہو گئی تھی کہ ماں جی زندہ ہیں مگر ان کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی۔ وہ جو چاہتے تھے کہ اصل درگاہ کی جگہ زیادہ شان و شوکت والی درگاہ بنے اور ان کا مذموم کاروبار پہلے کے مقابلے میں زیادہ چلے۔ اس بدمعاشی کے اڈے کو ختم کرنے والا سکندر تھا۔ وجہ ذاتی عناد سہی... اس نے یہ کام گا مارستم کی مدد سے کیا تھا اور خرابی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ قدرتی طور پر ان کا سب سے بڑا دشمن سکندر تھا۔ دوسرا نمبر میرا تھا جس کو پیر سائیں نے اپنا جانشین نامزد کر دیا لیکن میں دشمنوں سے جا ملا۔ ان کی نظر میں ڈاکوؤں کو بلانے اور پیر کے ساتھ ان کی فیملی کا نام و نشان مٹانے والوں کے ساتھ میں نے سازباز کی تھی۔ تیسرے نمبر پر اب روبی آ گئی تھی جس نے وہاں دوبارہ درگاہ کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی پشت پناہی سکندر کے ساتھ ہم سب کر رہے تھے چنانچہ ہم سب گردن زدنی تھے۔

ہم نے ریکارڈنگ کئی بار سنی مگر اس کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ بات کرنے والے نے تین منٹ دیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہم نے اپنے فون کو ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ سے آبزرویشن پر رکھنے کو کہا ہو گا تو معلوم ہو جائے گا کہ کال کہاں سے ہوئی تھی۔ ایسے واقعات کا حوالہ ضرور دیا جاتا تھا کہ کچھ لوگوں نے کال کرنے والوں کو بھی گفتگو میں الجھایا اور اتنی دیر میں پولیس پہنچ گئی۔ عموماً وہ کسی پبلک کال آفس سے بات کر رہے ہوتے تھے۔ پی سی او بھی دو قسم کے تھے۔ ایک جو دکان داروں نے بنا رکھے تھے۔ دوسرے محکمے کے خودکار جو سکہ ڈالنے سے کنیکٹ ہو جاتے تھے۔ ہم سے بات کرنے والوں نے جو تین منٹ کی لسٹ رکھی تھی، بہت کم

اپنی ہم عمر عورتوں سے مل کر انہیں کبھی خوشی نہیں ہوتی...... یوں ہی چپ لگ جاتی ہے

تھی۔ شاید دس منٹ میں بھی ایسی کارکردگی کا مظاہرہ ممکن نہ تھا کہ کال کا پتا لگ جائے تو قریبی تھانے کو مطلع کیا جائے اور وہاں سے پولیس فورس مستعدی دکھاتے ہوئے مجرم کو مصروفِ گفتگو گرفتار کر لے۔ یہاں بڑے شکم کو سنبھال کے کسی تھانے دار کا اٹھنا، بیلٹ باندھنا، ماتحتوں کو حکم جاری کرنا کہ وہ اسلحہ سنبھالیں اور پھر کسی سرکاری گاڑی میں سوار ہوں تو پتا چلے کہ ٹائر پنکچر ہے یا گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔

مراد کی ماں کے سامنے کسی نے اپنے رویے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ گھر میں کوئی زلزلہ آیا ہوا ہے۔ پتا نہیں روبی کے حلیے میں تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے آسانی سے قبول کر لیا تھا کہ سب کچھ پہلے کی طرح ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت کتنی ناقابلِ اعتبار ہے۔ روبی اور ریشم نے ہماری صورتوں پر پڑھ لیا تھا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے مگر سکندر نے پہلے ہی ان کو ڈرائنگ روم سے نکال دیا تھا۔ اب بھی کوئی ان کو شریکِ راز کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم تینوں پھر اکٹھے ہوئے تو سکندر نے پوچھا۔ "بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟"

"کیا کرنا چاہیے؟" انور نے کھلے لہجے میں کہا۔ "تم کہتے ہو تو میں مرید کا بھر جائی سے تبادلہ کرا سکتا ہوں۔ محفوظ رہتے ہوئے۔"

میں نے کہا۔ "ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تم نے سنا ہوگا کہ اس نے آخر میں کیا کہا تھا؟"

انور نے سر ہلایا۔ "ہاں، باقی پھر۔"

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ان کے مطالبات کی فہرست میں اور کچھ بھی ہے۔“

”وہ دوبارہ درگاہ بنانا چاہتے ہیں۔ روبی اس پر تیار نہیں اور میں بھی... لیکن ماں وہ تمہاری ہے، تم جیسا کہو گے۔“

انور سے پہلے میں نے کہا۔ ”اتنی جلدی میں فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ اگر تھوڑی سی مہلت ملے تو ہوسکتا ہے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

”کھل کر بتا تو کیا سوچ رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”انور! فرض کر وہ پھر کل فون کرتے ہیں۔ اگر ہم فوری جواب سے بچ جائیں۔ ایک آدھ دن کی مہلت لے لیں۔“

”انہیں شک ہو جائے گا۔“ انور بولا۔

”یار جتنی اہمیت تمہارے لیے ماں کی ہے۔ ان کے لیے مرید اول کی اتنی نہ سہی... باقی سب سے زیادہ ہے۔ تھوڑی سی مزاحمت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی ہمت چاہیے تو بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“

”تھوڑی سی ہمت میں بہت زیادہ رسک ہے اور ہوگا کیا ایک دو دن میں آخر؟“

سکندر نے اس کی تائید کی۔ ”انور ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ چٹان ہے۔ ٹوٹ جائے گا بولے گا نہیں، یہ پولیس کے لوگ جو یہاں بھیجے گئے، تفتیش کے ماہر تھے۔ تم نے ان کو بھی روک دیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک دن اور ایک رات کی مہلت چاہیے۔“

”کیا کرے گا تو؟“

”ابھی نہیں بتا سکتا۔ ہوسکتا ہے کل شام تک وہ کچھ بتا دے۔“

ان دونوں کے لبوں کی تلخ طنزیہ اور مذاق اڑاتی مسکراہٹ نے وہ کہہ دیا جو الفاظ نہیں کہہ سکتے تھے۔

”انور! مجھ پر ہمیشہ بھروسا کیا تو نے... اور یہ اعتماد کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ اب میں جانتا ہوں کہ ناکام رہا تو تیرے سامنے ساری عمر شرمندہ رہوں گا۔ پھر بھی میں رسک لے رہا ہوں۔ رسک میرے لیے نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ فائدہ ہوگا۔ بس کل شام تک۔“

وہ دونوں کچھ دیر ساکت اور خاموش بیٹھے رہے۔

”چل ٹھیک ہے۔ ان خطرناک مجرموں کو ٹھکانے لگانا جہاد سے کم تو نہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، کیا کرنا ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کرنا۔ میں صبح کوشش کروں گا۔ یہاں کے قانونی اور دوسرے معاملات سے تم نمٹ لینا اور اب میرا خیال ہے کہ آنے والے دن کی تیاری کے لیے ہم سب کو سو جانا چاہیے۔ کام بہت ہیں اور مشکل۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے لیے روبی نے وہ کمرا مختص کر دیا تھا جو اس کا اور مراد کا حجلۂ عروسی رہا ہوگا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ متصل کمرے میں ہے۔ میں نے لائٹ آف کی اور آنکھیں کھول کے نیند سے لڑتا رہا۔ مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب گھر کی خاموشی سب کے سو جانے کی خبر دے۔ خواہ خبر غلط ہو۔ سب میری طرح نیند سے لڑ رہے ہوں۔ دروازے پر انگلی سے دستک سن کے میں چونکا۔ آواز کیے بغیر کنڈی کھول کے دیکھا تو روبی اندر آگئی۔

”تم کیا کر رہی ہو یہاں؟“

”مجھے ضروری بات کرنی تھی تم سے، ابھی... اور میں جاؤں گی نہیں خواہ تم شور مچاؤ۔ میں کافی لائی ہوں۔“ اس نے ٹرے میں رکھی ہوئی ننھی سی ستارے جیسی روشنی کو جلا دیا۔ اب میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ پریشانی میں پردے برابر کر کے میں پلٹا تو وہ بیڈ کے ساتھ والے صوفے پر براجمان تھی۔

”ایسی کون سی قیامت آجاتی اگر یہ بات صبح کر لی جاتی؟“ میں نے کہا۔

اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔ ”بس اللہ کا حکم تھا کہ بات ابھی کی جائے۔ اس کے علاوہ عقل مندوں نے کہا ہے کہ آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔ یہ عقل مند بھی خوب ہیں۔ دوسرا کہتا ہے جلدی کا کام شیطان کا۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا بولتی ہو۔ خیر فرماؤ ساڑھے تین سو الفاظ میں کہ مدعا کیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“

”میرے پاس ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”آج سارا دن ہم خواتین کو تم لوگوں نے دور رکھا۔ بند دروازے کے پیچھے غٹرغوں کرتے رہے۔ آخر کیوں؟“ اس نے دھپ سے میز پر ہاتھ مارا۔

میں اچھل پڑا۔ ”کیا کرتی ہو، سن لے گا کوئی۔“

”الحمد للہ مسماۃ ریشم جان دروازے سے کان لگائے کھڑی سب سن رہی ہیں اور عالم بالا میں ہم تینوں کے سوا کوئی نہیں۔ اب تم کہو گے کہ بہتر ہے اسے بھی اندر بلا لو۔ تو میرا خیال بھی یہی ہے۔“ اس نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔

ریشم دانت نکالتی کافی کے مگ سمیت آئی اور بیٹھ گئی۔ ''میں مخل تو نہیں ہوئی آپ لوگوں کی پرائیویسی میں؟ فکر نہ کریں، میں بہری ہوں۔''

روبی نے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ جو قربانی کا سانڈ نیچے لا کے باندھا ہے آپ نے۔ رانا کہلاتا تھا وہ... مرید کچھ نامناسب ہے۔''

''مجھے بھی اس کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی۔''

''بعد میں کرنا۔ پہلے میری سنو۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا؟''

''نہیں، بولتا نہیں۔''

''کتنا وقت ضائع کیا تم نے۔ میں بتا دیتی۔ نام ہے اس کا رحیم یار خان سب رانا کہتے ہیں۔ یہ شہر کا نام بھی کسی بندے کے نام پر ہوگا۔ ماں باپ نے رکھا ہوگا۔ مجھے یاد ہے یہ سولہ اٹھارہ سال کا تھا جب آیا تھا۔ داڑھی مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔ اب تو واقعی سانڈ بن گیا ہے مگر اس وقت تھا دبلا پتلا گورا چٹا۔ ابا کا خاص خدمت گار تھا۔''

وہ تو ہونا ہی تھا۔ میں کہتے کہتے رک گیا اور غالباً روبی کا علم نہیں تھی۔

''عرس کے موقع پر ڈانس کرتا تھا۔ ایسے ٹھمکے لگاتا تھا... بال بھی لمبے تھے تو عورت لگتا پھر ترقی کرتا رہا اور اب دیکھو نمبر ون ہے۔ گویا کرتا دھرتا دوسرے گیارہ مرید اس کا حکم مانتے ہیں۔''

''وہ سب روپوش ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نہیں بتاتا۔''

''تم کو کیا پوچھنا تھا؟''

''بہت کچھ... درگاہ بدمعاشی کا اڈا تھی اور بدمعاشی کا مقصد جنت کمانا نہیں مال کمانا تھا۔ تو مال بدمعاشی کے ہر غیر قانونی ذریعے سے کمایا گیا۔ دنیا میں جو شیطانی کاروبار ہیں، سب ہوتے تھے وہاں۔ منشیات سے بردہ فروشی تک۔''

''وہ سلسلہ تو اب ختم ہو گیا۔ کیا یہ پھر شروع کرنا چاہتے ہیں؟'' روبی نے پوچھا۔

''یہی تو فساد کی جڑ ہے۔ یہ کھلم کھلا غنڈا گردی اور بدمعاشی پر اتر آئے ہیں۔ تمہیں تو اندازہ نہیں کہ رات بھر میں انور کے ساتھ حویلی میں نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے باندھ کے ڈال رکھا تھا اور اگر میں عقل سے کام نہ لیتا...''

''یہ بتانا چاہتے ہیں آپ کہ عقل بھی ہے آپ کے پاس۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تم نے تو بک دیا تھا کہ... جیسے جھوٹ بولا تھا میں نے اور ہم عیاشی کر رہے تھے... انور نے پچیس ہزار اسے دیے جس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ صبح یہ مجھے لے جاتے۔ قسمت تھی کہ میں بچ کے بھاگ آیا۔ وہ پہلوان...''

''ابھی تک اس کہانی میں پہلوان کوئی نہیں تھا؟''

روبی نے لقمہ دیا۔

''تھا... ایک ریٹائرڈ پہلوان جس کو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دس ہزار ملتے اگر وہ قیدی کی یعنی میری ڈلیوری صبح دیتا۔ میں نے دس کے پچیس کیے اور وہ بھی بھاگ گیا اپنے بیوی بچوں سمیت... وہاں، رانا کے ساتھ آنے والوں نے بڑا کشت و خون کیا۔ وہاں سکندر کے اور انور کے وفاداروں نے مقابلہ کیا اور لوگ بھی مارے گئے۔ ایک بندہ اور ان میں شامل تھا۔ یہ انعام اچھا ملا۔ امید تھی کہ اس سے سب کا پتا چل جائے گا مگر اس پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ نہ آگ نہ پانی... نہ بجلی نہ مار۔''

''تم کیا پوچھنا چاہتے تھے اس سے؟''

''دوسرے بدمعاشوں کے نام اور ٹھکانے پھر باری باری سب کو اٹھا لیتے۔ شہر کی پولیس نے دو تفتیشی ماہر بھی بھیجے تھے۔ وہ بھی ناکام ہو گئے۔ کہتے تو ہیں کہ ہمیں کارروائی کرنے دو۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مر گیا تو ایک ہی کلیو ہے۔''

روبی نے سوچ کے کہا۔ ''یہ وہیں دوسری زیادہ بڑی اور شاندار درگاہ بنانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، اور مالک تو تم ہو زمین کی مگر ہم انکار کر چکے ہیں۔''

''انور کی ماں کو اسی لیے اٹھایا گیا ہوگا، مجھے سب معلوم ہے۔ دباؤ ڈالنے کے لیے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے عزیزہ۔''

''اور حویلی کو بم لگا کے بھی انہوں نے ہی اڑایا ہوگا مجھے معلوم ہے۔''

''سب معلوم ہے آپ کو علامہ صاحبہ... یہ فرمایئے کہ جو آپ کی بڑی بہن شاہینہ کو معلوم تھا، آپ کتنا جانتی ہیں؟''

''تم شاہینہ سے شادی پر مجبور کر دیے گئے تھے؟ اسے جانتے نہیں تھے؟''

''یہ کیسا بے محل سوال ہے۔ تمہاری تو خبر نہیں تھی۔ وہ

ایسی عورت تھی جو ہیلن آف ٹرائے ہوتی، قلوپطرہ ہوتی، نور جہاں اور ایوا براؤن ہوتی۔"

"ان سب سے کہاں ملے تھے تم؟" ریشم نے سادگی سے پوچھا۔

روبی نے کہا۔ "بس کرو۔ پہلے زندگی میں آئی ہوں گی نورین سے پہلے۔"

"کس قدر جاہل ہو تم لوگ، بابا یہ عورتیں وہ ہیں جن کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ جو حاکموں کے دل پر حکومت کرتی رہیں۔ شاہینہ کی بدقسمتی کہ اس فضول گاؤں میں جنم لیا۔ ہالی ووڈ میں ہوتی تب بھی تہلکہ مچا دیتی۔ بات صرف حسن کی نہیں... اس کی غیر معمولی ذہانت کی ہے۔"

روبی نے تسلیم کیا۔ "ہاں، میں تو اس کے سامنے جاہل اور احمق تھی۔ حالانکہ وہ مجھے کہتی رہتی تھی کہ روبی! دنیا میں جینے کا ڈھنگ سیکھ لے، ورنہ وہی ہوگا جو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ ناقص العقل اور پاؤں کی جوتی کہلائے گی۔ مجھ میں جو تھوڑی بہت عقل یا ہمت ہے اسی نے سکھائی۔"

"مجھے اسی کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟ شاہینہ کی؟"

"اب وہ نہیں تو اس کی نالائق شاگرد تم کیا کر سکتی ہو؟"

"میں ایک کافی اور بنا کے لا سکتی ہوں۔ تمہاری ناک بہہ رہی ہے وہ صاف کر سکتی ہوں۔"

"مذاق میں وقت مت ضائع کرو۔" میں نے تکیے کے نیچے سے رومال نکال کے ناک صاف کی۔ "اس نے مجھے بتایا تھا کہ درگاہ پر دونوں کام ہوتے تھے۔ بیمار کرنا اور پھر علاج کرنا۔ جن اتارنے کے ساتھ جن چڑھانے کے لیے بھی دوائیں تھیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ سب دماغ کو متاثر کرنے والی دوائیں تھیں جو عام نہیں ملتیں۔ پتا نہیں، کہاں سے آجاتی تھیں۔ اب یہ مت ڈسکس کرنا مجھ سے کہ درگاہ پر ان جوان لڑکیوں یا عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا تھا۔"

"مجھے اور ہم سب کو معلوم ہے۔ ان کا ہسٹریا دور ہو جاتا تھا۔ وہ صاحبِ اولاد ہو جاتی تھیں۔ ان کی شادی بھی ایک علاج تھی۔ وہ دوائیں کیا تھیں؟ ان کے نام یاد ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا شوق شاہینہ کو تھا۔ وہ سب جانتی تھی۔"

"تم نے مایوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ مدیر نمبر ایک کو ان دواؤں کے زیرِ اثر بولنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک دوا ہوتی ہے جو پولیس سے زیادہ سراغ رساں ادارے استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ممنوع اور خطرناک بھی ہے۔ اسے سچ کا زہر نہیں سچ کا تریاق کہتے ہیں۔ ٹرتھ سیرم (TRUTH SERUM) انجکشن لگاتے ہیں تو مجرم کی ساری ذہنی مزاحمت ختم... اس سے جو پوچھو سچ بتانے لگتا ہے۔ باہر ایک مشین بھی استعمال ہوتی ہے جو جھوٹ پکڑنے کا آلہ کہلاتی ہے۔"

"تم اسے وہ انجکشن دو گے، رانا صاحب کو؟"

"اگر ملے... نہ وہ بازار میں دستیاب ہے نہ اسپتالوں میں، مسئلہ حل ہو جاتا، سب پتا چل جاتا۔"

وہ سوچ میں ڈوبی رہی۔ "پتا چل گیا تو تم کیا کرو گے؟ سب کو مار دو گے؟"

"اگر انہوں نے ہمیں مارنے کی کوشش کی... ورنہ قانون کے حوالے۔"

"قانون؟" وہ حقارت سے ہنسی۔ "جو میرا تمہارا سب کا زرخرید ہے، غلام ہے اور ان کی کیا بات کرتے ہو۔ وہ اپنی کارروائی شروع کر چکے ہیں۔ اس حساب سے یہ تیسری واردات ہوگئی۔ پہلے تم کو اٹھوایا، پھر حویلی تباہ کی اور انور کی ماں کو لے گئے۔"

"وہ چوتھا قدم بھی اٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے ماں جی کے بدلے میں مرید نمبر ایک کو مانگا ہے۔"

"اور انور کیا کہتا ہے؟"

ریشم بولی۔ "وہ مان گیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، ابھی تک وہ اس ارادے پر قائم ہے کہ اس بدمعاشوں کے گروہ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ ہم پہلے کوشش کریں گے ماں جی کا پتا چل جائے۔"

"سلیم! مجھے اپنے ساتھ شامل سمجھو، تم سے زیادہ میں نے دیکھی ہے ان کی بدمعاشی... سب کو پکڑ لو، چن چن کر ختم کر دو انہیں، وہ جہاں بھی ہوں۔ انور اور تم بھی کم ہمت نہیں۔ ضرورت پڑے گی تو میں بھی ساتھ دوں گی تمہارا... ریشم بھی دے گی۔" وہ جوش سے بولی۔

ریشم نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ وہ کم گو تھی اور شاید کنفیوژن میں بھی کہ انور کا ساتھ دینے کا اعلان کیسے کرے۔

میں نے ہنس کے کہا۔ "میں رانی جھانسی اور رضیہ سلطانہ والے اس جذبے سے متاثر ہوا۔ ضرورت پڑے گی کہیں تو تمہیں بھی میدانِ جنگ میں لے جائیں گے، ابھی سے تلوار مت اٹھاؤ۔"

وہ خفا ہوگئی۔ ''تم تینوں خود کو بڑا طرم خاں اور افلاطون سمجھتے ہونا ہمارے مقابلے میں... وقت آیا تو دیکھ لینا ہم کسی سے کم نہیں۔''

''بجا ارشاد... آپ سے سب کم ہیں مگر جو پہلا کام کہا ہے...''

اس نے مسکرا کے کہا۔ ''سمجھو ہوگیا۔''

''کیا مطلب، بیٹھے بیٹھے ہوگیا۔ نام بتاؤ دواؤں کے... اسی پر منحصر ہے میری کامیابی۔''

''نام خود دیکھ لینا، میرا خیال ہے کہ ایک جگہ کچھ دوائیں پڑی ہیں، تم جانتے ہو۔''

میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ''کہاں؟ اور میں کیسے جانتا ہوں؟''

''اس لیے کہ تم رہے ہو وہاں۔ مجھے معلوم ہے، اکبر کا ایک ٹھکانا تھا۔ ایک کوٹھی تھی الگ تھلگ عیاشی کے لیے۔''

میرا منہ بے یقینی کی حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''ہاں، میں نے دیکھی ہے وہ جگہ، میں رہا ہوں وہاں... محبت کا قیدی بن کے۔''

''اس جگہ کی تلاشی لو۔ آخری دنوں میں شاہینہ نے بڑا ہاتھ مارا تھا۔ ابا چلا رہے تھے کہ دوائیں کہاں گئیں، ان کا آدھے سے زیادہ اسٹاک غائب ہوگا تو انہیں پتا نہیں چلے گا۔''

''دل چاہتا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔'' میں نے جذبات کی روانی میں کہہ دیا۔

روبی نے ہاتھ آگے کر دیے۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

شرمندگی سے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ روبی نے مجھے سوچے سمجھے بغیر بولنے کی اچھی سزا دی تھی۔ اس نے اعتماد، سادگی یا معصومیت میں یہ حرکت کی تھی لیکن مجھ میں اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اس کا ہاتھ بھی پکڑ سکتا۔ پہلے میں نے بڑی بہن شاہینہ کا روپ دیکھا تھا جو جرأت و ذہانت میں خطرناک حد تک آگے بڑھا ہوا تھا۔ چھوٹی اس کے برعکس ہمت اور سمجھ بوجھ میں کم نہ تھی۔ لیکن اس کی ہمت کا کوئی منفی پہلو نہ تھا۔ اس نے محبت کی تھی تو کسی احساسِ گناہ کے بغیر اور زندگی کا جتنا بھی تھوڑا بہت سفر مراد کے ساتھ کیا تھا شریکِ حیات کی حیثیت سے کیا تھا۔ اب وہ اپنی ہمت سے ایک خاندان کی دو نسلوں کو سنبھال رہی تھی۔

جب وہ چلی گئی تو اپنے پیچھے نئی ہلچل چھوڑ گئی۔ گو منزل دور تھی مگر نشانِ منزل صحیح ثابت ہوا تھا۔ میں نے ساری آس روبی سے باندھ رکھی تھی اور کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ میں نے ٹھیک سوچا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس جگہ سے دوائیں اٹھا لاؤں جو اکبر کا عشرت کدہ تھی اور میرا قید خانہ... اب وہ پرانی حویلی کسی کے کام نہیں آ رہی تھی تو ویران ہی پڑی ہوگی۔ دیر سے سونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں سورج طلوع ہونے کے ایک گھنٹے بعد جاگا۔ اوپر والی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو سکندر اور انور ٹہلتے ہوئے کسی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔

ابھی تک دہشت گردی کرنے والوں نے دوبارہ کال نہیں کی تھی۔ یہ مجھے سکندر نے بتایا۔ اس نے ساری رات فون کے پاس بیٹھ کر جاگنے کے بجائے اپنے بیڈروم میں سرہانے کی طرف فون رکھ لیا تھا۔ وہ سوتے جاگتے انتظار کرتا اور صبح ہوگئی۔

انور بہت پریشان تھا۔ ''معلوم نہیں رات ماں جی نے کیسے گزاری۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ان کو حویلی میں ہی دیکھا۔ سوائے خاندانی تقریبات کے وہ کہیں جاتی تھیں تو ابا کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''ان کی عمر زیادہ ہے لیکن ایک تو بیماری کوئی نہیں، دوسرے وہ مشکل حالات میں بھی پرسکون رہنا جانتی ہیں، تو فکر نہ کر۔''

وہ بگڑ گیا۔ ''کیسی باتیں کرتا ہے تو... تیری ماں نہیں ہے نا۔''

یہ بات مجھے گالی کی طرح لگی مگر انور کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر میں پی گیا۔ ''ایک بات کی طرف سے تو اطمینان ہوگیا ہے تاکہ وہ سودا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود خیال رکھیں گے ماں جی کا، ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ ان سے بات کرائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم رحیم یار خاں سے بات کرا دیں۔''

''اس میں کوئی حرج نہیں۔'' انور بولا۔

''دیکھ انور! تو نے بھی دنیا دیکھی ہے یہ اغوا برائے تاوان ہے۔ تاوان میں وہ پیسا نہیں رحیم کو مانگ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمارے تذبذب یا تاخیری حربے ان کو شک میں ڈال دیں کہ ہم دیر اس لیے کر رہے ہیں کہ پس پردہ دوسری کارروائی جاری ہے۔ پولیس اور تمام خفیہ ادارے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ دھمکی دیں گے کہ ہم نے ایسا کیا تو ماں جی کی لاش ہی ملے گی۔''

''یہ سارے ہتھکنڈے وہ ضرور آزمائیں گے۔'' انور اداسی سے بولا۔

''شاید اس سے بھی زیادہ... کچھ اغوا کرنے والے

تشدد کر کے چیخیں سنواتے ہیں مگر تو فکر مت کر... آج کل میں کچھ اچھا ہوگا۔ اب امید پیدا ہوگئی ہے۔''

''رات ہی رات میں کیا ہو گیا ایسا؟'' انور نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ چل... معلوم ہو جائے گا۔''

''جانا کہاں ہے؟'' اس کی حیرانی بڑھ گئی۔

''اکبر ایک پرانی حویلی کو عیاشی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہیں جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''کیا ہے وہاں؟''

''راستے میں بتاؤں گا، تو دیکھ لے گا۔''

سکندر اب تک خاموش تھا۔ اس نے کہا۔ ''جہاں جاؤ، اکیلے مت جاؤ۔ مجھے کچھ قانون سے نمٹنا ہے اس سے فرصت ملے تو اپنے بندے ملبا اٹھانے پر لگاؤں۔ مشینری آجائے گی۔''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے روبی نے دروازہ تھوڑا سا کھول کے چلانا شروع کیا۔ ''فون...''

ہم سب ایک ساتھ لپکے مگر ہمارے پہنچنے تک گھنٹی بند ہوگئی تھی۔ روبی نے وہیں ہمارے سامنے ناشتا لگوا دیا۔ ہم ضرورت سمجھ کے کھاتے رہے اور گھنٹی کے انتظار میں ٹینس بیٹھے رہے۔ یہ اعصابی کشیدگی کا اثر تھا کہ فون بجا تو ہم سب چونک پڑے پھر انور کے اشارے پر سکندر نے ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو، کون بول رہا ہے؟''

اسپیکر میں آواز سنائی دی۔ ''تم جانتے ہو۔'' اس نے غرا کے کہا۔

''اچھا بولو، میں سکندر ہوں۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تم کیوں آجاتے ہو بیچ میں... ہر جگہ اپنی ٹھیکے داری...''

''اچھا لو انور سے بات کرلو۔'' سکندر نے ریسیور بڑھا دیا۔

''وہ نامعلوم کا نطفہ... ملک سلیم کہاں ہے، آئندہ بات اسی سے ہوگی۔''

ریسیور میں نے لے لیا۔ ''میں ملک سلیم ہوں۔''

''دیکھ لومڑی کی اولاد... تو ہے بہت چالاک اور عیار... سب کو قابو کر رکھا ہے۔ مگر اس معاملے میں ہوشیاری دکھائی تو بیٹا بڑھیا کے ٹکڑے ہی ملیں گے، ابھی تک تو آرام سے ہے۔''

''اسے آرام سے ہی رکھو، مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ تمہاری بھی ہوگی۔''

''ڈائیلاگ مت مار، ہم جذباتی نہیں ہو سکتے۔ یہ بتاؤ استاد رحیم کو کہاں لا رہے ہو؟''

''جہاں تم کہو اور فکر نہ کرو، ہم کسی سے مدد نہیں لے رہے ہیں۔ نہ پولیس سے نہ فوج سے۔''

فون غیر متوقع طور پر بند گیا۔ وہ بالکل روایتی طریقے پر ڈیل کر رہے تھے۔ اگلی بار وہ آواز سنیں گے اور سنوائیں گے۔ پھر ہو سکتا ہے ایک بوڑھی عورت کی آہ و زاری سنوائیں۔ ہمارے اعصاب توڑنے کے لیے... حسب توقع فون کے اسکرین پر نظر آنے والا نمبر بدل گیا تھا۔ وہ جگہ بدل بدل کے فون کر رہے تھے۔ اگر ہم معلوم کرتے تو پتا چلتا کہ نمبر کسی پی سی او کا ہے۔

''وہ جانتے ہیں کہ تجھے سب کا اعتماد حاصل ہے۔'' انور کچھ دیر بعد بولا۔

''میں کوشش کروں گا کہ اس اعتماد پر پورا اتروں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگلی کال فوراً نہیں آئے گی۔ ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔''

ہم یوں گھر سے نکلے جیسے ایوانِ صدر سے صدر کی سواری نکلتی ہے۔ یہ سکندر کی احتیاط پسندی کا تقاضا تھا۔ میں نے سب کو گیٹ سے باہر ہی روک دیا۔ ایک فور وہیل ڈرائیو کے چار گارڈز ہماری گاڑی کے آگے چلتے رہے۔ میں اس کے حق میں نہیں تھا لیکن سکندر کے اصرار پر میں نے انہیں اجازت دے دی۔ راستہ وہی تھا جس پر میں بارہا سفر کر چکا تھا۔ وہ کوٹھی دونوں بھائیوں کی جاگیر کے درمیان کہیں واقع تھی۔

انور نے آدھے راستے میں کہا۔ ''رمضان کا اور گاؤں والوں کا حال تو پوچھنا چاہیے۔''

''اس کشت وخون کے قانونی معاملات سکندر شاہ سلجھا رہا ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ پرانی حویلی جس میں کبھی اکبر بادشاہ کی طرح شباب و شراب کی محفلیں سجاتا تھا آج ویران اور نمونۂ عبرت بنی پڑی تھی۔ اس کو میرا قید خانہ بھی بنایا گیا تھا۔

انور اپنے چھوٹے بھائی کے شب و روز کا سارا احوال جانتا تھا اور اس کے لیے یہ جگہ نئی نہیں تھی۔ میرے تصور میں وہ روز و شب تھے جب شاہزادی ایک غلام سے ملنے یہاں آتی تھی۔ ایک رات کا اخراج تو عام بات تھی۔ ایک بار وہ دو دن گزار گئی تھی۔ معلوم نہیں اپنے گھر میں باپ کی نظر سے اوجھل ہو کے یہاں رہنے کا خطرہ وہ کیسے مول لیتی تھی اور

کیوں پکڑی نہیں جاتی تھی۔ پرانے وقت کو میں حویلی کے اندر ایسے ہی دیکھ سکتا تھا جیسے یہ گزرے دن کی بات ہے۔ ایک بوڑھی خادمہ میری خدمت پر مامور تھی۔ مختلف کمروں میں جو کھلے ہوئے تھے عیش و عشرت کے کیا لوازمات تھے۔ میں نے کھلی ہوئی خالی اور بھری ہوئی ولایتی قیمتی شراب کی بوتلوں کو ہر جگہ پایا تھا۔ شاہینہ نے کبھی نہ خود پی تھی اور نہ مجھے پلانے پر اصرار کیا تھا۔ اسے اس کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ جو دوا وہ مجھے کھانے میں دے دیتی تھی اس کا اثر شراب سے کہیں زیادہ میرے بدن میں آگ لگاتا تھا اور ایک رات کے لیے میرا جسم اس کی خواہشات کے اشارے پر چلتا تھا۔

''یہاں کیا ہے؟'' انور نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

میں چونکا۔ ''جس چیز کی مجھے تلاش ہے۔ اگر وہ مل گئی تو شام تک سب معلوم ہو جائے گا۔''

انور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مجھے مختلف کمروں میں جا کے الماریاں کھنگالتے دیکھتا رہا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں شاہینہ نے وہ سب دوائیں بعد میں یہاں سے ہٹا نہ دی ہوں یا کوئی اور انہیں نہ لے گیا ہو۔ وہ خطرناک دوائیں تھیں۔ انہیں عام دوا سمجھ کے استعمال کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ الماریوں میں اب بھی فحش تصویروں والے رسالے پڑے تھے۔ آدھے گھنٹے تک سب کچھ نکال کر دیکھ لینے کے بعد بھی مجھے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ میں نے کچن بھی دیکھ لیا۔ مرچ مسالوں کے ڈبوں میں بھی جھانک لیا۔

پھر مجھے باتھ روم کا خیال آیا۔ کچھ لوگ دواؤں کو ٹھنڈی جگہ رکھنے کے لیے فریج نہ ہو تو باتھ روم کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ میری تلاش بار آور ہوئی۔ مجھے پرانے شیمپوز اور کاسمیٹکس کے ساتھ ایک کیبنٹ میں تقریباً ایک آٹھ انچ لمبا چار انچ چوڑا اور گہرا ویکسی نیشن کا بیگ ملا جو دیکھنے میں شیونگ کٹ لگتا تھا۔ میں نے زپ کھولی تو اندر نہ ریزر تھا نہ شیونگ کریم اور آفٹر شیو... اس کے اندر کچھ انجکشن تھے اور کچھ گولیاں مختلف رنگ کی۔ مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی خزانہ تلاش کرنے والوں کو اشرفیوں سے بھری تجوری مل جانے سے ہوتی۔

''یوریکا... یوریکا۔'' میں نے چلا کے کہا تو انور دوسرے کمرے سے آ گیا جہاں وہ تصاویر سے دل بہلا رہا تھا۔

''یہ کیا شور ہے؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے پالیا۔ میں نے پالیا۔'' اور اسے وہ بیگ دکھایا۔

یوریکا یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ میں نے پالیا۔ کہتے ہیں شہنشاہ نے کسی سنار سے سونے کا تاج بنوایا تو سونے کے خالص ہونے کا پتا چلانے کی ذمّے داری ارشمیدس کو سونپی۔ اور مزاج شاہانہ کے مطابق حکم میں دونوں امکانات بیان کر دیے کہ کامیابی کا انعام اتنا ہی سونا اور ناکامی کی صورت میں موت۔ ارشمیدس ایسا کوئی طریقہ نہیں جانتا تھا۔ ایک دن وہ غسل کے لیے پانی کے ٹب میں اترا تو کچھ پانی ٹب سے چھلک گیا۔ اچانک اس کے دماغ میں آنے والے خیال کے تحت اس نے پھر ٹب بھرا اور بار بار بھر کے اس میں لکڑی، لوہا، پتھر مختلف ہلکی بھاری چیزیں ڈالتا رہا۔ ہر بار ٹب سے چھلکنے والا پانی مختلف وزن کا ہوتا تھا۔ وہ ایک دم سمجھ گیا کہ اب سونے کے خالص ہونے کا پتا چل جائے گا اور اپنی اس سائنسی دریافت پر جسے آج ہم کثافت کہتے ہیں اتنا خوش ہوا کہ کپڑے پہننا یاد نہ رہا۔ لوگوں نے اسے بازاروں سے محل کی طرف ننگا بھاگتا دیکھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ یوریکا... یوریکا۔

واپسی کے سفر میں انور کو میں نے ان دواؤں کے بارے میں بتایا۔ ''ابھی صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ دوائیں انسان کی سوچ کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس کی شخصیت بدل دیتی ہیں اور اس کی ذہنی مزاحمت صفر ہو جاتی ہے۔ وہ ہپناٹائز کیے جانے والے شخص کی طرح وہی کرتا ہے جس کا حکم ملے لیکن ہپناٹزم کا اثر وقتی ہوتا ہے۔ ان دواؤں کا اثر رہتا ہے، مجھے نہیں معلوم کتنا عرصہ۔''

''یہ سب شاہینہ نے بتایا ہوگا مگر کون سی دوا کس مقصد کے لیے اور کتنی استعمال ہوتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کوئی دماغ کا ماہر ڈاکٹر بتا سکتا ہے۔ وہ پاگل خانے میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور سول یا ملٹری انٹیلی جنس اداروں میں خصوصی ٹریننگ رکھنے والا جس کو سی آئی اے یا کے جی بی نے ٹریننگ دی ہو۔''

''پاگل خانے سے تو پوچھا جا سکتا ہے مگر وہاں نہ ہوا تو؟ یہ نہ ہو پولیس یا ملٹری ہمیں پکڑ لے۔ یہ سخت ممنوعہ دوائیں ہیں۔''

''کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ خدا کرے یہ انجکشن وہی ہوں۔ ٹرتھ سیرم... سچ بلوانے کی دوا والے۔'' میں نے کہا۔

''تجھے یہ سوجھی کیسے؟'' انور بولا۔

''یار بڑے وقت پر سوجھی... مگر سوچنے سے کیا

ہوتا... جب تک روبی مجھے نہ بتاتی کہ دوائیں یہاں مل سکتی ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’فرض کر یہ وہی جادو اثر دوائیں ہیں۔ ایک سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انہیں استعمال کون کرائے گا؟‘‘

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ’’میں اور کون۔‘‘

’’خواہ بندہ مرجائے؟‘‘ اس نے کہا۔

’’چودھری صاحب! مجھے کوئی میڈیکل سائنس کی ڈگری نہیں لینی، کسی ڈاکٹر سے ان دو چار دواؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اس سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ دوائیں کارآمد ہیں یا ان کی میعاد ختم ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر کون ہو گا اور کہاں ہو گا۔ تو جوئندہ یا بندہ... ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ابھی آج کا پورا دن پڑا ہے ملتان میں نہ ملا تو ہم لاہور جاسکتے ہیں۔‘‘

’’ایسا نہ ہو وہ ہمیں پکڑوا دے۔‘‘

’’اب ایسے لاوارث اور گئے گزرے بھی نہیں۔ انصاف اور قانون کو خرید سکتے ہیں تو کیا ایک ڈاکٹر کو نہیں خرید سکتے۔ دنیا کے بازار میں سب برائے فروخت موجود ہے۔‘‘

’’تو بہت پُرامید ہے۔ چل دیکھتے ہیں۔ مجھے ماں جی کی طرف سے ڈر ہے سلیم۔‘‘

’’انہی کو بچانے کے لیے سارے جتن کر رہے ہیں۔ فکر مت کر، جتنی حفاظت ہم رانا کی کر رہے ہیں اس سے زیادہ وہ ماں جی کی کر رہے ہوں گے، ان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔‘‘

پھر آگے پل پر سے گزرتے ہوئے مجھے وہ بچہ نظر آ گیا جو مجھے قبرستان تک لے گیا تھا۔ جہاں رمضان ایک کھلی قبر میں مرا پڑا تھا۔ میں نے انور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ بچہ نہر پر مچھلی پکڑنے والی ڈور کو ایک بانس کے ساتھ پانی میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ گھبرایا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دس بارہ سال عمر کا خوب صورت اور بھولا بھالا بچہ تھا۔

میں نے کہا۔ ’’ڈرو نہیں۔ نام کیا ہے تمہارا۔‘‘

’’بادشاہ۔‘‘ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ’’بادشاہ، کبھی کوئی مچھلی پکڑی؟‘‘

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ’’کل بھی دو پکڑی تھیں۔ ایک بہت چھوٹی... ایک بڑی۔‘‘

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ ’’یہ تمہیں مل سکتے ہیں اگر تم ایک بات بتا دو۔‘‘

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ ’’کرکٹ کھیلنے کا بیٹ بیس روپے کا ملتا ہے۔‘‘

میں نے رقم دگنی کر دی۔ ’’آج لے لینا۔‘‘

اس نے نوٹ پکڑ لیے بلکہ میرے ہاتھ سے چھین لیے۔

’’ہاں مجھے کل مل گئی تھی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’انہوں نے دلائی ہو گی جنہوں نے کہا ہو گا کہ مجھے قبرستان لے جاؤ، رمضان کے پاس۔‘‘

’’یہ تو کسی نے نہیں کہا تھا۔ تم نے پوچھا تو میں نے بتا دیا تھا۔‘‘

مجھے مایوسی ہوئی۔ ’’تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ رمضان قبر میں لیٹا ہوا ہے؟‘‘

’’وہ تو میں چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔ پہلے بھی اس قبر میں چھپ جاتا تھا۔ اس دن رمضان پر کود گیا تو بھاگا۔ ابا کو پتا چلا تو اس نے کہا خبردار جو پھر اُدھر گیا۔ وہ دونوں چرسی ہیں۔ قبرستان میں پڑے رہتے ہیں۔‘‘

’’دونوں کون؟‘‘ میں چونکا۔ ’’اس کا بھانجا اور وہ۔‘‘

’’وہ تو مر گیا کب کا۔‘‘ بچہ خاصا باخبر تھا۔ ’’ابا نے گولی کی بات کی تھی۔‘‘

’’گولی کون؟‘‘

’’گلاب دین... سب گولی کہتے ہیں اور مجھے کچھ نہیں معلوم۔‘‘ وہ بانس اٹھا کے چل پڑا۔

مجھے بیس روپے ضائع ہونے کا غم نہیں تھا۔ رمضان کا بھانجا نہ سہی گلاب دین کا لنک مل گیا تھا۔ اس سے بعد میں پوچھا جاسکتا تھا کہ یہ کیا شوق ہے ان کا۔ وہ ضرور جانتا ہو گا رمضان کے بارے میں۔ میں واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ مراداں والی کی طرف سے گزرتے ہوئے انور نے گاڑی کا رخ حویلی کی طرف موڑ لیا۔ اب بھی وہاں دھوئیں سے کالی اینٹوں کے ڈھیر... جلے ہوئے شہتیروں اور آثارِ عبرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ عارضی خیمہ لگائے انور کے نمک خوار گارڈ کے ساتھ ایک چارپائی پر ایک پولیس مین محوِ خواب تھا۔ اس نے آرام کے لیے پتلون کی بیلٹ ہی نہیں اوپر کے بٹن بھی ڈھیلے کر لیے تھے۔ ہڑبڑا کے اٹھنے سے پتلون اس کے جوتوں پر گر گئی۔

انور نے گارڈ سے بات کی۔ ’’باقی لوگ کہاں ہیں؟‘‘

’’تین چل گئے تھے جناب عالی۔ ایک زخمی ہے۔ دن میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے رات کو میرا بھائی آ جاتا ہے۔‘‘

’’میں نے بھی نظر رکھی ہوئی ہے جناب۔‘‘ پولیس مین

بیلٹ باندھ کے بولا۔

"وکس کس پر؟ تمہارا اب یہاں کیا کام ہے؟" انور نے ناگواری سے کہا۔

"وہ جی، حکم ہے تفتیش چل رہی ہے ابھی۔ کوئی متعلقہ فریق اِدھر نہ آئے۔" کانسٹیبل بولا۔

"میرے نزدیک تم خود غیر متعلقہ فریق ہو۔" اس نے گارڈ کو کچھ اور لوگ بلانے کی ہدایت کی جو ہر طرف سے نگرانی کریں اور کوئی مشکوک آدمی نظر آئے آس پاس منڈلاتا تو اسے پکڑ لیں۔

یہ کچھ بھی نہیں تھا، محض رسمی کارروائی۔ اپنی گم شتہ جنت کی بازدید... عظمتِ رفتہ کے آثار پر ایک نظر جو اَب نشانِ عبرت بنے ہوئے تھے۔ سکندر نے کہا تھا کہ جب وقت ملے گا اس ملبے کو صاف کرا دیا جائے گا پھر بھی اس کی جگہ کوئی اور عمارت لے گی۔ اس نقش کہن کے ساتھ پرانے وقتوں کے سب آثار مٹ جائیں گے۔ وقت خواب وخیال اور انسان کہانیاں ہو جائیں گے۔ یہ گاؤں تھا چنانچہ ابھی تک عمارت کی لاش کو نوچنے والے گدھ نہیں آئے تھے۔ شہر ہوتا تو راتوں رات ملبے سے حویلی کا قیمتی اسباب کھود کر نکالنے والے آجاتے۔ وہ سب جو زیرِ استعمال تھا اندر ہی دفن تھا۔ لوگ جلی ہوئی کھڑکیاں دروازے نہ چھوڑتے اور پھر بھی کوئی نوٹس نہ لیتا تو اینٹیں تک لے جاتے مگر یہاں اس کا امکان نہ تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ سکندر شاہ ہمیں گھر پر ہی مل گیا۔ وہ کوئی معاملہ نمٹا کے آیا تھا اور پھر ایسے ہی کسی کام سے جا رہا تھا کہ رک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "کل آپ نے کسی ذہین اور نوجوان پولیس افسر کا ذکر کیا تھا۔"

"آفریدی، ملتان میں ایس پی ہے۔ ذہین ہے اور بھروسے کا آدمی ہے۔ کیا کام ہے اس سے؟"

میں نے اسے کام کی نوعیت کم سے کم الفاظ میں بتائی۔ "اگر وہ کچھ مدد کر سکے۔"

"مل کے دیکھ لو۔ قائل ہو گیا تو جو کر سکتا ہے کرے گا۔ وہ میرے ایک دوست کے بیٹے کا دوست ہے۔"

"اور دوست کا بیٹا کون ہے، کیا کرتا ہے؟"

"یہ پوچھو وہ کیا نہیں کرتا۔ ملو گے تو اندازہ ہوگا۔ ماں باپ نے لاڈ میں نام رکھ دیا تھا جانِ دین... چن ماہی مشہور ہے۔ اس کے حوالے سے جاؤ گے یا اسے ساتھ لے کر تو فائدہ ہوگا حالانکہ بندہ آفریدی بھی کھرا ہے۔ سفارش کام نہیں کرتی مگر تعارف ہو جائے گا۔"

"اور یہ چن ماہی کہاں دستیاب ہوگا؟"

اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر پتا لکھ دیا۔ "یہ باپ کی کوٹھی ہے۔ ایک کے اوپر خود رہتا ہے۔ اسی احاطے میں دوسری کسی وکیل کی ہے۔ دونوں سے اتنا کرایہ مل جاتا ہے کہ خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پھر بھی سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ بے کار کام، صحافت، سوشل ورک، پتنگ بازی۔"

یہ نمونہ قابلِ دید ضرور تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم گلگشت میں اس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہاں جدید کوٹھیاں سب بڑی تھیں۔ دو کنال اور چار کنال اور اس سے بھی زیادہ رقبہ والی۔ گیٹ بند تھا اور باہر کی تختی پر پیتل کے چمکتے حروف میں چن ماہی کے والد ماجد کا نام لکھا تھا۔ آفتاب گیلانی۔ گرد گرما گدا اور گورستان کی چھاپ ابھی تک اس پانچ ہزار سال پرانے شہر پر دیکھی جاسکتی تھی تاہم اب یہاں گیلانی، قریشی، گردیزی اور خاکوانی جیسے نام بھی شہر کی شناخت بن رہے تھے۔ کال بیل بجاتے ہی ایک سات فٹ قد کا... پگڑی اور شملے کے ساتھ سوا آٹھ فٹ، خاص میانوالی کا چوکیدار نکل آیا۔ وہ اتنا دبلا تھا کہ سات فٹ کی لمبائی کے مقابلے میں اس کی چوڑائی سات انچ لگتی تھی۔ ملیشیا کی شلوار قمیص کے اوپر اس کی کالی کجراری آنکھوں کے نیچے چہرے جتنی کڑک نوکدار مونچھیں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔

"جی حکم کرو۔" جب وہ بولا تو اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک لرزتی ہوئی تھی یعنی موٹی پتلی ہوتی رہتی تھی۔ پچ کا اتنا زیادہ فرق بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

"ہم...... چن ماہی سے ملنے آئے ہیں۔"

"بجناب چن ماہی صاحب" اس نے یوں دہرایا جیسے نام ہی پہلی بار سنا ہو اور پھر غور کر کے بولا۔ "اس وقت قبرستان میں مل سکتے ہیں۔ وہ خود فوت نہیں ہوئے الحمدللہ...... کسی کو فوت کرنے...... میرا مطلب ہے دفن کرانے گئے ہیں۔"

"یہاں تو ہر قدم پر قبرستان ہے۔ پتا بتاؤ" انور بولا۔

"پتا تو ہم کو بھی نہیں...... مگر جناب چن ماہی صاحب وہاں سے کھانا کھانے تشریف لائیں گے نور خاں نور کے ہوٹل جہاں دال فرائی ملتی ہے۔"

بالآخر ہم دال فرائی کے شہرۂ آفاق ٹھکانے کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب رہے اور جب وہاں پہنچے تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خود بھی دال فرائی کھا کے چن ماہی کے آنے کا

انتظار کریں۔ ہوٹل مالک نذانے اپنی پبلسٹی کے لیے سائن بورڈ پر خود اپنی تصویر بنوائی تھی یا بنائی تھی۔ کیونکہ اس تصویر میں بال دلیپ کمار جیسے ماتھے پر آتے ہوئے تھے مگر صاحبِ تصویر کا سر کاؤنٹر پر لٹکے بلب کے نیچے دوسرے بلب کی طرح روشن تھا۔ نور خاں نور کا نام اتنا غیر موزوں بھی نہیں لگتا تھا۔ پریشان میں اس خیال سے تھا کہ وہ گینڈے کے وزن کا بغیر گردن والا کہیں شاعر نہ ہو۔ شاعری کا وائرس تشویشناک رفتار سے پھیل رہا تھا اور اس کی روک تھام کا کوئی ٹیکا بھی نہیں تھا۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چن ماہی کی آمد ہوئی تو جیسے بگل بج گیا۔ کاؤنٹر سے پہلی صدا بلند ہوئی۔ ''اوئے خیر ہووے چن ماہی جناب، آج سواری کدھر نکل گئی تھی؟''

جس شخص کو چن ماہی کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا، وہ لمبے لمبے بالوں والا دراز قد گورا اور خوب صورت نوجوان تھا جس کی مسکراہٹ روشن تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ خاکی رنگ کا لمبا سا کرتہ پہن رکھا تھا۔ ابھی وہ نور خاں نور سے کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ میں اس کے پاس جا پہنچا۔

''میں بہت دور سے ملنے آیا تھا اور بہت دیر سے بیٹھا ہوں یہاں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سکندر شاہ نے بھیجا ہے۔ وہ آپ کے والد آفتاب گیلانی کے دوست تھے۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''کسی حوالے کے بغیر بھی آپ آسکتے تھے۔''

وہ ہمارے ساتھ آ بیٹھا اور اس کا لنچ وہیں سرو کیا گیا۔ تعارف ابھی مختصر اور محدود رہا۔ میں نے براہِ راست کہا۔ ''ایک کام میں آپ کی مدد درکار تھی۔ کام ہے ایس پی آفریدی سے۔''

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''سفارش تو وہ باپ کی نہ مانے۔''

''تم سفارش نہیں، تعارف کرا دو۔ تمہاری شہرت ایک سوشل ورکر کی بھی ہے۔''

''شہرت؟'' وہ ہنسا۔ ''بدنام گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اس کو بہت سے لوگ کہتے ہیں پنگا لینا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ انسانی مسئلہ ہے۔'' انور بولا۔ ''کچھ لوگ میری ماں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ میری خاندانی حویلی کو بم سے اڑا کے...... اور اب تاوان مانگ رہے ہیں۔''

''بے شک یہ پولیس کیس ہے۔ میں مانتا ہوں۔ اسی علاقے کا ہے تو آفریدی کو پتا ہوگا۔'' وہ جیسے قائل ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم ایس پی آفریدی کے آفس میں تھے۔ حالات کی مدد شاملِ حال لگتی تھی کہ اس نے ہمیں براہِ راست آفس تک پہنچا دیا۔ میں ذہنی طور پر پوری تیاری کر چکا تھا کہ مجھے اپنا کیس کیسے پیش کرنا ہے۔ آفریدی نے مراداں والی کے چودھریوں کی حویلی کے بم سے اڑائے جانے کی خبر سنی تھی۔ ''اس سے پہلے وہاں کوئی درگاہ تباہ ہوئی تھی۔'' وہ اپنے علاقے سے باخبر تھا۔

''وہ ڈاکوؤں کا کام تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہاں کے مرشد انور کے تایا تھے۔ واردات میں ان کی بیوی اور بیٹی بھی ہلاک ہوئی تھیں۔''

''میں نے سنا تھا کہ یہ کام ڈاکو گامارستم نے کیا تھا۔ کچھ اس کے حریف کا نام لے رہے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''خرابی اس کے بعد یہ ہوئی کہ وہ مرید جو درگاہ پر دس قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے کرتے تھے درگاہ کو نئے سرے سے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ اس کی اجازت نہ انور نے دی اور نہ خاندان کی وارث باقی رہ جانے والی ایک لڑکی نے۔''

اس نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ''وہ تو دشمن ہو گئے ہوں گے؟''

''یہی بات ہے۔ انہوں نے انور کی حویلی کو بم سے اڑایا اور اس کی بوڑھی ماں کو ساتھ لے گئے۔ اب پولیس تو چلتی ہے ضابطے کے مطابق اور ابھی تک نتیجہ ہے صفر...... مگر ایک بندہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جو اُن کا سرغنہ تھا۔''

''اسے یہاں لے آؤ، یا ہم منگوا لیتے ہیں۔'' آفریدی نے کہا۔

''ہم سے اس کی رہائی کا سودا کیا جا رہا ہے۔ اسے چھوڑ دو تو انور کی ماں واپس آجائے گی۔ لیکن تفتیش میں اس نے کچھ نہیں اگلا حالانکہ آپ کے بھی محکمے کے دو پرانے تفتیش کرنے والے تھے۔'' میں نے ان دونوں کا نام بتایا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''پھر آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''تشدد کے بجائے اسے ٹرتھ سیرم دیا جائے تو وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگا۔''

ایس پی دم بخود رہ گیا۔ ''آپ نے یہ نام سن لیا ہے کہیں سے...... پولیس ابھی اتنے ماڈرن اور سائنٹیفک طریقے استعمال نہیں کر سکتی۔''

''میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ طریقے کون استعمال کر

سکتا ہے۔ انجکشن اور دوائیں میرے پاس ہیں مگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ "مگر یہ ممنوعہ دوائیں ہیں۔"

"سرکار! آپ کس کو امپریس کر رہے ہیں آخر اپنے اس ولایتی قانون سے۔" چن ماہی بولا۔

"یہ پاکستان کا قانون ہے۔"

چن ماہی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہی نا جو گورے بنا گئے تھے۔ جو پہلے یوز ہوتا تھا تو کالے حاکم اسے مس یوز کر رہے ہیں۔"

"چن ماہی! یہاں اس وردی میں اور اس آفس میں بیٹھ کے تو میں کہہ نہیں سکتا کہ قانون کوئی نہیں، جو جی چاہے کرے۔"

"ایس پی صاحب! سارا مسئلہ وقت کا ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے ورنہ یہاں نہ سہی لاہور، کراچی کہیں تو ہمارے مطلب کا آدمی مل ہی جائے گا۔" انور بولا۔

میں نے کہا۔ "آپ کا کہنا بجا کہ ایسی دوائیں ممنوعہ ہیں۔ لیکن ایک تو لانے والا کوئی اور...... جو زندگی بھر استعمال کراتے رہے ان سے کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بھی نہیں پتا کہ انہوں نے کتنے بندے مار دیے، ہر دوا بنائی جاتی ہے کسی مرض سے شفا کے لیے مگر استعمال ہوتی ہے دوسروں کی جان سے کھیل کر اپنی تجوری بھرنے کے لیے...... اس درگاہ پر بھی ہوتی رہی اور خود قانون اس لاقانونیت میں شریک رہا۔"

ایس پی نے خفگی سے کہا۔ "بتانا میرا فرض ہے۔ کیا پولیس اور کیا دوسرے محکمے سب کی لاقانونیت کا علم ہے مگر اسے میں جائز نہیں کہہ سکتا۔"

"زہر اگر تریاق کے طور پر استعمال ہو تو اجازت ہوتی ہے۔" چن ماہی نے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی قاتل کے خنجر سے کسی مریض کو سیب کاٹ کے دیا جائے۔"

"اوکے، اوکے...... مجھے پتا ہے، بحث ہوگی تو میں ہار جاؤں گا۔ لاہور کے مینٹل اسپتال میں ایک ڈاکٹر تھا جو ریٹائر ہونے کے بعد یہیں ہے ملتان میں۔"

چن ماہی کے کان کھڑے ہوئے۔ "ڈاکٹر مینٹل...... جس کا اصل نام ڈاکٹر اشفاق ہے؟"

"وہ خود مینٹل نہیں ہے۔ پاگل خانے میں رہنے کی وجہ سے نام پڑ گیا ہے۔ اس کو کچھ معلوم ہے۔ پاگل خانے میں اس نے کچھ مریضوں پر تجربے کیے تھے۔ وہ گیا تھا غالباً ایف آر سی ایس کرنے...... وہاں کسی ریسرچ میں شریک رہا اور ایک جرمن ڈاکٹر سے اس کی دوستی ہو گئی۔ دونوں کی دلچسپی ایک ہی موضوع پر تھی۔ دماغ کی سوچ بدلنا...... جس سے دماغ کا علاج ممکن ہو۔"

چن ماہی نے سر ہلایا۔ "کوئی کتاب لکھ رہا ہے وہ یا لکھ رہا تھا...... برین واشنگ پر؟"

"آپ جانتے ہیں تو ہم ان سے مل لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آفریدی صاحب! اس ریٹائرڈ دماغ کے ڈاکٹر اور آپ کے درمیان شناسائی کا سبب کیا ہے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ پہلے جہاں ہم رہتے تھے لاہور میں...... وہاں ایک خاتون میری خالہ بنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر انہی کا شوہر ہے۔ جب بھی امی سے ملتی ہیں تو انہی کے قصے کہتی ہیں، پاگلوں میں رہتے رہتے خود پاگل ہو گئے ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی پاگلوں سے جان نہیں چھوٹی۔ اپنا نفسیاتی کلینک چلاتے ہیں۔" آفریدی نے بتایا۔

آدھے گھنٹے میں ہم ڈاکٹر مینٹل کے گھر میں تھے۔ گھر کی حالت کوئی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر بھی پرانا تھا۔ پرانے وقتوں کے ایک اسپیشلسٹ کی ایسی مالی حالت غیر متوقع تھی۔ آج کل کے اسپیشلسٹ تو دولت مند مریضوں اور مہنگی دوائیں بنانے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مدد سے لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا۔ ان کی تیس چالیس سال ساتھ چلی ہوئی شریکِ حیات نے دروازہ کھول کے ہمیں بٹھا دیا تھا جیسے پاگل خانے میں ڈاکٹر اور عملہ سب پاگل نظر آتے ہیں۔ وہ بھی مجھے کچھ ایسی ہی لگیں۔

ڈاکٹر کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم چہرے مہرے اور حلیے سے بھی پرانا بوڑھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے بال بہت گھنے اور سفید تھے اور بڑے سلیقے سے پیچھے بنے ہوئے تھے۔ اس نے سرخ شرٹ کے ساتھ گرے پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کے بیٹھ گیا۔

"آپ اس مریض کو دکھانے آئے ہیں؟" اس نے چن ماہی کی طرف دیکھا۔

چن ماہی مسکرایا۔ "یہ آپ کی شہرت سن کر آئے ہیں۔ آپ برین فنکشن کنٹرول پر کوئی تحقیق کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ ہیومن بی ہیویئر کو متاثر کرنے والی دواؤں پر کسی جرمن سائنٹسٹ کی مدد سے مل کر ریسرچ کر رہے تھے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ ناممکن ہے یہاں۔ وہ مجھے جرمنی بلا رہا ہے‘ ابھی میں کسی سے کچھ شیئر نہیں کر رہا ہوں۔“

ترپ کے پتّے کی طرح میں نے جیب سے دوائیں نکالیں اور ڈاکٹر اشفاق کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے پیکٹ اٹھا کے ایک ایک دوا نکالی اور اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہو چکی تھی۔ ”یہ کون استعمال کرتا ہے یا کراتا ہے؟“

”کوئی بھی نہیں۔ اور استعمال کسی کو بھی نہیں آتا۔“ انور نے کہا۔

”پھر یہ تمہارے پاس کیسے؟“ وہ ہم سب کو دیکھتا رہا اور ان کی الگ الگ صفات بتاتا رہا۔

میں نے کہا۔ ”آپ تو ان کا استعمال جانتے ہیں؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میری تو فیلڈ ہے۔ پھر یہ عام استعمال کی چیز نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں ڈائریکٹ اور مختصر بات کروں گا۔ یہ میرا دوست انور ہے۔ اس کی عمر رسیدہ ماں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اغوا کرنے والوں کا ایک بندہ ہمارے ہاتھ لگا ہے مگر وہ کچھ بتاتا نہیں۔ پولیس کے تربیت یافتہ تفتیش کاروں نے بڑی محنت کی۔ اسے سب معلوم ہے مگر زیادہ تھرڈ ڈگری کا استعمال کیا تو وہ مر جائے گا پھر ہمارے پاس کوئی کلیو نہیں رہے گا۔“

اس نے ایک انجکشن اٹھایا۔ ”تم اس سے سچ اگلوانا چاہتے ہو؟ اس کی مدد سے؟“

”ظاہر ہے۔ پولیس پر بھروسا نہیں۔ کام جلدی کا ہے۔“

”یہ اچھا تجربہ ہوگا۔“ اس نے جیسے خود سے کہا۔ ”جب وہ سچ کہے گا۔ اس کے نتائج میرے لیے اہم ہیں لیکن وہ خود کہاں ہے۔ اگر تم اسے لے آتے۔“

”یہ تکلیف آپ ہی کریں گے۔ اس کی فیس ہم آپ کو منہ مانگی دے سکتے ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”منہ مانگی؟ بات یہ ہے کہ ساری عمر مجھے صرف تنخواہ ملی۔ باقی ڈاکٹر ریٹائر ہوتے ہیں تو اپنی پریکٹس کرتے ہیں۔ یہاں نفسیاتی علاج کرانے کون آتا ہے۔ لوگ ماں باپ کو جان چھڑانے کے لیے آخری عمر میں کسی پاگل خانے کے حوالے ضرور کر آتے ہیں۔ تم میرے گھر کی حالت دیکھ رہے ہو؟ اور بھی اسپیشلسٹ دیکھے ہوں گے تم نے جو باہر سے ڈگریاں لے کر آئے۔“

انور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہم جو بھی کر سکتے ہیں‘ ضرور کریں گے۔“

”تم پڑھے لکھے لوگ ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ غیر قانونی کام سب کرتے ہیں مگر اس کی ایک قیمت لیتے ہیں۔ میں یہ نہ کرتا مگر مجبوری یہ ہے کہ مجھے کم سے کم ایک بار جرمنی جانا ہے‘ تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”بہت اچھی طرح ڈاکٹر صاحب۔“

”میں صرف ریسرچ کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مجھے جرمنی پسند ہے اور پاکستان پسند نہیں۔ یہ تعلیم کا سلسلہ ساری عمر ختم نہیں ہوتا اور اگر میں نے کوئی مفید کام کیا۔ یہاں تو سہولت بھی نہیں‘ تو وہ کس کے کام آئے گا؟ صرف میرے...... میرے کولیگ مذاق اڑاتے تھے کہ میں نوبل پرائز لے لوں گا۔ کیا یہ بری بات ہے؟ اور نوبل پرائز سے کیا صرف مجھے فائدہ ہوگا۔ میرے ملک کا نام روشن نہیں ہوگا۔ اس کے بعد تحقیق کے نتائج سے ساری انسانیت کو فائدہ ہوگا جو ذہنی امراض میں مبتلا ہیں۔“

شاید وہ جینئس تھا اور جینئس سب پاگل ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ مذاق اڑاتے ہوں گے کہ پاگل خانے میں رہ کر وہ پاگل ہو گیا جیسے پاگل پن کوئی چھوت کا مرض ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا موجد ایڈیسن بچپن میں مرغی کے انڈوں پر بیٹھ گیا تھا کہ اکیس دن بعد بچے نکل آئیں گے۔ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا سائنس داں آئن اسٹائن ایک عالمی کانفرنس کی صدارت کے لیے جا رہا تھا تو بیوی نے بہت سمجھا کے موزے اور ٹائیاں رکھے تھے لیکن وہ واپس آیا تو دونوں پیروں میں موزوں کا رنگ الگ تھا اور ٹائی مضحکہ خیز انداز میں گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔

”تم سوچ میں پڑ گئے، زیادہ مانگ لیا میں نے؟“

میں چونکا۔ ”نہیں سر، ایسا نہیں۔ آپ ابھی چل سکتے ہیں؟“

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”گویا تم بندوبست کر دو گے میرے جرمنی جانے کا؟“

راستے میں وہ ہمیں بتاتا گیا۔ ”ایک بار میں جرمنی پہنچ گیا تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ میرے لیے سب انتظام ہو جائے گا۔ کچھ لوگ ہنستے ہیں کہ اب کیا فائدہ...... مگر کام تو کام ہے۔ اس میں دیر بھی ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کام ہی چھوڑ دیا جائے۔“

”آپ نے اس وقت کوشش کیوں نہیں کی؟ جب

آپ سروس میں تھے؟"

"مجھے بیوروکریٹس سے نمٹنا نہیں آتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے وظیفے تھے مگر کیمیکل ہیلتھ...... دل، جگر کے امراض، زنانہ امراض، دماغ کی کسے پروا ہے۔ سارا ملک پاگل کہتا ہے ایک دوسرے کو، اور میں بتاؤں رشوت نہیں لی میں نے۔"

میں نے افسوس سے اس پرانے وقتوں کے شریف آدمی کو دیکھا۔ "آج کے زمانے کے معیار پر آپ بے وقوف ہیں۔"

وہ اداس ہو گیا۔ "بیوی بھی ایسا ہی سمجھتی ہے اور بچے...... وہ تو کہتے تھے کہ ملتا ملاتا کچھ نہیں۔ ہماری بدنامی مفت میں ہوتی ہے کہ باپ پاگل خانے میں ہے۔ ان سب کو پڑھا لکھا کے اس قابل کر دیا میں نے کہ آج سکھ چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر ایسے دور دور رہتے ہیں جیسے میں سچ مچ پاگل ہوں۔"

وہ مجھے راستے بھر ان دواؤں کے خواص کے بارے میں بتاتا رہا۔ سب نہیں تو اس کا کچھ حصہ میں پہلے سے جانتا تھا اور مجھے یہ بتانے والی کوئی ڈاکٹر نہیں ایک عام عورت تھی جو زیادہ پڑھی لکھی تھی اور نہ کسی پاگل خانے کے طریق علاج سے واقف مگر اس نے بہت کچھ جان لیا تھا جو عام نہیں تھا۔ میرے دماغ میں امید کی ایک کرن تھی کہ شاہینہ نے باپ سے سیکھا، باپ نے بھی تو کسی سے سیکھا ہی ہوگا اور وہ پاکستان میں ایک ہی آدمی نہیں ہو سکتا۔ دماغ کا معاملہ ہے تو ڈاکٹر الگ ہوتا ہے سرجن الگ۔ ڈاکٹر مجھے ملتان میں ہی مل گیا تھا۔ لاہور، کراچی میں بھی مل جاتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ساتھ نہ آتے۔

مرادنگر کی طرف مڑنے والی سڑک روشن تھی۔ ڈاکٹر نے مضافات سے اتنی دور کی کوئی آبادی نہیں دیکھی تھی۔ یہاں تو جگمگاتی رات جنگل میں منگل کا سماں پیش کرتی تھی۔ اسی چکاچوند پیدا کرنے کا ایک مقصد پبلسٹی تھا۔ سکندر شاہ کا پہلا پروجیکٹ ایسا تھا تو اس کے بعد والا کیسا ہوگا۔ جب وہ نئی اسکیم اناؤنس کرے گا تو بکنگ کرانے والے قطار بھی بنائیں گے۔ یہ بلڈرز کی اسٹریٹجی ہے۔ چکاچوند پیدا کرنا۔ صرف روشنیوں سے ہی نہیں، گل و گلزار سے رنگوں اور آسائشوں کے فریبِ نگاہ سے، کیا ہے جو یہاں نہیں ہے، آؤ آؤ۔

گاڑی مین گیٹ کے سامنے رکی تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ ریشم اور روبی نے دلچسپی اور تجسس کے ساتھ پروفیسر کو دیکھا۔ میں نے کہا۔ "جیسے اللہ والے دل کا حال جان لیتے ہیں یہ دماغ کو سمجھتے ہیں۔"

روبی نے متانت سے کہا۔ "اگر دماغ ہو۔"

میں نے کہا۔ "اسی لیے خواتین کو نہیں دیکھتے۔"

پھر ہم پروفیسر کو اندر لے گئے۔ اندر نہ سکندر شاہ تھا اور نہ انور۔

"فون آیا کسی کا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور چلی گئی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر کو اس کیس کی دیگر تفصیلات بھی مہیا کر دوں۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کیس ہسٹری تھی۔ کوئی فون ریسیو ہونے کی اطلاع نے انور کو مضطرب کر دیا تھا۔ اسی وقت ریشم دوڑتی ہوئی آئی۔ فون کال موصول ہو گئی تھی۔

فون سیٹ گزشتہ رات سے سکندر کے بیڈ روم میں تھا۔ انور لپکا تو ریشم سے ٹکرایا۔ جھنجلایا۔ "تم کہاں راستہ روکے کھڑی ہو۔" اور اسے پشیمان پریشان چھوڑ کے نکل گیا۔ کہاں کے رسم و رواج کی پابندی اور کہاں کے جذبات۔ اس نے تو شاید یہ بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ ٹکرانے والی ریشم ہے۔ وہ بسورتی ہوئی لوٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بدحواس لوٹی۔ "وہ، فون انہوں نے لے لیا ہے۔"

"کس نے؟" میں نے پوچھا۔

"مراد کی ماں نے۔ کہتی ہے مراد کا فون ہے۔ باتیں کر رہی ہیں معلوم نہیں کیا۔"

"انور سنبھال لے گا ماں کو۔" میں نے کہا۔

"وہ نہیں سن رہی ہیں اس کی۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ ماں جی کو زبردستی لے جائیں۔"

یہ بڑی عجیب صورت حال ہو گئی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں گیا۔ ادھر ایک بیٹے سے بچھڑی ماں کے جذبات کی دیوانگی تھی۔ دوسری طرف ایک خطرناک مجرم...... ان کے درمیان کیا بات ہو گی۔ لیکن وہ بڑی متانت سے مصروفِ گفتگو تھیں اور دونوں طرف سے سوال جواب ہو رہے تھے۔

"اماں کس سے بات کر رہی ہیں؟" میں نے پریشان صورت انور سے پوچھا۔

"یار کچھ پتا نہیں، کال اسی کی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ کیسے معلوم ہوا؟ ریشم کو کیا پتا؟"

"یار میں نے پوچھا ہے اس سے...... اس نے کہا کوئی مرد تھا۔ بہت بدتمیزی سے بات کر رہا تھا، وہی ہوگا۔"

ریسیور اماں سے چھینا نہیں جا سکتا تھا۔ انور نے واجبی سی کوشش کی مگر وہ ریسیور کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔

''تو جا یہاں سے...... ابھی میں بات کر رہی ہوں۔''

''اماں میری کال تھی۔'' وہ بے بسی سے منمنایا۔ اس صورتِ حال پر ہنسی بھی آتی تھی۔

اماں بیڈ کے آخری کنارے پر چلی گئی تھیں اور انہوں نے ریسیور کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ چھینا جھپٹی میں تار ٹوٹتا یا فون...... کچھ دیر بعد میں نے گفتگو پر غور کیا اور بھونچکا رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ''انور! بات تیری ماں سے ہو رہی ہے۔''

بے یقینی کے ساتھ خوشی حیرت اور اطمینان کے جذبات انور کے چہرے پر پھیل گئے۔ ''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری طرف سے انور کی ماں ہی محوِ گفتگو تھی۔ وہ ایسے بات کر رہی تھیں جیسے کال مراد اماں والی سے مراد گھر کی گئی تھی۔ ان کے درمیان پہلے حویلی کے رشتوں پر بات ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے اس پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ پھر بات زمانہ حال پر آ گئی کہ چلو، جو ہوا سو ہوا۔ آگے کی بات کرو۔ بات پہنچی ریشم کی انور سے شادی پر اور طے پایا کہ اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

صورتِ حال یکلخت بدل گئی تھی۔ ہم بات کرتے تو انور کی ماں کی خیریت ہی دریافت کرتے۔ اس کا ثبوت مل گیا تھا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ ہم سے بات کرنے والے نے جب اماں کی آواز سنی ہو گی تو اس کے دماغ نے ایک چال چلی۔ اس نے انور کی ماں اور مراد کی ماں کی بات کرا دی۔ دوسری طرف سچویشن نہ جانے کیا ہو گی۔ ادھر تو ہمارے قبضے میں فون ہی نہیں آیا تھا۔ سنائی دینے والی آواز کے بارے میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ انور کی ماں تھی۔ وہ اتنی پُرسکون کیسے ہو سکتی تھی اور بالکل نارمل طریقے سے بات کیسے کر سکتی تھی۔ یہ کسی اجنبی جگہ پر ان کی قید کا دوسرا دن تھا۔ ان کو اپنے گھر سے نکل کے جانا پڑا تھا۔ شاید انہیں یہ بھی علم ہو گا کہ ان کی وہ حویلی جو خاندانی وقار کی علامت تھی، جہاں وہ رخصت ہو کے آئی تھیں اور زندگی گزاری تھی۔ وہ تباہ ہو چکی۔ ان کو انور کی طرف سے بھی متفکر ہونا چاہیے۔

ایک دم میرے ذہن نے یہ ڈراما مسترد کر دیا۔ میں نے اس کی وضاحت انور سے بھی کر دی جو خود اب شکوک میں مبتلا تھا۔ ''یہ ان کا فراڈ ہے نہ جانے دوسری طرف کون عورت ہے۔ وہ بریف کیے ہوئے جوابات دے رہی ہے۔''

ادھر میں سکندر کی بیوی کو پاگل تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن وہ جذباتی عدم توازن کا شکار تھی۔ تُو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز...... اسے زندگی اور خوشی کے لیے بہانہ درکار تھا۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کسی تذبذب کے بغیر اپنی بہو کو شادی کے کپڑوں میں دیکھا تو مان لیا کہ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ درمیان میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور اب وہ اسی جھوٹ کے کھیل میں خوش اور مطمئن تھی کہ مراد زندہ ہے۔ دوسری طرف سے ایک عیار دشمن کو بہانہ مل گیا تھا۔ مراد کی ماں کون سا فون پر انور کی ماں کی آواز پہچانتی تھی۔ شاید دوسری طرف سے کوئی عورت دشمن کے اسکرپٹ اور ہدایات کے مطابق بات کر رہی تھی۔ وہ انور کی ماں نہیں تھی مگر مراد کی ماں نے مان لیا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آنے کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا آسان ہو گیا۔ انور نے بریکٹ سے تار الگ کر دیا۔ میں اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مراد کی ماں اب مایوسی سے خاموش ریسیور تھامے بیٹھی تھیں۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ شاید دس منٹ جاری رہا تھا۔

''ماں جی کیسے ہو سکتی ہیں اتنی نارمل؟'' انور نے کہا۔

''یہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا۔ تو کہتا کہ ان سے بات کراؤ۔ اب وہ کہے گا کہ بات ہوئی تو تھی، مجھے بھی یقین ہے کہ یہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی گئی۔'' میں نے کہا۔

''مگر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''کیا مطلب؟''

''وہ ماں جی سے بات کرا سکتا تھا۔ نہ چاہنے کا مسئلہ ہے یہ یا ان کے نہ ہونے کا؟''

میں نے کہا۔ ''خواہ مخواہ پریشان مت ہو۔ اس سے پھر بات ہو گی تو کنفرم کر لیں گے۔''

ڈاکٹر نے پچاسویں بار گھڑی دیکھی اور دسویں بار کہا کہ دیر ہو رہی ہے۔ اسے جانا بھی ہے۔

''سوری، وہ بیچ میں دوسرا معاملہ آ گیا۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔'' انور نے کہا۔

میں اس کا مختصر بیگ لیے پیچھے چلا۔ باہر نکل کے ہم سیدھے ہاتھ کی طرف اور پھر پیچھے گئے جہاں سے زینہ نیچے تہ خانے میں جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے قلعہ نما رہائش گاہ کے حفاظتی انتظامات اور اس کی وسعت اور شان و شوکت کو بہت مرعوب ہو کے دیکھا۔ میرا دماغ اس نئی الجھن میں گرفتار تھا جو انور اور مراد کی ماں کے درمیان مکالمے سے پیدا ہوئی تھی۔ مراد کی ماں سے کچھ پوچھنا لاحاصل تھا۔ وہ اپنے

خیالوں کی دنیا میں زندہ تھی حقیقت سے اس کی دوری خود اس کے حق میں ہی بہتر تھی اور ہمارے لیے بھی...... لیکن اس غیر متوقع گفتگو نے میرے دل میں بھی بہت سے اندیشوں کو جگا دیا تھا۔ انور کے سوال کا میرے پاس بھی جواب نہ تھا کہ اس ڈرامے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

اگر خدانخواستہ قید کی سختی...... کسی اچانک بیماری یا محض صدمے سے انور کی ماں نہ رہی تو پھر اس سب تگ ودو کا حاصل کیا جو ہم کر رہے تھے؟

یہ نچلی منزل کا اسٹور روم جیسا کمرا تھا۔ دیگر کمروں کے مقابلے میں کچھ چھوٹا۔ رانا فرش پر پڑا ہوا تھا اور مردہ لگتا تھا مگر وہ نیند میں تھا۔ انسپکٹر نے لات مار کے اسے اٹھایا اور ایک گالی عادتاً دی۔ ”مکرمت کر......“

وہ سوئے شیر کی طرح اٹھا اور آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ ”تم پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔ یہ جو کچھ تم کر رہے ہونا۔“ وہ غرایا۔

انور نے ایک لات مار کے اسے گرا دیا۔ ”پہلے اپنی خیر منا۔“

بوٹ کی ٹھوکر اس کے گال پر لگی تھی۔ وہ کراہا اور منہ پکڑ کر خون تھوکنے لگا۔ ”مٹ گئے ہو پہلے ہی...... نام ونشان نہ رہے گا تمہارا...... قبر پر کتے موتیں گے۔“ اس نے اپنے جلالی انداز میں بددعائیں دینا شروع کیں۔

میں نے انور کو روکا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”اچھا تھا تم خود ہی کچھ سوالوں کے جواب دے دیتے۔ اب تمہارا توڑ یہ بنگالی کالے علم کا ماہر ہے۔“

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ ”اللہ والوں پر کالا جادو اثر نہیں کرتا۔ سمجھا دو اس جوکر کو۔“

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ڈاکٹر اپنا کام شروع کرے۔ رانا تنومند آدمی تھا۔ اسے رضا کارانہ طور پر انجکشن لگوانے کے لیے آمادہ کرنا جتنا مشکل تھا زبردستی اس کے بازو کی ایک رگ میں انجکشن کی سوئی اتارنا اس سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔ میں نے انسپکٹر اور اس کے مددگار کو اشارہ کیا۔ ”اسے قابو کرو، باندھ کے ڈال دو۔“

یوں لگتا تھا جیسے رانا نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ ”خبردار جو کوئی میرے قریب آیا۔ بھسم کر دوں گا۔“

یہ وہی ڈائیلاگ تھے جو اسے درگاہ کی عادت پڑ گئی تھی۔ جن اتارتے وقت کبھی کسی منہ زور جن سے تو کبھی شاہِ جنات سے ہر جگہ ایک سی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے جسم میں کچھ غیر معمولی طاقت آگئی تھی کہ اس کو جکڑنے کی کوشش کرنے والا حوالدار اور اس کا باس بری طرح پسپا ہوئے۔ اس نے ایک کے پیٹ میں لات ماری اور دوسرے کو سر سے ٹکر۔ وہ گالیاں بکتے اٹھے۔ انسپکٹر اب اس کے سر پر مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھا چکا تھا جو اس کی کلائی سے موٹا تھا۔

میں نے اسے روک دیا۔ ”دیکھو رانا! تم جانتے ہو کہ یہاں سے تم لڑ بھڑ کے نہیں نکل سکتے۔“

اس نے ایک نعرہ لگایا۔ ”کوئی نہیں بچے گا۔ سب خاک ہو جائیں گے۔“

آہستہ آہستہ دوستانہ لہجے میں بات کرتا میں اس کی طرف بڑھا۔ ”ہماری بات ہو گئی ہے۔ رات کو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔“

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ”اللہ والوں کا مقابلہ کرتے ہو۔“

دو فٹ کا فاصلہ تھا کہ میں بجلی کی طرح اس پر ٹوٹا۔ یہ ایک ہی کھڑی ہتھیلی کی ضرب تھی جو اس کی بھینسے جیسی گردن پر لگی۔ عرصہ دراز سے میں آؤٹ آف پریکٹس تھا لیکن کوئی سبق بھولا نہیں تھا۔ پریکٹس نہ ہونے سے وار اوچھا پڑتا تو کارگر نہ ہوتا لیکن مجھے بڑی خوشی ہوئی جب تین من کا ہٹا کٹا لڑکھڑا کے زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارت کی طرح گر گیا۔

”اب آپ اپنا کام کر سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے انجکشن نکالا۔ ”ایک بات اور...... تمام دواؤں میں ری ایکشن کا رسک ہوتا ہے۔ خطرناک دواؤں میں زیادہ ہوتا ہے۔ کسی نقصان کی ذمے داری میری نہیں ہوگی۔“

میں نے اسے روک لیا۔ ”پہلے بتا دیں یہ ری ایکشن کیا ہو سکتا ہے؟“

”کچھ بھی، اس کا دماغ مفلوج ہو جائے۔ دس فیصد چانس ہے کہ دوا کارگر نہ ہو اور دس فیصد یہ کہ موت واقع ہو جائے۔“

میں نے انور کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے رضامندی میں سر ہلایا۔

اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے رانا کی شیطانی طاقت کارگر ہو گئی۔ ایک دھماکا ہوا۔ مجھے اس زمین دوز کمرے کے در و بام لرزتے محسوس ہوئے۔ چھت سے چونا گرا، پھر جیسے پوری عمارت گر گئی۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

آرزوئوں کا تصوراتی تاج محل لمحوں بھر کا محتاج ہوتا ہے... مگر حقیقت میں تراشے گئے اس محل کی تعمیر میں برسوں لگ جاتے ہیں... ایک بوڑھے شخص کی عجیب و غریب خواہش کا دردناک قصہ... وہ اپنے خاندان کا آخری فرد تھا... اور کسی صورت نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بعد اس کا خاندان بے نام و نشاں رہ جائے...

عمدہ منصوبہ بندی کی حامل کہانی کا غیر متوقع انجام

تکمیلِ آرزو

سلیم انور

"میں اپنے خاندان کی آخری پیڑھی ہوں۔" بوڑھے فریڈی نے کہا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فلالین کا پاجامہ اور رنگین چار خانے کا اونی ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔

کمرے کے دوسرے حصے میں اس کا خدمت گار ٹیری واٹسن اس کا بستر درست کر رہا تھا۔

"میں وہ نایاب نسل ہوں جس کا وجود خطرے میں ہے۔" بوڑھے فریڈی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ ”ایک بار جب میں مرجاؤں گا تو کارلنگ ورتھ خاندان کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا۔ ہمارے وجود کی نشانیوں میں صرف چند باقیات رہ جائیں گی جیسے چند تصویریں، مرنے کے بارے میں دو ایک نوٹس اور قبر کے کتبے پر تراشے ہوئے الفاظ جو وقت کے ساتھ دھندلا جائیں گے۔ بس یہی انجام ہوگا۔“

”کم آن، فریڈی۔ افسردگی کی باتیں مت کرو۔“ ٹیری نے بستر کی چادر جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی پیڑھی کی آخری نشانی کس طرح ہو سکتے ہو؟ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کارلنگ ورتھ تو موجود ہوگا۔“

”اگر کوئی موجود ہوتا تو اس سے عمدہ اور کیا بات ہوتی، ٹیری! لیکن میں ہی اس خاندان کا آخری فرد باقی رہ گیا ہوں۔ تم چاہو تو فون بک میں یا انٹرنیٹ پر چیک کر سکتے ہو۔ میں ہی وہ واحد کارلنگ ورتھ ہوں گا جو تمہیں ان دونوں جگہوں پر ملے گا اور کیا تم جانتے ہو کہ اس حوالے سے بدترین بات کیا ہے؟“

خدمت گار ٹیری نے پلٹ کر استفہامیہ نظروں سے بوڑھے فریڈی کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

”میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی خاص کام نہیں کیا۔ بس وقت کے دھارے میں بہتا رہا۔ میں نے آسان روٹ اختیار کیا اور کبھی بھی غیر ضروری رسک نہیں لیے۔ میری تمام زندگی بے عملی اور جمود کا شکار رہی۔ البتہ کبھی کبھار کسی عورت کی توجہ حاصل کرنا چاہی بھی تو وہ مجھے جل دے کر نکل گئی۔ کوئی ایسی عورت زندگی میں نہیں آئی جو ہمارے خاندان کو آگے بڑھانے میں میری معاونت کر سکتی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنی تمام زندگی ایک بلبلے میں بند ہو کر گزار دی ہے۔ لیکن وہ بھی تن تنہا...... سب سے الگ تھلگ۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟“

”میری عمر اڑتالیس برس ہے اور میں بہ طور کیئر اسسٹنٹ کام کر رہا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اب بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوں؟“ ٹیری نے کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تم سمجھ جاؤ گے۔ تم میں اور مجھ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔“

ٹیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اب وقت آچکا ہے کہ میں مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوں۔ فریڈی نے کہا۔ ”کسی عمل سے اپنا نام پیدا کر جاؤں۔ دنیا میں اپنی شناخت کی کوئی نشانی چھوڑ جاؤں۔“

”نشانی؟“ ٹیری نے تکیے کا کور بدلتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ایک زبردست دھماکا کر جاؤں اور کارلنگ ورتھ کا نام دنیا کے نقشے پر ثبت کر دوں جو کہ میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں اپنا اکلوتا وارث بنا دوں گا۔ تمہیں میرا مکان مل جائے گا، اپنے تمام بینک اکاؤنٹس تمہارے نام کر دوں گا اور اس تمام رقم سے تم اپنا نام بھی پیدا کر سکو گے۔ بس تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“

”مدد؟“

”ہاں، میری عمر تراسی برس ہے۔ مجھے اپنی مدد کے لیے ایک ونگ مین چاہیے۔“

”ونگ مین؟“

”بینک کے لیے۔“

”بینک کے لیے؟“ ٹیری نے دہرایا۔

”میرا مطلب ہے بینک لوٹنے کے لیے۔“ فریڈی نے وضاحت کی۔

”بینک لوٹنے کے لیے؟“ ٹیری نے تکیہ بیڈ پر رکھ دیا اور دھم سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ”بینک لوٹنے کے لیے؟“ اس نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں، بینک لوٹنے کے لیے۔ اور اپنا حوصلہ بلند رکھو، کیا سمجھے؟ میری ہمیشہ ہی سے کسی بینک کو لوٹنے کی خواہش رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ دو ہی چیزوں کا خواب دیکھا ہے۔ ایک کسی بینک کو لوٹنے کا اور دوسرا سامنے سے آتی ہوئی کسی کار سے آمنے سامنے کی ٹکر کا۔ کیا تم نے بھی اس بارے میں سوچا ہے؟“ فریڈی نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”آمنے سامنے کی ٹکر؟“ ٹیری کے لہجے سے بدستور حیرت عیاں تھی۔

”ہاں، کیسا ہوگا جب آپ کی کار رخ موڑ کر سینٹر لائن سے دوسری جانب چلی جائے اور مخالف سمت سے آنے والی کار سے آمنے سامنے کی ٹکر ہو جائے؟“

”نہیں، بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے...... اور...... اور ہم کوئی بینک نہیں لوٹ رہے...... میرا مطلب ہے کہ تم کوئی بینک نہیں لوٹ رہے۔“

”تم کس قسم کے کیئر اسسٹنٹ ہو؟“ فریڈی نے

کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تمہارا مقصد میری ہر خواہش کو بر لانا اور میرے آخری دنوں میں میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے۔''

''میں ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں، لیکن ہم کوئی بینک نہیں لوٹیں گے، فریڈی۔ تم ڈزنی لینڈ جانا چاہتے ہو، فائن۔ تم کسی فینسی ریسٹورنٹ میں آخری کھانا، کھانا چاہتے ہو تو میں چچے کی مدد سے تمہیں کھانا کھلانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم کسی ہوائی جہاز سے چھلانگ لگانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کسی بینک کو لوٹنے کے معاملے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

''تم یہ خوبی جانتے ہو کہ چند گز چلنے کے بعد میرا سانس پھولنے لگتا ہے اور پھر میرے لیے مزید قدم اٹھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر بھلا میں تمہاری مدد کے بغیر کسی بینک کو کس طرح لوٹ سکتا ہوں؟ اور تمہارے علاوہ میرے پاس اور کوئی بھی نہیں ہے، جو میری مدد کر سکے، یا ہے؟'' فریڈی نے سوال کیا۔

''دیکھو، میرے بارے میں تو بھول جاؤ اور میری مدد کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔'' ٹیری نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں کس کی مدد مانگوں؟''

''ویسے ایک بات تو بتاؤ۔'' ٹیری نے کہا۔ ''کسی بھی صورت تم بغیر گن کے بینک کس طرح لوٹ سکتے ہو؟''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے ایک گن کا بھی انتظام کر دو۔''

''اف خدایا!'' ٹیری نے سر تھام لیا۔ ''تم مجھ سے یہ توقع کیوں کر رہے ہو کہ میں تمہارے لیے ایک گن حاصل کر سکتا ہوں۔ میں ایک نرسنگ ہوم میں ایک کیئر اسسٹنٹ ہوں، میرا تعلق بدمعاشوں کے کسی گروہ سے نہیں ہے۔''

''ٹام اسمتھ کے پاس ایک شاٹ گن ہے۔'' فریڈی نے اسی نرسنگ ہوم کے ایک اور باسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک الماری میں محفوظ ہے اور اس میں تالا لگا ہوتا ہے۔'' ٹیری نے جواب دیا۔

''تم چاہو تو......''

''نہیں۔'' ٹیری نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

''تو پھر اغوا کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اغوا! کس کا اغوا؟''

''ہم اس رئیس کی بیٹی کو اغوا کر سکتے ہیں جو اس نرسنگ ہوم کا مالک ہے پھر اس سے تاوان طلب کریں گے۔''

''نہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس بے چاری بچی کو دہشت میں مبتلا کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس میں اس بچی کا کوئی قصور نہیں کہ اس کا باپ ایک خبیث انسان ہے۔''

یہ سن کر ٹیری نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اس کا یہ اطمینان عارضی تھا۔

فریڈی دوبارہ گویا ہوا۔ ''بہتر یہی ہوگا کہ ہم بینک لوٹنے کے کام تک ہی محدود رہیں۔''

''بینک لوٹنے کا کوئی کام نہیں ہوگا۔'' ٹیری نے قدرے غصے سے کہا۔

''تمہارا شیئر ایک ملین ڈالرز ہونا چاہیے۔ میرا مال و اسباب اس کے علاوہ جب میں مر جاؤں گا۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ پھر تمہیں بوڑھے لوگوں کی غلاظت صاف کرنے اور ان کے سرین دھلانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''ایک ملین ڈالرز۔''

''ایک ملین ڈالرز اور اس کے علاوہ وہ تمام رقم جو میں نے بچت کی ہے۔ پھر میرے مکان کی مالیت بھی چند لاکھ ڈالرز ہوگی۔'' فریڈی نے ٹیری کو لالچ دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تم ہو گے جو بینک لوٹو گے، میں نہیں؟''

''گن میرے ہاتھ میں ہوگی۔'' فریڈی نے کہا۔

اس کی آنکھیں جوش اور ہیجان سے چمکنے لگی تھیں۔ یہ جگمگاہٹ برسوں بعد اس کی آنکھوں میں دیکھنے میں آئی تھی۔ ''تم میرے ونگ مین ہو گے......تم میری وہیل چیئر دھکیل کر بینک کے اندر لے جاؤ گے اور بینک لوٹنے کے بعد بچ نکلنے کے لیے گاڑی بھی تم ہی ڈرائیو کرو گے۔''

''وہیل چیئر دھکیل کر بینک کے اندر لے جاؤں گا؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟'' ٹیری نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''کوئی بھی وہیل چیئر میں بیٹھ کر بینک نہیں لوٹتا۔'' ٹیری نے بے بسی سے کہا۔

''جب ہی تو انہیں توقع نہیں ہوگی کہ ہم بینک لوٹنے کے لیے آئے ہیں اور وہ رقم ہمارے سپرد کر دیں گے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم زیادہ دور نہیں پہنچ پائیں گے اور وہ ہمیں دھر لیں گے۔'' فریڈی نے کہا۔

''دھر لیں گے؟'' ٹیری نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، کیونکہ میرا ایک پلان ہے۔''

''کیسا پلان؟''

''مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے برسوں کا وقت مل گیا تھا، ٹیری۔ میں نے منصوبے کی تمام تفصیلات پورے دھیان کے ساتھ طے کر لی ہیں۔ میرا جسم ضرور ناکارہ ہو چکا ہے لیکن میرے دماغ کے خلیے اب بھی درست کام کر رہے ہیں اور ان کی کارکردگی میں کسی قسم کی خامی نہیں ہے۔''

''یہ تو اپنی اپنی رائے کا معاملہ ہے۔'' ٹیری نے کہا۔ پھر وہ بیڈ پر سے اٹھ کر آلودہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''دیکھو اور میری بات دھیان سے سنو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہیں میں نے مجبور کیا تھا۔ تمہیں گن دکھا کر دھمکایا تھا۔'' فریڈی نے اسے راغب کرنے کی کوشش کی۔

ٹیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور کھڑکی سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''تمہیں کس چیز سے محروم ہونے کا ڈر ہے؟'' فریڈی نے پوچھا۔

''اپنی آزادی سے۔'' ٹیری نے جواب دیا۔ ''میری آزادی کا خاتمہ جیل میں ہو سکتا ہے۔''

''تم کسی جیل میں نہیں جاؤ گے۔ میں نے تم سے ابھی کہا ہے کہ اس کا نتیجہ میں خود بھگتوں گا۔ یوں بھی میری زندگی کا خاتمہ ہونے کو ہے۔ کم از کم اس طرح میں اس دنیا سے ریں ریں کرتا ہوا نہیں بلکہ دندناتا ہوا رخصت ہوں گا اور میرا نام سب کی زبان پر ہوگا اور اگر ہمارا پلان کامیاب رہا تو تم نہایت امیر آدمی بن جاؤ گے۔'' فریڈی نے اسے یقین دلانا چاہا۔

ٹیری کی نظریں بدستور کھڑکی کے باہر خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس پیشکش کو دل ہی دل میں تول رہا تھا۔ ایک ملین ڈالر یقینی طور پر اس کی زندگی میں یکسر تبدیلی لے آئیں گے۔ وہ تب بھی وقت کے دھارے کے ساتھ زندگی گزارے گا، لیکن یہ ایک پُرتعیش زندگی ہو گی۔ دوسری جانب حالات جس رخ پر جا رہے ہیں تو وہ یونہی نابود ہو سکتا ہے اور شاید اس کے ہاتھ کچھ نہ آئے...... یوں بھی اسے اپنی آنے والی زندگی کے درجن بھر سال مسلح ڈکیتی کی سزا کے طور پر کسی جیل میں گزارنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

''کم آن ٹیری۔'' فریڈی نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ایڈونچر کی حس کہاں چلی گئی؟ کیا تم زندگی بھر ریٹائر ہونے تک ایک کیئر اسسٹنٹ ہی رہنا چاہتے ہو؟ بے بس لوگوں کی دیکھ بھال ہی تمہارا مقصدِ حیات ہے؟ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال جن کے پاس کہنے کے لیے بہت کم ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس میں بھی بے حد وقت لے لیتے ہیں۔''

''اور یہ منصوبہ کامیاب رہے گا؟ کیا ایسا ہی ہوگا؟'' ٹیری نے پوچھا۔

''اس منصوبے میں غلطی کا اندیشہ ہی نہیں ہے۔'' فریڈی نے کہا۔ ''یہ فول پروف پلان ہے۔''

ٹیری نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور کھڑکی سے پلٹ گیا۔

فریڈی نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے، بہتر ہوگا کہ میں ٹام اسمتھ کے لاکر کی چابی حاصل کر لوں۔''

☆☆☆

''تم یقیناً اسے استعمال نہیں کرو گے، ٹھیک ہے نا؟'' ٹیری نے فریڈی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

بوڑھا فریڈی ونڈ اسکرین کے پار خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کا باریک ربر کے دستانے میں بند ہاتھ شاٹ گن کو تھپتھپا رہا تھا۔ ٹیری نے گزشتہ شب اس شاٹ گن کی نالی کو آری سے کاٹ کر بارہ انچ کر دیا تھا۔

فریڈی نے اس وقت اپنا بہترین سنڈے سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کے سائز سے دو نمبر بڑا تھا۔ قمیص کا رنگ ہلکا پیلا تھا جو کبھی سفید ہوا کرتی تھی۔ ٹائی گہرے سبز رنگ کی تھی۔ کیپ پر جلی حروف میں فائٹنگ آئرش نوٹرو ڈیم کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔

''فریڈی؟''

اپنا نام پکارنے پر بوڑھے فریڈی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ڈرائیور کی جانب چہرہ گھماتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہے؟''

''تم اس گن کو استعمال نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟'' ٹیری نے کہا۔ وہ یہ بات اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ دہرا چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب اس نے اس بوڑھے کی اسکیم میں شمولیت کی ہامی بھری تھی۔ اسے اب پچھتاوا ہو رہا تھا۔

''شاٹ گن لوڈ نہیں ہے، ٹیری۔'' فریڈی نے کہا۔

ٹیری نے مشکوک نظروں سے فریڈی کی طرف دیکھا۔

تب فریڈی نے اپنے کوٹ کی جیب کو تھپتھپا دیا جو پھولی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ''کارتوس یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔'' فریڈی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے تو پریشانی کی بات اس لیے نہیں ہے کہ تم اپنی زندگی گزار چکے ہو۔'' ٹیری نے کہا۔ فکرمندی اب بھی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ ''اگر معاملہ الٹ ہو گیا تو تم اس وقت تک بہت پہلے مر چکے ہو گے جب مجھے قید سے رہائی ملے گی۔''

''معاملہ الٹ ہرگز نہیں ہوگا۔'' فریڈی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''منصوبہ بالکل آسان ہے۔ تم مجھے وہیل چیئر پر دھکیلتے ہوئے اندر لے جاؤ گے اور میں رقم طلب کروں گا پھر ہم رقم لے کر وہاں سے چمپت ہو جائیں گے۔''

''اگر انہوں نے ہمیں رقم نہیں دی تو پھر کیا ہوگا؟''

ٹیری نے خدشے کا اظہار کیا۔

''تو یہ شاٹ گن اور کس لیے ہے؟'' فریڈی نے شاٹ گن کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''شاٹ گن کے سامنے کوئی بھی انکار کی جرأت نہیں کرتا۔ یوں بھی دوسروں کی رقم کے پیچھے کوئی اپنی جان داؤ پر نہیں لگاتا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچ چکے تھے۔

ٹیری نے کار ایک ایسی سڑک پر تھما دی جس پر شاپنگ مالز اور دیگر تجارتی مراکز تھے۔ ایک کنارے پر ایک سپر مارکیٹ تھی۔ ان سب کے سامنے کے حصے میں چند ایکڑ پر پھیلی ہوئی پارکنگ لاٹ تھی جو تقریباً خالی دکھائی دے رہی تھی۔

''کار پوسٹ آفس کے سامنے پارک کر دو۔''

فریڈی نے ہدایات دیں۔

''بینک تو ادھر ہے۔'' ٹیری نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

''ہم بینک نہیں لوٹیں گے۔'' فریڈی نے کہا۔

''کیا؟'' ٹیری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ہم بینک نہیں لوٹیں گے۔'' فریڈی نے دہرایا۔ ''ہم پوسٹ آفس کو لوٹیں گے۔''

''لیکن ہماری پلاننگ تو بینک لوٹنے کی تھی۔'' ٹیری نے اپنا گال کھجاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ہماری پلاننگ پوسٹ آفس کو لوٹنے کی تھی۔ کار وہاں پارک کر دو۔'' فریڈی نے اپنی شاٹ گن سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''فریڈی! تم اس اسٹیج پر پہنچ کر اپنا پلان تبدیل نہیں کر سکتے۔''

''پلان ہمیشہ سے یہی تھا، ٹیری۔''

''ہمیشہ سے۔'' ٹیری ایک بار پھر چکرا گیا۔

''ہاں، اور اس کی تین وجہ ہیں جو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ سب سے پہلی وجہ یہ کہ اگر تم نے اپنے بکواس پن سے بھانڈا پھوڑ دیا......''

''بھلا میں کیوں بھانڈا پھوڑوں گا؟'' ٹیری نے فریڈی کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

فریڈی نے اس کی بات نظرانداز کر دی اور سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دوسری وجہ یہ ہے کہ تم بینک کا جائزہ لیتے رہے ہو۔''

''میں.... نہیں تو۔'' ٹیری نے انکار کیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم بینک میں جاتے رہے ہو، لہٰذا انکار کرنے کی زحمت نہ کرو۔ میں نے تمہارے کوٹ کی جیب میں بینک کے کیش پوائنٹ کی رسید دیکھ لی تھی۔ ان کی سیکیورٹی فوٹیج میں تمہارا چہرہ ہر جگہ موجود ہوگا۔''

ٹیری نے اس مرتبہ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''تیسری وجہ یہ ہے کہ بینک کو فورٹ نوکس کی طرح تعمیر کیا گیا ہے۔ جس لمحے ہم اپنی گن نکالیں گے، دروازے خود بہ خود مقفل ہو جائیں گے اور دھاتی شٹر کیشیئرز کے سامنے آٹومیٹک نظام کے تحت آن گریں گے اور ہمارے اور ان کے درمیان آہنی دیواریں حائل ہو جائیں گی۔ پھر ہم اس طرح ٹریپ ہو جائیں گے جیسے چوہا چوہے دان میں قید ہو جاتا ہے۔''

ٹیری آنکھیں پھاڑے فریڈی کی صورت تک رہا تھا۔

''تم نے آخری مرتبہ کسی بینک ڈکیتی کے بارے میں کب سنا تھا؟'' فریڈی نے پوچھا۔ ''برسوں پہلے۔ ٹھیک ہے نا؟''

ٹیری بدستور خاموش تھا۔

''نہیں، اب ہمارے پاس گنے چنے مواقع رہ جاتے ہیں یا تو تم کسی بینک ملازم کی فیملی کو اغوا کر لو اور اسے کیش لوٹنے پر مجبور کر دو، یا کسی بکتر بند وین کو لوٹ لو جو کیش لے جا رہی ہو، یا دیوار میں نصب اے ٹی ایم کو کھدائی کرنے والی مشین سے اکھاڑ کر چمپت ہو جاؤ یا پھر کسی پوسٹ آفس کو لوٹ لو۔ اور ان سب کے مقابلے میں ایک عام پوسٹ

آفس میں سیکیورٹی کے انتظامات سب سے ناقص ہوتے ہیں۔'' فریڈی نے بتایا۔

''جیسس کرائسٹ، فریڈی۔'' ٹیری اپنی نشست پر تلملا گیا۔ ''اور تم نے یہ باتیں اب سے پہلے مجھے بتانا گوارا نہیں کیں؟'' ساتھ ہی وہ اپنے ڈولتے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

''لیکن اب بتا تو دی ہیں۔'' فریڈی نے ٹیری کے جذبات کی پروا کیے بغیر پرسکون لہجے میں کہا۔

ٹیری اسے گھورنے لگا۔

''دیکھو ٹیری! میں تو تم پر ایک عنایت کر رہا ہوں۔ اگر ہم نے بینک لوٹنے کی کوشش کی تو وہاں سے نکلتے وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی۔ البتہ دوسری صورت میں جب ہم پوسٹ آفس سے نکلیں گے تو ہمارے ہاتھوں میں نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ نوٹوں سے بھرا بیگ بہتر رہے گا یا ہتھکڑیاں؟'' فریڈی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ٹیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''نقدی کے علاوہ تمہیں میرا مکان بھی مل جائے گا اور وہ سب کچھ بھی جو میری ملکیت ہے، جب میں اوپر آسمان کی جانب روانہ ہو جاؤں گا۔'' فریڈی نے اسے للچانے کی کوشش کی۔ ''اگر ہم نے یہ واردات درست طریقے سے سرانجام دے دی اور اس کے بعد تم نے اپنا منہ بند رکھا تو ہم کبھی بھی پکڑے نہیں جائیں گے۔''

ٹیری یہ سُن کر نرم پڑ گیا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم، فریڈی میں کسی قسم کا دھوکا نہیں کھانا چاہتا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟''

''ٹیری، ٹیری، کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تم بالکل بھی فکر مت کرو، میں نے تمام معاملات پر اچھی طرح سے غور کر لیا ہے۔ میں نے برسوں تک اسی پوسٹ آفس سے اپنی پینشن لی ہے۔ میں اس جگہ کو اندر اور باہر سے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس کے تعمیری خاکے، اس کے اسٹاف اور یہاں کے طریق کار سے بہ خوبی واقف ہوں۔ صبح کے ان اوقات میں یہاں پینشن کی ادائی اور بے روزگاروں کے الاؤنس کی مد میں کیش بھرا ہوتا ہے۔ ان کو اس وقت لوٹنا اتنا آسان ہوگا جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے کینڈی لینا۔ یہ دیکھو۔'' فریڈی نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ٹیری کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

اس کاغذ پر پوسٹ آفس کے اندر کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ خاکہ خود فریڈی نے تیار کیا تھا۔

''یہ دروازہ ہے۔'' فریڈی نے کاغذ پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے اوپر بائیں جانب ایک کیمرا لگا ہوا ہے۔ اندر کیشیئر کا کاؤنٹر یہاں پر ہے۔ اندر کی جانب کیمرے یہاں، یہاں اور یہاں پر لگے ہوتے ہیں۔ اس وقت جو کسٹمر پوسٹ آفس میں موجود ہوں گے، وہ سب کے سب میری عمر کے ہوں گے۔ بے روزگار اتنی صبح سویرے اپنا الاؤنس لینے نہیں آتے۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' ٹیری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کم آن، اب وہیل چیئر باہر نکال لو۔ اب اس ہیجان خیزی کو ضائع کرنا نہایت شرمناک بات ہوگی۔ میں اب خود کو توانا محسوس کر رہا ہوں۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع ہے جب میں حقیقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں واقعی زندہ ہوں۔'' فریڈی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ٹیری نے اس کے جذبات کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اپنی خفگی، نروس پن کے باوجود وہ بھی حقیقت میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت بوڑھے فریڈی کے جذبات کیا ہیں۔

اس نے اپنی سیاہ کار کے بڈ کو کھول دیا۔ وہیل چیئر تہ کی ہوئی ڈکی میں رکھی تھی۔ اس نے وہیل چیئر باہر نکالی، اس کی تہ کھولی اور اسے چلا کر کار کے پسنجر دروازے کے پاس لے گیا۔ فریڈی کار کا دروازہ پہلے ہی کھول چکا تھا۔

فریڈی اپنے ہاتھوں پر زور لگاتے ہوئے نشست پر سے اٹھا اور کار سے باہر قدم رکھ کر ہانپتے ہوئے وہیل چیئر پر دھب سے بیٹھ گیا۔

''پلیز، گن اور بیگ مجھے تھما دو۔'' اس نے ٹیری سے کہا۔

ٹیری نے دونوں چیزیں کار سے نکال کر اس کے حوالے کر دیں۔

فریڈی نے اسپورٹس بیگ اپنی گود میں رکھ لیا اور شاٹ گن وہیل چیئر پر اپنے دائیں جانب رکھ دی۔

''اب اپنے اپنے ماسک پہن لیتے ہیں۔'' فریڈی نے کہا۔

ٹیری نے مسٹر بین کا ربر ماسک نکال کر فریڈی کو تھما دیا اور خود ایلوس پریسلے کا ربر ماسک اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔

فریڈی نے اپنے چہرے کی باریک جلد کو ربر ماسک سے ڈھانپ لیا اور اپنی کیپ دوبارہ سر پر منڈھ لی۔

''او کے، اب چلتے ہیں۔ یاد رہے کہ اندر داخل ہوتے وقت تم دروازے پر لگے ہوئے کیمرے سے بچ کر گزرنا۔ پھر میری وہیل چیئر کو چلاتے ہوئے کیش کاؤنٹر پر لے جانا۔ ٹھیک ہے؟''

ٹیری نے سر ہلا دیا۔

فریڈی نے وہیل چیئر آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ٹیری نے وہیل چیئر کو پیچھے کھینچتے ہوئے پیر کی ٹھوکر سے کار کے پسنجر سائڈ کے دروازے کو بند کر دیا اور وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے پوسٹ آفس کی طرف چل دیا۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اُمید اور خوف کے ملے جلے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا ہر بڑھتا ہوا قدم اسے ایک پُرآسائش زندگی کی جانب لے جا رہا ہے یا برسوں کی قید کی سمت۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ ان تمام کارلنگ ورتھس کے نام پر ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔'' فریڈی نے کہا۔ وہ اپنی آواز کے ہیجان کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ ''کارلنگ ورتھس کا بول بالا رہے۔''

''یقیناً یہ بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔'' ٹیری بڑبڑایا۔

جب وہ پوسٹ آفس کے دروازے پر پہنچے تو ٹیری نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کیمرے کے لینس کو دوسری جانب موڑ دیا۔ کیمرا عین اس جگہ اوپر بائیں جانب لگا ہوا تھا جیسا کہ فریڈی نے اسے بتایا تھا۔

پھر وہ دونوں پوسٹ آفس کے اندر داخل ہو گئے۔

اس وقت پانچ کسٹمر پوسٹ آفس میں کاؤنٹر کے سامنے قطار بنائے کھڑے تھے۔ کاؤنٹر اور شیشے کی اسکرین کے پیچھے دو کیشیئر بیٹھے ہوئے تھے۔

فریڈی نے اپنی وہیل چیئر کے سائڈ میں رکھی ہوئی شاٹ گن اٹھائی اور چیخ کر بولا۔ ''یہ ڈکیتی کی واردات ہے۔'' اسے یہ جملہ ادا کرتے وقت بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ یہ جملہ ادا کرنے کا متمنی رہا تھا اور بچپن ہی سے اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ اسے حقیقی زندگی میں یہ جملہ ادا کرنے کا موقع مل جائے اور آج اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بچ کیسڈی ہے اور ٹیری سن ڈانس کڈ! نامور ڈکیت جوڑی۔

ہر فرد نے اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کر لی لیکن ان سب کا انداز لاتعلقی سا تھا۔

ٹیری کے قدم یہ منظر دیکھ کر دہشت سے وہیں جم گئے۔

''دیگر کیمروں کو دیکھو۔'' فریڈی نے ٹیری سے مخاطب ہو کر ہدایات دیں۔

تب ٹیری تیزی سے آگے بڑھا۔

''میں نے کہا یہ ڈکیتی کی واردات ہے۔ ہر کوئی اپنی جگہ پُرسکون کھڑا رہے تو کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ سب اپنا اپنا رخ دیوار کی سمت کر لیں۔'' فریڈی نے بلند آواز سے کہا۔

لیکن کسی کسٹمر نے کوئی حرکت نہیں کی۔ سب جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔

بوڑھے فریڈی کو وقت کے لمحات ہاتھوں سے نکلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کے خواب اور حقیقت ایک دوسرے میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ تب وہ ایک بار پھر چیخا۔ ''کیا تم نے سنا نہیں، دیوار کی طرف منہ پھیر لو۔''

یہ سن کر دو بوڑھی خواتین پریشانی کے عالم میں دھیرے دھیرے دیوار کی سمت کھسکنے لگیں۔ باقی افراد اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

ٹیری نے اپنا کام مکمل کیا اور پھر پلٹ کر تیزی سے فریڈی کے پاس آ گیا۔ پھر وہ فریڈی کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا کیش کاؤنٹر کے پاس لے گیا۔

فریڈی نے اپنی گود میں رکھا ہوا اسپورٹس بیگ کاؤنٹر کی پالش شدہ چمکدار لکڑی کی سطح پر رکھ دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی زرد چہرے والی ادھیڑ عمر عورت سے بولا۔ ''اسے نوٹوں سے بھر دو۔''

اس ادھیڑ عمر عورت نے چند مرتبہ حیرت سے پلکیں جھپکائیں لیکن اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔

''کیا تم سن نہیں سکتیں؟ میں نے کہا کہ اس کم بخت بیگ کو نوٹوں سے بھر دو۔'' فریڈی نے بلند آواز سے کہا۔ ''اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں ان پانچوں بوڑھے بندروں کے جسم گولیوں سے بھر دوں گا۔'' اس نے کسٹمرز کی جانب شاٹ گن لہرا دی۔

''م...... م...... میں......'' ادھیڑ عمر کیشیئر ہکلانے لگی۔ فریڈی نے شاٹ گن لوڈ کر لی۔

فریڈی نے ایک اچٹتی نگاہ کسٹمرز پر ڈالی۔ وہ سب کے سب فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک عورت رو بھی رہی تھی۔

فریڈی نے اپنی توجہ دوبارہ ادھیڑ عمر کیشیئر خاتون کی جانب مبذول کر دی۔ اب اس کے احساسات میں شدت آ گئی تھی۔ ناقابلِ تسخیر ہونے کا ایک جوشیلا احساس اسے اپنے خون میں دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چیخا۔ ''بیگ بھر دو۔''

تب ادھیڑ عمر کیشیئر خاتون نے شیشے کی کھڑکی کو اٹھاتے ہوئے اسپورٹس بیگ اندر کھینچ لیا اور پھر ایک چھوٹے سے پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔

فریڈی نے ایک مرتبہ پھر اپنی توجہ کسٹمرز کی جانب مبذول کر لی۔ ایک عورت کے رونے کی آواز کے علاوہ دوسری آواز ٹیری کے ہاتھ کی تھی جو نروس زدہ انداز میں وہیل چیئر کے ہینڈل کو اس طرح تھپتھپا رہا تھا جیسے وہ کوئی ڈھول ہو۔

''کم آن، جلدی کرو۔'' فریڈی نے چیخ کر کہا تو اس پر خشک کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا اور آنکھوں میں پانی آ گیا۔

اتنے میں وہ کیشیئر عورت دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے فریڈی کا دیا ہوا بیگ اس کی جانب کھسکا دیا۔ بیگ آدھا بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا، اسے بھر دو۔''

''سب کچھ یہی ہے۔'' کیشیئر عورت نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''بقیہ رقم ایک سیف میں بند ہے جس میں ٹائم لاک ہوا ہے۔ وہ ایک بجے سے پہلے نہیں کھلے گا۔''

''لعنت ہو۔'' ٹیری بڑبڑایا۔

فریڈی نے جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے بیگ اٹھا لیا اور اسے اپنی گود میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''کم آن، اب یہاں سے نکل چلیں۔''

لیکن ٹیری نے کوئی حرکت نہیں کی۔

''کم آن۔'' فریڈی نے ٹیری کو پکارا۔

ٹیری نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا، وہ ایک جھٹکے سے سحر سے نکل آیا۔ اس نے وہیل چیئر گھمائی اور اس کا رخ بیرونی دروازے کی جانب کر دیا۔ اسے بیرونی دروازے کو کھولنے میں قدرے دشواری پیش آئی لیکن وہ بیک وقت دروازہ کھولنے اور وہیل چیئر کو دروازے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کار پارکنگ میں آ گئے۔

کار پارکنگ میں سب لوگ ڈکیتی کی اس واردات سے بے خبر دکھائی دے رہے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت معمول کے مطابق جاری تھی۔ کوئی ان کی جانب متوجہ بھی

نہیں ہوا۔

ٹیری جاگنگ کرتا ہوا کار کے پاس پہنچا۔ وہ اپنا ماسک پہلے ہی چہرے پر سے کھینچ کر اُتار چکا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں پر سے ربر کے پتلے دستانے بھی کھینچ کر اتار لیے اور ہتھیلی کی پشت کو سہلانے لگا جہاں دیر سے کھجلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس پر طاری ہیجان خیزی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ اعصاب کو جھنجوڑنے والی کیفیت نے لے لی تھی۔

''فریڈی! تم نے تو کہا تھا کہ شاٹ گن لوڈ نہیں کرو گے۔'' ٹیری اپنے ذہن میں کلبلانے والی بات کو زبان پر لے آیا۔

''میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' فریڈی نے اس انداز سے جواب دیا جیسے ٹیری کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

ٹیری کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں خالی گن لے کر وہاں جاؤں گا؟'' فریڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک مسلح ڈکیتی تھی۔ کم آن، اب کار میں بیٹھنے میں میری مدد کرو۔''

''تم کسی کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔''

''صرف اس صورت میں اگر کوئی مزاحمت کرتا۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ٹیری۔ رقم ہمارے ہاتھ آ چکی ہے۔'' فریڈی نے اسپورٹس بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹیری نے ایک جھٹکے سے کار کی پسنجر سائڈ کا دروازہ کھولا اور دستانے اور ماسک سیٹ پر اچھال دیے۔ ''مجھے معلوم تھا کہ یہ آئیڈیا اچھا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فریڈی کی گود میں رکھا ہوا اسپورٹس بیگ اٹھایا اور اسے کار کی فٹ ویل میں پھینکتے ہوئے بولا۔ ''اس میں کسی صورت بھی دس لاکھ ڈالر نہیں ہوں گے یا شاید ایک لاکھ ڈالر بھی نہ ہوں۔''

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟'' فریڈی نے وہیل چیئر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ شاٹ گن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ کار کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب پیر گھسیٹتے ہوئے بڑھنے لگا۔

''یقیناً اس سے فرق پڑتا ہے۔'' ٹیری نے غراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہیل چیئر کو تہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

''وہیل چیئر کو چھوڑ دو، کم آن۔ اب نکل چلو۔''

فریڈی نے کھانستے ہوئے کہا۔ پھر سانس لینے کے لیے ہانپنے لگا۔

''وہیل چیئر پر نرسنگ ہوم کا نام لکھا ہوا ہے۔'' ٹیری نے جواب دیا۔ اس دوران وہ وہیل چیئر کو فولڈ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر اس نے تہ کی ہوئی وہیل چیئر ڈکی میں ڈال دی۔

اتنے میں دور کہیں سے پولیس سائرن کی آواز فضا میں کھلبلی سی مچانے لگی۔

''اگر ہم اسے یہاں چھوڑ دیں تو ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی وہ وہاں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

ٹیری نے ایک جھٹکے سے ڈکی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر پسنجر سائڈ کے دروازے کو دھکیل دیا تاکہ فریڈی آسانی سے دروازہ بند کر سکے پھر گھوم کر تیزی سے ڈرائیونگ سائڈ پر آ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اگنیشن سوئچ گھما دیا۔ وہ جسمانی طور پر خود کو بیمار محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک چھوٹا سا معجزہ ہو گا۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک حقیر سی رقم کی خاطر کیا ہے۔

وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو جھڑک رہا تھا کہ اس نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے شبہات پر پہلے دھیان دینا کیوں گوارا نہیں کیا۔ اسے چاہیے تھا کہ بوڑھے فریڈی کی افسانوی اسکیم کو ابتدا ہی میں رد کر دیتا جب اس نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

اس کے برابر میں بیٹھا ہوا فریڈی ہوا خوری کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی سانسیں

درست کرنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔
''تم ٹھیک تو ہو نا، فریڈی؟''
''ہم...... نے...... بالآخر...... کر دکھایا۔'' فریڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ پھر اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔
''فریڈی؟''
''تم بس...... ڈرائیو کرو۔''

☆☆☆

پولیس کار تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کا رخ پوسٹ آفس کی جانب تھا۔ اس کی لائٹیں فلیش کر رہی تھیں اور سائرن بج رہا تھا۔
فریڈی اپنی نشست پر گھوم گیا اور اس وقت تک پولیس کار کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ ٹیری بھی نروس زدہ انداز میں بار بار عقبی آئینے میں دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے معدے میں شدید مروڑ سی اٹھ رہی تھی۔
''ہم نے کر دکھایا، ٹیری۔'' فریڈی نے دوبارہ اپنا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ ''ہم نے حقیقت میں کر دکھایا۔''
''ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا، فریڈی۔''
''اس حد تک قنوطی بننے کی کوشش مت کرو، ٹیری۔ ہم ٹام اسمتھ کی کار اس کے گھر واپس لے جائیں گے اور نقلی نمبر پلیٹیں اتار دیں گے۔ پھر کار پر سے اپنی انگلیوں کے تمام نشانات مٹا دیں گے۔ پھر ہم تمہاری کار میں وہاں سے چل پڑیں گے۔ شاٹ گن کو جھیل میں پھینک دیں گے اور گھر واپس آجائیں گے۔ یوں سب کچھ بہ آسانی ہمارے ہاتھ آجائے گا۔ کوئی بھی اتنا عقلمند نہیں کہ ہم تک پہنچ پائے گا۔'' فریڈی نے فخریہ لہجے میں کہا۔
''انہیں پتا چل جائے گا۔ وہ ہمیں کھوج نکالیں گے۔'' ٹیری نے قدرے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
''اور انہیں حقیقت میں کن کی تلاش ہو گی؟ سیاہ رنگ کے ٹاپ اور نیلی جینز میں ملبوس پھولے ہوئے چہرے والا ایلوس پریسلے اور وہیل چیئر میں بیٹھا ہوا مسٹر بین؟ پھر سڑکوں پر دوڑنے والی سفید رنگ کی فورڈ کاروں کی تعداد ہزاروں میں ہے جبکہ یہ کار اپنی اوریجنل نمبر پلیٹوں کے ساتھ ٹام اسمتھ کے گیراج میں بہ حفاظت موجود پائی جائے گی۔ تمہیں عجلت دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اسی طرح ڈرائیو کرتے رہو جیسے عام حالات میں کیا کرتے ہو۔''
''اس بیگ میں کسی طور پر ایک ملین ڈالرز نہیں ہو سکتے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ایک ملین ڈالرز ہاتھ آئیں گے اور میں نے صرف چند ہزار ڈالرز کی خاطر پندرہ سے بیس سال تک کی قید کاٹنے کا خطرہ مول لے لیا ہے۔'' ٹیری کا لہجہ بدستور شکایتی تھا۔
''میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں ٹیری کہ تم جیل نہیں جاؤ گے۔ میرے مرنے کے بعد تم ہی میرے اکلوتے وارث ہو گے۔ پھر تم بے پروائی کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی پوری عیش و عشرت کے ساتھ بسر کرتے رہنا اور تم ابھی زندہ ہو۔ میرا مطلب ہے حقیقت میں زندہ ہو۔ تم یہ بھی شکوہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا ساجھا کر رہا ہوں۔'' فریڈی نے جواب دیا۔
''مجھے تو سوزشِ معدہ اور توہمات کی شکایات کے سوا اور کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔''
''جیسس ٹیری! ہم نے ابھی ابھی ایک پوسٹ آفس کو لوٹا ہے۔ ہم دونوں نے۔ ہم نے جو زندگی میں شکست خوردہ تھے۔ ہم حقیقت میں وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں جس کا اکثر لوگ صرف خواب ہی دیکھا کرتے ہیں۔''
''ہاں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' ٹیری نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بہتر یہی ہے کہ فریڈی کو فی الوقت خوش ہونے دیا جائے۔ وہ پوسٹ آفس لوٹنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ البتہ ٹیری کی اضطراری کیفیت اسے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ دن کا خاتمہ ہونے تک وہ دونوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔
''میں تم سے کہہ رہا ہوں ٹیری کہ تمہارے بوڑھے لوگوں کی غلاظت صاف کرنے اور ان کی خدمت کرنے کے دن اب تمام ہو گئے۔'' فریڈی نے کہا۔
''صرف اس صورت میں جب تم...... ویل تم تو جانتے ہی ہو۔ میری تو اس وقت تک تسلی نہیں ہو گی جب تک حقیقت میں یہ پتا نہیں چل جاتا کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد ہمارے ہاتھ کیا لگا ہے اور اس بیگ کے اندر کتنی رقم ہے؟'' ٹیری نے کہا۔
''اس کے اندر تمہارے گمان سے کہیں زیادہ رقم موجود ہے۔'' فریڈی نے جواب دیا اور فٹ ویل پر سے اسپورٹس بیگ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی اور بیگ کے اندر جھانکا۔ پھر نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اسے ٹیری کے چہرے کے مقابل لہراتے ہوئے بولا۔ ''یہ پچاس کے سو نوٹ ہیں۔ یعنی پانچ ہزار۔ پورے پانچ ہزار! اور اس بیگ کے اندر ایسے پچاس بنڈل اور ہیں۔''

یہ کتنی رقم ہوئی؟ پانچ لاکھ۔‘‘

’’دو لاکھ پچاس ہزار۔‘‘ ٹیری نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

’’یہی تم چاہتے تھے، دو لاکھ......‘‘ یہ کہتے ہوئے فریڈی دہرا ہوگیا اور اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

’’تم ٹھیک تو ہونا فریڈی؟‘‘ ٹیری نے ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

فریڈی نے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے پرے رہنے کا اشارہ کیا۔ ’’میں...... میں...... بالکل ٹھیک ہوں...... جیسس!‘‘

’’کیا میں کار روک کر تمہارے لیے پانی کی بوتل لاؤں؟‘‘ ٹیری نے کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

’’اوہ گاڈ! نہیں، ہم...... ہم پانچ منٹ میں...... ٹام اسمتھ کے گھر پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو؟‘‘

’’خدا کے لیے، ٹیری! مجھ سے مادرانہ رویے سے کام مت لو۔‘‘ فریڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

’’میں اب بھی تمہارا کیئر اسسٹنٹ ہوں، فریڈی! ہو سکتا ہے کہ وہاں اپنی حد سے آگے بڑھ گیا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی تمہاری دیکھ بھال میرے فرائض میں شامل ہے۔‘‘ ٹیری نے کار کی رفتار دوبارہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔

’’لیکن زیادہ دنوں تک نہیں، ٹیری۔‘‘ فریڈی نے اپنی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر بیگ میں سے مزید چند گڈیاں نکال کر ٹیری کے سامنے لہرانے لگا اور بولا۔ ’’زیادہ دنوں تک نہیں۔‘‘

اتنے میں ہلکی سے پھنکارنے کی سی آواز ابھری۔ پھر دوسرے لمحے فریڈی کے ہاتھوں میں موجود نوٹوں کی گڈیوں میں سے ایک گڈی پھٹ پڑی۔ ساتھ ہی سرخ رنگ کی ڈائی کے دھارے پھوٹ نکلے۔

فریڈی نے نوٹوں کے بنڈل پھینک دیے۔ دھماکا خیز مواد کی حدت سے اس کی انگلیوں میں جلن ہو رہی تھی۔

’’لعنت ہو۔‘‘ ٹیری بڑبڑایا۔ ساتھ ہی ڈائی سے بھرے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اپنی آنکھیں ذرات اور گلو سے پُرمحسوس ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اپنے سینے میں خوف و دہشت کی ایک لہری اٹھتی محسوس ہونے لگی۔

’’انہوں نے نوٹوں کے درمیان کوئی دھماکا خیز شے رکھی ہوئی تھی۔‘‘ فریڈی نے کہا۔ ساتھ ہی اپنی انگلیاں چوسنے لگا جن میں جلن ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں نشستوں کے درمیان پھٹے ہوئے نوٹوں کی گڈیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

’’فریڈی؟‘‘

بوڑھے فریڈی نے سر اٹھا کر ٹیری کی طرف دیکھا۔ ٹیری نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ پھر فریڈی نے اپنی نگاہوں کا رخ کار کی ونڈ اسکرین کی جانب پھیر دیا جو سرخ رنگ کے چھینٹوں سے آلودہ ہو چکی تھی۔

ان کی کار اب لہراتی ہوئی سڑک کی درمیانی پٹی پر چل رہی تھی۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک آرہا تھا۔ کار اور ٹرک کے درمیان صرف چند میٹر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اس روز یہ دوسرا موقع تھا جب فریڈی خود کو مکمل طور پر چاق و چوبند اور توانا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ایک اور خواب حقیقت کا روپ دھارنے جا رہا تھا۔ ہیجانی کیفیت سے اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اسے اس طرح اپنے انجام کی توقع تو نہیں تھی لیکن اب اسے اپنی منزل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی پوری زندگی اس لمحے کا منتظر رہا تھا۔ اس نے کارلنگ ورتھ خاندان کا نام دنیا کے نقشے پر ثبت کرنے اور تمام اہم اخبارات کی سرخیوں کی زینت بننے کے لیے زندگی بھر انتظار کیا تھا۔

ادھر سامنے سے آنے والے ٹرک کا ہارن تنبیہی انداز میں پوری شدت کے ساتھ بجے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے پہیے بھی اچانک لگائے جانے والے بریک کے دباؤ سے چرچرا رہے تھے۔

’’فریڈی؟‘‘ ٹیری کی خوف و دہشت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ٹیری کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سینے کو خاردار تاروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ جیل میں زندہ رہنا بہتر تھا۔ وہ جیل میں کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کاٹ لے گا۔

’’سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، ٹیری۔‘‘ فریڈی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور خود آگے کی جانب جھک گیا تاکہ اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کے خاتمے کے لیے موت کو سینے سے لگا سکے۔

اب تصادم ناگزیر تھا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا اور......!

خون آشام

کاشف زبیر

ماورائی مخلوق کے وجود سے انکار ممکن نہیں... مگر نظروں سے اوجھل رہنے والی ان مخلوقات کے ذکر سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... موہوم سایوں اور پُراسرار ماحول کی پروردہ سنسنی خیز تحیر انگیز کہانی... اس کے دونوں کردار ایک جان دو قالب تھے... اچانک ہی ان کے درمیان ایک خون آشام درندہ داخل ہو گیا۔

دو دوستوں کی طویل رفاقت میں رخنہ انداز ہونے والے ناقابلِ یقین معاملات

مرزا جمال بیگ کا خیال تھا کہ وہ ڈریکولا بن رہا ہے۔ ڈریکولا یعنی ویمپائر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں۔ بڑے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، بچے ضرور جانتے ہیں کیونکہ ہالی ووڈ میں اس کردار پر ہر سال کئی کئی فلمیں بنتی ہیں اور وہ تمام فلمیں ہمارے ہاں شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ ناظرین میں اکثر بچے ہوتے ہیں جو دیکھتے بھی ہیں اور پھر ڈر ڈر کر ماں باپ کی زندگی حرام کرتے ہیں۔ اس کا تجربہ میرے چچازاد بھائی اور اس کی بیوی کو خوب ہو رہا ہے۔ ان کے دونوں بیٹے ہارر فلموں کے دیوانے ہیں۔ ساتھ ہی ڈرتے بھی ہیں۔ رات کو کمرے کے ساتھ موجود باتھ روم تک بھی جانا ہو تو ماں باپ میں سے کسی کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ بڑے برخوردار مغرب کے بعد لان میں نہیں جاتے اور ان سے چھوٹے اگر سایہ بھی دیکھ لیں تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ مگر آفرین ہے ماں باپ پر جو بچوں کے شوق میں ذرا بھی حائل ہوتے ہوں۔

بات ہو رہی تھی مرزا جمال کی جو میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم نے ایک ہی اسکول میں پڑھا۔ ہمارے باپ آپس میں بزنس پارٹنر تھے۔ دونوں وکیل تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آنے کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی اور ایک ساتھ کامیابی کی منزلیں طے کیں۔ اتفاق سے میں اور جمال ماں باپ کے اکلوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری ایک بہن بھی ہے۔ جمال اس سے بھی محروم ہے۔ مگر اسے خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ اکلوتا ہونے پر خوش تھا کہ ماں باپ کی ساری توجہ اس پر مرکوز رہتی تھی۔ کامیابی کے بعد ہمارے والد صاحبان نے گھر بھی برابر بنوائے تھے۔ اس زمانے میں ڈیفنس نیا نیا آباد ہوا تھا۔ پلاٹ بہت سستے تھے اور چھ سو گز کے یہ دونوں پلاٹ ساتھ تھے۔ انہوں نے ان پر بنگلے بھی تقریباً ایک جیسے ڈیزائن کے بنوائے۔

جب ہم نے ہوش سنبھالا تو گھر میں آسائش کی ہر شے تھی۔ کبھی کوئی کمی نہیں دیکھی۔ ہم نے اعلیٰ درجے کے اسکولوں اور پھر یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل کی۔ مرزا جمال نے انجینئرنگ کا انتخاب کیا اور سول انجینئر بن کر اپنی فرم کھول لی۔ میں نے فارمیسی کا انتخاب کیا اور ایم فارمیسی کر کے ایک دواؤں کی کمپنی میں ملازمت کی اور پھر اپنی کمپنی کھول لی۔ اب میں باہر سے دوائیں منگوا کر انہیں ری پیکنگ کے بعد مقامی مارکیٹ میں فروخت کرتا ہوں۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے بزنس میں کامیاب ہیں۔ مزے کی بات ہے عام بزنس مین کی طرح ہمیں صبح سے شام تک سر بھی کھپانا نہیں پڑتا ہے۔ عام طور سے ہم دس بجے تک روانہ ہوتے ہیں اور شام پانچ بجے تک واپس آ چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔

مرزا جمال کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اصل میں اس نے ایک لڑکی کو پسند کیا تھا مگر بدقسمتی سے لڑکی نے اسے پسند نہیں کیا اور ماں باپ کے دباؤ پر پہلے تو مان گئی مگر اچانک ہی اس نے کورٹ میرج کر کے نہ صرف جمال اور

اس کے گھر والوں بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی ششدر کر دیا تھا۔ مرزا جمال کو یہ شاک ایسا لگا کہ اس نے ساری عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماں باپ رو پیٹ کر ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے اور مرزا جمال آج بھی چالیس سال کی عمر میں کنوارا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری شادی ہوئی تھی اور ایک بیٹی بھی ہوئی لیکن پھر ہم میاں بیوی میں اَن بن ہو گئی۔ زویا مجھ سے کہیں زیادہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس نے بلا تکلف طلاق مانگ لی اور میرے انکار پر عدالت سے خلع لے لیا۔ بیٹی بھی اسی کے پاس ہے اس لیے میں اپنے بنگلے میں اکیلا ہوں۔ والد صاحب بھی دو سال پہلے گزر گئے تھے۔ دیکھا جائے تو اب میں اور مرزا ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ہماری بیشتر شامیں اور چھٹی کے دن ساتھ گزرتے ہیں۔ وہ میرے ہاں آ جاتا ہے یا میں اس کے ہاں چلا جاتا ہوں۔

ہمارے نوکر بھی مشترک ہیں۔ میرا مالی مرزا کے لان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور مرزا کا باورچی کریم خان میرے لیے بھی کھانا بناتا ہے۔ وہ پہلے میرا ناشتا بناتا ہے اور پھر جا کر مرزا کا ناشتا بناتا ہے۔ لنچ ہم اپنے اپنے آفس میں کرتے ہیں اور ڈنر باری باری ایک جگہ کیا جاتا ہے۔ اتوار والے دن کریم خان کی چھٹی ہوتی ہے اور ہم کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے دو ملازمائیں ہیں جو باری باری دونوں گھروں میں کام کرتی ہیں۔ وہ برسوں سے کام کرتی آ رہی ہیں اس لیے ان پر اعتماد ہے اور جب ہم نہیں ہوتے تب بھی وہ پورے گھر میں جہاں چاہیں آ جا سکتی ہیں۔ ڈرائیورز کی ہمیں ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ خود ڈرائیونگ کرتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی مرزا کے وہم کی۔ میں اسے وہم ہی کہوں گا کیونکہ بچپن سے میں نے مرزا کو سخت قسم کا وہمی اور وہم پر کامل یقین کرنے والا شخص پایا تھا۔ ویسے تو اسے ایک وہم یہ بھی تھا کہ میرے بغیر اس کی زندگی نامکمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے لیے انسان کی اہمیت ہوتی ہے مگر ناگزیر کوئی نہیں ہوتا۔ انسان ماں باپ، بہن بھائی اور حتیٰ کہ بیوی بچوں سے محروم ہونے کے باوجود بھی زندہ رہتا ہے۔ مگر اس نے اس وہم کی کبھی تردید نہیں کی۔ کیونکہ خود مجھے بھی یہی وہم تھا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے یاد ہے مرزا کو بچپن میں جو پہلا وہم ہوا وہ یہ تھا کہ اس کی ایک ٹانگ غائب ہو گئی ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ سائیکل چلاتے ہوئے گرا اور اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی۔ ڈاکٹر نے

اس کے شور شرابے سے گھبرا کر اسے سُن کرنے والا انجکشن لگا دیا۔ اس کے بعد درد تو ختم ہو گیا مگر مرزا نے اس بات پر واویلا کیا کہ اس کی ٹانگ غائب ہو گئی ہے۔ حالانکہ ٹانگ سامنے تھی مگر مرزا کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس کی ٹانگ موجود ہے تو محسوس کیوں نہیں ہو رہی اور وہ یہ وضاحت ماننے کو بھی تیار نہیں تھا کہ انجکشن نے اسے سن کر دیا ہے۔

اس سارے قصے کے دوران میں میرا ہنس ہنس کر بُرا حال تھا اور مرزا اس بات پر مجھ سے باقاعدہ خفا ہو گیا۔ دو دن اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ ٹانگ کا سُن ہونا تو بارہ تیرہ گھنٹے بعد ختم ہو گیا مگر مرزا کو بہت عرصے تک یہ وہم رہا اور وہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی ٹانگ چیک کرتا تھا کہ وہ موجود ہے یا نہیں۔ دوسرا یادگار وہم اسے آغازِ جوانی میں ہوا جب ہم میٹرک میں تھے اور ہمارے کلاس فیلوز سامنے موجود گرلز اسکول سے نکلنے والی لڑکیوں کا پیچھا کرتے تھے۔ مرزا کو یہ وہم ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ سن کر میں اس بار بھی ہنسا تو اس نے خفگی سے کہا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”یار تم کیا کوئی لڑکی ہو جس کا پیچھا کیا جائے۔“

”تو کیا صرف لڑکیوں کا پیچھا کیا جاتا ہے؟“

”میں نے تو کسی کو کسی لڑکے کا پیچھا کرتے نہیں دیکھا۔“

مگر مرزا کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بہت عرصے تک وہ راہ چلتے چونک کر پیچھے دیکھتا رہتا اور کئی بار تو اس نے اپنے طور پر کسی کو رنگے ہاتھوں پکڑا بھی تھا۔ وہ مجھ سے کہتا۔ ”دیکھ یار، یہ بندہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔“

مگر وہ بندہ عام طور سے اپنی راہ کا مسافر نکلتا تھا۔ ہم کالج میں آگئے اور اب ہم گاڑی میں آتے جاتے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور پاپا نے مجھے کار دلوا دی تھی۔ اب گاڑی میں سفر کے دوران اسے نیا وہم یہ لاحق ہوا کہ رانگ سائڈ سے آنے والی گاڑی کے تصادم میں وہ مارا جائے گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے مگر جو بات ایک بار مرزا کے دماغ میں بیٹھ جاتی وہ اتنی آسانی سے نہیں نکلتی۔ اس نے فرنٹ سیٹ کے بجائے پچھلی نشست پر بیٹھنا شروع کر دیا اور وہ بھی میری والی سمت میں۔

یہ وہم یوں ختم ہوا کہ ایک دن میں نے اپنی طرف سے کار معمولی رفتار سے ایک درخت سے ٹکرا دی۔ اس حادثے میں کار پر ڈینٹ پڑ گئے مگر ہم دونوں کو معمولی زخم آئے۔ یوں مرزا کو یقین آگیا کہ حادثہ کسی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا شروع کیا۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ ایک وہم اس کی جان چھوڑتا تھا تو فوراً ہی کوئی دوسرا وہم اس کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ہم بڑے ہوئے اس کی شادی نہ ہو سکی۔ میری ہو گئی مگر انجام کار میں بھی اکیلا رہ گیا اور اب ہم ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ تازہ ترین وہم یوں ہوا کہ مرزا جو واحد کام میرے بغیر کرتا تھا وہ رات کی واک تھی۔ میں کاہل نہیں ہوں مگر رات کے کھانے کے بعد واک کے خیال سے مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔

مرزا واک کے لیے نزدیکی پارک تک جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی علاقے کا قبرستان بھی تھا۔ شروع میں یہاں اتنی قبریں نہیں تھیں مگر اب یہ خاصا آباد ہو گیا ہے۔ ویسے تو پارک بہت خوب صورت اور ہرا بھرا ہے لیکن شام کے وقت یہاں سناٹا چھا جاتا ہے اور وجہ صاف ظاہر ہے۔ مرزا کو یہی سناٹا پسند ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے روزانہ ڈنر کے بعد آدھے گھنٹے کی واک کے لیے جاتا ہے۔

میں ڈنر کے بعد ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتا ہوں۔ ٹاک شو یا کوئی اور پرائم ٹائم شو دیکھتا ہوں۔ مرزا کی واپسی پر ہم چائے اور کافی سے شغل کرتے ہیں۔ مجھے کافی پسند ہے اور مرزا کو چائے۔ کریم خان یہ آخری کام کر کے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم اس وقت تک گپ شپ کرتے جب تک نیند نہیں آنے لگتی۔ اتفاق سے اس دن میرے ہاں ڈنر تھا۔ کریم خان گھر جانے کے لیے کچھ بے تاب تھا۔ وہ مرزا کی کوٹھی میں سرونٹ روم میں رہتا تھا اور ان دنوں گاؤں سے اس کی بیوی آئی ہوئی تھی اس لیے میں اس کی بے تابی کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ جیسے ہی مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی اس نے مجھ سے کہا۔ ”صاحب چائے کافی لے آؤں۔“

میں نے ذرا اچک کر شیشے کے پار دیکھا تو مجھے مرزا تیز قدمی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”لے آؤ۔“

کریم خان کے کچن کی طرف جاتے ہی مرزا لاؤنج میں داخل ہوا۔ میں چونکا کیونکہ مرزا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر میری طرف آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے، کہیں پھر کسی نے پیچھا تو نہیں شروع کر دیا۔“

مرزا نے میرے برابر میں بیٹھ کر اور مجھ سے کسی قدر چپک کر میرے کان میں تقریباً گھس کر کہا۔ ''خان مجھے کسی نے کاٹ لیا ہے۔''

میرا نام انیس الدین خان ہے اور مرزا مجھے خان کہتا ہے جیسے میں اسے مرزا کہتا ہوں۔ میں نے ذرا پیچھے ہو کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''کاٹ لیا ہے؟''

اس نے زور سے سر ہلایا۔ ''ہاں میری گردن کے پیچھے کاٹ لیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں اس سے گردن دکھانے کی فرمائش کرتا کریم خان ٹرے لیے لاؤنج میں آیا۔ اسے دیکھتے ہی مرزا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ناک کی سیدھ میں گھورنے لگا۔ کریم خان نے ٹرے رکھی اور اس سے پہلے کہ وہ اجازت طلب کرتا مرزا نے کہا۔ ''تم اب جاؤ۔''

''شکریہ صاحب۔'' اس نے خوش ہو کر کہا اور باہر کی طرف لپکا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بیوی بھی کیا چیز ہے، ہو تب بھی سکون نہیں ہے اور نہ ہو تب بھی آدمی بے چین رہتا ہے۔''

''بیوی کو گولی مارو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اول تو میری بیٹی چھوٹی ہے اور اسے ماں کی ضرورت ہے دوسرے اب وہ میری بیوی نہیں رہی۔''

''یار مذاق مت کرو۔'' وہ پُروحشت لہجے میں بولا۔ ''مجھے سچ مچ کسی چیز نے کاٹا ہے۔''

میں سنجیدہ ہو گیا۔ ''کہاں کاٹا ہے؟''

مرزا نے گول گلے والی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے سے گلا کھینچ کر نیچے کیا اور بولا۔ ''دیکھو۔''

اس کی گردن پر بائیں شانے سے ذرا اوپر دو سوراخ نما نشانات تھے اور ان سے ہلکا سا خون نکل کر جم گیا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ہاں دو معمولی سے زخم ہیں لیکن اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

''بات ہے، مجھے کسی چیز نے کاٹا ہے۔''

''وہاں اکثر چمگادڑیں اڑتی رہتی ہیں، کسی چمگادڑ نے کاٹ لیا ہوگا۔ یہ کوئی اتنی زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔ ہاں کل تم ڈاکٹر کو دکھا لینا۔ ممکن ہے کوئی ٹریٹ منٹ کرنا ہو۔''

''چمگادڑ نے نہیں کاٹا ہے۔'' اس نے انکار کیا۔ ''مجھے کسی انسان نے کاٹا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''اللہ کو مانو مرزا۔ انسان کے بھلا ایسے دانت ہوتے ہیں؟''

مرزا نے ایک بار پھر میرے کان میں گھس کر کہا۔ ''وہ انسان نہیں تھا مگر انسان جیسا تھا۔''

مرزا دوبارہ مجھ سے چپکا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کانپ رہا ہے اور اس کا جسم بالکل سرد ہو رہا تھا۔ ''انسان جیسا تھا... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ ڈریکولا تھا۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑا۔ ''لگتا ہے تم نے بھی ہارر موویز دیکھنا شروع کر دی ہیں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا، سچ کہہ رہا ہوں۔''

''یار اول تو اس قسم کے فرضی کردار صرف کہانیوں اور فلموں میں ملتے ہیں۔ دوسرے ڈریکولا مقامی کردار نہیں ہے۔ اگر تم چڑیل، سر کٹے یا کسی ایک آنکھ والے جن کی بات کرتے تو میں غور بھی کرتا مگر ڈریکولا... لاحول ولا...''

''تم ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو۔''

''ضرور لیکن چائے پیتے ہوئے۔'' میں نے اس کا مگ اسے تھمایا اور اپنا مگ اٹھا لیا۔ مرزا نے بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔

''میں واک کر رہا تھا، تم نے واک ٹریک دیکھا ہے؟''

''ہاں پارک کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔''

''میں اسی پر چل رہا تھا۔ دوسرے چکر میں جب قبرستان والی دیوار کے پاس سے گزرا تو مجھے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ مگر میں نے توجہ نہیں دی، میں سمجھا کوئی بلی جھاڑیوں میں گھسی ہوئی ہے۔'' مرزا کہہ رہا تھا۔ ''جب میں دوسرے راؤنڈ میں وہاں پہنچا تو مجھے لگا کہ جھاڑیوں میں موجود چیز خاصی بڑی ہے اور وہ مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے توجہ نہیں دی۔''

''اب تم اسے کتا سمجھے ہو گے؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''بالکل میں کتا ہی سمجھا تھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''تم جانتے ہو میں پارک کے پانچ چکر لگاتا ہوں۔ چوتھے چکر میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چیز میرے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چل رہی ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، جھاڑیاں بہت گھنی ہیں اور ان میں آرام سے چلنا پھرنا ممکن نہیں ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''اس پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی۔ ان میں سے کئی جھاڑیاں کانٹے دار ہیں اور اگر کوئی ان میں گھسے تو تم اس کا حشر سوچ سکتے ہو۔ مگر اس کے باوجود جھاڑیوں میں جو چیز تھی وہ تقریباً میری رفتار سے چل رہی تھی۔ حالانکہ میں خاصی تیز واک کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''اب مجھے ذرا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ میں آخری چکر میں جب قبرستان والی دیوار تک پہنچا تو وہ بھی میرے ساتھ تقریباً بھاگنے لگا۔ جب اسکوائر کے کونے تک پہنچ کر میں مڑا تو مجھے لگا جیسے جھاڑیوں سے نکل کر کوئی ہیولا مجھ پر جھپٹا ہو۔ اس نے میری گردن پر منہ مارنا چاہا مگر میں تیزی میں آگے نکل گیا اور صرف اس کے دانت میری گردن کے پچھلے حصے کو چھو سکے۔ اس کے بعد میں نے بھاگنا شروع کیا تو مجھے ہوش نہیں رہا اور جب حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو تمہارے گھر کے گیٹ پر پایا۔''

''جب تم آخری چکر میں قبرستان والی دیوار کے ساتھ چل رہے تھے کیا تب بھی جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آرہی تھی؟''

''نہیں، اس چکر میں کوئی آواز نہیں آئی کیونکہ وہ آخری حصے میں جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔''

''تم نے جھپٹنے والے کو واضح دیکھا؟''

''نہیں، وہ پیچھے سے آیا تھا اور اس طرف تاریکی بھی تھی۔''

''پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ کون تھا؟''

''میں نے ہیولا محسوس کیا تھا اور اس کی غراہٹ سنی تھی، ایک بار نہیں بلکہ جب میں بچ کر بھاگا تب بھی عقب سے اس کی غراہٹ سنائی دی تھی جیسے شکار ہاتھ سے نکلنے پر مایوس ہو۔''

''تم نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟''

''اگر اس وقت مجھے ایک بار پلٹ کر دیکھنے کے عوض امریکا کی صدارت بھی مل رہی ہوتی تو میں انکار کر دیتا۔''

میں نے کافی کا خالی مگ میز پر رکھا اور انگلیوں پر گننے لگا۔ ''تم نے کسی کو دیکھا نہیں، پھر پلٹ کر نہیں دیکھا، تیسرے جھپٹنے والے نے صرف دانتوں کا استعمال کیوں کیا جبکہ اس کے ہاتھ بھی ہونے چاہئیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے پیچھے کیوں نہیں آیا؟''

''میں نہیں جانتا۔'' مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تب وہ چمگادڑ ہی ہوگی کیونکہ وہ پُر پھیلا کر جھپٹتی ہے اور صرف دانتوں کا استعمال کرتی ہے۔ اس کا سائز شاید بڑا ہوگا اس لیے تمہیں لگا کہ کوئی آدمی جھپٹا ہے۔ اس کے دانت تمہیں لگے اور اس کے بعد تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ چمگادڑ کا وار خالی گیا اور ممکن ہے وہ غرائی بھی ہو۔ وہ تمہیں پکڑ نہیں سکتی تھی اور نہ تمہارے پیچھے آسکتی تھی۔'' میں نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔ مگر مرزا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔

''اگر وہ چمگادڑ تھی تو جھاڑیوں میں کیسے چل رہی تھی؟''

''ممکن ہے جھاڑیوں میں سچ مچ کوئی کتا یا بڑی بلی ہو۔ وہاں چوہے بکثرت ہوتے ہیں، ان کے چکر میں بلیاں بھی آتی ہیں۔ چمگادڑ کے حملے کا اس چیز سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم دو الگ چیزوں کو ملا کر پیش کر رہے ہو۔''

اپنا نکتہ رد کیے جانے پر مرزا کسی قدر جھنجلا گیا۔ ''تم ہمیشہ میری بات کی مخالفت کرتے ہو۔''

''اگر وہ بات معقولیت سے دور ہو اور تمہارے وہموں میں شامل ہو تو۔'' میں نے کہا۔ ''تم خود سوچو کہ آج تک مغرب میں کوئی اصل ڈریکولا سامنے آیا۔ جس شخص کو اصل میں ڈریکولا کہا جاتا ہے وہ صرف ایک ظالم جاگیردار تھا اور اس کے لغوی معنی ہیں شیطان کا بیٹا۔ اب بتاؤ اس میں خون پینے کی روایت کہاں سے آگئی؟''

''وہ تو ہے بھئی۔'' مرزا نے کہا۔ ''تب ہی اس پر اتنا لکھا گیا ہے، مووِیز بنی ہیں۔''

''صرف اس لیے کہ یہ ایک دلچسپ ہارر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایک منٹ رکو میں تمہارے زخم صاف کرتا ہوں، کہیں انفیکشن نہ ہو جائے۔ کل تم لازمی ڈاکٹر کو دکھا لینا۔''

لیکن جب میں اپنا میڈیکل بکس لے کر آیا تو مرزا جا چکا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس بار مرزا کو وہم نہیں ہوا تھا، اسے سچ مچ کسی چیز نے کاٹا تھا مگر وہ چیز ڈریکولا نہیں ہو سکتی تھی جیسا کہ مرزا کا خیال تھا۔ ہو سکتا ہے وہ چمگادڑ یا اسی قبیل کا کوئی اڑنے والا پرندہ یا کیڑا ہو جس نے مرزا کو کاٹا ہو۔ اگلے دن کریم خان ناشتا بنانے آیا تو اس نے بتایا۔ ''صاحب ابھی سو رہے ہیں، ہم نے جگایا مگر وہ اٹھے نہیں۔''

''شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

"تم دیکھتے رہنا اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر کو بلا لینا اور مجھے بھی کال کرنا۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" کریم خان نے کہا۔ "میں خیال رکھوں گا۔"

میں دفتر گیا۔ وہاں مصروفیات میں الجھا تو ذہن میں مرزا کا خیال نہیں آیا۔ شام کو ذرا فرصت ملی تو اسے کال کر ہی رہا تھا کہ ایک پارٹی کی کال آگئی اور پھر اس سے بزنس کی گفتگو میں ایسا پھنسا کہ گھر روانہ ہوتے ہوتے بھی سات بج گئے۔ میرا دفتر ڈیفنس سے نزدیک ایک انڈسٹریل ایریا میں تھا۔ جہاں میرے دفتر کے ساتھ ہی چھوٹا سا ری پیکنگ اور پیکنگ پلانٹ تھا۔ اگرچہ میرے پاس ادویات سازی کا لائسنس بھی تھا مگر فی الحال میں نے اس شعبے میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میرا پیکنگ اور ری پیکنگ کا صاف ستھرا کام اچھا خاصا چل رہا تھا کیونکہ اب لوگوں میں باہر کی دوائیں استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ مہنگی لیکن معیاری ہوتی ہیں۔ گھر آتے آتے مجھے ساڑھے سات بج گئے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور سورج ابھی غروب ہوا تھا۔ اس کی روشنی کسی قدر باقی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر مرزا کے گھر کا رخ کیا جہاں کریم خان پریشان سا موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"صاحب کچھ کریں، صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم نے ڈاکٹر کو کال کی تھی؟" میں نے مرزا کے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، انہوں نے منع کر دیا۔ میں نے پھر کہا تو ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا اب کمبل اوڑھے لیٹے ہیں۔"

میں رک گیا۔ "اے سی اتنا تیز کیوں کیا ہے جب طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"صاحب اے سی کہاں چل رہا ہے، صاحب نے پنکھا بھی بند کروا دیا کہ سردی لگ رہی ہے۔"

میں اب فکر مند ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے مرزا نے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کریم خان نے سمجھ لیا اور بولا۔ "صاحب کہہ رہے ہیں دفع ہو جاؤ۔"

"مرزا یہ میں ہوں۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ اس بار اس نے کچھ نہیں کہا اس لیے میں اندر آگیا۔ اے سی اور پنکھا بند ہونے سے کمرا خاصا گرم ہو رہا تھا۔

"دروازہ بند کر دو۔" اس نے کہا۔

"مرزا کیا بات ہے اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے؟"

"یہ ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں ہے۔" اس نے ایک آنکھ کمبل سے نکال کر کہا جو خاصی سرخ ہو رہی تھی۔

"احمقانہ باتیں مت کرو مرزا۔" میں کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بیماری کا علاج ڈاکٹر کا نہیں تو کیا کسی مکینک کا مسئلہ ہوتا ہے۔ میں ڈاکٹر کو کال کر رہا ہوں۔"

مرزا نے مجھے موبائل نکالتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا سلیپنگ سوٹ بالکل خشک تھا جبکہ اسے پسینے پسینے ہونا چاہیے تھا اور اس کے کھلے بازو پر رونگٹے یوں کھڑے تھے جیسے اسے سچ مچ سردی لگ رہی ہو۔ ادھر میرا پسینا بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں ڈاکٹر کو کال مت کرو، میرا خیال ہے میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"یہ تو تمہارا خیال ہے اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

"تب تم ڈاکٹر کو کال کر دینا لیکن پلیز، ابھی مجھے مت چھیڑو۔" اس نے کہا اور دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

"او کے۔" میں نے کہا۔ "میں کل تک دیکھوں گا۔ یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا ہے؟"

"میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔"

یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ مرزا تقریباً چوبیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ وہ بھوک کا کچا تھا اور کھانے میں ذرا تاخیر اسے مشکل سے برداشت ہوتی تھی۔ اگر کسی شادی کی تقریب میں کھانے میں دیر ہو جائے تو مرزا کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بہ قول اس کے چونکہ اسے بھوک بھی نہیں تھی تو معاملہ واقعی تشویشناک تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم کچھ کھا لو، دودھ ہی پی لو۔"

"میں کچھ نہیں کھا سکتا۔" اس نے کہا۔ "مجھے کھانے کے خیال سے ابکائی آرہی ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکٹر رضوان سے بات کر ہی لوں۔ ہو سکتا ہے کہ مسئلہ اتنا بڑا نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن جب میں اٹھنے لگا تو مرزا نے کہا۔ "خان تم یہ بات کسی سے نہیں کہو گے۔"

"کون سی بات؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"یہی میری کیفیت والی، تم ڈاکٹر رضوان کو بھی کال نہیں کرو گے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "ٹھیک ہے میں کسی

سے نہیں کہوں گا لیکن کل صبح تک اس کے بعد تم مجھے نہیں روک سکو گے۔''

میں گھر آیا جب بھی میری تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد میں پھر مرزا کو دیکھنے گیا تو اس کی وہی کیفیت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہی پڑے گا مگر میں صبح کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا اس نے میری رات رکنے کی پیشکش بھی مسترد کر دی۔

''تم فکر مت کرو، مجھے لگ رہا ہے کہ میں صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

مجھے قطعی امید نہیں تھی لیکن جب میں صبح ناشتا کرتے ہی مرزا کے پاس آیا تو اسے ڈائننگ ٹیبل پر چائے کے ساتھ اخبار دیکھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ ''اب کیا حال ہے؟''

''تم دیکھ رہے ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''اب سردی بھی نہیں لگ رہی ہے اور میں خود کو بالکل چاق چوبند محسوس کر رہا ہوں۔''

''تم نے ناشتا کیا؟''

''ہاں...'' اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ ''تم دفتر جا رہے ہو؟''

''ہاں، تم جاؤ گے؟''

''بالکل، کل بھی نہیں جا سکا تھا، کچھ اہم کام ہیں۔''

''کیا خیال ہے ڈنر کسی اچھی جگہ کریں۔ آج مجھے دیر ہو گی، میں براہِ راست آجاؤں گا۔''

مرزا نے سر ہلایا اور اپنے پسندیدہ سی فوڈ ریستوران کا نام لیا۔ ''یہاں چلتے ہیں۔''

''ڈن، میں سات بجے تک پہنچ جاؤں گا، دیر کی تو اپنی پسند کی ٹیبل مشکل سے ملے گی۔''

مرزا کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر میں نے سکون محسوس کیا اور زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے پرسوں رات والے واقعے پر بات نہیں کی تھی۔ میں واپس آیا اور تیار ہو کر دفتر روانہ ہو گیا۔ آج بھی دفتر میں مصروفیت زیادہ تھی۔ جب میں ریستوران پہنچا تو مرزا آچکا تھا اور اس نے میز حاصل کر لی تھی۔ یہ دوسرے فلور پر سمندر کے بالکل سامنے تھی۔ شیشے کے پار ساحل پر لگی تیز روشنیوں میں سمندر کی لہریں دور تک واضح دکھائی دیتی تھیں اور یہاں بیٹھ کر ڈنر کرنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ مرزا کو جھینگے پسند تھے اور مجھے مچھلی۔ ہم نے اپنی اپنی پسند کی ڈشز کا آرڈر کیا۔ مرزا نے بے تابی سے ہاتھ ملے۔ ''مجھے آج ایسی بھوک لگ رہی ہے جس کا اس سے پہلے تجربہ نہیں ہوا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''تم یقین کرو گے میں پونے سات بجے کا یہاں بیٹھا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں ہنسا۔ ''مجھے معلوم ہے تم بھوک کے کچے ہو۔''

جیسے ہی ڈشز آئیں مرزا کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے نہایت تیزی سے اپنی ڈش ختم کی۔ یہ سادہ چاول کے ساتھ جھینگے اور سرکے کی ڈش تھی۔ جو اسے بہت پسند تھی۔ مرزا بہت خوش نظر آرہا تھا مگر اس کے بعد جو ہوا، وہ خاصا خوفناک تھا اور اس نے نہ صرف میرا بلکہ وہاں موجود کئی افراد کا کھانا حرام کر دیا تھا۔ مرزا نے اچانک منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر تیزی سے اٹھا تھا کہ اس کے منہ سے قے کی بوچھاڑ ہوئی۔ جو نہ صرف فرش پر بلکہ پاس موجود ایک میز تک گئی جس پر ایک جوڑا کھانے میں مصروف تھا۔ عورت نے ہذیانی انداز میں چیخ ماری اور مرد بھڑک کر اٹھا تھا مگر وہ مرزا کو کیا کہتا جو الٹیاں کر کر کے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ میں بہ مشکل اسے پکڑ کر ریستوران کے واش روم تک لایا مگر وہاں تک آتے ہوئے وہ اپنا معدہ مکمل طور پر صاف کر چکا تھا۔ منہ دھو کر اور کلیاں کر کے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر اس کا لباس خراب ہو گیا تھا اور ویسے بھی اس نے وہاں جو کیا تھا اس کے بعد ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے بل ادا کیا اور اسے باہر لے آیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی سرد ہوا نے اس کے حواس بحال کیے تو اس نے مجھ سے معذرت کی۔

''معاف کرنا یار، میں نے تیرا کھانا بھی حرام کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں لیکن یہ کیا تھا، کیا کھانے میں کوئی مسئلہ تھا؟''

''نہیں کھانا بالکل ٹھیک اور بہت اچھا تھا۔ میں کھا کر بہت اچھا محسوس کر رہا تھا مگر اچانک مجھے معدے پر بوجھ محسوس ہوا اور پھر میں کسی طرح بھی قے روک نہیں سکا۔''

''تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔''

''نہیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''اب مجھے اور یقین ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ ڈاکٹر کے بس کا نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھے کچھ کھائے ہوئے آج دو دن ہو گئے ہیں اور ابھی جو میں نے کھایا وہ تو سب ہی نکل گیا۔''

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہاری طبیعت خراب

ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''اس کے برعکس میں خود کو بالکل فٹ اور ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔'' اس نے تردید کی۔ ''مجھے ذرا بھی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی ہے۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے، ایک آدمی دو دن کچھ نہ کھائے اور وہ خود کو بالکل ٹھیک محسوس کرے؟''

''اسی بات سے تو مجھے یقین ہو گیا ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''کہ مجھے کسی ڈریکولا نے کاٹا ہے اور میں ڈریکولا بن رہا ہوں۔''

میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''واقعی... کیا تم خون کی پیاس محسوس کر رہے ہو؟''

اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''نہیں، مجھے تو اس خیال سے گھن آ رہی ہے۔ لیکن اس کی اور کیا توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے؟''

''تم بیمار ہو۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک تم ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤ گے، پتا کیسے چلے گا کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ میں بتا چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میرے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا اور ہم واپس گھر کی طرف آئے مگر میں نے اپنی کار قبرستان والے پارک کے ساتھ روکی۔ مرزا نے بھی اپنی کار وہیں روک لی۔

''یہاں کیوں رکے ہو؟''

''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' میں نے کہا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''دیکھو مرزا اگر تمہاری بات درست ہے اور تمہیں کسی ڈریکولا نے کاٹا ہے تو تمہیں اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم ان کی برادری میں شامل ہو گئے ہو اور دوسری صورت میں...''

''مجھے تمہارا خوف ہے۔'' مرزا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''کہیں تمہارے ساتھ بھی ایسی کوئی بات نہ ہو جائے۔''

''میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔''

''مانتا تو میں بھی نہیں ہوں لیکن...''

مرزا کی بات پوری ہونے سے پہلے میں اسے کھینچ کر پارک کے اندر لے گیا اور اس طرف بڑھا جہاں بہ قول مرزا کے اسے کسی نے کاٹا تھا۔ اس جگہ جھاڑیاں قبرستان کے بڑھ جانے والے درختوں سے مل رہی تھیں اور یہاں خاصی تاریکی تھی۔ میں نے مرزا کی جگہ خود کو کھڑا کر کے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے سوائے تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اتفاق سے پارک کی روشنیاں بھی یہاں سے خاصے فاصلے پر تھیں اور سامنے کی طرف بھی یہ جگہ خاصی نیم تاریک لگ رہی تھی۔ میں نے مرزا سے کہا۔ ''مجھے یہاں پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تو تم نے کیسے دیکھ لیا؟''

''بس میں نے دیکھ لیا۔'' اس نے غصے سے کہا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

''تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اس نے کہا اور کار کا دروازہ زور سے کھولا تو وہ اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ میں اور مرزا دونوں دم بہ خود رہ گئے۔ اس کے پاس جاپان اسمبلڈ لگژری کار تھی اور اس کی باڈی اور تمام چیزیں بہت مضبوط تھیں مگر دروازہ یوں اس کے ہاتھ میں آ گیا جیسے گتے کا بنا ہو اور مرزا نے وزنی دروازہ یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے وہ سچ مچ گتے کا ہو۔ پھر اچانک اس نے دروازہ دور پھینک دیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں۔'' اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ ''پتا نہیں کیسے یہ دروازہ اکھڑ گیا۔''

''کسی وجہ سے کمزور ہو گیا ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بعض اوقات ایسے فالٹ آ جاتے ہیں۔''

''شاید۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضاحت سے میں خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ اگر دروازے میں کوئی مسئلہ تھا تب بھی وہ اس طرح سے الگ ہو کر ہاتھ میں نہیں آ سکتا اور مرزا نے اسے بہت آرام سے اٹھایا ہوا تھا۔ پھر اس نے اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ جب میں اسے اٹھا کر گاڑی کے ہڈ پر رکھ رہا تھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ خاصا وزنی تھا اور میں نے مشکل سے اٹھایا تھا۔ مرزا گھر روانہ ہو گیا۔ جب میں نے اپنے پورچ میں کار روکی تو وہ اندر جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے پاس پہنچا تو وہ متفکر سا لاؤنج میں موجود تھا۔ کریم خان ہمیں دیکھ کر کافی اور چائے لے آیا۔ میں نے مرزا کی طرف دیکھا۔

''تم چائے تو پی رہے ہو۔''

''ہاں، میں کل سے پانی بھی پی رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''دو بار کولڈ ڈرنک بھی پی ہے لیکن جب دودھ پیا تو پھر وہی ہوا تھا۔''

''الٹی میں نکل گیا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ”میرے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔“

”اس کا پتا تو ڈاکٹر سے چیک اپ یا ٹیسٹ سے ہی چلے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔“

”فی الحال میرا ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے انکار کیا۔ ”بلکہ میں اپنے اندر ایسی توانائی محسوس کر رہا ہوں جو اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔“

”خدا کے لیے یار۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں ڈریکولا کے موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور ویسے بھی آج کل نئی نئی بیماریاں وجود میں آ رہی ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی اسی قسم کی کوئی چیز ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک کسی ایسی بیماری کا نہیں سنا جس میں انسان خود کو چاق چوبند محسوس کرے۔“

”دیکھو دوائیں میری فیلڈ ہیں اور میں جانتا ہوں کہ بعض کیمیکلز اور اسٹرائیڈز ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو وقتی طور پر بہت چاق و چوبند اور توانا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے دوررس نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اکثر کھلاڑی اچھی کارکردگی کے لیے انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس قسم کے کیمیکلز اور اسٹرائیڈز کو غیر قانونی قرار دیا ہے اور کوئی کھلاڑی انہیں استعمال کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے بین کر دیا جاتا ہے۔ اس کا اعزاز چھن جاتا ہے۔“

”میں کھلاڑی نہیں ہوں اور تمہارے خیال میں مجھے جس چیز نے کاٹا اس نے مجھے ایسا کوئی کیمیکل یا اسٹرائیڈ انجیکٹ کر دیا؟“ مرزا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”یہ کوئی وائرل انفیکشن بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”تم اپنا چیک اپ کراؤ، اس سے پہلے کہ معاملہ ڈاکٹروں کے ہاتھ سے بھی نکل جائے۔“

”اوکے، میں کل تک دیکھتا ہوں، اگر مجھ سے کچھ کھایا نہیں گیا اور میں نے کمزوری محسوس کی تو میں ڈاکٹر کے پاس ضرور چلوں گا۔“

”کل تک؟“ میں نے انگلی بلند کر کے اسے وارننگ دی۔ ”اس کے بعد میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا؟“

”ڈن ہے۔“ وہ مان گیا۔

میری یہ رات بہت بے چین گزری۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ مرزا میرے بیڈ روم کی کھڑکی سے اندر آیا ہے اور اس کی باچھوں سے نہ صرف دو عدد دانت نکلے ہوئے تھے بلکہ ان سے خون بھی ٹپک رہا تھا اور جیسے ہی وہ میری طرف لپکا میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لاحول پڑھی کہ مرزا نے میرا بھی دماغ خراب کر دیا تھا تبھی مجھے ایسا خواب دکھائی دیا۔ صبح میں جاگا تو سر میں درد تھا مگر آج بھی آفس جانا لازمی تھا اس لیے تیار ہو کر چلا گیا۔ راستے میں کال کر کے مرزا کی خیریت پوچھی تو اس نے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں اور خود کو فٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

”میں شام کو جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“

”فی الحال تو میں بھی دفتر کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔“ مرزا نے کہا۔ ”شاید مجھے بھی دیر ہو جائے۔“

لیکن اس دن مجھے دفتر میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ میں ساڑھے نو بجے دفتر سے نکل رہا تھا کہ مرزا کی کال آئی۔ ”تم کہاں ہو، اب تک آئے نہیں۔“

مرزا کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ”کیوں، کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“

”ہاں سب خیریت ہے لیکن میرے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا ہے، تم آؤ تو میں بتاؤں گا۔“

میں ہر ممکن تیزی سے گھر پہنچا پھر مرزا کے گھر میں داخل ہوا تو وہ مجھے باہر ہی لان میں ٹہلتا ہوا مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی سرگوشی میں بولا۔ ”آج میں واک کے لیے پارک گیا تھا۔“

”تو پھر؟“ میں نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”اس بار کوئی چڑیل مل گئی یا پھر کسی ڈریکولا سے ملاقات ہو گئی۔“

”خان مذاق مت کر۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے میں پارک کے چار چکر لگاتا ہوں لیکن آج میں نے دس منٹ میں دس چکر لگا لیے۔“

میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”یعنی ایک منٹ میں ایک چکر؟“

”بالکل۔“

”یہ تو خاصی تیز رفتار ہے۔“ میں نے کہا۔

”مزے کی بات سنو، میں نو بجے پارک میں داخل ہوا۔ واک کے آغاز سے پہلے میں ہمیشہ گھڑی دیکھتا ہوں اور ہر چکر مکمل ہونے کے بعد بھی گھڑی دیکھتا ہوں۔ پہلے پانچ چکر میں نے ذرا کم رفتار سے کوئی آٹھ منٹ میں طے کیے اور اس کے بعد آخری پانچ چکر بہت تیزی سے مکمل کیے۔“

”یعنی دو منٹ میں پانچ چکر؟“ اب میرے لیے

یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ دو منٹ میں طے کر لیا۔''

واک وے تین سو میٹرز طویل تھا اور اس کے پانچ چکر پندرہ سو میٹرز بنتے ہیں یعنی ڈیڑھ کلومیٹرز۔ مرزا نے یقین دلایا۔ ''یہ بالکل سچ ہے۔''

''یہ ناممکن ہے، سو میٹرز کا عالمی ریکارڈ دس سیکنڈ سے ذرا کم ہے۔ جو چھتیس کلومیٹرز فی گھنٹا بنتا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ تم نے پینتالیس کلومیٹرز کی رفتار سے یہ فاصلہ طے کیا۔''

''بالکل یہ میرے جوتوں کا حال دیکھو۔'' اس نے اپنے جوتوں کے تلے دکھائے جن کی حالت بری تھی اور وہ بری طرح گھس گئے تھے۔ ''ان کا یہ حال آخری دو منٹ میں ہوا ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' اس نے میرا بازو پکڑا۔ ''ہم سی ویو کی سڑک پر چل رہے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ باہر آیا اور کار میں ہم سی ویو کی طرف روانہ ہوئے پھر اس کے آخری حصے میں آئے جہاں سڑک تقریباً ویران تھی۔ مرزا نے جوتے اتار دیے اور مجھ سے کہا۔ ''میں سڑک پر دوڑ رہا ہوں، تم کار چلاتے ہوئے اسپیڈومیٹر پر نظر رکھو۔''

''ٹھیک ہے لیکن یہ سب مجھے احمقانہ لگ رہا ہے۔''

''تم کرو تو۔'' اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ وہ میرے برابر میں آیا اور ایک دو تین کہتے ہی دوڑ پڑا۔ میں نے کار آگے بڑھائی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شروع میں اس کی رفتار کم رہی۔ میٹر کی سوئی دس پر تھی لیکن رفتہ رفتہ رفتار بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد رفتار بیس کلومیٹرز فی گھنٹا ہوئی اور مرزا میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ میں نے رفتار آگے بڑھائی اور تیس کلومیٹرز پر پہنچ کر پیچھے دیکھا تو مرزا بس ذرا دور تھا اور وہ جلد دوبارہ میرے ساتھ آ گیا۔ چالیس کی رفتار پر بھی وہ ساتھ رہا اور پھر رفتہ رفتہ آگے نکلنے لگا۔ یہ قطعی ناقابلِ یقین تھا کہ کوئی انسان اس رفتار سے دوڑ سکتا ہو۔ مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اب مزید تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا تھا۔ میں نے ہارن دیا اور کار روکنے لگا۔ مرزا بھی رک گیا اور جب میں اتر کر اس کے پاس آیا تو وہ قطعی نارمل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سانس معمول کے مطابق تھا۔ میں نے جھک کر اس کے ننگے پاؤں دیکھے تو وہ بھی ٹھیک لگے ورنہ کچھ دیر پہلے مضبوط ترین جوگرز کا کیا حال ہوا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر گہری سانس لی۔ ''اگر میں نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔''

''سچی بات ہے، مجھے اب تک یقین نہیں آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا ہے؟''

''نہیں اور آج صبح سے پانی بھی نہیں پیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب تم کیا کہتے ہو؟''

''کس بارے میں؟''

''یہی کہ میں ڈریکولا بن رہا ہوں۔''

''میں کہہ چکا ہوں یہ سب بکواس ہے۔'' میں نے جواب دیا لیکن سچی بات ہے میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ مرزا نے میری طرف دیکھا۔

''تم سمجھتے ہو کہ میں صرف تیز دوڑ سکتا ہوں۔''

''تو کیا کچھ اور بھی کر سکتے ہو؟''

''ہاں، آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور سڑک سے اتر کر پتھریلے ساحل کی طرف آیا اور ایک وزنی پتھر جس کا وزن کم سے کم ایک من ہو گا اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا میں اسے اٹھا سکتا ہوں؟''

''بہت مشکل ہے؟''

اس نے جھک کر آرام سے پتھر اٹھا لیا اور یہی نہیں بلکہ اسے سمندر کی طرف اچھال دیا۔ پتھر کم سے کم دس گز آگے پانی میں جا گرا۔ یہ واقعی ناممکن تھا۔ مرزا نے ایک اور زیادہ بڑا پتھر اٹھایا اور اسے بھی پانی میں پھینک دیا۔ مجھے لگا جیسے میری عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے۔ میرا دوست کیا بن گیا تھا اور اس وقت میرے سامنے کیا کر رہا تھا۔ واپسی پر ہم دونوں چپ اور سوچوں میں گم تھے۔ میں نے بنگلے کے سامنے گاڑی روکی تو مرزا بغیر کچھ کہے اتر کر اندر چلا گیا اور میں اپنے بنگلے میں آ گیا۔ بہت عرصے بعد ہمارا ساتھ ڈنر کا معمول ٹوٹ گیا جبکہ ہم دونوں ہی گھروں میں تھے۔ مرزا کو کچھ کھانا نہیں تھا۔ کریم خان نے میرے لیے ڈنر بنایا۔ وہ کچھ سہا ہوا تھا، جب وہ میرے لیے کافی بنا کر لایا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''صاحب کچھ گڑبڑ ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟''

''صاحب کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ کل رات میں اپنے کوارٹر سے نکلا تو انہیں لان میں کھڑے دیکھا اور ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے اندھیرے میں بلیوں کی چمکتی ہیں، پر صاحب اس وقت لان میں روشنی تھی۔ میں تو ڈر کر واپس کوارٹر میں چلا گیا۔''

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کریم خان اور تمہیں

وہم ہوا ہوگا یا روشنی اس زاویے سے آرہی ہوگی کہ تمہیں اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی لگیں۔''

''اللہ جانے صاحب۔''

کریم خان نے مجھے صبح کا ناشتا بنا کر دیا اور چلا گیا۔ ابھی میں ناشتا کر رہا تھا کہ وہ دوڑا آیا۔ اس نے بوکھلائے انداز میں کہا۔ ''صاحب کو کچھ ہوگیا ہے، جلدی چلیں۔''

میں اس کے ساتھ بھاگا۔ مرزا اپنے بیڈ روم میں تھا اور اس کا چوکیدار باہر سہما کھڑا تھا۔ اندر سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی درندہ کراہ رہا ہو۔ میں اندر داخل ہوا تو مرزا بستر پر تڑپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ یوں سرخ تھا جیسے پورا چہرہ آبلہ زدہ ہوگیا ہو اور اس کے ہاتھوں پر بھی سرخ آبلے سے پڑے تھے۔ میں لپک کر اس کے پاس آیا۔ ''مرزا یہ کیا ہوا؟''

''پتا نہیں۔'' وہ غرانے کے انداز میں بولا۔ وہ کسی درندے کی طرح پُرشور انداز میں ہانپ رہا تھا۔ ''میں بس باہر نکلا تھا کہ مجھے لگا جیسے میرا جسم جل رہا ہے۔''

''تم پر کوئی چیز گری؟''

''نہیں، میں بس دھوپ میں گیا تھا۔''

میں غور سے اس کے زخم دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر کو کال کرنے کا سوچ رہا تھا کہ رک گیا کیونکہ اس کے چھالے کم ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں کے چھالے غائب ہو گئے اور جلد ویسے ہی ہموار ہوگئی اب مرزا کراہ نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور وہ عجیب سے انداز میں منہ کھولے ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے چھالے بھی بہت مدھم ہوگئے مگر وہ مکمل ختم نہیں ہوئے تھے۔ مرزا نے میرا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''تم نے دیکھا، ذرا سی دیر کے لیے دھوپ میں جانے سے میرا کیا حشر ہوا؟''

''مرزا تم بیمار ہو اور تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔''

''نہیں۔''

''میں تمہیں اسپتال لے جا رہا ہوں، تمہیں علاج کی اشد ضرورت ہے۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گا اب میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ واقعی اس کے چہرے کے چھالے بھی غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ جیسے مردہ ہوجانے والی سفید کھال رہ گئی تھی۔ مرزا نے چہرہ رگڑا تو وہ بھی اتر گئی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر سر تھام لیا۔

''تب اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے شانے جھٹکے۔ ''ممکن ہے جس نے مجھے کاٹا ہے وہی اسے ٹھیک کرسکے۔''

''لیکن ہم اسے کہاں تلاش کریں؟''

مرزا میری طرف جھکا۔ ''قبرستان میں۔''

''قبرستان میں کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

اس رات تقریباً گیارہ بجے ہم قبرستان میں تھے۔ ہمیں پارک سے گھوم کر جانا پڑا تھا۔ یہ قبرستان پوش آبادی میں ہے اس لیے الٹی سیدھی سرگرمیوں کا مرکز بھی نہیں ہے یعنی یہاں نہ چرسی موالی پائے جاتے ہیں اور نہ جرائم پیشہ جو مال حرام یہاں لا کر چھپائیں۔ قبرستان کا رکھوالا اور گورکن ایک ہی خاندان پر مشتمل تھا جو نزدیک ہی چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا رات کے وقت وہ بھی اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ میں اور مرزا ایک درخت کے نیچے موجود تھے اور سامنے قبرستان کا غیر آباد حصہ تھا جہاں جنگل سا اگ آیا تھا۔ میں نے مرزا سے پوچھا۔ ''یہاں کب تک کھڑے رہیں گے؟''

''جب تک وہ سامنے نہیں آجاتا۔''

''سوال یہ ہے کہ وہ سامنے کیوں آئے گا۔ ویسے اس تاریکی میں وہ نظر کیسے آئے گا؟''

''مجھے نظر آرہا ہے۔'' مرزا نے کہا اور میں نے غور کیا تو واقعی اس کی آنکھیں بلی کی طرح چمک رہی تھیں۔

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔''

''ششش، خاموش رہو۔''

''مرزا اگر تمہیں نظر آرہا ہے تو لازمی بات ہے اسے بھی نظر آرہا ہوگا جس نے تمہیں کاٹا تھا تو اس کا مطلب ہے وہ ہمیں اس درخت تلے دیکھ سکتا ہے۔''

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' مرزا بولا اور مجھے کھینچ کر ایک قبر کے بڑے سے کتبے کی آڑ میں لے آیا۔ ''وہ یہاں ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔''

مگر مفروضہ ''وہ'' بارہ بجے بھی نہیں آیا۔ میں نے مرزا سے کہا۔ ''یار ہمیں واپس جانا چاہیے، کسی نے یہاں دیکھ لیا تو کیا سوچے گا آخر ہماری عزت ہے علاقے میں۔''

مگر مرزا نے جواب نہیں دیا۔ وہ نیچے جھکا ہوا تھا اور کچھ عجیب سے انداز میں خرخرانے جیسی آواز نکال رہا تھا۔ اچانک وہ زمین پر گر گیا اور ہاتھ پاؤں سیکیڑ کر کانپنے لگا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ''مرزا کیا ہوا ہے، ہوش کرو۔''

مگر اسے ہوش نہیں تھا۔ بہ مشکل میں نے اسے کھینچ کر

سیدھا کیا اور گھسیٹ کر قبرستان کے پاس کھڑی کار کی طرف لے جانے لگا۔ اچانک مجھے لگا جیسے پاس ہی کہیں کوئی خشک ٹہنی چٹخی ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا مگر نیم تاریکی میں جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اس کے باوجود میرے اندر ایک خوف سا آیا اور میں مرزا کو زیادہ تیزی سے گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے مرزا کو کار کی عقبی نشست پر لٹایا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔ کار اسٹارٹ کر کے میں آگے بڑھنے والا تھا تب میں نے قبرستان کے دروازے کے پاس ایک ہیولے کی جھلک دیکھی۔ اس کے بعد میں نے کار دوڑا دی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور میں بڑی مشکل سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ مرزا کے بنگلے پر پہنچ کر میں نے چوکیدار کو بلایا اور اس کی مدد سے مرزا کو اندر لے گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر چوکیدار خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مرزا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھلی ہوئی اور بری طرح اکڑی ہوئی تھیں۔ وہ رہ رہ کر لرز رہا تھا۔ ناک اوپر چڑھ گئی تھی اور منہ آگے نکل آیا تھا۔

''صاحب یہ کیا ہوا صاحب کو؟'' چوکیدار بولا۔

''تم باہر جاؤ اور کسی کو ایک لفظ نہیں کہو گے۔'' میں نے کہا۔ چوکیدار چلا گیا۔ میں نے تشویش سے مرزا کو دیکھا۔ وہ اس وقت بھی سکڑ سمٹ کر لیٹا ہوا تھا، اس نے دونوں پاؤں پیٹ سے لگا لیے تھے۔ اس وقت وہ انسان سے زیادہ جانور لگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے خرخرانے اور کبھی کبھی غرانے کی آوازیں قطعی انسانی نہیں تھیں۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے ڈاکٹر رضوان کو کال کی اور ان سے مرزا کے بنگلے تک آنے کی درخواست کی..... میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مرزا کو اسپتال لے جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس کا نتیجہ خود مرزا کے حق میں خراب نکل سکتا تھا۔ ڈاکٹر رضوان آدھے گھنٹے میں آ گئے اور میں انہیں اندر لے گیا۔ میں نے مرزا کو دکھانے سے پہلے انہیں لفظوں میں اس کی حالت بتا دی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ تشویش سے بولے۔ میں باہر ہی رک گیا اور وہ اندر چلے گئے۔ میں باہر ٹہلتا رہا۔ چند منٹ بعد اچانک اندر سے شور اور غرانے کی آوازیں آئیں۔ میں اندر کی طرف لپکا تو میں نے دیکھا کہ مرزا نے ڈاکٹر رضوان کو نیچے گرا رکھا ہے اور منہ مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رضوان نے اس کو گردن سے پکڑ رکھا تھا اور خود کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے پاس آیا اور مرزا کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ آرام سے پیچھے آ گیا اور اس نے میرے ہاتھ پر بھی منہ مارنے کی کوشش کی مگر میں اس سے پہلے اسے بستر پر پھینک چکا تھا۔ وہ گرا اور وہیں پڑے پڑے ہانپنے اور غرانے لگا۔ اس کا چہرہ حیوانیت کے تاثرات لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر رضوان ہانپتے کانپتے ہوئے اٹھے اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولے۔

''یہ پاگل ہو گیا ہے، اسے کسی نفسیاتی اسپتال لے جاؤ، اسے بند کر کے رکھنا ہو گا۔ یہ انسانوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ بیمار ہے۔''

''ہاں لیکن دماغی طور پر بیمار ہے۔ اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔''

''لیکن اس کی حالت دیکھیں، کیا نفسیاتی مریض کی یہ حالت ہوتی ہے؟'' میں نے کہا لیکن ڈاکٹر رضوان نے سنا ہی نہیں اور بکتے جھکتے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں نے مرزا کی طرف دیکھا اور سر تھام لیا۔ وہ ایک بار پھر مدہوشی والی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ میرا دوست تھا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کیسے ٹھیک ہوتا؟ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کریم خان کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''دیکھو صاحب کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بیڈ روم کو لاک کر دو اور جب تک میں نہ آؤں، تم کسی صورت دروازہ نہیں کھولو گے۔ سمجھ گئے؟''

''جی صاحب۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں روانہ ہو گیا۔ میری واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی اور کریم خان پہرے داری کر رہا تھا۔ میں نے اسے رخصت کر کے پہلے بنگلے کے سارے دروازے اندر سے بند کیے اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ وہ بستر کے بجائے نیچے قالین پر سکڑا سمٹا پڑا ہوا تھا۔ میرے اندر آتے ہی وہ چونکا اور اس نے بے تابی سے منہ اوپر کر کے کچھ سونگھا۔ میں نے شاپر سے پلاسٹک بوتل نکالی اور اس کی اوپری نلکی کھول کر اسے مرزا کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے جانوروں کی طرح منہ مارا اور پھر کسی بچے کی طرح نلکی چوسنے لگا جس سے خون نکل کر اس کے منہ میں جا رہا تھا۔ یہ تھیلی میں ایک بلڈ بینک سے خرید کر لایا تھا۔ تقریباً ایک لیٹر کی تھیلی مرزا نے دیکھتے ہی دیکھتے خالی کر دی تھی۔ جب تھیلی خالی ہو گئی تب بھی وہ اس میں سے خون کھینچنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی حالت میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں کا کھنچاؤ ختم ہو گیا تھا

اور اس نے خرخرانا اور غرانا بند کر دیا تھا۔ میں نے تھیلی وہیں چھوڑی اور باہر آ کر دروازے کو لاک کر دیا۔

میں دروازے کے سامنے ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اور پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو مرزا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو، اسے کس نے بند کیا ہے؟''

میں نے دروازہ کھولا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ''اب تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے اس طرح سے بند کیوں کیا اور وہ بھی میرے ہی گھر میں؟'' مرزا نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہو گئے تھے۔

''تم ٹھیک نہیں تھے، کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟''

''کیا یاد نہیں ہے؟''

''تم میرے ساتھ قبرستان گئے تھے۔''

''ہاں یہ تو یاد ہے۔''

''اس کے بعد کیا یاد ہے؟''

اس نے اپنی پیشانی رگڑی۔ ''بس مجھے یہ یاد ہے کہ ہم ایک قبر کے کتبے کی آڑ میں بیٹھے تھے۔''

''وہیں تمہیں دورہ پڑا اور تمہاری حالت غیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے میں تمہیں گھر تک لایا۔ تم بالکل آپے میں نہیں تھے۔ میں نے ڈاکٹر رضوان کو کال کی اور وہ تمہیں دیکھنے آئے۔''

''پھر... پھر کیا ہوا، انہوں نے کیا کہا؟'' مرزا بے تابی سے بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ اس نے ڈاکٹر رضوان پر حملہ کیا اور انہیں کاٹنے کی کوشش کرتا رہا، میں نے اسے قابو کیا تو اس نے مجھے بھی کاٹنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رضوان غصے میں چلے گئے۔ اس کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تمہیں قید کر دیا جائے۔

''تم نے مجھے قید کیا لیکن یہ کیا ہے؟'' مرزا نے خون کی خالی تھیلی مجھے دکھائی۔ ''اس میں خون تھا۔''

''ہاں اور وہ میں نے تمہیں پلا دیا۔'' میں نے اقرار کیا۔ ''اسی وجہ سے تم ٹھیک حالت میں نظر آ رہے ہو۔''

مرزا چند لمحے مجھے دم بہ خود نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

جواب میں، میں نے اسے اپنے اسمارٹ فون سے لی ہوئی اس کی تصاویر دکھائیں جن میں وہ دیوانگی کی حالت میں تھا۔ وہ انہیں نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ اچانک وہ پلٹا اور باتھ روم کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے آیا تو وہ واش بیسن پر جھکا ہوا ابکائیاں لے رہا تھا مگر اس کے پیٹ سے کچھ نہیں نکلا۔ وہ بس ابکائیاں ہی لیتا رہا۔ پھر اس نے پانی پیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے میری خوراک بس خون ہے؟''

''شاید اور اسی کی کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ایک چانس لیا تھا کہ شاید تمہاری حالت سدھر جائے اور تم ہوش میں آ کر اپنے بارے میں فیصلہ کر سکو۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''یہی کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟... تمہیں اسی طرح زندگی گزارنی ہے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرانا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اسپتال جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟''

''ہاں جو بات صرف میں اور تم جانتے ہیں وہ سب جان جائیں گے اور ممکن ہے خصوصی کیس کی حیثیت سے تمہارا ملک گیر شہرہ ہو جائے۔ بات میڈیا تک پہنچی تو پھر سارا ملک جان جائے گا۔''

مرزا نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ممکن ہے مجھے پکڑ کر بند کر دیا جائے جیسا کہ ڈاکٹر رضوان نے کہا ہے۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی خیال تھا۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ عرصے بعد پھر خون درکار ہو گا اور اس صورت میں بھی بات کبھی نہ کبھی تو کھل جائے گی۔''

''تم نے خون کہاں سے حاصل کیا؟''

''بلڈ بینک سے رقم دے کر۔''

''تو کیا ہم اسی طرح خون حاصل نہیں کر سکتے؟'' اس نے پوچھا۔

''مرزا تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو، کیا تم عام انسانوں سے کٹ کر زندگی گزارنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔''

''تب اس بارے میں سوچو، میں بھی سوچتا ہوں، ہم مل کر کوئی راہ نکالتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں چلوں گا، مجھے آرام کی ضرورت ہے۔''

''اور میں خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

اس کی وجہ تھی اور میں گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس بار مرزا کا وہم درست ثابت ہوا۔ وہ ڈریکولا بن گیا

تھا۔ اگرچہ ان معنوں میں نہیں جس طرح فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ نکیلے دانتوں اور ماورائی قوتوں کا حامل ایک ایسا کردار جو چمگادڑ بن کر ہوا میں اڑتا ہے اور دیواروں سے گزر جاتا ہے۔ مرزا میں بھی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ طاقت ور ہوگیا تھا اور تیزی سے دوڑ سکتا تھا۔ مگر اس کی زندگی کا دارو مدار خون پر رہ گیا تھا۔ جب اسے خون نہیں ملتا تو اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی اور جب اسے خون مل گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ صبح میں اٹھا تو خلافِ توقع کریم غائب تھا۔ میں نے اپنے چوکیدار سے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں مرزا کے بنگلے پر آیا تو اس کا چوکیدار غائب تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مرزا لاؤنج میں موجود تھا مگر اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کیے ہوئے تھے جن سے دھوپ اندر آسکتی تھی۔

"کریم خان کہاں ہے؟"

"میں نے اس کی چھٹی کر دی۔" مرزا نے جواب دیا۔

"اور چوکیدار؟"

"اسے بھی نکال دیا۔ اب مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں ضرورت نہیں ہے؟"

"سمجھا کرو، یار میں ڈریکولا بن گیا ہوں اس لیے۔ اب مجھے نہ تو عام زندگی گزارنی ہے اور نہ ہی مجھے عام آدمیوں جیسے لوازمات کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے مرزا۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "تم ایک عام انسان ہو۔"

"تب بتاؤ میں صرف خون پی کر ہی کیوں ٹھیک رہتا ہوں؟"

"اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ممکن ہے تمہارے نظامِ ہضم میں کوئی ایسی تبدیلی آئی ہو جس کی وجہ سے تم عام خوراک کھانے سے قاصر ہوگئے ہو۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو صرف مخصوص خوراک کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں۔"

"لیکن ان میں سے کوئی خون پر زندہ نہیں رہتا ہوگا۔"

"مرزا یار، ہم ساری دنیا کیا، اپنے علاقے میں رہنے والوں کے بارے میں نہیں جانتے ہیں کہ کون کیا کھاتا ہے۔"

"میں دن میں باہر نہیں جاسکتا اس لیے اب میں کام بھی نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اسے اسپتال جانا چاہیے۔ "دیکھو یہاں ایسے اسپتال ہیں جو اپنے مریضوں کے معاملات ہر قیمت پر خفیہ رکھتے ہیں۔ ہم انہیں منہ مانگا معاوضہ دے سکتے ہیں۔"

"نہیں میں رسک نہیں لے سکتا۔ تم سوچو کہ اگر یہ بات کھل گئی تو قانون ایک طرف، پہلے لوگ ہی مجھے مار ڈالیں گے۔ ویسے بھی ہماری پبلک میں تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایسے معاملات میں لوگ اجتماعی تشدد پر اتر آتے تھے اور ان کا مقابلہ ریاست نہیں کر سکتی، ہماری تو کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔ تب اس کا یہی حل تھا کہ معاملات کو جوں کا توں چلنے دیا جائے جب تک کہ کوئی حتمی حل سمجھ میں نہ آجائے۔ ہم نے طے کیا کہ دیکھیں گے کہ مرزا کتنے دن خون کے بغیر رہ سکتا ہے اور اس کے بعد اس کے لیے خون کا بندوبست کیا جائے گا۔

ایک ہفتہ وہ ٹھیک رہا اور پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی اور بارہ گھنٹے کے اندر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر جانوروں جیسی حالت میں آگیا تھا۔ میں اس کے لیے خون کی بوتل لے آیا اور اسے اپنے وجود میں اتار کر وہ دوبارہ بارہ گھنٹے میں بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ مرزا کا کوئی دوست اور کوئی ایسا قریبی رشتے دار نہیں تھا جس سے وہ روٹین میں ملتا ہو۔ چند دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے سالوں میں کہیں جا کر کسی تقریب میں ملاقات ہوجاتی تھی۔

اس لیے رشتے داروں کی فکر نہیں تھی۔ پاس پڑوس میں بھی بس سلام دعا تھی اور یہاں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اس لیے پڑوسیوں کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ مرزا کے بزنس کا مسئلہ تھا، شروع میں اس نے اسے چلانے کی کوشش کی مگر اس کا تو سارا کام ہی دن کا تھا اور دن میں وہ باہر نکل نہیں سکتا تھا اس لیے مجبوراً اسے اپنی فرم اور بزنس فروخت کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی گڈول اچھی تھی اس لیے اسے اچھی قیمت مل گئی۔ یہ رقم اس نے فکسڈ ڈپازٹ کرادی جس سے اسے اچھی آمدنی ملنے لگی جو اس کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ اسے اب سوائے خون کے اور کسی چیز کی فکر یا ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ خون کا اسٹاک جمع کرلے مگر میں نے مخالفت کی۔ "نہیں اس طرح تم شاید عادی ہوجاؤ جیسے نشے کے عادی ہوتے ہیں اور پھر تمہارے

خون کی طلب بڑھتی جائے۔ تم فکر مت کرو، میں تمہیں جب ضرورت ہوگی خون لا دوں گا۔"

یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ میں سماجی خدمت بھی کرتا تھا اور مرزا کے لیے خون لانے سے پہلے بھی میں نے کئی بار غریب مریضوں کو خون خرید کر فراہم کیا تھا۔ اس لیے مختلف بلڈ بینکوں سے میری جان پہچان تھی اور میں اگر مہینے یا ڈیڑھ مہینے بعد کسی بینک سے خون خریدتا تو کوئی مجھ پر شک نہیں کرتا۔ میں کرتا یہ تھا کہ ایسے گروپ کا خون مانگتا جو آسانی سے مل جائے۔ ورنہ ایسے گروپ بھی تھے جو پورے شہر میں بھی مشکل سے ملتے تھے۔ مرزا کو گروپ سے کوئی مطلب نہیں تھا اسے صرف خون درکار ہوتا تھا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اگر ہم کسی جانور کا خون ٹرائی کریں اور مرزا وہ پی سکے تو اسے مہیا کرنا زیادہ آسان ہو گا۔ مرزا تیار ہو گیا اور میں کچھ مرغیاں لے کر آیا مگر انہیں ذبح کر کے ان کا خون نکالنے میں جو ہڑبونگ مچی اور گندگی ہوئی مرزا نے ایسا خون پینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"یار خان، وہی ٹھیک ہے۔ صاف ستھرا بوتل میں بھرا ہوا۔"

انسانی خون مہنگا ملتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ مہینے میں مرزا تقریباً بیس ہزار کا خون پی جاتا تھا مگر رقم اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ بزنس ختم ہونے کے بعد بھی اس کی آمدنی لاکھوں میں تھی۔ اس کے علاوہ اس کے اخراجات بھی کم ہوئے تھے کیونکہ چوکیدار اور باورچی کو نکال دیا تھا، ان کی تنخواہوں کی بچت اور اس نے گھر میں کچن ختم کر دیا تھا یہ بچت الگ تھی۔ اس نے واک پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر آرام کرتا یا ٹی وی اور موویز دیکھتا اور شام کو میرے پاس آجاتا۔ میں نے ایک عورت کو کھانا بنانے کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ ناشتا بناتی اور رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ یہ کام وہ میری آمد سے پہلے کر کے چلی جاتی اور میں کھانا گرم کر کے کھا لیتا تھا۔ کھانے کے دوران میں مرزا مجھ سے گپ شپ کرتا۔ کبھی وہ اداس ہو جاتا اور وہ وقت یاد کرتا جب ہم مل کر کھاتے تھے۔

کھانے کے بعد ہم کبھی کبھی باہر چلے جاتے۔ مرزا ضرورت کی چیزیں شام کے بعد ہی لیتا تھا۔ شاپنگ نہیں کرنی ہوتی تو ہم ہاکس بے یا کسی اور جگہ کے لیے سی ویو چلے جاتے تھے۔ ایک بار ہم ریت پر ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے کہ اچانک چند لفنگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ چھوٹے ڈنڈوں اور چاقوؤں سے مسلح تھے۔ انہوں نے ہم سے پرس اور موبائل کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا کہ ہم دے رہے ہیں مگر مرزا کا موڈ کچھ اور تھا۔ اس نے اچانک ایک لڑکے کو بازو سے پکڑا اور گھما کر سمندر کی طرف اچھال دیا۔ وہ ایک طویل چیخ کے ساتھ پانی میں جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے عقب سے مرزا کے سر پر بہت قوت سے ڈنڈا مارا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی ہو گی مگر مرزا آرام سے کھڑا رہا۔ اس نے دوسرے لڑکے کا بھی وہی حشر کیا تو تیسرے نے خود دوڑ لگا دی۔ گھر آ کر میں نے مرزا کے سر کا معائنہ کیا تو اس پر چوٹ کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا۔ یہ وار کسی عام آدمی کے سر پر لگا ہوتا تو اس کی کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔

شروع میں مرزا ہفتے میں ایک بار خون پی کر سیٹ رہتا تھا مگر رفتہ رفتہ اس کی طلب بڑھنے لگی اور اب اسے ہر پانچ دن بعد ایک لیٹر خون درکار ہوتا تھا ورنہ اس کی حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ میں اور مرزا دونوں فکر مند ہو گئے۔ مجھے فکر یہ تھی کہ یہ سلسلہ کہاں تک بڑھے گا اور مرزا کو فکر تھی کہ کہیں خون کی سپلائی رک نہ جائے۔ اس نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ وہ خون اسٹور کر کے رکھ لیتا ہے۔ اس کے کہنے پر میں اس بار دو تھیلیاں لے آیا مگر جب اس نے پانچ دن بعد دوسری تھیلی کھولی تو اس میں موجود خون خراب ہو گیا تھا کیونکہ وہ بلڈ بینک میں مخصوص درجۂ حرارت پر رکھا جاتا ہے۔ فریج کا درجۂ حرارت اس سے الگ تھا اس لیے خون خراب ہو گیا۔ مرزا کی حالت اب خراب ہو رہی تھی اس لیے مجھے ایمرجنسی میں بھاگنا پڑا اور جب میں گھر سے نکلا تو مرزا ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر جانور والی حالت میں آ گیا تھا۔

بدقسمتی سے میں جو گروپ کہتا وہاں سے انکار سننے کو ملتا۔ میں کئی بلڈ بینکوں میں گیا اور بالآخر پانچویں بینک میں کام بنا۔ میں خون لے کر واپس آ رہا تھا کہ تیز رفتاری میں گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا ایک موڑ کاٹتے ہوئے میں ذرا رانگ سائڈ پر گیا اور سامنے سے آتے منی ٹرک نے میری کار کو ٹکر ماری۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ میں لمحے میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد میں اسپتال میں دو دن بے ہوش پڑا رہا اور اس دوران میں میرے دو آپریشن ہوئے۔ خوش قسمتی سے میرے دفتر والے آ گئے اور انہوں نے مجھے سرکاری سے ایک اچھے نجی اسپتال میں منتقل کیا جہاں میرا علاج ہوا۔ تیسرے دن مجھے ہوش آیا اور سب سے پہلے مجھے مرزا کا خیال آیا کہ اس کا کیا ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر سے یہ سن کر میں اور

پریشان ہوگیا کہ مجھے دو دن بعد ہوش آیا ہے۔ میں نے بہ مشکل اس سے کال کی اجازت لی اور مرزا کو کال کی مگر وہ نہ تو موبائل پر اور نہ ہی گھر کے نمبر پر کال ریسیو کررہا تھا۔ وہ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے ہوش کہاں ہوگا کہ وہ کال ریسیو کرتا۔

خوش قسمتی سے مجھے کوئی میجر فریکچر نہیں ہوا تھا۔ پسلیوں پر چوٹ آئی تھی اور اصل میں سر پر چوٹ آئی تھی اور خون جمنے سے بچانے کے لیے ڈاکٹرز نے دو آپریشن کیے۔ بہرحال دس دن بعد مجھے اسپتال سے فارغ کردیا گیا۔ اس دوران میں، میں نے کئی بار مرزا سے رابطے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام رہا۔ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مرزا کے گھر جا کر دیکھ لے۔ مجھے ایمبولینس نے گھر تک چھوڑا۔ دفتر کے لوگ میرے ساتھ آئے تھے۔ پھر گھر میں ملازم بھی تھے اس لیے میں جلدی مرزا کی طرف نہیں جا سکا۔ چوکیدار آزردہ تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ''ہم کو افسوس ہے مرزا صیب آپ کو دیکھنے نہیں آیا۔''

''وہ بیمار ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے وہ تم کو نظر آیا؟''

''نہیں صیب۔'' چوکیدار نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے ہی میرے آس پاس سے لوگ ہٹے، میں اسٹک کا سہارا لے کر مرزا کے گھر پہنچا اور اندر داخل ہوتے ہی لاؤنج کے کھلے دروازے نے ساری کہانی سنا دی۔ بیڈ روم کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور مرزا غائب تھا۔ گھر مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اس دوران میں یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مرزا کہاں گیا ہوگا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں جاتا۔ یہ ہمت آنے میں مزید تین دن لگے۔ پٹیاں اتر گئی تھیں اور ڈاکٹرز نے مجھے فٹ قرار دے دیا تھا۔ میں نے رات کے کھانے کے بعد قبرستان کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ مرزا اسی طرف گیا ہوگا۔ قبرستان کا بڑا حصہ جو ابھی قبروں سے خالی تھا وہاں بہت گھنی جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور ان میں چھپنے کی بہت جگہیں تھیں۔ رات کے نو بجے وہاں سناٹا تھا اور خود میرا بھی دل خوف کی وجہ سے تیز دھڑک رہا تھا۔ میں قبروں کو پار کرکے جھاڑیوں کے پاس آیا اور مرزا کو آواز دی۔

''جمال... جمال کہاں ہو تم؟''

پتا نہیں وہ سچ مچ آواز تھی یا میرا وہم تھا۔ مجھے لگا جھاڑیوں میں کوئی بہت ہلکے سے غرایا ہو۔ میں نے پھر آواز دی مگر اس بار کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کوئی مجھے یہاں دیکھ نہ لے اور پتا نہیں کیا سمجھے۔ میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میری نظر جھاڑیوں پر مرکوز تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ بارہ بجے کے قریب مجھے لگا کہ جھاڑیوں میں کوئی چل رہا ہے۔ میں چوکنا ہوگیا۔ اندر موجود چیز کے چلنے سے جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ مگر کچھ دیر بعد یہ حرکت رک گئی۔ میں نے ہمت کرکے پھر مرزا کو آواز دی اور ذرا دھیمے لہجے میں وقفے وقفے سے اسے پکارنے لگا۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے قبروں کے درمیان گیا ہو۔ نیم تاریکی میں بس ایک لکیر سی دکھائی دی اور وہ چیز قبروں کے درمیان غائب ہوگئی۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر مرزا کو پکارنے لگا۔ اچانک قبروں کے درمیان سے ایک ہیولا بلند ہوا۔ اس نے سر سے پاؤں تک خود کو جیسے کسی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ پھر وہ میری طرف آنے لگا۔

''مرزا... یہ تم ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے دھیمی لیکن گونجتی آواز میں کہا تو میری ہمت جواب دے گئی اور میں پلٹ کر بھاگا۔ وہ میرے پیچھے جھپٹا اور عین اس وقت جب میں قبرستان سے نکلنے والا تھا وہ مجھ تک پہنچ گیا مگر وہ مجھے پکڑ نہیں سکا کیونکہ عین اسی لمحے کسی نے غرا کر اس پر چھلانگ لگائی اور وہ دونوں گتھم گتھا ہوکر جانوروں کی طرح لڑنے لگے۔ میں نے رک کر دیکھا۔ دوسرا فرد صرف ایک پھٹ جانے والے پاجامے میں تھا۔ اس کا اوپری جسم عریاں تھا اور وہ سیاہ پوش ہیولے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ اسے گرائے ہوئے تھا اور پھر اس نے مڑ کر مجھ سے غراتی آواز میں کہا۔

''خان... بھاگ۔''

وہ مرزا تھا اور میری جان بچانے کے لیے اس ہیولے سے بھڑ گیا تھا۔ میں بھاگا اور مجھے ہوش نہیں کہ میں گھر کیسے پہنچا۔ میری طبیعت خراب ہوگئی اور مجھے ایک بار پھر اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں میں تین دن رہا۔ اب اس واقعے کو کئی برس ہوگئے ہیں۔ میں اسی جگہ رہتا ہوں لیکن اس کے بعد میں کبھی قبرستان یا اس سے متصل پارک کی طرف بھی نہیں گیا۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ اس طرف جاؤں۔ شاید مرزا مجھے نظر آئے مگر جب دوسرے ہیولے کا خیال آتا ہے تو میں اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہوں۔

چوک

حمیرا اقبال

معمولی سی چوک پہاڑ جیسی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے... ایک وفا شعار... فرمانبردار رفیقِ کار کی عملی کارروائی... اس نے فیصلہ کن گھڑی کو کھو جا... تولا اور پالیا... آخری پل میں پلٹ جانے والی ہولناک بازی۔

مغرب سے برآمد مختصر سی کڑوی کسیلی تحریر

مارگریٹ نے اپنے شوہر کے پولیس اسپیشل ریوالور کی نال اس کی داہنی کنپٹی پر رکھ دی اور دباؤ ڈالتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔

فائر کی گونج اس کی توقع سے بڑھ کر تھی۔ دھماکے کے نتیجے میں اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے اور تکیہ خون میں تربتر ہونے لگا۔

یہ نظارہ دیکھ کر مارگریٹ بوکھلا سی گئی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

دھماکے کی گونج سے اس کے کان ابھی تک جھنجھنا رہے تھے۔ پھر اپنی سوجی ہوئی آنکھوں اور اپنے شوہر کی مار

پیٹ سے ان رخساروں نے اپنی بے بسی کا احساس دلایا تو وہ جیسے چونک گئی۔ ''تم کتیا کی اولاد!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

پھر اس نے جھک کر ریوالور اٹھالیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اور ریوالور کی نال خون میں تربتر تھے۔ ''کاش تم نشے میں بے سدھ پڑے رہنے کے بجائے ہوش میں ہوتے۔ مجھے تمہارے بیدار ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تب تمہاری پتلون گندی ہوجاتی جب تم دیکھتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے جارہی ہوں۔''

مارگریٹ نے باتھ روم کے سنک میں اپنے خون آلودہ ہاتھ دھوئے اور ریوالور کے دستے کو گیلے تولیے سے اچھی طرح صاف کیا۔ پھر ایک چھوٹے سے تولیے کی مدد سے اس نے ریوالور اٹھالیا تاکہ اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت نہ ہونے پائیں۔

وہ واپس بیڈ روم میں پہنچی اور ریوالور اپنے شوہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس کی انگلیاں ٹریگر کی گرپ پر جما دیں۔ پھر تولیے سے اپنے ہاتھ اور بازو کو ڈھانپتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ریوالور کا رخ کمرے کی مخالف سمت کرتے ہوئے اس کی انگلی سے ٹریگر دبادیا۔

''اب تمہاری انگلیوں پر بارود کے ذرات اور جھلنے کے نشانات آچکے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کی وضاحت تم کس طرح کروگے۔ گھامڑ آدمی! کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کہ کون سا فائر پہلے کیا گیا تھا۔ اب آئندہ تم کبھی میرے ساتھ مار پیٹ نہیں کرسکوگے۔ مجھے تمہارے ظلم و ستم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی ہے۔''

پھر وہ دوبارہ باتھ روم میں پہنچی اور سنک پر صابن اور بلیچ کی مدد سے اپنے ہاتھ خوب اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیے اور کسی قسم کے خون یا بارود کے ذرات باقی نہیں رہنے دیے۔

اب وہ چھوٹا سا فرشی قالین ٹھکانے لگانا باقی رہ گیا تھا جس پر خون کے لوتھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے وہ فرشی قالین لپیٹ دیا اور اسے اٹھا کر نچلی منزل کے بوائلر روم میں لے گئی۔ اس نے وہ قالین فائر بکس میں جھونک دیا۔

جب اسے یقین آگیا کہ وہ فرشی قالین مکمل طور پر جل کر راکھ ہوچکا ہے تو وہ دوبارہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آگئی

قیمت

مرزاجی نے امریکا کی سیر کے لیے ایک بہت پرانی اور خستہ حال گاڑی خریدلی، کئی ہفتوں تک وہ اس میں سیر سپاٹے کرتے رہے پھر گاڑی نے انہیں مسلسل تنگ کرنا شروع کردیا۔ اسے بیچنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن کوئی خریدنے پر تیار نہیں ہوا۔

ایک روز وہ اسی کار میں مضافات کی طرف نکل گئے۔ کچھ دیر میں ٹول پلازا آگیا۔ انہوں نے بمشکل اپنی گاڑی کھڑکی کے پاس روکی۔

''دس ڈالر۔'' کھڑکی والا اونچی آواز میں بولا۔

''منظور!'' مرزاجی گاڑی سے کود گئے۔ ''یہ تمہاری ہوئی، نکالو دس ڈالر۔''

گلزار فاطمہ، پشاور سے

اور کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی پرانی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک پولیس کار اپنی روشنیاں فلیش کرتی ہوئی اس کے مکان کے سامنے فٹ پاتھ کے کنارے آکر رک گئی۔

مارگریٹ نے پلٹ کر ایک اچٹتی نگاہ بیڈ پر ڈالی جہاں اس کے شوہر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لاش کو دیکھ کر اسے ایک قلبی اطمینان محسوس ہوا۔

لیکن پھر دوسرے لمحے اس کا یہ اطمینان پارہ پارہ ہو گیا۔ وہ ایک ایسی ہولناک حقیقت تھی جس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔

باہر سیڑھیوں پر وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دینے لگی جو تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔

مارگریٹ بے بسی سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کر بیٹھی تھی۔

اس کی نظریں اپنے شوہر کے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر مرکوز تھیں جبکہ اس کا شوہر پیدائشی کھبا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز کے ساتھ ہی اس کے اعصاب شل ہوتے چلے گئے۔

ایک سراغ رساں کی تفتیشی کارروائیاں... کوئی اس پر اعتماد کرنے کو تیار نہ تھا...

دھوکے باز

سکندر علیم

کسی دانش مند کا کہنا ہے کہ ہر خرابی کا مداوا موجود ہے... حماقت کا نہیں... کسی ضدی احمق کو نصیحت کرنا یا کسی غبی کو سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے پانی پر نقش بنانا... ایک نوجوان کی ناتجربہ کاری کی رُوداد... جو اپنی دانست میں کیے گئے فیصلوں کو مسئلے کا بہترین حل سمجھتا تھا... دھوکے اور فریب کاری کا انوکھا منصوبہ...

اُس روز بھی معمول کے مطابق میری آنکھ دیر سے کھلی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت مجھے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ کو باس کی خوں خوار نظروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ آنے والی گھڑی کو ٹالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے بھاگم بھاگ شاور لیا اور ناشتا کیے بغیر ہی دفتر کی طرف دوڑ لگا دی۔ راستے میں گاڑی روک کر ایک اسٹور سے برگر اور کوک کی بوتل لی اور گاڑی چلاتے ہوئے اس ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ریڈیو آن کیا تو اس پر وہی خبر چل رہی تھی جس کے بارے میں پہلے سے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔ چارلس البریمٹی گزشتہ تین روز سے غائب تھا اور پولیس کو ابھی تک اسے تلاش کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ایم بوائے بوٹ رائٹ ہے لیکن دوست اور دفتر کے ساتھی مجھے بوائے کہہ کر پکارتے ہیں۔ میری عمر پچاس سال ہے۔ تین مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ بچہ کوئی نہیں۔ مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ میں سراغ رساں کے طور پر کام کرتا ہوں۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے چھبیس سال ہو گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ ابھی تک مجھے نوکری سے نہیں نکالا گیا حالانکہ اپنی عادتوں کی وجہ سے میرا ایک دن بھی ملازمت پر رہنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال اب جیسے جیسے پنشن کا وقت قریب آ رہا ہے، میں سنجیدہ ہوتا جا رہا ہوں اور میری ہر روز یہی کوشش ہوتی ہے کہ صبح سویرے بھاگم بھاگ تیار ہو کر دفتر کا رخ کروں تاکہ میرا مستقبل محفوظ رہے۔

اگر پولیس چارلس کو ابھی تک تلاش نہیں کر سکی تو یہ میری ناکامی تھی کیونکہ یہ کیس میرے ہی سپرد کیا گیا تھا۔ تین روز قبل چارلس کی ماں آستھا نے نو گیارہ پر فون کر کے اطلاع دی تھی کہ اس کا بیٹا بستر سے غائب ہے اور اس کی جگہ وہاں سے ایک کاغذ ملا ہے جس میں اسے تاوان کی کال کا انتظار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ میں نے اس کیس پر کافی کام کیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے باوجود مجھ سے کہا گیا کہ کوشش جاری رکھوں۔ دراصل مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جنہیں ٹیم کا نام دیا گیا اور یہ ٹیمیں پورے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈیوڈ کی ٹیم میں رکھا گیا تھا اور میرا دفتر شہر کے وسط میں واقع بالکن اسٹریٹ پر تھا۔ اسی عمارت میں ڈپارٹمنٹ کا مرکزی دفتر بھی تھا اور شاید اسی لیے تمام ہائی پروفائل کیس میرے سپرد کیے جاتے تھے۔

دفتر پہنچا تو میز پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ''چیف سے فوراً ملو۔'' میں نے ٹائی کی ناٹ درست کی اور دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے لفٹ میں سوار ہو گیا۔ سیکریٹری نے بتایا کہ چیف ٹام ملاجی میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔ میں نے دھڑکتے دل کے

ساتھ دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ کچھ کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''ہوائے! اندر آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹوں بعد اسے فراغت نصیب ہوئی تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ میرے خدا! یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ اسے کیا بتاتا کہ ایک تنہا آدمی کی رات کس طرح گزرتی ہے۔ اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''ٹی وی کی خبروں میں البرٹینی کے معاملے کو کافی اچھالا جا رہا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ہماری اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔''

''ہاں، ہمیں ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس لڑکے کو نصف شب کے قریب بستر سے کھینچ کر لے جایا گیا۔ میں نے ہر اس جگہ سے معلومات حاصل کیں جہاں وہ اس شب سے پہلے گیا تھا۔ تقریباً سبھی لوگ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر چکے ہیں۔ کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں ملا کہ وہ ریاست کی حدود سے باہر چلا گیا ہے۔ گو کہ ہم ساؤتھ کیرولینا سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر ہیں۔ ابھی تک کسی نے آستھا سے تاوان کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا اور ہم اس کے فون کا انتظار کر رہے ہیں اگر وہ تحریر اس کے بستر سے نہ ملتی تو یہ محض ایک لاپتا فرد کا کیس ہوتا۔''

''شاید تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ البرٹینی خاندان اس شہر کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کا میئر، آستھا کا سیکنڈ کزن ہے اور اسے اس بات پر گہری تشویش ہے کہ چارلس ابھی تک لاپتا ہے۔''

''اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے خاندان کے ہر فرد اور ان کے دوستوں سے بات کی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی چارلس سے کوئی شکایت نہیں ہے اور کسی نے بھی اخبارات کو فون کر کے اس واقعے کی ذمّے داری قبول نہیں کی۔ ہم نے البرٹینی کی رہائش گاہ کے فون ٹیپ کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں ایک شخص کو چوبیس گھنٹے کے لیے تعینات کر دیا ہے تاکہ وہ صورتِ حال پر نظر رکھ سکے۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں میں؟''

''میں ان تمام اقدامات سے واقف ہوں اور اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔'' ملاجی نے کہا۔ ''مجھے آستھا کی فون کال

موصول ہوئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ تھوڑی سی سنکی ہے۔ وہ تم پر کافی برہم ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس کا یہ بھی خیال ہے کہ تم اور تمہاری ٹیم جو کچھ کر سکتی تھی، وہ کر چکی۔ اس نے اب کسی اور کی مدد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر سڑک کا نظارہ کرنے لگا پھر پلٹ کر بولا۔ ''ہمارے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس نے کارپینٹر سے اس کیس کو دیکھنے کے لیے کہا ہے۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہے۔'' ملاجی نے کہا۔

''اس کے ساتھ کام کرنے سے بہتر ہے کہ میں ریٹائرمنٹ لے لوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''تم اس کے ساتھ کام نہیں کرو گے؟'' ملاجی نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کو آپس میں ملنے کا موقع بھی نہ ملے۔ اسے اپنے طور پر کام کرنے دو۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو باس کہ اگر ایک بار اس نے آستھا کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تو اس کا کہا ہوا پتھر کی لکیر ثابت ہوگا۔ اگر اس نے کوئی تجویز بھی دی تو وہ میرے لیے حکم کا درجہ ہوگی، جبکہ وہ ایک ناکارہ شخص ہے اور محض اپنی قسمت سے کھا رہا ہے۔''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے کبھی کسی کام کا کریڈٹ نہیں لیا۔''

''وہ شہرت نہیں بلکہ پیسوں کے لیے کام کرتا ہے اور انتہائی درجے کا ناقابلِ برداشت شخص ہے۔ صرف وہی کیوں؟ کیا اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کی خدمات حاصل نہیں کی جاسکتیں؟''

''تم معاملات کو مشکل بنا رہے ہو بوائے۔'' میلاجی نے کہا۔ ''میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تمہیں اس کیس سے الگ نہیں کر رہا بلکہ تم اب بھی مرکزی سراغ رساں کے طور پر کام کرو گے لیکن چاہے تم اسے پسند کرو یا نہیں کارپینٹر اس کیس کا حصہ بننے جا رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم جھیل وائسن پر واقع اس کے گھر جاؤ اور اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔''

جھیل وائسن شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں امرا کے مکانات تھے اور ان کی قیمتیں پانچ لاکھ ڈالرز سے شروع ہوتی تھیں اور وہی شخص ان مکانوں کو خرید سکتا تھا جس کا معاوضہ سات ہندسوں میں ہو۔ کارپینٹر بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ میں نے ڈرائیو وے کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے اس کے عالی شان مکان پر نگاہ ڈالی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا رقبہ کم از کم نو ہزار مربع فٹ تھا۔ یقیناً اس میں پانچ کمرے اور کئی باتھ روم ہوں گے۔ گیرج کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے وہاں سفید رنگ کی مرسیڈیز نظر آ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں مجھے اپنی تین سال پرانی امپالا بہت حقیر لگی تاہم میں اسی پر مطمئن اور قانع تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور کئی منٹ بعد کارپینٹر نے دروازہ کھولا۔ اس وقت بھی وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود دوبارہ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اس کا قد تقریباً ساڑھے پانچ فٹ تھا اور اس نے سفید پتلون کے ساتھ کاٹن کی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ کی انگلیوں میں چھ انگوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔

کافی دیر بعد اس کی گفتگو ختم ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سراغ رساں بوٹ رائٹ! تم سے مل کر خوشی ہوئی، کیسے ہو؟''

''کیا تم نہیں جانتے؟'' میں نے جل کر کہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم بہت زیادہ ڈرنک کرتے اور کھانے کا خیال نہیں کرتے ہو۔ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہو رہی اور اپنا بہت سا وقت دفتر میں گزارتے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ کسی نفسیات داں کو بھی اس نتیجے تک پہنچنے میں دماغ سے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''حقیقت یہ ہے کہ میں نے بھی اپنے دماغ پر زور نہیں ڈالا۔'' ''تمہاری آنکھیں سب کچھ بتا رہی ہیں۔ میں تمہارے پسینے سے الکحل کی بو سونگھ سکتا ہوں۔ بہت زیادہ پینے والے شاید ہی ڈھنگ سے کھانا کھاتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ اس اخبار نے بیان کر دیا ہے۔'' اس نے ٹیلی گراف کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں چارلس کے بارے میں لکھا ہے، واقعی صورتِ حال بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری تھوڑی بہت مدد کر سکوں گا۔''

''ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو لیکن اس کے لیے تمہیں ہر حال میں مداخلت کرنا ہوگی۔''

''واقعی تم بہت ہوشیار ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی دخل اندازی کے بارے میں نہیں سوچتا اگر آستھا براہِ راست مجھ سے رابطہ نہ کرتی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں پولیس کی مدد کرنے کے عوض بھاری معاوضے کی پیشکش کی ہوگی۔''

''وہ عورت بہت فیاض ہے۔'' وہ مجھے مشروب کا گلاس پکڑاتے ہوئے بولا۔

''تمہاری ٹیلی فون سروس کیسی جارہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی۔ میں نے چھ ماہ پہلے یہ سروس شروع کی تھی۔ میں نے اس کے لیے کوئی اشتہار نہیں دیا اور نہ ہی کسی قسم کی پبلسٹی کی۔ صرف دو یا تین باقاعدہ گاہکوں کو اپنا پرائیویٹ نمبر دے دیا تھا اور انہوں نے ہی اپنے جاننے والوں میں اس کا تذکرہ کرکے میرے کام کو پھیلا دیا۔''

''تمہاری فیس کتنی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم ٹیلی فون پر مشورہ دینے کا فی منٹ کتنا معاوضہ لیتے ہو؟''

''مجھے شرم آتی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ''کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے چارلس کے کیس پر بات کرسکتے ہیں؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم نے کیا معلوم کیا؟''

میں نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ تمام متعلقہ افراد جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرچکے ہیں اور نہ ہی ابھی تک کسی نے تاوان کے لیے فون کیا۔''

''یہ سب کچھ مجھے آستھا نے پہلے ہی بتادیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر تم اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر یہ بتادو کہ چارلس کو کس نے اغوا کیا ہے تو میں اسے گرفتار کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''یہ کام اس طرح نہیں ہوگا۔ مجھے البرٹینی ہاؤس جانا ہوگا تاکہ کچھ اشارے تلاش کرسکوں۔'' پھر اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''میں ابھی نہیں جاسکتا کیونکہ کوئی شخص مجھ سے اپنے کسی معاملے میں مشورہ کرنے آرہا ہے۔ کیوں نا میں تمہیں وہاں پانچ بجے کے قریب مل جاؤں۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

البرٹینی کا احاطہ مورگن کے جنوب میں دس ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ دراصل اس خاندان کے کسی فرد نے بھی یہاں سے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سب یہیں بسے رہے۔ اس خاندان کی چار نسلیں چھ مکانات پر قابض تھیں۔ چارلس نے شادی نہیں کی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی بگ ہاؤس چھوڑ کر نہیں گیا۔ اس مکان کو جانے والی چوتھائی میل لمبی سڑک پر مختلف چینلز کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، میں نے ایک دو شناسا چہروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گھر کے سامنے بنے ہوئے دائرہ نما کار پارک کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ کسی وقت بھی مکان میں داخل ہو سکتا ہوں جب میں نے دروازے پر دستک دی تو وہاں مجھے اپنے ایک معاون سراغ رساں اسکاٹ بیگنز کا چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا سا حیران ہوا اور بولا۔ ''معاف کرنا، میں سمجھ رہا تھا کہ تم دو گھنٹے بعد آؤ گے۔''

''مچالی نے ایک نیا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ مسز البرٹینی کہاں ہیں؟''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آستھا البرٹینی نے پارلر کا فرانسیسی دروازہ کھولا اور میرے سامنے آگئی۔ اس نے ایک لمبا سا لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے پیروں تک آرہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔ ''کیا تم کوئی خبر لے کر آئے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے مسز البرٹینی، فی الحال میرے پاس کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ میں صرف سراغ رساں بیگنز سے یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے کوئی فون تو نہیں کیا۔''

''نہیں۔'' بیگنز نے مختصر جواب دیا۔

''اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟'' آستھا نے پوچھا۔

میں اسے سچ نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ تاوان کے لیے فون آنے میں جتنی تاخیر ہورہی تھی، اتنا ہی چارلس کی زندگی کے لیے خطرات بڑھتے جارہے تھے۔

''ہمیں فی الحال صبر سے کام لینا ہوگا۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے لیے مسلسل دعائیں مانگ رہی ہوں۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میری خدا سے یہی التجا ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں کوئی اشارہ یا چھوٹی سی اطلاع مل جائے تاکہ ہم اپنے پیارے بیٹے کو واپس لا سکیں۔''

''ہم اسے واپس لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''تم تھکی ہوئی معلوم ہورہی ہو۔ شاید تھوڑی دیر سونے سے بہتر محسوس کرسکو۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گی۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں بھی کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے باہر آگیا جہاں میرا سامنا لیلیٰ اوئیکس سے ہوا۔ وہ مقامی نیوز چینل پر کرائم رپورٹر تھی۔ اس نے عمدہ سلا ہوا لینن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے میرے پاس آتے ہی کہا۔

''بوائے! تم مجھے ایک منٹ دے سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کیمرا مین کو اشارہ کیا جس نے اپنے کندھوں پر ویڈیو ریکارڈر لٹکایا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تصویریں نہیں بنیں گی۔ میں تم سے پس منظر میں رہ کر بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک ہفتے کے دوران میں ٹی وی پر بہت زیادہ آچکا ہوں۔''

وہ تھوڑا سا جھکی اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کسی اخبار میں کام نہیں کرتی اور ٹی وی پر خبر چلانے کے لیے اس کی ویڈیو بنانا ضروری ہے۔''

''تمہیں انٹرویو چاہیے یا نہیں؟'' میں نے سختی سے کہا۔

میری بات سن کر وہ ڈر گئی اور اس نے کیمرے مین کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے کہ آستھا نے کسی ماہر کی خدمات حاصل کی ہیں جو اس کیس کی تحقیقات میں مدد کرے گا؟''

''یہ مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ کی پالیسی نہیں ہے کہ وہ باہر کے کسی آدمی کو تحقیقات میں شامل کرے۔ ہم سے کسی نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔''

''یہ میرا سوال نہیں تھا۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا کارپینٹر اس اغوا کے کیس پر کام کر رہا ہے؟''

''ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔''

''لیلیٰ، میں تمہیں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ اس کا ہماری تحقیقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارا سوال یہ ہے کہ کیا آستھا نے کارپینٹر کی خدمات حاصل کی ہیں تو یہ سوال بھی اسی سے پوچھو۔''

''میں کوشش کر چکی ہوں۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں، اس نے مجھے ایک پیسٹری پکڑائی اور واپس گھر چلی گئی۔''

وہ اپنا ہونٹ چباتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی جواب میں اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر ہم دونوں نے ہی ایک ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔ بہت دنوں بعد میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

''میں مسز البریٹی سے پوچھوں گا اگر اس نے مجھے اس معاملے پر تم سے بات کرنے کی اجازت دے دی تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی کارپینٹر کے آنے میں دیر تھی۔ اس لیے میں نے اس وقت کو کسی تعمیری کام کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد میں کچن میں داخل ہوا جہاں میری ملاقات چارلس کے باپ ٹیمی البریٹی سے ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ پینا چاہو گے؟'' اور یہ کہہ کر اس نے خود ہی میرے لیے گلاس بھر دیا۔

''میں نے چارلس کے تمام دوستوں سے بات کی ہے۔ کم از کم وہ جنہیں میں تلاش کر سکا اور ان سب نے جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر دی ہے۔ اسی طرح میں نے خاندان کے تمام لوگوں سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ سب بے قصور معلوم ہوتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ چارلس کو اغوا کرنے والا کوئی باہر کا شخص ہے۔''

''ممکن ہے۔ زیادہ تر اغوا کے کیسز میں اجنبی ملوث ہوتے ہیں اور ان کا مقصد پیسا کمانا ہوتا ہے۔''

''اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟'' ٹیمی نے پوچھا۔

''بہت سی باتیں ممکن ہیں۔ اسی لیے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے چارلس کیسا لگ رہا تھا؟''

''تمہارا مطلب ہے غائب ہونے سے پہلے۔ کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ خاموش رہنے لگا تھا جب سے اسے وہ حادثہ پیش آیا۔''

''حادثہ؟''

''اسے کار ریس کا شوق تھا اور وہ تیز رفتاری سے کار چلانا پسند کرتا تھا۔ وہ گزشتہ موسم خزاں میں ہونے والی ریس میں ایک اسپورٹس کار چلا رہا تھا کہ کار کو صحیح طرح کنٹرول نہ کر سکا۔ اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور بالآخر کار سے گر پڑا۔''

''کیا اسے کوئی گہری چوٹ آئی تھی؟''

"ہاں اس کے سر میں چوٹ لگی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا اور ابھی تک اس کا یہی حال ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کی یادداشت کبھی واپس نہیں آسکے گی، تاہم آستھا کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ وہ مسلسل چارلس کو اکساتی رہی اور اسے یاد دلانے کی کوشش کرتی رہی۔ جیسے وہ کہیں کوئی چیز رکھ کر بھول گیا ہو۔ کبھی کبھی تو اس عورت کی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔"

پانچ بجے کے قریب کارپینٹر کی آمد ہوئی۔ وہ جیسے ہی کار سے باہر آیا تو وہاں موجود صحافیوں اور کیمرامین نے اسے گھیر کر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا پولیس نے اس کیس میں معاونت کے لیے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ کارپینٹر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجمع کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں یہاں صرف اس فیملی کے دوست کی حیثیت میں آیا ہوں۔ مسز البریمنی نے اس مشکل وقت میں سہارا دینے کے لیے مجھے بلایا ہے۔ آپ پولیس کی تحقیقات کے بارے میں سراغ رساں بوٹ رائٹ سے سوالات کرسکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجمع میں سے کسی نے بہ آواز بلند میرا نام لے کر پکارا لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور پانچ منٹ بعد میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ کارپینٹر بغلی کمرے میں آستھا کا ہاتھ تھامے اسے تسلی دے رہا تھا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ڈیئر، بوٹ رائٹ کا شمار بہترین سراغ رسانوں میں ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اسے تلاش کرنے کی ہرممکن کوشش کررہا ہے۔"

"ایکسکیوزمی، مسز البریمنی۔" میں نے کہا۔ "مجھے کارپینٹر سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ میں کارپینٹر کو لے کر پارلر میں آگیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا میں تم سے کچھ سوالات کرسکتا ہوں؟ مجھے اس کیس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے جو اخبارات میں شائع ہوا ہے۔"

"چیف نے مجھے ہر حال میں تم سے تعاون کرنے کی ہدایت کی ہے۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب، کیا تم مجھے اس اغوا کے بارے میں کچھ بتاسکتے ہو؟"

"نہیں، ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق تین دن پہلے جب آستھا صبح ساڑھے سات بجے کے قریب چارلس کے کمرے میں گئی تو اسے بستر پر اپنے بیٹے کے بجائے ایک خط ملا جو چارلس ہی کی تحریر تھی اور اس میں لکھا تھا کہ وہ جلد ہی فیملی سے رابطہ کرے گا۔"

"کیا تم بتاسکتے ہو کہ یہ خط وہاں کیسے پہنچا؟"

"اگر اسے اغوا کیا گیا ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط اغوا کنندہ نے وہاں چھوڑا ہوگا۔"

"یعنی اسے اس کے کمرے سے اغوا کیا گیا؟"

"یہ آستھا کا خیال تھا۔"

"کیا میں وہ کمرا دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور۔"

میں اسے دوسری منزل پر لے گیا جہاں میرے معاون اسکاٹ بیگز نے چارلس کے کمرے کے دروازے کے سامنے پیلا ٹیپ باندھ دیا۔ میں نے اسے ہٹا کر دروازہ کھولا، کارپینٹر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے کی لمبائی سترہ اور چوڑائی پندرہ فٹ تھی۔ اندرونی دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کا بستر تھا جبکہ دوسری دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی الماری بنی ہوئی تھی۔

"کیا کسی نے کمرے کی صفائی کی تھی؟" کارپینٹر نے پوچھا۔

"نہیں، کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا۔"

کارپینٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے کے وسط میں چلا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور ایک چھوٹے دائرے کی شکل میں چکر لگانے لگا۔

"کوئی اشارہ ملا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ چکر لگانے لگا۔ ایک منٹ بعد وہ رک کر بولا۔

"باتھ روم اس طرف ہے؟" اس نے دائیں جانب کی دیوار میں ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اب اس نے اپنے ہاتھ پشت پر سے ہٹا لیے تھے اور باتھ روم کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دیوار میں لگا ہوا دواؤں کا کیبنٹ کھولا اور اس کا غور

سے جائزہ لینے کے بعد دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ پھر وہ سیدھا کھڑکی کی طرف گیا اور اس کے دونوں دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

''کھڑکی کے نیچے قدموں کے نشانات نظر نہیں آ رہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، کسی قسم کی گڑبڑ کے آثار نہیں دکھائی دیے۔''

''مجھے بھی یہی امید تھی۔''

''لگتا ہے کہ تم پہلے سے ایک نظریہ قائم کر کے یہاں آئے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہے اور مجھے شبہ ہے کہ تم بھی پہلے سے ہی ان خطوط پر سوچ رہے ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ چارلس کو اس کمرے سے لے جایا گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم صحیح سوچ رہے ہو۔ کھڑکیاں اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی ہیں اور کھڑکی کے نیچے گھاس پر بھی کوئی نشان نہیں ہے اور جس رات چارلس غائب ہوا تو مرکزی دروازہ بھی نہیں کھولا گیا۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ایک روز پہلے معمول کے مطابق الارم کو آٹھ بجے پر سیٹ کیا گیا تھا اور جب دوسری صبح آستھا کو وہ خط ملا تو اس وقت بھی الارم آن تھا۔''

''اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چارلس اس رات کمرے ہی میں نہ ہو؟'' کارپینٹر نے خیال ظاہر کیا۔

''اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ خط وہاں کیسے پہنچا؟'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب ہم بستر کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اغوا کرنے والا، اپنے شکار کو سوتے سے اٹھانے اور اسے ساتھ لے جانے سے پہلے بستر ٹھیک کرنے کا موقع دے، تم دیکھ رہے ہو کہ اس پر ایک شکن بھی نہیں ہے جیسے اسے استعمال ہی نہ کیا گیا ہو پھر یہاں جوتے بھی نظر آ رہے ہیں۔''

میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ بستر کے نیچے جوتوں کا ایک جوڑا موجود تھا۔ ''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے چارلس کو سوتے سے اٹھایا اور اسے الماری تک جانے کی مہلت دی تاکہ وہ وہاں سے جوتوں کا ایک جوڑا نکال لے جبکہ بستر کے نیچے بھی جوتے رکھے ہوئے تھے۔''

''تمہارا کہنا درست ہے۔'' کارپینٹر بولا۔ ''تمہیں اس کے سر کی چوٹ کے بارے میں علم ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''آستھا نے مجھے اس بارے میں کئی روز پہلے بتایا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا اور ڈاکٹر نے اس کے لیے دوائیں تجویز کی تھیں جب میں نے اس کی دواؤں کا کیبنٹ دیکھا تو وہاں مجھے کوئی دوا نظر نہیں آئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ چارلس اپنے ساتھ دوائیں بھی لے گیا؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور بولا۔ ''فی الحال یہی اشارے مل رہے ہیں آؤ، اس کے گھر والوں سے بات کرتے ہیں۔''

میں نے آستھا اور ٹمینی کو فون کر دیا کہ وہ پارلر میں ہمارے ساتھ گفتگو میں شریک ہو جائیں۔ آستھا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کارپینٹر سے پوچھا۔ ''تم ہمیں کوئی نئی بات بتا سکتے ہو؟''

''ابھی میں اس پر کام کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک یہ معلوم نہ کر لوں کہ چارلس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔''

''اوہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' آستھا بولی۔ ''کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں؟''

''کیا گھر میں کوئی ایسی چیز ہے جو چارلس کے لیے بڑی اہم ہو۔ کوئی ایسی چیز جو طویل عرصے سے اس کے پاس ہو؟''

''مثلاً کپڑے وغیرہ؟'' ٹمینی نے پوچھا۔

''کوئی جیولری۔'' کارپینٹر نے کہا۔ ''کوئی ایسی چیز جو وہ بیشتر وقت پہنتا ہو۔''

''ایک منٹ، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر آستھا چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک دھوپ کا چشمہ تھا۔ اس نے بتایا۔ ''چارلس ہر جگہ یہ لگا کر جایا کرتا تھا۔ اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ہی اسے دھوپ میں نکلنے سے تکلیف ہوتی تھی۔''

میں نے کارپینٹر کی طرف دیکھا۔ جواب میں اس نے بھی مجھ پر ایک نظر ڈالی جس سے اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور وہ یہ کہ اگر چارلس اپنی مرضی سے گیا تھا تو وہ یہ چشمہ کیوں لے کر نہیں گیا۔

کارپینٹر نے جلدی سے وہ چشمہ ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ''براہِ کرم کھڑکی کا پردہ برابر کر دیں۔ باہر سے آنے والی روشنی کی وجہ سے میری توجہ منتشر ہو رہی ہے۔''

ممی نے آگے بڑھ کر پردے کھینچ دیے۔ اب کمرے میں برائے نام روشنی تھی۔ کارپینٹر نے بہ آواز بلند کہا۔

"میں کوئی ڈراما نہیں کر رہا۔ البتہ اس طرح مجھے اشاروں کو محسوس کرنے میں آسانی رہے گی۔ میں سب لوگوں سے یہی کہوں گا کہ وہ بالکل خاموش رہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی ہتھیلی پر چشمہ رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور سانس لینے کے سوا کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ "میں اس چشمے کے ذریعے چارلس کی موجودگی محسوس کرسکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "وہ بہت ہی متحرک شخص ہے۔"

"وہ ہمیشہ سے ہی مضبوط ذہن کا بچہ تھا۔" آستھا نے کہا۔

کارپینٹر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دوبارہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں حال ہی میں ہونے والی گڑبڑ کو بھی محسوس کررہا ہوں۔"

میں نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ کارپینٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "معاملات ایسے نہیں جو کہ نظر آرہے ہیں۔ ہم بہت سی باتوں کے بارے میں نہیں جانتے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ چارلس کو اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا ہے۔"

"کیا؟" ممی حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"پلیز۔" کارپینٹر بولا۔ "ایک منٹ رک جاؤ۔ ہاں، میں یہ بات زیادہ شدت سے محسوس کررہا ہوں۔ اس کی گمشدگی محض ہمارا وہم ہے۔ ہم صحیح سمت میں نہیں دیکھ رہے اور اسی لیے ہمارا فیصلہ مبہم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"مسٹر بوٹ وائٹ۔" آستھا چلاتے ہوئے بولی۔

"وہ کچھ بتانے والا تھا۔"

"وہ تمہیں کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ درحقیقت اس نے ابھی تک کوئی بھی ٹھوس بات نہیں کی۔"

کارپینٹر بالکل خاموش رہا۔ اسے بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آستھا اس کا دفاع کرنے کے لیے کافی ہے۔

"معاف کرنا۔" وہ بولی۔ "تم اس کیس پر تین دن سے کام کررہے ہو۔ اب تک تم نے کیا معلوم کیا؟"

"تمہارے چشمہ دینے سے پہلے میں اور کارپینٹر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چارلس کو اس رات زبردستی نہیں لے جایا گیا۔ البتہ یہ معما بھی حل طلب ہے کہ وہ تحریر وہاں کس نے رکھی۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" ممی نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ وہ اپنے بستر پر نہیں سویا جو بالکل تیار حالت میں تھا اور اس پر ایک شکن بھی نہیں تھی۔ دوسرا نکتہ کہ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور اس رات..... الارم بھی نہیں بجا جس کا مطلب ہے کہ باہر سے کوئی شخص اندر نہیں آیا۔ تیسری بات، اس کے بستر کے نیچے جوتوں کا ایک جوڑا ملا ہے اگر اسے کمرے سے اغوا کیا جاتا تو یہ جوتے اس کے پیروں میں ہونے چاہیے تھے۔ چوتھی بات، اس کے کیبنٹ سے دوائیں غائب ہیں اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کوئی معمول کا اغوا نہیں تھا اگر چارلس غائب ہے تو اس میں کوئی فاؤل ہے۔ ہوا یا نہیں لیکن یہ طے ہے کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا۔"

آستھا اور ممی نے مڑ کر کارپینٹر کی طرف دیکھا۔ ان کے تاثرات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے چرب زبانی کے لیے مورد الزام ٹھہرانا چاہ رہے تھے یا انہیں امید تھی کہ وہ کوئی ایسا ثبوت پیش کرے جس کے ذریعے اس پر ان کا اعتماد بحال ہوسکے۔ کارپینٹر ابھی تک ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔ اس نے سامنے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کچھ خفیہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔"

پھر وہ کھڑا ہوگیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پارلر سے باہر نکل گیا۔ "یہ کیا کررہا ہے؟" ممی نے پوچھا۔

"چہل قدمی۔" میں نے کہا اور کارپینٹر کے پیچھے چل دیا۔ وہ کچن کو جانے والی راہداری پر جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ چشمے کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ آستھا اور ممی بھی میرے پیچھے چلے آئے۔ کارپینٹر کچن کے دروازے پر جا کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"یہاں بہت کمزور اشارے مل رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

پھر وہ راہداری میں آگیا۔ پارلر کے بالمقابل لائبریری تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے دونوں کمروں کے درمیان کھڑا چشمے کو مختلف سمت میں گھماتا رہا پھر لائبریری کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "یہاں زیادہ مضبوط اشارے مل رہے ہیں۔"

ہم اس کے پیچھے لائبریری میں چلے گئے۔ یہ ایک

بہت بڑا کمرا تھا اور غالباً اس کا رقبہ تین سو مربع فٹ ہوگا، اس کے وسط میں ایک بڑا سا فانوس لٹک رہا تھا اور فرش سے چھت تک دیواروں کے ساتھ بک شیلف بنے ہوئے تھے جن میں ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ کتابیں ہوں گی۔''

''ہاں۔'' کارپینٹر نے کہا۔ ''وہ یہیں ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''گڑبڑ کی بنیاد۔''

اس نے چشمہ مجھے پکڑا دیا اور اپنے ہاتھ اس طرح پھیلا دیے جیسے کوئی دعا مانگ رہا ہو۔ پھر وہ اس اندرونی دیوار کی طرف بڑھا جو لائبریری کو کچن سے الگ کرتی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آگے پیچھے ہلانے لگا پھر بولا۔

''یہاں سب سے زیادہ توانا اشارے مل رہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی ٹارچ ہے بوائے؟''

میرے پاس ٹارچ نہیں تھی لیکن ممی نے اسے کچن سے لا کر ٹارچ پکڑا دی۔ اس نے دیواروں اور چھت پر روشنی ڈالی اور اسے وہ چیز نظر آگئی جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے اخروٹ کے تختے کے درمیان ایک جگہ کو دبایا تو وہ نمایاں ہوگئی۔ کسی نے وہاں اس مہارت سے تختہ لگایا تھا کہ غور سے دیکھنے پر بھی نظر نہ آتا۔ کارپینٹر نے اپنی انگلی سوراخ میں ڈالی اور اسے دائیں بائیں گھمانے لگا۔ تختہ ایک طرف سے ہٹ گیا اور اندر مٹی کی تہ نظر آنے لگی۔

''یہ کیا ہے؟'' ممی چلایا۔

''او میرے خدا۔'' آستھا بولی۔

میں آگے بڑھا اور کارپینٹر کے ہاتھ سے ٹارچ لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو یہ کوئی راستہ معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے سوراخ میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا پھر آہستہ آہستہ تختے کو اندر کی جانب گھمانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اتنی جگہ بن گئی کہ کوئی شخص جھک کر اندر جا سکے۔ میں نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ ابھی کوئی شخص اندر جانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے بعد میں لائبریری سے باہر راہداری میں آگیا۔ مجھے ہال کے وسط میں ایک الماری نظر آئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو اس میں صفائی کا سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ الماری دو سے تین فٹ گہری تھی اور اس کا فاصلہ لائبریری کے دروازے سے اتنا ہی تھا جتنا کہ لائبریری کی اندرونی دیوار کا۔

میں دوبارہ اس خفیہ خانے کی طرف گیا اور اس میں اپنا سر ڈال دیا تا کہ اندر کی جگہ دیکھ سکوں۔ وہ خلا چار سے پانچ فٹ اونچا تھا لیکن مجھے دو فٹ کے فاصلے پر وہ سیڑھیاں صاف نظر آرہی تھیں جو الماری اور راہداری کے نیچے جارہی تھیں۔ اگر میں اندر چلا جاتا تو کچے فرش پر میرے قدموں کے نشانات بھی بن جاتے۔

''سب لوگ لائبریری سے باہر چلے جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''میری نظر میں یہ بھی جائے وقوعہ ہے اور مجھے اس کا معائنہ کرنے کے لیے لیبارٹری کے لوگوں کو بلانا ہوگا۔''

میں گھر کے باہر پورچ میں کھڑا ان لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کا ٹرک پہنچ گیا۔ ''پہلے ہم نے کچھ چیزوں کو نظرانداز کر دیا تھا۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ہم نے لائبریری کی دیوار کے پیچھے ایک خفیہ جگہ تلاش کی ہے اور وہاں تازہ قدموں کے نشانات ہیں۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

میں نے انہیں وہ جگہ دکھائی اور بتایا کہ کس طرح یہ تختہ دریافت ہوا۔ اس کے بعد میں نے انہیں وہیں چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنا کام کر سکیں اور خود پارلر میں واپس آگیا۔ آستھا وہاں صدمے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی اور ممی اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔

آستھا نے کارپینٹر کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں آکر مجھے اشارے ملنے لگے۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔۔۔ صرف میرے تصور نے رہنمائی کی۔''

''کتنی حیرت انگیز بات ہے۔'' آستھا نے کہا۔ ''قدرت نے تمہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔''

''اس معاملے میں دخل اندازی کرنا پسند نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم سے چند سوالات کرنا ضروری ہیں۔ مسز البر ممی کیا تمہیں پہلے سے اس تختے یا خفیہ خانے کے بارے میں معلوم نہیں تھا؟''

''نہیں۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے صرف تیس سال ہوئے ہیں۔ البتہ میرے شوہر نے ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔''

''میرے لیے بھی یہ ایک خبر ہے۔'' ممی نے کہا۔ ''میں یہیں پلا بڑھا لیکن کسی نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔''

''اس کا مطلب یہ کہ تمہارے بیٹے کو بھی اس کا علم نہیں ہوگا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔'' ممی

نے کہا۔

''یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''کارپینٹر کا کہنا ہے کہ اس نے چارلس کے چشمے سے اشارے وصول کیے اور ان کی مدد سے وہ لائبریری تک پہنچ گیا۔ اگر چارلس پہلے کبھی اس چیمبر میں نہیں گیا تو اس چشمے سے کس طرح اشارے مل سکتے تھے؟''

میری بات سن کر سب نے کارپینٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل پُرسکون نظر آرہا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ یہ سنسنی خیزی کہاں سے آگئی۔ کسی بھی گھر میں تصادم کے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ گھر جتنا پرانا ہوگا، اس میں اتنے ہی زیادہ تنازعات ہوں گے اور ہر تنازعہ ناخوش گوار تاثر پیش کرتا ہے۔''

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں چلاتے ہوئے بولا۔ ''بہت ہو چکی، اب بس کرو۔''

''مسٹر بوائے۔'' آستھا نے ناگواری کے انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کارپینٹر دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''سراغ رساں بوٹ رائٹ کا شبہ بالکل جائز ہے۔ وہ ایک اچھے پولیس مین کی طرح حقائق اور اعداد و شمار کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ چارلس کے چشمے سے کچھ معلوم کر سکوں گا لیکن اس عمل کے دوران میں کسی اور جانب چلا گیا اور اس کے نتیجے میں یہ خفیہ خانہ ہاتھ آ گیا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے خیال میں یہ خفیہ کمرا کس کام کے لیے استعمال ہوتا ہوگا؟'' کارپینٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ لائبریری میں بیٹھے لوگوں کی جاسوسی کی جائے یا گھر سے چوری چھپے جانے کے لیے اسے استعمال کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مکان کا نقشہ تمہارے دادا کی مرضی سے بنا ہوگا مسٹر البرٹ مینی۔''

''یہ درست ہے۔''

''اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ کسی کے علم میں لائے بغیر اس خفیہ کمرے کو استعمال کرنا چاہتا ہوگا۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس چیمبر میں واقع سیڑھیاں کہاں جاتی ہیں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ تہ خانے تک جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔''

''ہمارے یہاں کوئی تہ خانہ نہیں ہے۔'' مینی نے کہا۔

''ممکن ہے کہ تمہیں اس کا پتا نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک گھنٹا پہلے تک اس چیمبر کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے۔''

''یہ سیڑھیاں کہیں بھی جا رہی ہوں۔'' کارپینٹر نے کہا۔ ''ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ تمہارے دادا نے کسی خاص مقصد کے لیے یہ سیڑھیاں بنوائی تھیں۔''

''تم جانتے ہو۔'' مینی نے کہا۔ ''دادا جان کبھی کبھی کسی کو بتائے بغیر گھر سے باہر جانا چاہتے ہوں گے۔ میرے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ وہ عورتوں کے رسیا تھے۔''

''اوہ میرے خدا! میں یہ سب سننے کے لیے یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔'' آستھا نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں بھی تازہ ہوا میں سانس لینے کی غرض سے باہر گیا تو رپورٹروں نے مجھے گھیر لیا۔ لیلیٰ ان کی سربراہی کر رہی تھی۔ میں نے انہیں سوال کرنے کا موقع دینے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''فی الحال میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہم نے مکان کے اندر معلومات کا ایک نیا ذریعہ دریافت کیا ہے۔ ابھی تک اغوا کنندہ نے رابطہ نہیں کیا ہے لیکن ہم اس نئے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بس۔ اس سے زیادہ بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''کیا اس ذریعے کو دریافت کرنے میں کارپینٹر کا کوئی کردار ہے؟'' لیلیٰ نے پوچھا۔

''فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ کچھ کھانے کے لیے قریبی ریستوران میں چلے جائیں، ممکن ہے کہ تھوڑی دیر بعد میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کوئی نئی بات ہو۔''

وہ مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے لیکن میں نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔ مجبوراً انہیں مایوس ہو کر جانا پڑا۔

مجھے شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن میرے ڈاکٹر نے دو سال پہلے سگریٹ چھڑوا دی تھی اور اب میں دوبارہ اس راستے پر نہیں چلنا چاہتا تھا چنانچہ میں پورچ کی ریلنگ پر جھک کر گہرے سانس لینے لگا۔ اچانک میری نظر کارپینٹر کی کار پر گئی اور مجھے اس کی پچھلی سیٹ پر کوئی

چیز رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں کار کے قریب پہنچا اور اندر جھانکا۔ وہاں رول کیا ہوا ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا۔

☆☆☆

کئی منٹ بعد مجھے لیبارٹری والوں نے اندر بلایا۔ ہیڈ میکنیشن کا نام بوائلز تھا اور وہ اپنے کام میں کافی تیز واقع ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''ہم نے پیروں کے نشان محفوظ کر لیے ہیں۔ اس لیے اب تم اندر جا سکتے ہو لیکن اس میں اندر ایک اور محراب ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

وہ مجھے ایک خفیہ دروازے سے اندر لے گیا اور مجھے ٹارچ تھمادی۔ ہم سیڑھیوں سے اتر کر نیچے گئے۔ اس کی تہ میں ایک محراب نما سرنگ تھی جس کے چاروں طرف اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں سے بمشکل دو آدمی بیک وقت گزر سکتے تھے۔ سرنگ کی چھت میں بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر ناکارہ ہو چکے تھے۔

''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کچھ بلب جنگِ عظیم دوم کے زمانے کے ہیں۔'' بوائلز بولا۔ ''یہ سرنگ حالیہ دنوں میں زیادہ استعمال نہیں ہوئی۔ ہم نے پہلی بار یہاں سے گزرتے ہوئے زیادہ تر مکڑی کے جالے صاف کر دیے تھے۔ یہ دیکھو۔''

''یہ تو قدموں کے نشان ہیں اور بالکل تازہ معلوم ہو رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس راستے کی لمبائی دو سے تین سو فٹ تھی، سرنگ کے اختتام پر ایک مضبوط لکڑی کا دروازہ لگا ہوا تھا جس میں لوہے کی بھاری کنڈی نصب تھی اور اس کے ساتھ ہی اینٹوں کے فرش پر ایک پرانا تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو ہلکا سے دھکا دیا تو وہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

''یہ اسپرنگ ہاؤس ہے۔'' اس نے ٹارچ کے ذریعے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں ایک فارم پر پلی بڑھی تھی اور میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ ان کمروں کا فرش ٹھنڈا ہوتا ہے اور اس کے لیے بیس فٹ گہرائی میں پانی کا تالاب بنایا جاتا ہے۔ لوگ ان کمروں کو ریفریجریٹر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دادی مکھن بنا کر اسپرنگ ہاؤس میں ہی رکھا کرتی تھیں تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر میری نظر ایک دوسرے دروازے پر گئی۔

''شاید یہ باہر جانے کا راستہ ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں بھی پہلی بار یہاں آیا ہوں، آؤ دیکھتے ہیں۔''

بوائلز نے اسے دھکا دیا تو وہ ایک چیخ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گرم ہوا کا جھونکا آیا اور ہم نے سورج کی روشنی میں ایک بے ہوش شخص کو فرش پر لیٹے دیکھا۔ وہ چارلس البرٹمینی تھا اور کارپینٹر اس پر جھکا ہوا تھا۔

''اس کی نبض چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بچ جائے گا۔''

میں نے دو مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ''کارپینٹر! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارا انتظار۔'' اس نے کہا۔ ''میں بیرونی دروازے سے اندر آیا تھا۔''

''اب یہ مت کہنا کہ تمہیں یہاں بھی کوئی اشارہ ملا تھا۔''

''مجھے معلوم تھا کہ تم سے یہیں ملاقات ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ہم ایمبولینس بلالیں۔ چارلس کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔''

ایک گھنٹے بعد چارلس کو اسپتال بھیج دیا گیا اور ہم سب دوبارہ لائبریری میں بیٹھ گئے۔ آستھا مسلسل رو رہی تھی اور رومال سے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔ ''میں تمہارا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔'' اس نے کارپینٹر سے کہا اور مجھے بالکل ہی نظرانداز کر دیا۔

''ہم بہت خوش قسمت ہیں۔'' کارپینٹر نے اسے بتایا۔ ''یہ میرا اندازہ ہے کہ چارلس سرنگ میں داخل ہوا تو اسے دماغی دورہ پڑا، اور وہ چکرا کر گر گیا۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ درمیان میں وقفے وقفے سے وہ ہوش میں آتا رہا لیکن پھر بے ہوشی غالب آجاتی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے گہری چوٹ آئی ہے لیکن وہ بچ جائے گا۔''

''ایک منٹ میری بات سنو۔'' میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔'' وہ مسز البرٹمینی سے معذرت کر کے میرے ساتھ باہر آگیا اور بولا۔ ''تم کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''تمہیں تو نفسیاتی ماہر ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''بالکل، وہ تو میں ہوں لیکن پہلے تم اسے پڑھ لو۔ یہ مجھے سرنگ میں چارلس کے پاس سے ملا تھا۔''
اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر رسالوں سے الفاظ کاٹ کر ایک پیغام ترتیب دیا گیا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس میں پانچ لاکھ ڈالر کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ورنہ وہ چارلس کو زندہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ گویا اغوا ہونے کا ڈراما اس نے خود ہی رچایا تھا۔

''یہ بات مجھے صبح ہی معلوم ہوگئی تھی جب تم میرے پاس آئے تھے اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ وہ شخص پارکر کاؤنٹی میں رہتا ہے اور اس کی گزر اوقات کھیلوں پر شرطیں لگا کر ہوتی ہے۔''

''دوسرے الفاظ میں ہم اسے بکی کہہ سکتے ہیں۔''

''میرا یہی مطلب تھا، اس کے علاوہ بھی میرے کچھ لوگوں سے تعلقات ہیں جن تک تمہاری رسائی نہیں۔ ان میں ایک نوجوان عورت بھی ہے جس کے ساتھ چارلس چند ماہ پہلے تک ڈیٹنگ کرتا رہا ہے۔ اس نے مجھے چارلس کے بارے میں چند تکلیف دہ باتیں بتائیں۔ یہ بکی بھی اس کا شناسا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چارلس کو ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے کیونکہ وہ کئی مرتبہ شرطیں ہار چکا ہے۔''

''لیکن پانچ لاکھ ڈالر تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''اس فیملی کے لیے یہ کچھ بھی نہیں لیکن وہ اپنے باپ سے یہ رقم نہیں مانگ سکتا تھا۔ اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس بکی نے مجھے بتایا کہ چارلس کئی دنوں سے بہت پریشان تھا اور سر کی چوٹ کی وجہ سے اس کی قوتِ فیصلہ متاثر ہو چکی تھی۔ اپنے اغوا کا ڈراما اس کی ایک مثال ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ سرنگ کے دروازے میں اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔''

''نہیں، اس کا تالا زمین پر پڑا ہوا تھا۔''

''جبکہ باہر جانے والا دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ شاید چارلس کو یہ بات معلوم نہیں تھی یا اپنی ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر وہ اسے بھول گیا۔ بہرحال اس نے وہ تحریر بستر پر چھوڑی اور لائبریری کی دیوار میں لگا ہوا تختہ ہٹا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ سرنگ کے راستے باہر نکل جائے گا۔ وہ پہلے ہی اس مجرمانہ فعل کی وجہ سے شدید دباؤ کا شکار تھا اور اسی وجہ سے اس کے دماغ پر زور پڑا، اور

وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ اسپرنگ ہاؤس کے باہر تین دن تک پڑا رہا اگر اندر رہتا تو اس کا بچنا مشکل تھا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے چارلس کو سرنگ میں تلاش کر لیا ہے اور تم کس طرح بیرونی دروازے تک پہنچے؟''

''اس کے لیے تھوڑا سا دماغ استعمال کرنا پڑا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس سرنگ کو کہیں نہ کہیں ختم ہونا تھا اور مجھے امید تھی کہ اس کے اختتام پر باہر نکلنے کا دروازہ بھی ہوگا۔ چنانچہ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر مکان کے عقبی حصے میں پہنچا۔ وہاں مجھے دروازے پر باہر کی طرف سے ایک تالا لگا ہوا نظر آیا جس کا مطلب تھا کہ چارلس ابھی تک اندر ہے چنانچہ میں نے وہ تالا توڑ دیا اور تمہارے پہنچنے سے چند سیکنڈ پہلے اندر داخل ہو گیا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' آستھا تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ ''میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ اگر تمہیں نہ بلاتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ تم نے مصیبت کی گھڑی میں ہماری بہت زیادہ مدد کی ہے۔''

اس نے آستھا کا ہاتھ تھپتھپایا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے گاڑی میں سوار ہو کر پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی اور تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا۔

''تمہیں اس کی تلاش ہے؟'' میں نے وہ کاغذ لہراتے ہوئے کہا جو اس کی گاڑی کی سیٹ سے اٹھایا تھا۔

''ہاں۔'' وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے وہ کاغذ اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ''تم بہت شاطر انسان ہو۔ صبح مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کوئی کلائنٹ تم سے ملنے آ رہا ہے جبکہ تمہیں صرف بکی سے ملنے اور ریکارڈ آفس جانے کے لیے وقت درکار تھا جہاں سے تم نے بگ ہاؤس کے نقشے کی کاپی حاصل کی۔''

''تم نے یہ بھی دیکھ لیا؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، ممکن ہے کہ ممی اور آستھا کو خفیہ پینل اور چیمبر کا علم نہ ہو لیکن نقشے میں ان کی موجودگی ظاہر کی گئی ہے۔''

''اسی لیے میں نے اس کا نوٹس لیا۔''

''اور وہ اشاروں والی کہانی کیا تھی؟''

''یہ سب کاروباری ہتھکنڈے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ آستھا اور ممی کتنے متاثر نظر آ رہے تھے۔ اب میں جاؤں؟''

''اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ اعتراف کر لو کہ تم دھوکے باز ہو۔ اس سرنگ کے بارے میں جاننے کے باوجود تم نے اشاروں کا ناٹک رچایا اور ظاہر کیا کہ تمہارے علاوہ کوئی بھی وہ سب کچھ محسوس نہیں کر سکتا اور صرف تم ہی یہ معجزہ دکھا سکتے ہو۔ اس طرح تم نے آستھا سے بھاری فیس وصول کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔''

''تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ہمیشہ جزئیات پر دھیان دیتا ہوں جنہیں عام طور پر پولیس اور سراغ رساں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر میں بکی سے نہ ملتا تو ہم کبھی بھی چارلس کے خودساختہ ڈرامے کے بارے میں نہ جان پاتے۔ اس کے بعد میرے لیے ریکارڈ آفس جانا ضروری ہو گیا تھا اور وہاں سے حاصل کردہ نقشے سے ہی مجھے اس پینل کا سراغ ملا۔ تمہیں تو میرا شکرگزار ہونا چاہیے کہ میں نے اس کیس کو حل کرنے میں تمہاری مدد کی اور اس کا سہرا تمہارے سر ہی جائے گا۔ مجھے تو صرف اپنی فیس سے غرض ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم پر..... تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح میری کارکردگی کی تعریف کرو گے کہ کس طرح میں نے وہ خفیہ راستہ تلاش کیا۔''

میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی وہ بہت شاطر اور ذہین انسان ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کا فن اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتنی معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ضروری نہیں، چارلس کو اغوا کیا گیا ہے۔ وہ خود بھی کہیں غائب ہو سکتا ہے اگر اس پہلو پر غور کر لیتا تو چارلس تک پہنچنا آسان ہو جاتا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ میں پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت کارپیٹر کی تعریف نہیں کر سکتا لیکن دل ہی دل میں اس کا شکرگزار رہوں گا۔ وہ پیشہ ور سراغ رساں نہیں لیکن اپنی نام نہاد روحانی طاقت کے بل بوتے پر معجزہ دکھانا جانتا ہے۔

سرورق کی پہلی کہانی

سنگزن

اے آر بھٹی

تکون... دوستوں کی ہو... یا دشمنوں کی... کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور کھڑا کرتی ہے... تین ایسے ہی افراد کا دوستانہ... لوگ ان کی دوستی کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھتے تھے... محبت کرنے والوں کی خواہش تھی کہ وہ اس تکون کا حصہ بن جائے... حسد اور جلن کا شکار چاہتے تھے کہ یہ زنجیر ٹوٹ جائے... خیر خواہ ناکام اور دشمن اپنی سازش میں کامیاب ٹھہرے... شش و پنج اور کشمکش کو گھٹاتی اور تشنگی کو بڑھاتی تحریر کے اسرار و رموز...

وجودِ زن سے رونما ہونے والے فتنے کا خونی شاخسانہ

حارث بیگ ابھی غسل کر کے واش روم سے نکلا ہی تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جسم پر صرف ایک تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ فون قریب ہی رکھا تھا، اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''سس... سر... ایک بری خبر ہے۔''

''فضول بکواس... آگے بولو۔'' حارث ہونٹ سکیڑ کر بیزاری سے بولا۔ وہ اپنے اس نوآموز اسسٹنٹ سے

سخت عاجز تھا۔
''سر جی... ساؤتھ سی کے مقام پر ایک نوجوان کی لاش ملی ہے۔''
''تم نے چاروں کونوں کی حد بندی کروادی ہے؟'' انسپکٹر حارث بیگ نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔
''جی سر، لاش کے گرد تین کونوں کی میں نے حد بندی کروادی ہے۔''
''تین کونوں کی؟'' انسپکٹر حارث الجھ گیا۔
''جی سر۔'' دوسری جانب سے تیمور نے کہا۔ ''چوتھی سمت ممکن نہ تھا، اس طرف سمندر ہے۔''
''ایڈیٹ۔'' حارث نے دانت پیس کر اسے ڈپٹا۔
''میں ابھی وہاں پہنچتا ہوں، تم وہیں رہو۔'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔
صبح کے سات بجے کا وقت تھا۔ وہ ویسے بھی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس اطلاع کے بعد اس کی تیاری میں ذرا تیزی آگئی تھی۔ ناشتا کرنے کا اب وقت نہ تھا۔ تاہم وہ صرف ایک کپ چائے اور ایک عدد توس پر ہی اکتفا کرنے کی غرض سے کچن میں داخل ہوا جہاں اس کا فربہی مائل خانساماں جو اپنے آپ کو مُنّا بھائی ایم بی بی ایف (میٹرک بار بار فیل) کہلوانا پسند کرتا تھا، وہ ابھی ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا۔ تاہم اس کے ہاتھ میں رول کیے ہوئے موٹے پراٹھے میں ڈبل ہاف فرائی انڈا دبا ہوا تھا اور ناشتا بنانے کے ساتھ ساتھ وہ موٹے رول کا بائٹ معدے میں اتارنے میں مصروف تھا۔
صاحب کی اچانک کچن میں دراندازی اسے ایک آنکھ نہ بھائی کیونکہ صاحب کو ناشتا دینے سے پہلے خود ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے کا جرم پکڑا گیا تھا۔ وہ جھینپ کر بولا۔
''وہ... صاحب جی... دراصل مجھے بھوک لگی تھی، سوچا ہلکا پھلکا منہ بھی مارتا چلوں۔''
''ضرور۔'' انسپکٹر حارث نے کہا پھر فلاسک میں رکھی چائے کو کپ میں انڈیلا، ٹوسٹر سے ہلکا سنکا ہوا ٹوسٹ نکالا اور جلدی جلدی اسے ختم کر کے کچن سے باہر نکلا۔
اس کے عقب میں مُنّا بھائی ایم بی بی ایف ''صاحب جی... صاحب جی!'' پکارتا ہوا لپکا مگر تب تک انسپکٹر حارث باہر نکل کر اپنی جیپ پر سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کر کے جا چکا تھا۔

☆☆☆

ساؤتھ سی ساحلِ سمندر کا وہ حصہ تھا جو عام فہم میں لونگ اسپاٹ کہلاتا تھا۔ رات گئے تک خوش فکر جوڑے ساحلی ریت پر ٹہلتے یا پھر سمندر کی جلترنگ موجوں کے شور سے ذرا دور نکیلے پتھروں پر بیٹھ کر محبت کی پینگیں بڑھاتے یا پھر مستقبل کے بارے میں سہانے منصوبے بناتے تھے۔ یہاں چند ماڈرن طرز کے اوپن ائر ریسٹورنٹ بھی تھے۔
انسپکٹر حارث جائے واردات پر پہنچا۔ وہاں پولیس کی ایک پرانے ماڈل کی جیپ بھی کھڑی تھی۔ صبح کا وقت تھا لوگ کم ہی تھے مگر لاش کے قریب زیادہ تر وہ لوگ جمع تھے جن کا تعلق یا تو ریسٹورنٹ سے تھا یا پھر وہ لوگ جن کی پُرشکوہ رہائش گاہیں ساحلِ سمندر کے قریب واقع تھیں اور وہ صبح خیزی کے لیے وہاں آتے رہتے تھے۔
حارث کا اسسٹنٹ تیمور اپنے دبلے پتلے وجود کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی کھڑا تھا اور تیمور اپنا لبوترا منہ گویا اس شخص کے کان میں گھسائے اس کا سر کھانے کے انداز میں باتیں کر رہا تھا جبکہ وہ شخص بے چارہ بری طرح بیزار اور پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کے جسم پر ویٹروں والی مخصوص وردی تھی۔
انسپکٹر حارث کی جیپ پر نظر پڑتے ہی تیمور نے اپنے ساتھ کھڑے اس ویٹر کو بازو سے پکڑا اور تیزی کے ساتھ جیپ سے اترتے حارث کی طرف بڑھا جیسے اس نے قاتل کو پکڑ لیا ہو۔
''سر! یہی ہے وہ شخص۔'' تیمور نے قریب پہنچ کر سیلوٹ کرنے کے بعد پُرجوش لہجے میں کہا تو بے اختیار انسپکٹر حارث کے منہ سے نکلا۔ ''کون... قاتل؟''
''نن... نہیں سر۔'' تیمور جلدی سے ہونقوں کی طرح بولا۔ ''یہ گل فشاں ریسٹورنٹ کا ویٹر مرلی دھر ہے۔ لاش نے اسے دریافت کیا تھا... م... میرا مطلب ہے لاش کو سب سے پہلے اسی نے دریافت کیا تھا۔'' اس کی بات سن کر انسپکٹر حارث نے پُرخشونت نظروں سے اپنے اسسٹنٹ کو گھورا اور جھڑکنے کے انداز میں بولا۔
''اس کا بازو چھوڑو۔'' اور تیمور نے اس طرح جلدی سے ویٹر مرلی کا بازو چھوڑا جیسے تھوڑی دیر مزید پکڑے رکھتا تو اسے کرنٹ لگ جاتا۔
انسپکٹر حارث نے ویٹر مرلی سے کہا۔ ''تم ابھی ذرا ادھر ہی رکو۔'' اس کے بعد وہ تیمور کے ساتھ لاش کی طرف بڑھ گیا۔ لاش کے تین اطراف قریباً بیس فٹ کے فاصلے سے سرخ ربن کی حد بندی کردی گئی تھی۔ جس کے باہر مذکورہ لوگ ہراساں چہرے لیے کھڑے آپس میں چہ میگوئیاں

میں مصروف تھے۔ چوتھی سمت شور مچاتی موجیں ساحل پر سر پٹخ رہی تھیں۔ انسپکٹر حارث لاش کے قریب پہنچا اور اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ بہ غور لاش کا معائنہ کررہا تھا۔

لاش... گیلے پتھروں کے قریب ریت پر پڑی تھی۔ وہ ایک خوبرو نوجوان کی لاش تھی۔ جس نے شوخ سی شرٹ اور ٹائٹ نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ رنگ گورا تھا۔ اس کی پیشانی اور کنپٹی کے قریب خون بہہ کر جم چکا تھا اور گیلی ریت میں جذب ہو کر سیاہ نظر آنے لگا تھا۔

حارث اس بدنصیب نوجوان مقتول کی عمر کا اندازہ بیس بائیس کے درمیان ہی لگا سکا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے دستانے نکال کر اپنے ہاتھوں پر چڑھائے اور بہت قریب سے وہ زخم کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔

زخم گہرا تھا اور کسی کند یا سخت نکیلی شے کے وار کا نتیجہ تھا کیونکہ زخم کا سائز اینڈ شیپ مخروطی تھا۔ حارث کے ذہن میں فوراً کسی بڑے اور نکیلے پتھر کا خیال ابھرا پھر جلد ہی اس کی متلاشی نظروں نے لاش کے قریب ایک بڑا سا نکیلا پتھر دیکھ لیا۔

اسے اٹھا کر حارث بہ غور اس کا معائنہ کرنے لگا تو اس کی باریک بین نظروں نے پتھروں کی کھردری سطح پر جمے ہوئے سیاہی مائل خون کا دھبا دیکھ لیا تھا گویا آلۂ قتل بھی جائے وقوعہ پر پڑا مل گیا تھا۔

یوں حارث کے مطابق قتل کا یہ کیس حل ہوا ہی چاہتا تھا تاہم یہ سوچنے کے بعد ایک اور بات بھی اس کی نگاہ میں تھی جو اس کے تجربے پر مبنی تھی کہ جو کیس جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے بعد میں وہ اسی قدر مشکل اور بسا اوقات ناممکن حد تک لاینحل بھی ثابت ہوتا تھا۔

انسپکٹر حارث نے سوچا محض ایک پتھر کے وار سے نوجوان نہیں مرسکتا تاہم یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ پتھر کی ضرب شدید سے نوجوان بے ہوش ہو کے گر پڑا اور ساری رات گہرے زخم سے خون رستے رہنے کے باعث اس کی موت واقع ہوگئی ہو۔ تاہم اس نے فوری طور پر تو دو اندازے قائم کرلیے تھے۔

پہلا یہ کہ بدنصیب نوجوان کا قتل رات یا ڈھلتی شام کے وقت ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس قتل میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا دخل کم ہی نظر آتا تھا بلکہ یہ کسی فوری اشتعال کے باعث نامعلوم قاتل کے ہاتھ جو لگا اسے بروئے کار لاتے ہوئے اس نے قتل کر ڈالا۔ بہ صورت دیگر خنجر یا پستول کا استعمال ہوتا بہرطور ان دونوں باتوں پر زیادہ انحصار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ایک تیسرا اندازہ بھی ذہن میں آتا تھا کہ دو دوستوں کے درمیان اچانک کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی ہو۔ باوجود اس کے ایک الجھن یہ تھی کہ یہاں زیادہ تر کپلز ہی آیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کوئی لڑکی اپنے محبوب کو تو قتل نہیں کرسکتی تھی۔

چوتھا خیال جو سب سے آخر میں انسپکٹر حارث کے ذہن میں ابھرا تھا جو حقیقی اندازوں کے قریب ترین بھی معلوم ہوتا تھا کہ شاید بدنصیب مقتول اپنی محبوبہ کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا اور رقیب نما قاتل وہاں آن پہنچا ہو۔ یہ سب وہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے اس پر حملہ کردیا۔ اس کے ہاتھ پتھر لگا جو اس نے مقتول کو دے مارا۔ یوں اشتعال انگیزی کا یہ تماشا خون رنگ لڑکے کا محبوب کی جان لینے پر منتج ہوا ہو۔

انسپکٹر حارث نے اپنے تمام تر اندازوں کا نچوڑ یہ نکالا کہ اس نوجوان کے قتل کی ٹھوس اور عینی گواہ شاید وہ لڑکی تھی جو مقتول کی یقیناً محبوبہ تھی اگر اس تک پہنچا جاسکے تو یہ کیس چٹکی بجاتے ہی حل ہوسکتا تھا یا پھر سرے سے یہ سارا چکر عاشقی معشوقی کا ہی نہ ہو۔

ممبا دیوی کے اس شہر خرابہ کی کھلنڈری فضاؤں میں ایسے کیسز عام بھی تھے۔ لونگ اسپاٹ ہونے کی وجہ سے علاقہ ساؤتھ سی میں لڑکی کے معاملے میں آئے دن اسپاٹ جھگڑے اور مارا ماری بسا اوقات قتل تک جا پہنچتی تھی۔

"سر جی! یہ قتل کس نے کیا ہے؟" قریب کافی دیر سے خاموش کھڑے ہو... اسسٹنٹ تیمور نے سوال کر ڈالا یا پھر اس نے اپنے قابل افسر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ خیالوں کے گھوڑے دوڑاتا قاتل تک جا پہنچا ہے بہرحال اس کے سوال پر انسپکٹر حارث ایک گہری سانس خارج کرتا اٹھ کھڑا ہوا اور تیمور کے اس احمقانہ سوال پر بڑے سکون سے بولا۔

"اس کا قتل کسی انسان نے کیا ہے؟"

"اچھا سر۔" تیمور توصیفی لہجے میں بولا۔ "واہ سر جی! آپ تو سمجھو قاتل تک پہنچ ہی گئے۔"

"ہاں... بس ذرا اسے تلاش کرنے کی دیر ہے۔" حارث نے اس بار اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑے پتھر کو ایک انگلی اور انگوٹھے کے ملاپ سے تھام کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں مزید بولا۔

''اسے نہایت احتیاط کے ساتھ صاف تھیلی میں ڈال دو، کہیں میں اسے تمہاری خالی کھوپڑی تک زحمت نہ دے دوں اور پھر مجھے یقیناً تمہاری کھوپڑی چٹخنے سے کہیں زیادہ اس پتھر کے ٹوٹنے کا افسوس ہوگا۔''

تیمور نے احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹا کر پتھر لیا اور فوراً ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال دیا۔ اسے اب لیبارٹری، تجزیے کے لیے بھیجنا تھا۔

لاش کے لباس سے مقتول نوجوان کا پاکٹ سائز پرس اور ایک رومال برآمد ہوا تھا۔ پرس میں پیسوں کے علاوہ ایک مقامی کالج کا کارڈ بھی تھا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم اور اس کے ورثا کی تلاش وغیرہ کا حکم صادر کرنے کے بعد حارث اپنی جیپ میں پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اس کے ہمراہ گل فشاں ریسٹورنٹ کا ویٹر مرلی دھر بھی تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' وہاں پہنچتے ہی حارث نے لاش دریافت کرنے والے ویٹر سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔

''مرلی دھر۔''

''باپ کا نام؟''

''بنسی دھر۔''

''کام؟''

''ویٹر ہوں۔''

''کہاں اور کون سے ریسٹورنٹ میں؟''

''ساؤتھ سی میں، گل فشاں ریسٹورنٹ۔''

''لاش صبح کتنے بجے تم نے دیکھی تھی؟ سوچ کے صحیح وقت بتانا؟'' یہ سوال کر کے حارث نے اپنی نظریں مرلی دھر کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا تاہم سوالوں کے جوابات پوری روانی اور اطمینان کے ساتھ دے رہا تھا۔

''صبح ساڑھے چھ بجے۔''

''میرے اندازے کے مطابق جس جگہ تم نے اس نوجوان کی لاش دیکھی تھی وہ تمہارے گل فشاں ریسٹورنٹ سے تقریباً ساٹھ گز کی دوری پر موجود تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اپنے ریسٹورنٹ سے نکل کر تم اتنی دور تک صبح ساڑھے چھ بجے کون سے گاہک کو سرو کرنے کے لیے وہاں گئے تھے؟''

''میں نے کسی گاہک کا ذکر تو نہیں کیا جناب۔''

''پھر... تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟''

''میں ریسٹورنٹ کا کچھ کوڑا اس طرف پھینکنے جارہا تھا تو میری نظر لاش پر پڑی۔''

''حیرت ہے اتنے بڑے ریسٹورنٹ کے مالک نے کوڑا پھینکنے کے لیے ایک سوئپر تک نہیں رکھا اور یہ گندا کام ویٹروں سے لیا جاتا ہے جو گاہکوں کو کھانا پینے کی چیزیں بھی سرو کرتے ہیں۔''

''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ آج صبح سوئپر اچانک چھٹی کر گیا تھا اس لیے مجبوراً میں نے ہاتھوں میں گلوز چڑھا کے یہ کام سرانجام دیا تھا۔''

''نوجوان مقتول کی لاش سے ملنے والے کالج کارڈ کے مطابق اس کا نام مدثر تھا۔ کیا تم نے مقتول مدثر کو پہلے بھی وہاں دیکھا تھا۔ ایسے نوجوان تو اکثر آتے جاتے رہتے ہوں گے؟''

''جی جناب! بالکل... قتل سے پہلے مقتول مدثر کو میں نے ایک شخص کے ساتھ اپنے ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا اور اکثر دیکھا کرتا تھا۔'' اس کے جواب پر حارث کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ اس نے پوچھا۔ ''قتل سے کتنی دیر پہلے تم نے اسے اپنے ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا؟''

''شام کے کوئی ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا۔''

''اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا؟'' حارث نے پُرسوچ انداز میں تسلی چاہیے۔

''جی جناب! میں نے آپ کو بتایا کہ اس کے ہمراہ ایک شخص تھا۔''

''میرا مطلب ہے... وہ دونوں ہی تھے یا کوئی تیسرا بھی تھا؟ کوئی لڑکی یا کوئی اور...؟''

''کوئی نہیں تھا وہاں ان دونوں کے سوا۔''

''دونوں کی گفتگو کا انداز دوستانہ تھا؟''

''کچھ ایسا لگتا تو نہیں تھا، وہ کسی گمبھیر اور سنجیدہ موضوع پر باتیں کرتے محسوس ہو رہے تھے۔''

''کتنی دیر بیٹھے تھے وہ دونوں؟''

''زیادہ تو نہیں، میرا خیال ہے کوئی پندرہ بیس منٹ ہی بیٹھے ہوں گے۔ مقتول مدثر کو وہاں سے اٹھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ بار بار باتوں کے دوران میں اپنی رسٹ واچ پر نظر بھی ڈالتا جارہا تھا۔ شاید اس نے وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جانا تھا یا پھر اسے کسی کے آنے کا انتظار تھا۔''

''کیا دوسرا شخص مقتول مدثر کا ہم عمر تھا؟''

''جی جناب۔'' مرلی دھر نے اثبات میں جواب دیا۔

''یہ بتاؤ، دونوں ایک ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلے تھے یا الگ الگ...؟''

''پہلے وہ شخص رخصت ہوا تھا جو مقتول کے ساتھ تھا پھر اس کے تھوڑی دیر بعد مقتول مدثر بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔''

''کیا تم... بتا سکتے ہو کہ دونوں ریسٹورنٹ سے الگ الگ نکلنے کے بعد کس سمت گئے تھے؟ میرا مطلب ہے سمندر کی طرف یا پھر پارکنگ ایریا کی طرف؟''

''سوری سر! یہ میں نے غور نہیں کیا تھا۔'' مرلی دھر نے جواب دیا۔

انسپکٹر حارث اس کے چہرے پر اپنی تیز نظریں مرکوز کیے ہوئے کرسی سے اٹھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رول کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا ہوا مرلی دھر کی کرسی کے قریب آکے میز پر ٹک کے بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔

''دیکھو مرلی دھر! پولیس سب سے پہلے اس شخص پر شبہ کرتی ہے جو لاش کو دریافت کرتا ہے لہٰذا اچھی طرح سوچ لو۔ تم سے کوئی اہم بات بتانا تو نہیں رہ گئی۔ جو بعد میں پتا چلے اور تم پر ہمارے شک کا دائرہ مزید تنگ ہو جائے۔''

''بالکل نہیں جناب! میں نے کوئی بات دانستہ یا نادانستہ نہیں چھپائی ہے۔ پورے اعتماد سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔'' مرلی دھر بولا۔

انسپکٹر حارث بیگ نے دل ہی دل میں کہا۔ ''تمہارا یہی اعتماد اور اطمینان ہے جو مجھے سب سے زیادہ شبہے میں مبتلا کر رہا ہے۔ بہرحال...'' وہ اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے مشکوک انداز میں بولا۔ ''اب ذرا ایک آخری اور اہم بات بتاؤ۔''

''جی جناب... پوچھیں۔''

''آخر تم نے ان دونوں کی حرکات و سکنات کے بارے میں اس قدر تفصیل سے کس طرح جان لیا جبکہ ایک عام اندازے کے مطابق ریسٹورنٹ میں کافی رش ہوتا ہے اور ویٹر گاہکوں کو سرو کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ تم اتنے فارغ تھے کہ ایک جگہ بیٹھ کر ان دونوں پر اپنی نظریں جمائے رہے؟''

یہ آخری سوال پوچھتے وقت انسپکٹر حارث کو پورا یقین تھا کہ اگر اس کے دل میں کوئی چور ہوگا تو وہ ایک لمحے کے لیے ضرور گڑبڑا جائے گا۔ بہ صورت دیگر وہ اس ویٹر کو شک کی کسوٹی سے بری الذمہ قرار دے دیتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

ویٹر مرلی دھر نے بڑے آرام سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جناب! آپ کی بات بالکل صحیح ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں واقعی ایک جگہ بیٹھ کر دونوں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا تھا۔'' اس کے اس عجیب جواب پر حارث کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

مرلی دھر نے بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے ایسا کوئی شوق نہیں اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت گاہکوں کا رش ایک تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسرے یہ کہ میں کاؤنٹر کے قریب اسٹول پر بیٹھا ایک برگر کھانے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کی میز سرونگ کاؤنٹر کے قریب تھی اور غیر ارادی طور پر میری نظریں جانے کیوں بار بار ان کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ کیونکہ باتوں کے درمیان دونوں میں سے کوئی ایک چیخ کر اپنے ساتھی سے کچھ بولتا تھا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ مرلی دھر... تم نے ایک اچھے اور ذمے دار شہری کا فرض نبھاتے ہوئے ہم سے بھرپور تعاون کیا۔'' انسپکٹر حارث نے میز سے اٹھ کر توصیفی انداز میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اب جا سکتے ہو لیکن تمہاری ضرورت قانون کو دوبارہ پڑ سکتی ہے۔''

''میں ہر دم حاضر ہوں جناب۔''

''گڈ... تم جا سکتے ہو۔ ہمارا آدمی تمہیں چھوڑ آئے گا۔'' یہ کہہ کر حارث نے گھنٹی بجا کے اردلی کو اندر بلایا اور مرلی دھر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد حارث اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر حارث بیگ خفیہ پولیس کرائم اینڈ انویسٹی گیشن برانچ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہوشیار اور ذہین ہونے کے علاوہ دیانت دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ مجرم چاہے کتنا ہی خطرناک یا بااثر کیوں نہ ہو، وہ اسے بالآخر کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔ وہ ایک قابل آدمی تھا۔ اس سلسلے میں اس کا طریقہ کار ان عام روایتی پولیس آفیسروں سے بالکل مختلف ہوتا تھا جو عموماً پولیس کی وردی پہن کر رعب اور دبدبے کے ساتھ مجرموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور شاید اس رعب و دبدبے کے باعث مجرم بہ آسانی خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر چھپ جایا کرتے تھے اور پھر چھپ کر کیس کے داخلِ دفتر ہونے کا انتظار کرتے تھے۔

انسپکٹر حارث پینتیس سالہ ایک جوان اور خوبرو شخص تھا۔ دراز قد، چوڑے شانے، رنگ گندمی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

وہ غیر شادی شدہ تھا۔ دنیا میں اس کا سوائے ایک بہن کے اور کوئی نہ تھا۔ حنا اس کی بڑی بہن تھی وہ شادی شدہ تھی۔ اس کے دو بچے تھے، وہ اپنے شوہر خضر حیات کے ساتھ احمد آباد میں رہتی تھی، اس کا شوہر خضر حیات چائے کی ایک بڑی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ کبھی کبھار حارث بہن اور اپنے شریر بھانجے، بھانجی سے ملنے کے لیے احمد آباد چلا جایا کرتا تھا۔ حنا کو اپنے چہیتے چھوٹے بھائی کی شادی کی فکر لاحق رہتی تھی جبکہ حارث ہمیشہ اس موضوع کو ٹالتا رہتا تھا۔

☆☆☆

مقتول مدثر، اقبال احمد خان کی اکلوتی اولاد تھی اور ایک بدنصیب باپ کے لیے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوتا.... اس کا باپ اقبال احمد ایک سرکاری دفتر میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ دونوں باپ بیٹا سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اب اکلوتے بیٹے کی جواں مرگ نے اقبال احمد کو غم سے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی عارضۂ قلب کا مریض تھا اور اب اسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔

انسپکٹر حارث نے اپنے لائحہ عمل کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے کالج کا رخ کیا جہاں مقتول مدثر زیر تعلیم تھا۔ کالج کے پرنسپل راجندر گوپال سے اس نے ملاقات کی۔ اس جانکاہ اطلاع پر پرنسپل کو ذہنی جھٹکا لگا بہرطور اس نے حارث کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

اس کے بعد حارث کے ایما پر پرنسپل نے مقتول کے چند قریبی کلاس فیلوز کو اپنے آفس میں طلب کیا۔ انہیں بھی جب اپنے دوست کی جانکاہ ہلاکت کا پتا چلا تو وہ بہت دکھی نظر آنے لگے۔ ان سے مختصر گفتگو کے دوران انسپکٹر حارث کو اندازہ ہو گیا کہ ان میں اشوک کمار نامی ایک اسٹوڈنٹ مقتول مدثر کے ذاتی حالات کے بارے کچھ زیادہ ہی معلومات رکھتا تھا۔ حارث نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کر ڈالی۔

اشوک گھبرا سا گیا اور پرنسپل صاحب کی طرف دیکھنے لگا مگر پرنسپل راجندر گوپال نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ انسپکٹر حارث صاحب صرف ضابطے کی کارروائی کے طور پر مقتول مدثر کے بارے میں کچھ تفصیل پوچھنا چاہتے ہیں۔

پھر انسپکٹر حارث کے دوستانہ اور مہربان رویے سے بھی اشوک نے حوصلہ پکڑا اور اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔

انسپکٹر حارث ان سب کا تہ دل سے شکریہ ادا کر کے اشوک کو ساتھ لیے ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اشوک پر ایک بار پھر گھبراہٹ طاری ہونے لگی کیونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا تھا۔ جس کی عمر بیس بائیس سال کے درمیان تھی۔ رنگ سانولا تھا اور وہ دبلا پتلا تھا۔

حارث نے اس کے لیے پہلے ایک عدد کولڈ ڈرنک منگوائی اور پھر اسے ذرا جوش دلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''دیکھو اشوک! بہ قول تمہارے مدثر تمہارا نہ صرف کلاس فیلو تھا بلکہ ایک اچھا دوست بھی تھا اور وہ اپنے بدنصیب باپ کا واحد سہارا بھی تھا۔ کیا تم اور تمہارے دیگر کالج کے ساتھی نہیں چاہیں گے کہ بے رحم قاتل پکڑا جائے جس نے یہ بھیانک جرم کیا؟''

اشوک فوراً جوش سے بولا۔ ''کیوں نہیں جناب! یہ تو ہم سب ساتھی چاہیں گے کہ جس کسی نے بھی یہ ظلم کیا ہے، وہ تختہ دار تک ضرور پہنچے۔ مدثر ہم سب کا اچھا دوست تھا۔ سب کی عزت کرتا تھا۔''

''شاباش!'' حارث نے توصیفی انداز سے کہا۔ ''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ مدثر کی کسی لڑکی سے دوستی تھی؟ یعنی اس کی کوئی گرل فرینڈ وغیرہ؟''

جواباً اشوک نے کولڈ ڈرنک کے چند گھونٹ بھرے پھر بولا۔ ''جی ہاں غزالہ سے اس کی دوستی تھی۔''

''غزالہ؟''

''جی... یہ کلاس فیلو ہے۔''

''کوئی محبت وغیرہ کا چکر یا پھر ایسے ہی دوستی تھی؟''

''محبت وغیرہ کے بارے میں تو ہم میں سے کسی کو کچھ اندازہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی دوست تھی۔''

''دونوں کی دوست تھی؟ دوسرا کون تھا؟''

''شکیل۔''

''شکیل...!''

''جی مدثر، شکیل اور غزالہ تینوں کی آپس میں بڑی گہری دوستی تھی گویا پورے کالج میں ان تینوں کی یہ تکڈم مشہور تھی۔''

''یہ بتاؤ، مدثر کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی یا کسی کے ساتھ اس کا حال ہی میں کوئی جھگڑا یا مار کٹائی ہوئی ہو؟''

''چھوٹے موٹے جھگڑے یا تلخ کلامی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو ہی جایا کرتی تھی لیکن ایسی خطرناک قسم کی دشمنی تو میرا خیال ہے اس کی کسی کے ساتھ نہیں تھی کہ اس بے

چارے کو قتل ہی کر دیا جاتا۔''

''کبھی اس کا اپنے گہرے دوست شکیل کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

انسپکٹر حارث کے سوال پر وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر قدرے صراحت میں جا کر بتانا شروع کیا۔

''مدثر، شکیل اور غزالہ کی تکڈم پورے کالج میں مشہور تھی۔ تینوں میں بہت گہری دوستی تھی، اس قدر کہ وہ اپنی اس تکڈم میں کسی چوتھے کو شامل کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ تینوں کالج سے باہر بھی اکٹھے ہی گھوما پھرا کرتے تھے۔

غزالہ ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی البتہ شکیل اور مدثر دونوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا بلکہ ان میں شکیل کہیں زیادہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا مگر باوجود اس کے تینوں میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم ان تینوں کی دوستی کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ آخر غزالہ مدثر اور شکیل میں سے کسی ایک کو ضرور دل سے پسند کرتی ہوگی۔ اس کا جھکاؤ آخر دونوں میں سے کسی ایک کی طرف تو ضرور ہوگا جس کے بارے میں وہ سنجیدہ ہو۔ اس بات پر ہم کالج کے دوستوں میں باقاعدہ شرطیں لگا کرتی تھیں مگر کچھ پتا نہ چل سکا۔ تاہم پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات ضرور ظاہر ہونا شروع ہوگئی کہ غزالہ کا زیادہ جھکاؤ مدثر کی طرف تھا پھر اس دوران بات مزید کھل کر تب سامنے آگئی جب ان تینوں کی دوستی میں ایک چوتھے شخص نے دراڑ ڈالنا شروع کر دی۔'' وہ اتنا بتا کر ذرا رکا۔

انسپکٹر حارث بہ غور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ چوتھے شخص کے ذکر پر وہ چونکا لیکن کچھ بولا نہیں۔

اشوک نے کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل میز پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اس چوتھے شخص کا نام سنیل تھا۔ پورا کالج جانتا تھا کہ سنیل کس قماش کا آدمی ہے۔ اس کی دوستی اپنے جیسے ہی چند اوباش نوجوانوں کے ساتھ تھی۔ وہ مدثر، شکیل اور غزالہ کی تکڈم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ غزالہ کی وجہ سے اس تکڈم میں شامل ہونا چاہتا ہے ورنہ اسے مدثر یا شکیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''غزالہ اگرچہ...... ایک بڑے گھرانے کی بولڈ لڑکی تھی لیکن وہ ایک حد میں رہنے کی عادی تھی۔ اسے آج تک کسی نے کالج میں نازیبا حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا مگر بدطینت سنیل اس کی آزاد خیالی کو دیکھتے ہوئے اسے دوسری قسم کی لڑکی سمجھا تھا۔ جب سنیل کو غزالہ سمیت تینوں نے گھاس نہ ڈالی تو وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ اس نے ایک موقع پر غزالہ کے ساتھ غیر اخلاقی حرکت کرنے کی کوشش کرنی چاہی تو غزالہ نے اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کر ڈالی۔ سنیل بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا جب تک مدثر اور شکیل، غزالہ کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں اس کی دال نہیں گل سکتی۔ یوں اس نے بہ ظاہر غزالہ کی جانب سے اپنی توجہ ہٹالی اور مدثر اور شکیل کو رام کرنے کی سعی میں مصروف ہوگیا۔

''غالباً غزالہ کے معاملے میں شکیل اور مدثر کے درمیان پہلے ہی سے کسی سرد جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ممکن ہے اس میں بھی کسی سازش کا دخل ہو کیونکہ ان کی تکڈم سے بہت سے کلاس میٹ حسد بھی کرتے تھے، بہرحال... ادھر سازشی ذہن کے مالک سنیل کو بھی ان کے بیچ گل کھلانے کا موقع مل گیا اور بالآخر مدثر اور شکیل کے درمیان پہلی بار باقاعدہ تو تکار، تلخ کلامی ہوتے دیکھی گئی۔

''اس کے بعد ایک دن تو حد ہوگئی، مدثر اور شکیل کے درمیان ٹھیک ٹھاک ہاتھا پائی بھی ہوگئی۔ غزالہ ان دونوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کر کے بیچ بچاؤ کرواتی رہی اور اس ضمن میں اسے کہتے سنا گیا کہ اس میں قصور شکیل کا تھا۔

''حتیٰ کہ ایک روز شکیل کو غزالہ سے نہایت غصے اور زہریلے لہجے میں یہ کہتے بھی سنا گیا کہ۔'' غزالہ! تم دغاباز ہو، دوغلی عورت ہو۔ تم مدثر کی جھوٹی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو اس لیے اب بہتر یہی ہے کہ میں تم دونوں کے بیچ سے ہٹ جاؤں۔''

''یوں ان کی یہ پرانی دوستی اور تکڈم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ اس کے بعد سے مدثر اور غزالہ اکثر ساتھ دیکھے جانے لگے۔ سنیل بھی شاید ایک حد تک اپنی سازش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ دور دور سے تماشا دیکھا کرتا مگر وہ .... غزالہ کے ہاتھوں اپنی بے عزتی نہیں بھولا تھا۔ اب وہ مدثر اور غزالہ کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش میں تھا کہ معلوم ہوا مدثر کا قتل ہوگیا۔''

انسپکٹر حارث بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ''مگر ان سب باتوں کے باوجود ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ سنیل تو چلو کسی حد تک اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کی غزالہ سے دوستی کا خواب تو پھر بھی پورا نہ ہو سکا تو کیا وہ چپ ہو کر بیٹھ رہا تھا؟''

''جی نہیں۔'' اشوک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سنیل نے غزالہ سے دوستی کرنے یا اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کو

شاید اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا لیکن وہ اس بات سے بھی پُرامید تھا کہ وہ شکیل کو ان دونوں سے متنفر کرنے کے بعد بہ آسانی مدثر کو بھی ایک دن غزالہ سے دور کردے گا لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تب سنیل، مدثر کے خلاف جارحانہ رویے پر اتر آیا۔ ایک روز دونوں کے درمیان اس بات پر لڑائی بھی ہوگئی۔ سنیل نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر مدثر کی پٹائی کروادی۔ معاملہ پرنسپل صاحب تک پہنچا تو انہوں نے سنیل کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

''آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو کالج سے تمہارا نام خارج کردیا جائے گا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزالہ کے معاملے میں شکیل اور سنیل کی مدثر کے ساتھ اکثر جھڑپ ہوتی رہتی تھی؟'' انسپکٹر حارث نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''بالکل جناب بلکہ یہ تو اب تقریباً روز کا ہی معمول بن کر رہ گیا تھا۔ گویا اب مدثر کو بیک وقت شکیل اور سنیل دونوں ہی کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔'' اشوک نے بتایا۔

''ہوں۔'' حارث نے پُرسوچ ہنکاری بھری۔

اسے اب قتل کے محرک کا کافی حد تک اندازہ تو ہوچکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ مدثر کے قتل میں شکیل اور سنیل دونوں کا ہی ہاتھ محسوس ہوتا تھا جبکہ گل فشاں ریسٹورنٹ کا ویٹر مرلی دھر کے اس بیان کے مطابق وقوعے سے پہلے یعنی شام کے آخری پہر مقتول مدثر کو آخری بار اس کے دیرینہ رقیب شکیل کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا۔ اب پتا نہیں، وہ شکیل تھا یا سنیل، حارث کو شبہ تھا کہ وہ شکیل ہی ہوگا جسے آخری بار مقتول مدثر کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

حارث فوراً حرکت میں آیا، شکیل اور سنیل دونوں کو شک کی بنا پر گرفتار کرکے لاک اپ کردیا اور جب گل فشاں ریسٹورنٹ کے ویٹر مرلی دھر کے سامنے دونوں کی شناختی پریڈ کروائی گئی تو مرلی نے فوراً شکیل کو پہچان کرلیا۔

''یہی وہ شخص تھا جو وقوعے سے پہلے گل فشاں ریسٹورنٹ میں مدثر کے ساتھ آخری بار دیکھا گیا تھا اور پھر مدثر کا قتل ہوگیا تھا۔ شکیل سے مقتول مدثر کی آخری ملاقات اور پھر مدثر کے قتل کا درمیانی وقفہ لگ بھگ چالیس سے پچاس منٹ تھا۔'' تب حارث نے شکیل اور سنیل کی تصاویر اتروانے کے بعد سنیل کو رہا کردیا لیکن شکیل کو مدثر کے قتل کے الزام میں شک کی بنیاد پر باقاعدہ گرفتار کرلیا۔

☆☆☆

''میں بے قصور ہوں انسپکٹر صاحب... میں بھلا اتنا بڑا جرم کس طرح کرسکتا ہوں۔'' دورانِ تفتیش شکیل نے پریشان ہوکر انسپکٹر حارث بیگ سے کہا۔

''کیوں... تم کیوں اتنا بڑا جرم نہیں کرسکتے؟ تم پر کوئی پابندی ہے؟'' قریب کھڑے اسسٹنٹ تیمور نے اس کی طرف گھور کے کہا۔ بے چارہ شکیل اس کی عجیب بات پر گڑبڑا سا گیا۔ تب حارث نے تیمور کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر بری طرح جھڑکا۔

''شٹ اپ بغیر سوچے سمجھے... بول پڑتے ہو، تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟''

اس پر تیمور خفیف ہوکے بولا۔ ''سوری سر! یہ کم بخت بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ آپ ذرا غور کرکے دیکھیں اس کے جملے پر... میں بھلا اتنا بڑا جرم کیسے کرسکتا ہوں۔ اب سر آپ ہی بتایئے بھلا اتنا بڑا دعویٰ پہلے سے کوئی کرسکتا ہے؟''

''آئی سے شٹ اَپ۔'' اس کی فضول بات پر حارث نے دہاڑ کر کہا اور دبلا پتلا تیمور باریک تار کی طرح جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کے بعد حارث، شکیل کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہر مجرم یہی راگ الاپتا ہے اس لیے یہ فضول بکواس چھوڑو، مجھے بتاؤ کہ تم اس شام گل فشاں ریسٹورنٹ میں مدثر سے ملنے کیوں گئے تھے؟''

اس سوال پر وہ کچھ فکرمند نظر آنے لگا پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ درست ہے انسپکٹر صاحب کہ میں اس شام مدثر سے ملا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میری وہ ملاقات مدثر سے بالکل اتفاقی تھی۔ ہم دونوں کے بیچ یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ نہیں تھی۔''

''تم اپنے بارے میں بتاؤ، وہاں تنہا کیا کرنے گئے تھے؟''

''غزالہ نے جب سے میری محبت کو ٹھکرایا تھا، میں اکثر تنہا ہی سمندر کے کنارے ٹہلنے چلا جایا کرتا تھا۔'' یہ بتاتے ہوئے شکیل کی آنکھوں میں غم کی شام سی اتر آئی۔ حارث کی عقابی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''میں غزالہ سے سچی محبت کرتا تھا جبکہ وہ مدثر کو پسند کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مدثر اس کے ساتھ فلرٹ کررہا تھا۔ میں مدثر کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ غزالہ کے معاملے میں کس حد تک سنجیدہ تھا۔''

''شٹ اَپ مجنوں کی اولاد۔'' انسپکٹر حارث نے

طیش میں آکر اسے جھڑکا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیاہ رول اس کی ٹھوڑی پر چبھو کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور بولا۔ ”تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ مجھے تمہاری ناکام عشقیہ کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے میرا سوال گول کرنے کی کوشش مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو سیدھی طرح کہ تم بدھ کی شام مدثر کے قتل سے محض نصف گھنٹا پہلے تنہا لونگ اسپاٹ پر کیا کر رہے تھے اور گل فشاں ریسٹورنٹ میں مدثر سے ملاقات تم نے کس مقصد کے تحت کی تھی؟“ شکیل بری طرح بوکھلا گیا۔ اسے انسپکٹر حارث بیگ سے اس قدر تیزی اور تندی کی توقع نہیں تھی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں انسپکٹر صاحب! میں وہاں ویسے ہی اپنے دل کی اداسی دور کرنے گیا تھا کہ مدثر پر نگاہ پڑ گئی۔ وہ تنہا تھا مگر اس کی غزالہ سے ملاقات طے تھی۔ وہ وہاں پہنچنے والی تھی، میں مدثر سے ملا اور اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ غزالہ کو دھوکا نہ دے۔ وہ بہت حساس لڑکی ہے اور...“

”تو تم ایسے نہیں مانو گے؟“ بالآخر انسپکٹر حارث نے اس کی بات کاٹ کر تہدیدی لہجے میں کہا۔

”میری بات پر یقین کریں انسپکٹر صاحب۔“ شکیل نے اس بار اپنے لہجے میں استحکام پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تیمورا!“ حارث نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنے اسسٹنٹ کو پکارا۔

”یس سر۔“ وہ یکدم سیلوٹ مار کر مؤدبانہ بولا۔

”اس کی ذرا مہمان خانے میں لے جا کر تواضع کرو۔ اس وقت تک جب تک یہ اپنے منہ سے سچ نہ اگل دے۔“ انسپکٹر حارث نے شکیل کی طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

حکم سنتے ہی تیمور ایک دم الرٹ ہو گیا اور شکیل کی گردن ناپتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ”چل اوئے عاشقِ نامراد اآگے لگ۔“ شکیل اپنی بے گناہی پر واویلا مچاتا رہا، تیمور اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ چکی تھی۔ اس کے علاوہ لیبارٹری سے خون جمے ہوئے پتھر کی جو تجزیاتی رپورٹ اس کے سامنے تھی اس کے مطابق اس پتھر کی ضرب سے ہی مدثر کا خون ہوا تھا۔ اس پر لگا خون مدثر کا ہی تھا جبکہ فنگر پرنٹس کی رپورٹ غیر تسلی بخش تھی۔

وجۂ موت جریانِ خون تھا۔ پتھر لگنے سے مقتول مدثر بے ہوش ہو گیا تھا۔ زخم گہرا ہونے اور رگ پھٹ جانے سے اور مسلسل بے ہوشی کی حالت میں خون بہتا رہا جس کی وجہ سے بے ہوشی کا دورانیہ طویل ہوا جو بالآخر بدنصیب مدثر کی موت کا سبب بنا۔

انسپکٹر حارث کو شکیل پر یقین کی حد تک شبہ تھا کہ یہ قتل ضرور اس نے ہی طیش کے عالم میں کیا تھا پھر گل فشاں ریسٹورنٹ کے ویٹر مرلی دھر کا بیان۔ شکیل اگرچہ مدثر سے ملنے کے بعد ریسٹورنٹ سے چلا گیا تھا مگر حارث کو اس بات کا سو فیصد یقین تھا کہ مدثر سے ملنے کے بعد وہاں سے گیا نہیں ہوگا بلکہ وہ مدثر کی ٹوہ میں رہا چونکہ مدثر کو وہاں غزالہ کا انتظار تھا لہٰذا غزالہ کے آنے کے بعد مدثر اور غزالہ ساحلِ سمندر کی طرف چہل قدمی کی نیت سے چل پڑے ہوں گے اور شکیل ان دونوں کے تعاقب میں وقوع والی جگہ تک جا پہنچا ہوگا اور وہیں عاشقِ نامراد بہ الفاظ دیگر رقیب روسیاہ شکیل، مدثر اور غزالہ کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر غصے سے رقابت کی آگ میں جل اٹھا ہوگا اور پھر وہیں شکیل اور مدثر میں ہاتھا پائی ہوئی ہوگی جس کے نتیجے میں شکیل کے ہاتھ وہ نکیلا پتھر آ گیا جو اس نے بے دریغ مدثر کی پیشانی پر بڑے زور سے دے مارا۔

یہ ساری باتیں سوچنے کے ساتھ حارث ایک اور سوال پر غور کرنے لگا کہ اس کے اندازے کے مطابق اگر غزالہ بھی طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے محبوب مدثر کے ساتھ تھی تو پھر کیا وجہ تھی کہ غزالہ نے اپنے دم توڑتے محبوب مدثر کی مدد یا اس کی جان بچانے کے لیے فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا، وہ اسے کسی قریبی اسپتال لے جا سکتی تھی یا پھر ہو سکتا ہے کہ شکیل نے جوش میں آ کر غزالہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہا ہو مگر غزالہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی ہوگی۔

انسپکٹر حارث بیگ کے لیے اب غزالہ سے ملاقات کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا چنانچہ وہ تنہا اور سادہ وردی میں غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا جس کا پتا اس نے شکیل سے حاصل کر لیا تھا۔

غزالہ گاندھی گارڈن کے ایک پوش علاقے میں اپنے باپ عادل ترمذی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا باپ کپڑے کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ علاوہ ازیں وہ چائے کے باغات کا مالک بھی تھا۔ وہ کاروباری دنیا میں سیٹھ عادل مراد ترمذی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

سیٹھ عادل مراد کی عالیشان کوٹھی کے گیٹ پر ایک

باوردی گن مین موجود تھا۔ حارث نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا کر تعارف کروایا تو وہ فوراً مرعوب ہوگیا تاہم اس نے بتایا کہ سیٹھ صاحب آج کل کاروباری دورے پر بنگلور گئے ہوئے ہیں البتہ ان کی بیٹی غزالہ اندر موجود ہے لیکن اس کی طبیعت ناساز ہے۔

حارث نے گن مین کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے خاصے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''مجھے درحقیقت سیٹھ عادل کی بیٹی غزالہ سے قتل کی ایک واردات کے سلسلے میں ملنا ہے۔ کیا ان کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ بات بھی نہیں کرسکتیں؟''

گن مین کا ماتھا ٹھنکا۔ ''قتل کی واردات... مگر بی بی جی کا اس سے کیا تعلق؟'' وہ پریشان سا ہوگیا۔

حارث نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں جو نوجوان اس واردات میں قتل ہوا ہے اسے غزالہ بی بی بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں مقتول نوجوان کے بارے میں کچھ تفصیل درکار ہے وہی پوچھنے آیا ہوں۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' گن مین کی پریشانی ذرا کم ہوئی پھر اس نے گیٹ پر لگے انٹرکام پر اندر غزالہ سے رابطہ کیا۔ اسے ساری بات بتائی پھر ''بہت بہتر بی بی جی۔'' کہہ کر وہ فارغ ہوا اور حارث کے لیے بغلی دروازہ کھول دیا۔

حارث اندر داخل ہوگیا۔ گن مین اس کے ہمراہ تھا۔ ایک پختہ روش پر چلتے ہوئے وہ گن مین وسیع وعریض خوب صورت لان میں اسے لے آیا۔ جہاں چند فولڈنگ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے حارث کو نہایت احترام سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود گیٹ کی طرف واپس لوٹ گیا۔

سہ پہر کے چار بج رہے تھے، فضا خوشگوار تھی۔ لان میں لگے خوش رنگ گل بوٹوں اور کیاریوں کی سوندھی سوندھی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ لان کے چاروں طرف ناریل کے درختوں کی قطار تھی۔ لان کے وسط میں بیڈمنٹن کے لیے ایک نیٹ لگا نظر آرہا تھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پورچ میں ایک نئے ماڈل کی چمچماتی کار کھڑی تھی۔ چند ملازم اسے دکھائی دیے۔

حارث ابھی ان چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ کوٹھی کے خوب صورت وسطی محرابی دروازے سے ایک خوش جمال لڑکی نمودار ہوئی۔ حارث نے اس کی عمر کا اندازہ بیس، بائیس برس کے قریب لگایا تھا۔ وہ خاصی پرکشش، اسمارٹ اور ٹین ایج ہی نظر آرہی تھی۔ بال بوائے کٹ تھے، رنگت شہابی اور جلد شفاف تھی مگر اس وقت اس کا چہرہ ستا ہوا اور مغموم نظر آرہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی تو حارث احتراماً کھڑا ہونے لگا مگر غزالہ نے سلام کرکے اسے بیٹھے رہنے کا کہا۔

''شکریہ۔'' حارث نے اس کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا پھر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔ ''آپ غزالہ ہیں؟''

''جی۔'' غزالہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا اور اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ ''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟''

''جی کچھ نہیں، شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں، میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔'' حارث نے پہلو بدل کر کہا پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''مدثر کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی، آپ کا کلاس میٹ تھا وہ۔''

''جی۔''

''یقیناً اس کے قتل کی بھی اطلاع آپ کو ہوگی؟''

''جی ہاں۔''

''مس غزالہ! مجھے مدثر کے قتل کا بے حد افسوس ہے، یقیناً آپ کے لیے بھی گہرے دکھ اور رنج کی بات ہوگی۔ میں آپ کے غم کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ قاتل تک پہنچنے کے لیے میں آپ سے چند ضروری سوالات کرنا چاہوں گا۔'' حارث بولا۔

''جی کیجیے۔'' غزالہ کی آواز مغموم تھی۔ مدثر کے ذکر پر اس کا چہرہ شدید غم میں ڈوبا نظر آنے لگا۔ تاہم وہ کچھ پریشان بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''وقوعے والے روز... یعنی بدھ کی شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان ساؤتھ سی کے مقام پر کیا آپ کی مقتول مدثر سے ملاقات طے تھی؟''

''جی ہاں۔'' غزالہ نے حارث کی توقع کے عین مطابق اثبات میں جواب دیا۔

''میں آپ کو پہلے یہ بتادوں کہ یہاں آنے سے پہلے میں کالج بھی گیا تھا اور وہیں سے آپ کے اور مدثر کے کچھ کلاس فیلوز کی زبانی مجھے آپ کے اور مدثر کے درمیان دوستی کا علم ہوا۔ خیر... یہ تو برسبیل تذکرہ تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ

اس طے شدہ ملاقات کے مطابق آپ مدثر سے ملی تھیں؟ یعنی ساؤتھ سی کے لونگ اسپاٹ ایریا پر؟''

''طے شدہ ملاقات کے مطابق میں اس سے ساؤتھ سی ملاقات کرنے پہنچی ضرور تھی مگر مدثر سے میری ملاقات نہ ہو پائی تھی۔'' غزالہ کی آواز میں رقت زدہ ارتعاش تھا۔

حارث اس کی خلاف توقع بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ الجھ کر بولا۔ ''یعنی آپ کی کل شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان سرے سے مقتول مدثر کے ساتھ ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی؟''

''جی ہاں، جب میں وہاں پہنچی تو مجھے مدثر کہیں نظر نہ آیا.... پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید میں وہاں جلدی آ پہنچی ہوں مگر کافی انتظار کے باوجود جب مدثر مجھے نظر نہ آیا تو میں اس سے ملے بغیر ہی واپس گھر لوٹ آئی تھی۔''

غزالہ نے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹشو پیپر سے آنکھوں میں اترنے والی نمی کو پونچھنے لگی۔ انسپکٹر حارث چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''ایک ذاتی سوال کروں گا لیکن کسی ذاتی دلچسپی کے لیے نہیں بلکہ اس کیس کو حل کرنے اور اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو....؟''

''آپ پوچھیے۔''

''جیسا کہ میں بتا چکا ہوں.. میں یہاں آنے سے پہلے آپ کے کالج بھی گیا تھا اور وہاں سے معلوم ہوا تھا کہ مدثر اور آپ کے بیچ محبت کا رشتہ بھی تھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

''جی ہاں۔'' غزالہ نے سر جھکا کے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا۔

''اور یقیناً وہ بھی آپ سے محبت کرتا ہوگا؟''

''جی۔''

''شکیل اور سنیل کا... درمیان میں کیا معاملہ تھا؟'' حارث نے پوچھا۔

اس سوال پر غزالہ کے غمناک چہرے پر نفرت کا تاثر ابھرا۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''سنیل ایک بدقماش اور لوفر آدمی ہے۔ شکیل اور مدثر کو اس نے ہی آپس میں لڑوا دیا تھا۔ میں اگرچہ شکیل کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی مگر شکیل کو جانے کیوں مدثر سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ یقیناً وہ رقابت تھی جو مدثر کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ شکیل بھی مجھ سے محبت کا دم بھرتا تھا لیکن میری انڈر اسٹینڈنگ مدثر کے ساتھ تھی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میں نے شکیل کو نظرانداز کر رکھا تھا، وہ بھی ایک اچھا انسان ہے۔ میرے اس کے ساتھ صرف دوستانہ مراسم تھے لیکن اس کی مرضی کچھ اور تھی۔''

''میں نے سنا ہے کہ شکیل تمہیں اکثر یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ مدثر تمہارے ساتھ سچی محبت نہیں کرتا اور تم سے محض فلرٹ کر رہا ہے۔'' معاً حارث کو شکیل سے کی گئی تفتیش کے دوران اس کی یہ بات یاد آ گئی تھی۔

انسپکٹر حارث کے اس سوال پر غزالہ کے چہرے پر پہلے ایک عجیب سا تاثر ابھرا اور پھر وہ تلخی سے بولی۔

"ایسا وہ جوشِ رقابت میں کہتا تھا۔"

حارث نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی پھر بولا۔ "شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہوگی کہ جب مدثر اس روز شام کو ساؤتھ سی پر آپ کا انتظار کر رہا تھا، اس سے تھوڑی دیر پہلے شکیل کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جسے وہ محض اتفاقیہ ملاقات کا نام دیتا ہے۔"

انسپکٹر حارث کی بات سن کر غزالہ چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ اس کی دلکش آنکھیں ہنوز اشکبار تھیں۔

"جی... اس شبہے کی بنیاد پر شکیل کو مدثر کے قتل کے متوقع جرم میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ تاحال تفتیش جاری ہے۔" حارث نے انکشاف کیا۔

غزالہ کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرے تھے۔ حارث کو ان تاثرات کی وجہ کا اندازہ نہ ہوسکا کیونکہ وہ تو یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ شکیل کی گرفتاری پر وہ طمانیت یا خوشی جیسے جذبات یا تاثرات کا اظہار کرے گی۔

"آپ... کچھ پریشان سی ہوگئیں، کیا آپ کو شکیل کی گرفتاری پر دکھ ہوا؟"

"پپ... پتا نہیں؟ قتل شکیل نے کیا بھی ہے کہ نہیں چونکہ وہ میرا اچھا دوست رہ چکا ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ وہ جوشِ رقابت میں آ کر اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔" غزالہ نے کہا۔

حارث کو تھوڑی حیرت ہوئی تاہم اس نے پہلو بدل کر پوچھا۔ "کیا آپ کو شکیل پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ مدثر کا قاتل ہوسکتا ہے؟"

"میرے لیے ابھی ایسا کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔" وہ عجیب سے گومگو لہجے میں بولی۔ "لیکن... مجھے نہیں لگتا کہ وہ قتل جیسا اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔"

حارث بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے اپنی بھویں سکیڑ کر بولا۔ "تو پھر آپ کے خیال میں یہ قتل کس نے کیا ہوگا؟ آپ کو کس پر شبہ ہے؟"

"میں ابھی اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"سنیل کے بارے میں کیا خیال ہے؟" سنیل کے ذکر پر غزالہ کے تاثرات بدلے پھر بولی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی بجز اس کے کہ میرا دل و دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔" ایک ذرا توقف کے بعد اس نے موضوع بدل کر انسپکٹر حارث کی طرف دیکھ کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب! باقی یہ بات میں کافی حد تک یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مدثر کا قتل بہرحال شکیل نہیں کرسکتا بلکہ قتل جیسا بڑا قدم وہ کبھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ میرا اچھا اور قریبی دوست رہ چکا ہے۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"لیکن میں نے سنا ہے اس کی اکثر اور باقاعدہ مدثر کے ساتھ ہاتھا پائی بھی ہوتی رہی ہے۔"

"یہ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ مدثر کا قتل کرنا چاہتا ہو۔"

"دیکھیے محترمہ غزالہ صاحبہ، یہ قتل اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہے۔ مشتعل ہونے کی صورت میں اتنا بڑا قدم اٹھایا جاسکتا ہے جبکہ مدثر اور شکیل کے درمیان اچھی خاصی ہاتھا پائی پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ ممکن ہے بدھ کی شام بھی دونوں کے درمیان ایک بار پھر ہاتھا پائی ہوئی ہو اور آپ بھی وہاں موجود ہوں پھر اس اشتعال انگیزی میں شکیل کے ہاتھ نکیلا پتھر آ گیا جو اس نے مدثر کی پیشانی پر دے مارا۔ حیرت ہے آپ اپنے محبوب کے ممکنہ قاتل کو کیوں سزا سے بچانا چاہ رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ یہ قتل شکیل نے نہیں کیا۔" غزالہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

حارث نے حیرت زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

"آپ اس قدر یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اس کا مطلب ہے آپ کو معلوم ہے کہ مدثر کا اصل قاتل کون ہے؟"

غزالہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حارث نے کہا۔

"دیکھیے غزالہ صاحبہ! مجھے لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہی ہیں جبکہ میرے اندازے کے مطابق آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں اور بدھ کی شام آپ کی ملاقات بھی مقتول مدثر سے ہوئی ہوگی ایسا کیسے ممکن ہے کہ مدثر اور آپ کے درمیان ملاقات کا وقت طے ہوا اور آپ دونوں نہ مل سکے... جبکہ بہ قول شکیل آپ دونوں کے بیچ ملاقات کا وقت مدثر کے قتل سے دس منٹ پہلے کا طے تھا اور کبھی آپ دونوں ایک مرتبہ بھی لیٹ نہیں ہوئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر وہ کیا وجہ ہے جس کی بنا پر آپ..."

حارث کی بات ادھوری رہ گئی۔ غزالہ نے درمیان ہی میں اسے ٹوک دیا۔ "انسپکٹر صاحب! محض اپنے اندازوں پر نہ چلیں جو زیادہ تر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں۔ میں پولیس والوں کو جانتی ہوں انہیں ہر ایک پر شبہ کرنے کی بیماری سی ہوتی ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ اپنے گھر والوں پر

بھی شبہ کرنے لگیں۔ آپ باقاعدہ عملی طور پر تفتیش کریں اور قاتل کو گرفتار کریں۔'' غزالہ کے طنزیہ انداز پر انسپکٹر حارث اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر سپاٹ نظریں مرکوز کرتے ہوئے سرسراتے لہجے میں بولا۔

''میں مدثر کے اصل قاتل شکیل احمد ولد توفیق احمد کو گرفتار کر چکا ہوں۔''

''وہ قاتل نہیں ہے۔'' غزالہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

حارث نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لوٹ آیا۔

☆☆☆

انسپکٹر حارث نے دانستہ شکیل کو مدثر کا قاتل ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔ ایسا اس نے غزالہ کا عدم تعاون اور اس کی شکیل میں دلچسپی کو قانون کی گرفت سے بچانے کی کوشش میں کیا تھا۔ حارث کو بار بار یہی بات کھٹک رہی تھی کہ غزالہ آخر شکیل کو کیوں بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس کا مطلب صاف تھا کہ غزالہ کو اصل قاتل کے بارے میں علم تھا۔ وہ مدثر کے قتل کے سلسلے میں کچھ بلکہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

حارث، غزالہ سے رخصت ہو کے اس کی عالیشان رہائش گاہ کے گیٹ سے نکلا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ابھی وہ اس راستے پر تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ اس کا رخ غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف تھا جبکہ انسپکٹر حارث بیگ اس شخص کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

وہ سنیل تھا... اسے غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف کا رخ کرتے دیکھ کر انسپکٹر حارث کو سخت اچنبھا ہوا تھا۔

پہلا سوال اسے یہاں دیکھ کر حارث کے ذہن میں یہ ابھرا تھا کہ... کیا یہ غزالہ سے ملنے آیا ہے لیکن کیوں... غزالہ تو اس سے سخت نفرت کرتی تھی؟ بہ قول اشوک کمار، وہ اس کا چہرہ تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی اور اب حالت یہ تھی کہ سنیل اس کی رہائش گاہ تک آن پہنچا تھا لیکن کیا اس میں غزالہ کی مرضی کا بھی دخل تھا؟ یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔ ورنہ سنیل کیا یہ نہیں جانتا تھا کہ غزالہ کو اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہ تھی تو بھلا اپنی رہائش گاہ پر اسے کیوں گوارا کرتی؟ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

حارث کو اب سنیل پر شبہ ہونے لگا تھا کہ ضرور کسی نہ کسی طرح مدثر کے قتل میں ملوث تھا مگر الجھن یہ تھی کہ مدثر کے قتل کا منظرنامہ کسی طرح سے بھی پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم یا منصوبہ بندی کا شاخسانہ نظر نہیں آتا تھا۔

بُری بات

ایک آئرش مصلح لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ''شراب نوشی بہت بری عادت ہے۔ نشے میں دھت ہو کر آدمی اپنی بیوی سے لڑنے لگتا ہے، بچوں کو مارتا ہے، پڑوسیوں سے جھگڑنے لگتا ہے، فحش کلامی پر اتر آتا ہے، اپنے مالک مکان پر گولی چلا دیتا ہے اور سب سے بری عادت یہ ہے کہ نشے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔''

اس کے برعکس وہ فوری اشتعال کا ردعمل نظر آتا تھا تو پھر یہ کیا ماجرا تھا؟ کوئی نیا معاملہ تھا؟ اسی قسم کے ان گنت سوالات کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا وہ ایک درخت کے عقب میں کھڑا ہوا اور سنیل پر نظریں جما دیں۔ جو اب غزالہ کے گھر کے گیٹ پر کھڑا گارڈ سے باتیں کر رہا تھا اور پھر گارڈ نے بغلی دروازہ کھول کے اسے اندر جانے کی اجازت بھی دے دی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی حارث نے سنیل کو دوبارہ گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا۔

حارث یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مدثر کا قتل شکیل اور سنیل دونوں میں سے کسی ایک نے تو ضرور کیا ہوگا یا پھر دونوں کی مقتول مدثر کے ساتھ ہاتھا پائی ہوئی ہوگی۔ مدثر تنہا تھا اور وہ دو، پھر سنیل یا شکیل کے ہاتھ وہ نکیلا پتھر لگ گیا اور اس نے سخت طیش میں آکر وہ مدثر کے سر پر دے مارا جو اس کی پیشانی پر لگا اور بعد میں اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

چونکہ یہ ساری کارروائی غزالہ نے خوف زدہ آنکھوں سے دیکھی ہوگی اس طرح وہ دونوں قاتلوں کی چشم دید گواہ بھی ہو سکتی تھی لہٰذا بعد میں شکیل اور سنیل نے غزالہ کو اپنا منہ بند رکھنے کے لیے دھمکیاں دی ہوں گی یا پھر دھمکیوں اور مدثر کے قتل والا معاملہ صرف سنیل تک ہی محدود ہو ورنہ غزالہ شکیل کی رہائی کے سلسلے میں اس کی سفارش کیوں کرتی؟

اس نے دیکھا اب سنیل .... خراماں خراماں لاابالی انداز میں سیٹی بجاتا ہوا ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے یکسر بے خبر کہ ایک قریبی درخت کے پیچھے کھڑا سادہ وردی میں موجود انسپکٹر حارث یہ غور اسے دیکھ رہا ہے۔

حارث کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آیا اسی وقت دوبارہ غزالہ کے گھر میں داخل ہو کے اس سے مل کر سنیل کی آمد کے بارے میں

استفسار کرے یا پھر یہ کام کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے اور سنیل کے تعاقب میں روانہ ہوجائے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اچانک اس کے قریب کھڑی اس کی جیپ میں نصب پولیس ریڈیو کی مخصوص بپ کی آواز ابھرنے لگی وہ تیزی سے جیپ کی طرف لپکا۔

وائرلیس سیٹ جیپ کے اسٹیئرنگ وہیل کے ساتھ ہی نصب تھا۔ حارث نے..... ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ کھڑے کھڑے وائرلیس سیٹ کا ماؤتھ پیس اٹھا کر.... اپنے منہ کے قریب کرلیا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بٹن پش کرکے بولا۔

''ہیلو! انسپکٹر حارث اسپیکنگ، اوور۔''

''ہیلوسر... آپ کہاں ہیں؟ اوور۔'' دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی آواز ابھری۔

''آگے بات کرو، اوور۔'' حارث نے دانت پیس کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

''سرجی، وہ گل فشاں ریسٹورنٹ کا ویٹر مرلی دھر آیا ہے اور آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے، اوور۔''

''اچھا ٹھیک ہے، اسے بٹھائے رکھو میں پندرہ منٹ کے اندر پہنچتا ہوں، اوور اینڈ آل۔'' یہ کہہ کر حارث نے بات ختم کردی اور پھر جیپ میں سوار ہوکے سیدھے ہیڈ کوارٹر پہنچا تو مرلی دھر کو بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔

رسمی کلمات کے بعد مرلی نے اپنی جیب سے ایک گول پلاسٹک کی ڈھکن نما شے نکال کر انسپکٹر حارث کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ''سر مجھے آج ہی اس مقام سے گیلے پتھروں کے قریب یہ پڑا ہوا ملا تھا جہاں مدثر نامی نوجوان کا قتل ہوا تھا اس کے بیک پر ایک نام بھی درج ہے چونکہ یہ وقوعے کی جگہ پڑا تھا، یہ سوچ کر میں نے اٹھالیا شاید آپ کے کام کی چیز ہو۔''

حارث نے بھویں سکیڑ کر اس کیپ نما شے کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ وہ کسی مووی کیمرے کا لینس پرفٹ ہونے والا حفاظتی کیپ لگتا تھا پھر جب اس نے اس کی بیک پر نظر ڈالی تو بری طرح چونک پڑا۔

وہاں سنیل سکسینا کا نام درج تھا۔ یہ جانا پہچانا نام تھا جسے پڑھ کر حارث کی رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اس نے سوچا کیا یہ اس سنیل کا پورا نام تھا جس پر شکیل کے بعد مدثر کو قتل کرنے کا شبہ تھا؟

''تمہارے تعاون کا شکریہ، مرلی دھر۔''

انسپکٹر حارث بیگ نے اس کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھا پھر اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ ''یہ تمہارا قانون سے تعاون کرنے کا انعام ہے، رکھ لو۔'' مگر مرلی دھر انکار کرنے لگا لیکن حارث نے اسے اس کا حق دار قرار دیتے ہوئے وہ نوٹ اسے زبردستی تھمادیا۔ وہ سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

قریب کھڑے تیمور نے ذرا کسمسا کے حارث سے کہا۔ ''سرجی آپ نے محض ایک معمولی سے ڈھکن کے عوض اس ویٹر کو پانچ سو کا نوٹ تھمادیا۔''

اس کی احمقانہ بات سن کر حارث نے غصے سے گھور کے اسے دیکھا اور دانت پیس کر بولا۔ ''جو کام تمہیں کرنا چاہیے تھا، وہ اس ویٹر نے کر دکھایا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے تمہاری جگہ رکھ لوں اور تمہیں بیراگری کرنے اس کی جگہ پر چھوڑ آؤں۔''

''لل... لیکن سرجی آپ مجھے حکم تو کرتے، میں ایسے ایک سو ایک ڈھکن سمیٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کرکے ہزاروں روپے کے انعام کا مستحق قرار پاتا۔ مرلی تو بے وقوف نکلا جو محض ایک ڈھکن اٹھالایا۔''

''ہاں تم اگر ایک سو ایک ڈھکن لاتے تو انعام کے طور پر تمہیں میں ایک سو ایک جوتے انعام کے طور پر مارتا... بے وقوف یہ ڈھکن جائے وقوعہ کے قریب پڑا ملا ہے، تم اگر تھوڑی کوشش کرتے اور اپنی موٹی عقل استعمال کرکے گردوپیش کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تو یہ تمہیں بھی پڑا نظر آسکتا تھا۔ میرا خیال ہے تم اس نوکری کے اہل نہیں ہو، تمہارا بندوبست مجھے کرنا پڑے گا۔''

''بس... سرجی ایسا ظلم مت کیجیے گا۔ میرے بڑے بڑے بچے ہیں۔'' وہ گھگیا کر بولا۔

حارث الجھ کر بولا۔ ''بڑے بڑے بچے؟''

''جی سرجی میری لڑکپن میں ہی شادی ہوگئی تھی جب مجھ پر نئی نئی جوانی آئی تھی۔ اب ماشاء اللہ میرے بچے جوان ہوگئے ہیں۔'' وہ شرما کے بولا۔

حارث کا منہ پھاڑ کے قہقہہ لگانے کو جی چاہا، اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ہنسی روکنے کی خاطر وہ تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

☆☆☆

حارث پوری رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا مگر اس کا ذہن اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ

قاتل تک پہنچ گیا ہو... اب اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

جیپ کو مسلسل نصف گھنٹے تک دوڑاتے رہنے کے بعد وہ ایک متوسط طبقے کے رہائشی علاقے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے سنیل سکسینا کا گھر ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کا پتا وہ شکیل سے حاصل کر چکا تھا۔ باقی رہی سہی کسر محلے والوں نے پوری کردی۔ کسی شیطان کی طرح وہ وہاں مشہور تھا۔

گھر کی حالت خستہ تھی مگر وہ کشادہ تھا اور ایک منزلہ تھا۔ پتا چلا اس کا باپ دھوبی تھا، ماں بھی یہی کام کرتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کا یہ جدی پشتی پیشہ تھا۔ دونوں اس وقت دھوبی گھاٹ پر تھے، اوپری منزل پر سنیل سے ملاقات ہوگئی۔ وہ وہاں اکیلا تھا۔

حارث... تیمور کو باہر ہی نیچے چوکس کھڑا رہنے کا حکم دے کر خود اس بیرونی زینے سے اوپر جا پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری بار دستک دی تو اندر سے کڑکڑاتی آواز ابھری۔

''کون ہے... دھیرج ذرا... اوئے دروازہ توڑ ڈالے گا۔ کالیا ہے نا؟''

حارث ان ریمارکس پر اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے سنیل کھڑا تھا۔ انسپکٹر حارث کو دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ حارث اپنے ہونٹ بھینچ کر اسے گردن سے دبوچے دھکیلتا ہوا اندر لے آیا تو ذرا ٹھٹکا۔ ایک طرف بڑی خوب صورت نازنین کھڑی تھی۔ اس کے نفاست سے تہ کیے بالوں میں ڈبل گھیر والا ہیئر بینڈ تھا... وہ جس میز کے قریب چیئر پر بیٹھی تھی، اس کی سطح پر دو پانسے (Dice) پڑے تھے۔

لڑکی بازاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ یک دم سراسیمہ سی نظر آنے لگی۔ ادھر انسپکٹر حارث نے اپنی بیلٹ سے جھولتی ہوئی ہتھکڑی نکال کر سنیل کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑ کے اسے پہنادی۔

''یہ... یہ... کیا لفڑا ہے انسپکٹر صاحب؟ اکھا ممبائی جانے ہے اپن کو۔ ایک دم شریف انسان ہے اپن۔ آج تک کوئی لفڑا گری نہ کی پر یہ کیا پولیس گردی؟'' وہ گھبرا گیا۔

حارث نے اسے گھُرکا۔ ''بکواس بند کرو اپنی زبان کو ذرا تالا لگائے رکھو۔'' یہ کہہ کر حارث نے اسے ہتھکڑی لگی حالت میں ایک قریب دھری کرسی پر بیٹھنے کے انداز میں بٹھا دیا۔ اسے وہیں بیٹھے رہنے کا حکم دے کر اس کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کردی۔ اس کام میں وہ ماہر اور تجربہ کار تھا۔ پل کے پل اس کے ہاتھ میں وہ مووی کیمرا آ گیا جس کے لینس پر کیپ نہ تھا۔

''یہ مووی کیمرا تمہارا ہی ہے ناں؟'' حارث کیمرا اس کے چہرے کے سامنے لا کر بولا۔

''اپن کا ہی ہے باپ۔ آپ کو پسند ہے تو رکھ لو۔ اکھا ممبائی جانتا اپن کو ایک دم سخی ہے دل کا۔'' وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص فلمی لہجے میں بولا۔

حارث نے اگلا سوال کیا۔ ''اس کے لینس کا کیپ کدھر ہے؟''

''وہ تو کھو گیا ہے پر دوسرا مل جائے گا۔''

''کہاں کھو گیا؟''

''پتا نہیں باپ۔''

انسپکٹر حارث نے اسے زہریلی مسکراہٹ سے گھورا پھر اپنی جیب سے کیپ نکال کر اس کو دکھایا اور بولا۔ ''پہچانو اسے۔ یہی ہے اس کا ڈھکن؟ اس پر تمہارا پورا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ سنیل سکسینا۔''

''بالکل یہی ہے باپ۔ اپن کا ڈھکن... پر...'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا، اس کے چہرے پر اب تفکر اور پریشانی کے تاثرات ابھرے۔ حارث نے بڑے آرام سے وہ کیپ مووی کیمرے پر چڑھایا تو وہ اس پر بالکل فٹ آ گیا۔ حارث کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے زہر خند نظروں سے گھبراہٹ میں مبتلا سنیل کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''اب کیا کہتے ہو؟''

''بب... بالکل یہی ہے باپ۔'' وہ بولا۔

پھر حارث قریب آیا۔ کیمرا اس کی ہراساں نظروں کے سامنے لہرا کے انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔

''جانتے ہو مجھے تمہارا یہ کیپ کہاں سے ملا ہے؟''

''پپ... پتا نہیں... مجھے کیا معلوم؟'' وہ کچھ نگلنے کے انداز میں بولا۔

حارث نے بڑے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''یہ کیپ مجھے اس جگہ سے ملا ہے جہاں مدثر کا قتل ہوا تھا اور اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تم نے اور شکیل نے کس طرح سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت مدثر پر حملہ کر کے اسے کیوں قتل کیا تھا؟''

''باپ! اپن نے یہ قتل نہیں کیا۔ اپن کو تو ساحلِ سمندر

میں ڈوبتے سورج کا موڈی بنانے کا شوق ہے۔'' سنیل کے جواب پر اچانک انسپکٹر حارث بیگ کے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔

اس کیمرے کے اندر موجود کیسٹ کو چیک کیا اور پھر مووی کیمرے کی مائیکرو ریکارڈنگ اسکرین کھول کر کیسٹ کو پلے کر دیا۔ مووی کیمرے کی ریکارڈنگ اسکرین روشن ہو گئی اور ایک منظر ابھرا۔ اس منظر میں حارث نے مقتول مدثر کو دیکھا اور بری طرح ٹھٹک گیا۔ منظر جائے واردات کا ہی تھا۔ ابھی وہ بہ مشکل اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ اچانک سنیل نے کرسی سے اٹھ کر بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود حارث کو زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔

یہ حملہ حارث کے لیے نہ صرف اچانک تھا بلکہ خاصا زوردار بھی تھا۔ جس کا نتیجہ میں حارث اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔

ہینڈی کیم مووی کیمرا اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور پختہ فرش پر گرنے سے اس کے کچھ حصے کھل کر بکھرے۔ اندر سے ایک کیسٹ بھی اچھل کر باہر آ گئی جسے سنیل نے کمال پھرتی سے گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے منہ میں وہ کیسٹ دبائی اور اٹھ کر بچ بستہ ہاتھوں سمیت دروازے کی طرف دوڑا اور چشم زدن میں باہر نکل گیا۔ لڑکی ہراساں ہو کر ایک کونے میں جا دبکی۔

ادھر انسپکٹر حارث کا سر دیوار سے ٹکرانے کے باعث بری طرح جھنجھنا گیا تھا۔ چند ثانیوں تک اس کی آنکھوں کے سامنے کالے دائرے ناچتے رہے۔ دو چار بار اپنے سر کو جھٹکے دے کر بینائی اور حواس بحال کرنے کے بعد وہ بھی دروازے کی طرف سنیل کے تعاقب میں لپکا جبکہ سنیل چکردار چوبی سیڑھیوں کو ایک ہی چکر میں پھلانگ کر گرتا پڑتا گلی میں جا پہنچا جہاں تیمور کھڑا تھا مگر اس کی اس طرف پشت تھی۔

اوپر سے انسپکٹر حارث نے حلق کے بل چیخ کر تیمور کو خبردار کیا تو خیالوں میں کھویا ہوا تیمور یکدم بدکا پھر اپنے صاحب کو اوپر دیکھ کر وہ بجائے زمین پر لوٹ لگا کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سنیل کو پکڑنے کے چکردار زینے چڑھنے لگا۔ ادھر سنیل اڑن چھو ہوا ادھر تیمور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زینے طے کرتا اوپر پہنچا اور حارث کے سامنے گویا ناک سے ناک ملا کر اٹین شن ہو کر بولا۔

''حکم کریں سر۔''

حارث نے ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا اور تیمور جس تیزی کے ساتھ اوپر آیا تھا، اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ بغیر زینے کے نیچے آ رہا۔

سنیل کے منہ میں کیسٹ دبی ہوئی تھی، دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے مگر وہ اپنی ٹانگوں سے خوب کام لے رہا تھا۔ وہ جکڑ بند ہونے کے باوجود چھلاوا ثابت ہوا۔ وہ محلے کی گلیوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو گیا اور سیدھا ایک لوہار کی بھٹی پر جا پہنچا۔ سب سے پہلے اپنی ہتھکڑیاں کٹوائیں پھر کیسٹ کو جیب میں ڈالا اور غائب ہو گیا۔

حارث محلے کی آڑی ترچھی بے ترتیب گلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ گیا۔ اول جلول سا تیمور اس کے عقب میں تھا۔ دونوں ایک بند گلی میں آ کر رک گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

''بدبخت! تمہیں جو میں نے طوطے کی طرح رٹایا تھا کہ نیچے چوکس کھڑے رہنا مگر مجرم بندھی ہوئی حالت میں تمہاری ناک کے نیچے سے نکل گیا اور تم اوپر آسمان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟'' حارث نے غصیلے لہجے میں تیمور کو جھاڑا۔ تیمور مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''سر جی! میں تو آپ کی چیخ سن کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے اس لیے میں اوپر آپ کے پاس پہنچا مگر آپ نے ایک ہی تھپڑ مار کے مجھے دوبارہ نیچے پہنچا دیا۔''

''میرا بس چلتا تو میں تمہیں دوسرا تھپڑ مار کر جہنم میں پہنچا دیتا۔'' حارث نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا اور تیمور آنکھیں پٹپٹا کر رہ گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر حارث اس روز کی ناکامی کے باعث سارا دن جھلایا ہوا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ناقص کارکردگی پر خود بھی بہت شرمسار ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب آہنی ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے تھے وہ نہ صرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اپنے ساتھ اہم ترین ثبوت بھی لے اڑا تھا جس سے مدثر مرڈر کیس بس حل ہوا ہی چاہتا تھا۔

حارث کے پاس فی الوقت عقل کے گھوڑے دوڑانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ اب یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ سنیل نے اپنی آنکھوں کے سامنے مدثر کا قتل ہوتے دیکھا تھا مگر

اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ فلم کا پورا منظر نہ دیکھ پایا تھا کہ اچانک خلافِ توقع سنیل نے اس پر حملہ کردیا اور مدثر قتل کیس کا اہم ثبوت لے اُڑا۔

حارث نے اندازہ لگایا کہ یقیناً مدثر کے قتل میں شکیل کے ساتھ سنیل بھی شامل رہا ہوگا مگر دوسرے لمحے وہ یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سنیل کو بھلا مدثر کے قتل کی وڈیو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ منظر میں وہ ابھی صرف مدثر کو ہی دیکھ پایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سنیل اگر اس قتل میں شامل نہ تھا تو بھی یہ طے تھا کہ سنیل ایک طرح سے مدثر کے قتل کا ایک عینی گواہ ضرور تھا۔ حارث کی نظر میں یہ معاملہ اب سنسنی خیز اور گمبھیر ہوتا جارہا تھا۔ اس سے بڑھ کر پُراسراریت میں ایک لمحے کو یہ کیس سلجھتا ہوا محسوس ہوتا تو دوسری طرف الجھنے ہی لگتا تھا۔

حارث کو اب جلد از جلد سنیل کو گرفت میں لینا تھا۔ حارث کی نظر میں سنیل کی گرفتاری میں ہی مدثر کے قتل کا راز چھپا تھا چنانچہ سنیل کی تلاش کے سلسلے میں حارث نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے گھر کے قریب خفیہ مقام پر دو سادہ وردی والے پولیس اہلکار متعین کردیے۔ جیسے ہی سنیل اپنے گھر کا رخ کرتا، وہ اسے فوراً دھر لیتے عین اسی طرح حارث نے غزالہ کے گھر کی بھی خفیہ نگرانی کے لیے تیمور کو تعینات کردیا۔ اب حارث کو یقین تھا کہ سنیل اس کی رہائش گاہ کا بھی رخ کرسکتا تھا۔

یہ سارے انتظامات کرنے کے بعد وہ اب غزالہ سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ اپنے اپارٹمنٹ پہنچا اسے سخت بھوک لگی تھی۔ موٹا خانساماں مُنّا بھائی ایم بی بی ایف اس وقت ایک بڑا سا کفگیر ہاتھ میں تھامے کچن کی کھڑکی کے سامنے والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی ایک صحت مند سانولی سلونی پڑوسن کو گھورنے میں مصروف تھا۔

وہ پڑوسن کچن کی گرمی یا پھر مُنّا بھائی ایم بی بی ایف کی نظروں کی گرمی سے پسینے میں بھیگی ہوئی تھی اور کاٹھیاواری طرز کی کس کر بندھی ہوئی ساڑی میں اس کا صحت مند بھرا بھرا سلونا وجود مُنّا بھائی ایم بی بی ایف کو بے اختیار گنگنانے پر مجبور کررہا تھا۔ بالآخر مُنّا بھائی کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ کسی فلم کا ایک گیت گنگنانے لگا۔

تو چیز بڑی ہے مست مست
تو چیز بڑی ہے مست مست

''ابے او مہینے بھر کے راشن۔'' حارث نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہوکر اس کے شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے موٹے وجود کو گھورتے ہوئے دہاڑ کے کہا تو بے چارے مُنّا بھائی کے ہاتھ سے بھاری بھرکم اسٹیل کا کفگیر چھوٹ کر کھڑکی سے باہر جاگرا۔

ایک ٹن کی آواز ابھری پھر دوسری ٹن کی آواز آئی، تیسری بار ہائے کے ساتھ ہی باہر نیچے گلی میں شور مچ گیا۔

مُنّا بھائی کا چہرہ تو فق ہوا ہی تھا ساتھ میں حارث بھی پریشان ہوگیا۔ دانت پیس کر بولا۔

''ابے گوشت کے پہاڑ! پھاڑ دیا نا کسی کا سر، بدبخت تو تو اندر جائے گا ہی... ساتھ میں میری بھی پیٹی اتروائے گا۔ اب چپ رہنا اور قاتل کفگیر کی وراثت سے صاف مکر جانا، سمجھا؟''

''میں اپنے کفگیر سے دست بردار نہیں ہوسکتا صاحب جی۔'' مُنّا بھائی نے اعلان کیا۔ ''وہ میرا ذاتی اور خاندانی کفگیر تھا، میری اماں کی ساس کی بہو کی خالہ اور اس کی بہن کے جہیز کا... نادر و نایاب اور کمیاب بھی۔''

''ابھی تو تیرے اس لمبے چوڑے شجرۂ نسب والے کفگیر نے نیچے گلی میں کسی کو مضروب کردیا ہے، اس کا کیا ہوگا؟'' حارث نے اسے گھور کر ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کسی نے باہر سے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کردیا اور ساتھ ہی کفگیر پھینکنے والے کا شجرۂ نسب بھی کھنگالا جانے لگا۔

''ابے او کفگیر کی اولاد سنبھلتا نہیں تھا تو اتنا بڑا رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ جو ہاتھ سے پھسل گیا۔'' کوئی باہر حلق پھاڑ کے چلا رہا تھا۔ حارث پریشان ہوگیا۔ قصور ان کا ہی تھا، وہ کیا کرسکتا تھا۔ باہر دروازہ دھڑ دھڑانے کے ساتھ مسلسل آوازیں دی جارہی تھی۔

''ابے او... میری بیوی کا سر کھول دیا تو نے میری زوجہ کو کچھ ہوگیا تو دو بھر والوں گا تجھ سے۔''

''صاحب جی! آپ پریشان نہ ہوں میں جا کر دیکھتا ہوں۔ دو بھروائے گا مجھ سے کوئی پانی کی بالٹیاں ہیں یہاں ہم ایک کو ترسے ہوئے ہیں۔'' مُنّا بھائی نے کہا، آستین چڑھائیں اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولا تو ایک منحنی سی شے لڑھکتی ہوئی مُنّا بھائی کے اسپرنگ جیسے وجود سے ٹکرائی اور اسی طرح لڑھکتی ہوئی واپس سڑک پر جا پڑی۔ سامنے کچھ لوگ جنازہ جیسی شے کے گرد کھڑے فاتحہ پڑھتے محسوس ہوئے۔ وہ کوئی عورت تھی جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور مُنّا بھائی کا کفگیر اس کے قریب پڑا نظر آرہا تھا۔ لڑھکتی ہوئی منحنی شے دوبارہ اٹھی تو

مُنا بھائی نے دیکھا، وہ ایک پتلے تار جیسا دبلا شخص تھا۔ قد بھی گھٹا سا تھا بہت ہی غصے میں نظر آرہا تھا۔

وہ دوبارہ تیزی کے ساتھ مُنا بھائی کی طرف بڑھا۔ اس بار اس نے مُنا بھائی کے ملتے وجود سے ٹکرانے سے مکمل پرہیز کیا تھا۔ مبادا پھر اسے فٹ بال کی طرح سڑک پر نہ لڑھکنا پڑ جائے۔ اس نے شعلہ بار نظروں سے مُنا بھائی کو گھورا پھر آستین چڑھا کے باریک آواز میں بولا۔

''کفگیر تو نے اوپر سے پھینکا تھا؟''

''ہٹ پرے۔'' مُنا بھائی نے جھڑکا۔ مختصر الوجود شخص تھوڑا لڑھکا۔ مُنا بھائی بڑے آرام سے آگے بڑھے۔ سڑک پر سے کفگیر اٹھایا، بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا اور دعائیہ لہجے میں بولا۔

''شکر ہے خدا کا ٹیڑھا نہیں ہوا۔''

''ٹیڑھا تو میں تجھے کردوں گا۔'' منحنی سا آدمی طیش سے بولا۔ ''تجھے اپنے دو ٹکے کے کفگیر کی پڑی ہے ایک انسان کے بھیجے کی پروا نہیں۔''

''میرا کفگیر انسانوں کے بھیجے تلنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔'' مُنا بھائی نے بڑے آرام سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''میں تجھے دیکھ لوں گا، بہت اکڑتا ہے تو ایک پولیس افسر کا باورچی ہوکر۔'' منحنی شخص نے آنکھیں اور آستینیں چڑھا کر کہا۔

''آجا دیکھ لے مجھے اچھی طرح سے۔'' مُنا بھائی کسی بدمست کی طرح اس کی جانب گھوما، کفگیر اس کے ہاتھ میں تھا۔ منحنی وجود والے نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا پھر بولا۔

''دیکھ لیا۔''

''اب جاتا ہے یہاں سے یا پھونک مار کر رخصت کروں؟'' مُنا بھائی نے یہ کہہ کر ایک لمبی سانس کھینچی تو اس کے دونوں گال غبارے کی طرح پھول گئے۔ منحنی سے وجود والا شخص ڈر کے اس سے دور کھڑا ہوکر بے بسی سے اپنے دانت کچکچانے لگا۔

اس اثنا میں اندر سے انسپکٹر حارث نمودار ہوا، اس نے ڈانٹ کر مُنا بھائی کو اندر جانے کا حکم دیا پھر اس منحنی سے وجود والے شخص سے معذرت کی اور اسے اچھی خاصی رقم دے کر زخمی بیوی سمیت ایک رکشے میں رخصت کردیا۔ اندر آکر حارث نے مُنا بھائی سے صاف لہجے میں کہا۔

''تیرے دو ماہ کی تنخواہ کٹ گئی اس خرچے میں۔''

''تو پھر کھانا بھی بند۔'' مُنا بھائی نے بھی اعلان کرڈالا۔

''تیرا جیل گھاٹ میں تبادلہ کرنے والا ہوں میں۔'' حارث نے بانسا پھینکا اور مُنا بھائی کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جیل گھاٹ میں نوکری کرنے والے اس جیسے باورچی کی وہاں کیا درگت بنتی تھی۔

وہ گھگیا کر بولا۔ ''یہ... ظلم مت کرنا صاحب جی، مجھے منظور ہے آپ کی بات۔''

''ہرگز نہیں، تو بہت منہ چڑھا ہوگیا ہے، بہت برداشت کرلیے میں نے تیرے نخرے۔''

''صاحب جی، آپ نے میرا نمک کھایا ہے۔''

''کیا...؟'' حارث نے اسے گھورا۔

''مم... میرا مطلب ہے میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔'' مُنا بھائی یکدم گڑبڑا کر بولا۔

''اب گولی کھا۔'' حارث نے گبر سنگھ کی طرح کہا اور اپنا سرکاری پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ مُنا بھائی بھاگ کر کچن میں جا گھسا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ حارث کو ہنسی آگئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ دہاڑ کے بولا۔

''فوراً کھانا لگا مجھے سخت بھوک لگی ہے ایک ضروری کام سے مجھے جلدی جانا ہے۔''

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد کھانا کھا کے حارث اپنی جیپ میں روانہ ہوچکا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد اس کی جیپ غزالہ کے گھر کے سامنے رکی۔ ایک گارڈ وہاں کھڑا تھا۔ حارث اس بار وردی میں آیا تھا۔ وہ جیپ سے اترا ہی تھا کہ اچانک گیٹ کھلا اور لمبی سی سفید کار برآمد ہوئی۔ یہ نئے ماڈل کی فیٹ تھی، اندر صرف ایک شخص براجمان تھا اور وہی کار ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور کلین شیو تھا، چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ حارث نے عقابی نظروں نے اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کے درمیان لگایا۔ وہ کار گیٹ سے برآمد ہونے کے بعد آگے نکل گئی۔ حارث نے اس شخص کے بارے میں سوچا کہ یہ غزالہ کا باپ عادل ترمذی ہوسکتا ہے مگر گارڈ سے ملنے کے بعد اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

''غزالہ بی بی تو اندر نہیں ہیں مگر ان کے والد سیٹھ صاحب اندر موجود ہیں لیکن وہ اس وقت کسی سے مل نہیں سکتے۔'' گارڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ شاید صاحب کی اندر موجودگی کے باعث وہ اب سرد مہری پر اتر آیا تھا اگرچہ انسپکٹر حارث کو سیٹھ عادل سے نہیں ملنا تھا بہ صورت دیگر وہ

اس گارڈ کی اکڑفوں نکال سکتا تھا تاہم اس نے پوچھا۔
''کیا بتا سکتے ہو غزالہ بی بی اس وقت کہاں گئی ہوئی ہیں اور کب تک لوٹیں گی؟''
''کچھ نہیں کہا جا سکتا، وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔'' گارڈ نے بدستور سرد مہری سے جواب دیا۔
انسپکٹر حارث پلٹا اور اپنی جیپ میں سوار ہو کر اسٹیئرنگ کو پکڑے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ وہاں سے سیدھا ہیڈ کوارٹر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ کوئی خاتون اس سے ملنا چاہتی ہیں۔ اس اطلاع پر وہ چونکا اور یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اس سے ملاقات کے لیے آنے والی خاتون غزالہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی... بہر طور اس نے اس خاتون کو اندر بھیجنے کا حکم دیا۔
آنے والی غزالہ نہیں تھی۔ وہ اس سے زیادہ پُرکشش تھی مگر اپنے لباس اور وضع قطع سے ایک اوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ حارث بہ غور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ.... آزردہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔
''جی محترمہ... تشریف رکھیں۔'' حارث نے اپنے سامنے والی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکی سلام اور شکریہ کہنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی اداس آنکھوں کے گرد حلقے ابھر آئے تھے۔ وہ جانے کتنی دیر روتی رہی تھی۔
''جی محترمہ... آپ کا نام؟ مزید یہ کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' حارث نے بدستور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے آنے کا مقصد بھی دریافت کیا۔
لڑکی نے جب ہولے سے کہنا شروع کیا تو اس کا گلا قدرے رندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے نام سے بات کا آغاز کیا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔
''میرا نام ستارہ ہے اور میں صرف یہ پوچھنے یہاں آئی ہوں کہ کیا مدثر کے قاتل کا سراغ لگ سکا؟'' اس کی بات پر حارث چونک گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنی بھوئیں سکیڑے اس کے چہرے کا بہ غور جائزہ لینے کے دوران جواب دینے کے بجائے مستفسر ہوا۔
''مقتول مدثر کی آپ کیا لگتی ہیں؟''
حارث کے سوال نے شاید ستارہ نامی دل نواز لڑکی کا کوئی زخم ہرا کر دیا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں کی اداسی کا کرب سوا ہوتا محسوس ہونے لگا پھر رنجیدہ لہجے میں ہولے سے اپنا سر جھکائے بولی۔
''میرا مدثر سے گہرا قلبی تعلق تھا۔''
یہ جواب سن کر حارث بیگ نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''گویا آپ اس سے... میرا مطلب ہے مقتول مدثر سے محبت کرتی تھیں؟''
''جی ہاں۔''
''کیا وہ بھی آپ سے محبت کرتا تھا؟''
''جی ہاں ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔'' ستارہ نے دکھی اور حسرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔
انسپکٹر حارث اس کے جواب پر بری طرح چکرا گیا۔ کیس سلجھتے سلجھتے مزید الجھ گیا تھا کیونکہ حارث کی مستند معلومات کے مطابق غزالہ مقتول مدثر سے محبت کرتی تھی اور مقتول مدثر بھی غزالہ سے محبت کرتا تھا جبکہ اب یہ ستارہ نامی لڑکی بھی مدثر سے محبت کی دعویدار تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بات بھی پورے یقین سے کہہ رہی تھی کہ مقتول مدثر بھی اس سے محبت کرتا تھا۔
اس نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا۔ ''کیا مدثر سے آپ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں؟''
''ظاہر ہم دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے اس لیے ملتے رہتے تھے بلکہ شادی بھی کرنے والے تھے۔'' ستارہ نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا، وہ اب روہانسی ہو رہی تھی۔
انسپکٹر حارث کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ مقتول مدثر سے محبت کرنے کی بیک وقت دو دعویدار کہاں سے پیدا ہو گئیں مگر کچھ ذہن لڑانے کے بعد اسے ستارہ پر شبہ ہوا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ مدثر سے اصل محبت کی دعویدار غزالہ ہی تھی جس کی تصدیق ان دونوں کے کلاس فیلوز کر چکے تھے۔ ان میں اشوک کمار کا بیان سرفہرست تھا پھر شکیل نے بھی کہا تھا کہ غزالہ واقعی مدثر سے محبت کرتی تھی۔
شکیل کا خیال ذہن میں آتے ہی حارث کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ گرفتاری کے بعد دورانِ تفتیش حارث کو یاد تھا کہ شکیل نے مقتول مدثر سے اپنے ذاتی جھگڑے یا چپقلش کی اہم وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ یعنی مدثر، غزالہ کے ساتھ فلرٹ یعنی محبت کے نام پر اسے دھوکا دے رہا تھا یعنی شکیل کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مدثر درحقیقت غزالہ سے نہیں کسی اور لڑکی سے محبت کرتا تھا تو کیا وہ دوسری لڑکی یہی ستارہ ہی تھی۔ جو اس کے سامنے غمگین صورت بنائے بیٹھی اپنے محبوب کے قاتل کی گرفتاری کے بارے میں استفسار کر رہی

تھی۔

انسپکٹر حارث چند ثانیے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ''ستارہ صاحبہ، کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ...''

''انسپکٹر صاحب! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' معاً ستارہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

حارث بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''مقتول مدثر کے قتل کے شبہے میں، میں نے شکیل احمد خان اور سنیل سکسینا نامی دو افراد کو گرفتار کیا تھا مگر ابھی تفتیش جاری ہے۔''

''قاتل کی جلد از جلد گرفتاری سے متعلق کوئی امید ہے؟''

''ہاں... کافی حد تک ہم پُرامید ہیں۔ مدثر کے اصل قاتلوں تک جلد پہنچ جائیں گے۔''

''قاتلوں...؟'' وہ الجھ سی گئی اور وضاحت طلب نگاہوں سے حارث کی طرف دیکھنے لگی۔

حارث اس کے سوالیہ انداز اور سوالیہ نگاہوں کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ''ہاں ستارہ بی بی، شواہد و حالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مدثر کے قتل میں شاید ایک سے زائد افراد ملوث ہیں۔''

''کیا مدثر کی خطرناک لوگوں کے ساتھ پہلے سے کوئی دشمنی چل رہی تھی اور یہ اسی دشمنی کا شاخسانہ ہے؟''

''ابھی تک یہ بات ظاہر نہیں ہوئی ہے تاہم آپ اپنا پتا وغیرہ بتا دیں تاکہ جیسے ہی مدثر کے اصل قاتلوں کو گرفتار کرلیا جائے تو آپ کو مطلع کیا جاسکے۔'' انسپکٹر حارث نے دانستہ ایسا کہا تھا مگر ستارہ نے اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا البتہ اس پرائیویٹ کمپنی کا نام ضرور بتادیا جہاں وہ ایک معمولی پوسٹ پر نوکری کرتی تھی۔

''آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے؟'' ستارہ نے اسے یاد دلایا۔

حارث ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ مقتول مدثر کا چکر آپ کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ بھی چل رہا تھا جو اس کی کلاس فیلو تھی اور اس کا نام غزالہ ہے؟''

حارث کی کھوجتی نظروں نے فوراً اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے محسوس کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ جانتی ہے مگر ستارہ نے دھیرے سے نفی میں جواباً کہا۔

''نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی مگر مجھے مدثر کی محبت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ مجھے کبھی بھی دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔''

''یہ آپ کا خیال ہے مگر بعض چشم دید گواہوں کے مطابق...''

''میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا انسپکٹر صاحب۔ میں اب آپ سے اس امید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ آپ بہت جلد مجھے مدثر کے اصل قاتلوں کی گرفتاری سے متعلق خوش خبری سنائیں گے۔'' ستارہ نے اس کی بات کاٹ کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر حارث نے اس کے چہرے پر سپاٹ سی نظریں مرکوز کرتے ہوئے اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ ستارہ کے رخصت ہونے کے بعد وہ خاصی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ ایک نئے کردار کی آمد پر وہ خاصا الجھ گیا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی پُرجوش آواز ابھری۔ ''سر! سنیل کو میں نے ٹریس کرلیا ہے۔''

''گڈ۔'' حارث نے بے اختیار توصیفی لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تفصیل بتاؤ؟''

''سر وہ اس وقت سیٹھ عادل ترمذی کی کوٹھی کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہا ہے اور خاصا عجلت میں ہے۔''

''گڈ! تم وہیں چوکس کھڑے رہو اور بدستور اس پر نظر رکھنا، میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔''

''جیسا آپ کا حکم سر۔'' تیمور نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ حارث نے رابطہ منقطع کردیا۔ ریسیور کریڈل پر پٹخا اور تیزی کے ساتھ اپنی کیپ سنبھالتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کا رخ گاندھی گارڈن کی طرف تھا۔ جہاں سیٹھ عادل ترمذی (غزالہ) کی رہائش گاہ تھی۔ جیپ میں اس وقت اس کے ہمراہ پانچ پولیس مین بھی موجود تھے۔

جب وہ گاندھی گارڈن پہنچا تو اسے اپنی جیپ کے وائرلیس پر تیمور کی کال موصول ہوئی۔

''سر سنیل گیٹ سے برآمد ہو رہا ہے، کیا میں اسے پکڑ

لوں؟ اوور!‘‘

’’ہرگز نہیں، تم محض اس کا تعاقب کرو اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بتاتے چلو اپنی لوکیشن کہ تم کس راستے پر اس کا... تعاقب جاری رکھے ہوئے ہو، سمجھ گئے؟ اوور!‘‘

’’جی سر، میں سمجھ گیا۔ اوور!‘‘

’’او کے اب تم اپنا وائرلیس مسلسل آن رکھو گے، اوور۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر۔ اب میں اس کے تعاقب میں روانہ ہو رہا ہوں۔ اوور۔‘‘

’’گڈ! اب مجھے بتاتے چلو کہاں سے کس طرف جارہے ہو تم؟ اوور۔‘‘

’’سر! گاندھی گارڈن کے آخری بڑے پلازا کو کراس کرنے والا ہوں، اوور۔‘‘

’’او کے۔‘‘ حارث نے کہا اور جیپ کو فوراً ایک شارٹ کٹ راستے پر ڈال دیا۔

☆☆☆

تیمور اپنی جنگ عظیم کے دور کی ڈبل سائلنسر سرکاری بائیک پر تھا جبکہ بہ قول اس کے سنیل بھی ایک بائیک پر سوار تھا۔ انسپکٹر حارث نے پل پل کا حساب نکالا۔

ایک آخری شارٹ کٹ مارا اور گاندھی گارڈن کے آخری پلازا... کے مصروف چوراہے پر آ گیا جو بڑا چوک کہلاتا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ سامنے سے ہی سنیل ایک تیز رفتار بائیک پر آتا دکھائی دیا۔

پولیس کی جیپ کو بیچ چوراہے پر کھڑا دیکھ کر وہ پہلے تو بری طرح بوکھلا گیا مگر پھر فوراً سنبھلتے ہوئے اس نے دائیں جانب بائیک کو موڑ دیا۔ جیپ سائرن بجاتی اس کے تعاقب میں دوڑی۔

سنیل کے عقب میں تیمور اپنی بائیک پر تیزی سے چلا آرہا تھا۔ بھاری بھرکم بائیک پر اس کا منحنی سا وجود یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک موٹے تازہ بیل پر کوئی بندر اس کے سینگ پکڑے بیٹھا ہو۔ بہرحال تعاقب جاری تھا۔

سنیل کی بائیک آگے تھی۔ حارث کی جیپ اس کے تعاقب میں اور سب سے آخری میں تیمور۔ سنیل نے بائیک جیسی آسان سواری کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بجائے کھلی سڑک پر دوڑانے کے نسبتاً تنگ اور کمرشل اسٹریٹ پر اپنی بائیک موڑ لی۔ حارث اس کی چال سمجھ گیا۔ اس نے جیپ دوسری جانب گھما دی اور وائرلیس کے ذریعے تیمور کو سنیل کی بائیک کے پیچھے بدستور تعاقب جاری رکھنے کا حکم دیا لہٰذا اس کے پیچھے تیمور اپنی بھاری بائیک دوڑاتا ہوا نسبتاً تنگ سی کمرشل اسٹریٹ میں جا گھسا۔ ہیوی بائیک کی زوردار گڑگڑاہٹ سے پوری مصروف گلی میں جیسے بھونچال آ گیا۔

سنیل نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ اس نے مڑ کے عقب میں دیکھا اور غصے سے دانت پیس لیے۔

اس نے ایکسلریٹر گھمایا اور اپنی ہلکی پھلکی بائیک کو ایک وہیل پر دوڑاتا ہوا سڑک پر لے آیا۔ ٹھیک اسی وقت انسپکٹر حارث کی جیپ بھی اس کے سر پر آن پہنچی۔ سنیل نے ہینڈل گھما کر اپنی بائیک موڑنے کی کوشش کرنی چاہی مگر عقب سے دندناتی ہوئی تیمور کی ہیوی بائیک نے اس کی دبلی پتلی اسمارٹ بائیک کو ٹکر ماری۔ سنیل کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ فضا میں اڑتا ہوا سیدھا انسپکٹر حارث کی جیپ کے بونٹ پر گرا۔ اس کے بعد باقی کام تیزی کے ساتھ انجام پایا۔

جیپ میں سوار پانچوں سپاہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اترے اور سنیل کو چند لمحوں میں کس دیا۔ انسپکٹر حارث نے خوشی سے اپنے ہونہار اسسٹنٹ تیمور کی پیٹھ تھپتھپائی اور توصیفی لہجے میں بولا۔

’’شاباش! اس طرح بہادری دکھایا کرو۔ تمہاری ٹکر سے سنیل بے بس ہو کر گر پڑا تھا ورنہ بھاگ چکا ہوتا۔ تمہیں محکمے سے جرأت مندی پر انعام دلواؤں گا۔‘‘

جواباً تیمور سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ’’ضرور سر! اس انعام کی رقم سے میں سب سے پہلے اپنی پرانی بائیک کے بریک ٹھیک کرواؤں گا۔‘‘

’’دھت تیرے کی... سارا مزہ کرکرا کر دیا۔‘‘ انسپکٹر حارث ہولے سے بڑبڑاتا ہوا اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سنیل کو لاک اپ کرنے کے بعد حارث نے کچھ سکون کا سانس لیا۔ اب وہ بڑے آرام سے سنیل سے بہت کچھ اگلوا سکتا تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ شکیل کو اپنے کمرے میں بلانے والا تھا۔ اس سے پہلے وہ چند ضروری نوعیت کے کام نمٹانے لگا۔

اس دوران میں ایک ماتحت نے بتایا کہ آج شکیل کی ملاقات آئی تھی۔ حارث کی ہدایت تھی کہ شکیل سے جو بھی ملاقات کے لیے آئے اس کے بارے میں اسے ضرور آگاہ کیا جائے۔

ماتحت سپاہی نے بتایا کہ غزالہ نامی ایک لڑکی ملزم

شکیل سے ملنے آئی تھی۔ ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ حارث پھر الجھ سا گیا۔ غزالہ کا جھکاؤ شکیل کی طرف بڑھ رہا تھا مگر کیوں جبکہ وہ جانتی تھی کہ اسے اس کے محبوب کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ غزالہ یہ نہیں مانتی تھی کہ شکیل اس کے محبوب مدثر کا قاتل ہو سکتا ہے۔

بہر حال حارث نے کچھ سوچ کر ایک گہری سانس لی پھر سنیل کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اب وہاں انسپکٹر حارث، سنیل اور اسسٹنٹ تیمور کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

سنیل کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور اسے کمرے کے وسط میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا وہاں پریشانی کا ذرہ بھر شائبہ تک نہیں تھا۔ انسپکٹر حارث ہاتھ میں سیاہ رول پکڑے اپنی چیئر سے اٹھا اور سامنے آ کر میز پر ٹک گیا۔

چند ثانیے کھڑے سپاٹ چہرہ لیے سنیل کو گھورتا رہا پھر ہولے ہولے اپنے رول کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے لگا پھر بولا۔ ''سنیل سکسینا! میں نے تمہیں مقتول مدثر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا اور پھر شک کا فائدہ دیتے ہوئے تمہیں رہا بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد تمہیں قانون سے تعاون کرنا چاہیے تھا مگر اس روز تم نے میرے ساتھ جو حرکت، اس کے باعث تم نے ایک بار پھر خود کو قانون کی نظروں میں مشکوک بنا لیا ہے۔''

حارث اتنا کہہ کر ذرا رکا ہی تھا کہ سنیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نے مدثر کا قتل نہیں کیا ہے۔''

''میں نے تم سے ابھی یہ نہیں پوچھا ہے۔'' حارث نے بہ دستور اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم جانتے ہو میں تم سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔'' لحظہ بھر کے توقف کے بعد بالآخر حارث نے اس سے وہ اہم اور پہلا سوال کیا۔ ''وہ کیسٹ کہاں ہے؟''

''کون سی کیسٹ؟'' سنیل فوراً انجان بن گیا۔

حارث اس کی ڈھٹائی پر دانت پیس کر بولا۔ ''وہ کیسٹ جو تم کسی کتے کی طرح اپنے منہ میں دبا کر بھاگے تھے جس میں مدثر کے قتل کی تم نے پوری مووی ریکارڈ کر رکھی تھی؟''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ایسی مووی نہیں تھی۔'' سنیل نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''تو پھر تم اسے کتے کی طرح اپنے منہ میں دبا کر کیوں بھاگے تھے؟''

''اس کیسٹ میں ساحلِ سمندر پر موجود چند جوڑوں کے قابلِ اعتراض مناظر تھے۔''

''ایسے نہیں مانو گے تم؟'' حارث غصے سے پھنکارا۔

ٹھیک اسی وقت ایک اردلی نے آ کر بتایا کہ کوئی جوگندر پال نامی شخص اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

''ابھی میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا، اس سے کہو انتظار کرے میرا۔''

''سر وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تمہارے صاحب سے اسی وقت...''

''شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔'' حارث نے اردلی کو غصے سے ڈانٹ دیا۔ وہ فوراً الٹے پاؤں باہر چلا گیا۔

حارث چند قدم چلتا ہوا سنیل کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا اور غصے سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''شرافت کے ساتھ وہ کیسٹ میرے حوالے کر دو ورنہ مجھے پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرنا آتا ہے۔''

جواباً سنیل اسی اطمینان سے بولا۔ ''میں نہیں جانتا آپ کون سی کیسٹ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' یہ سن کر حارث آپے سے باہر ہونے ہی لگا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اس کے پرسنل فون کی گھنٹی تھی، اس نمبر پر اعلیٰ افسران بہ وقت خاص اس سے رابطہ کرتے تھے۔ وہ عام نمبر کے فون کی گھنٹی کو خاطر میں نہ لاتا اور اپنا غبار سنیل پر ضرور نکالتا اب مجبوراً اسے غصہ پینا پڑا اور وہ سنیل کو گھورتا ہوا اپنی میز کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھایا اور بولا۔

''ہیلو!''

''انسپکٹر حارث، کرائم برانچ؟'' دوسری جانب سے گمبھیر استفہامیہ آواز ابھری۔

''یس سر۔'' حارث نے مؤدبانہ کہا۔ وہ شاید اپنے اعلیٰ افسر کی آواز پہچان نہ سکا تھا۔

''جوگندر پال نامی ایک شخص تم سے ملنے آیا ہے۔ اس سے ابھی اور فوراً ملاقات کرو۔ تم نے کسی سنیل سکسینا نامی شخص کو لاک اپ کر رکھا ہے۔ یہ اسی شخص کی ضمانت لے کر آیا ہے۔'' اعلیٰ آفسر نے کہا اور حارث کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

حارث جانتا تھا اس طرح کہہ کر دوسری طرف سے فوراً رابطہ منقطع کرنے کا مطلب حکم کی پیروی کرنا ہی تھا۔ وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اپنے ہونٹ بھینچ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا پھر بیل دے کر اردلی کو اندر بلایا۔ اور اسے باہر منتظر کھڑے کسی جوگندر پال کو اندر

لانے کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد جو شخص اندر داخل ہوا، اسے دیکھ کر حارث ذرا چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے مگر کہاں... یہ اسے سرِدست یاد نہیں آرہا تھا۔

''میرا نام جوگندر پال ہے۔'' اس شخص نے کھرکھراتی آواز میں اپنا تعارف کروایا اور مصافحے کے لیے حارث کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ حارث نے محض چھونے کے انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔

''میں اس کی ضمانت لے کر آیا ہوں۔'' جوگندر پال نے سنیل کی طرف اشارہ کر کے کہا پھر کچھ کاغذات حارث کی طرف بڑھائے۔ حارث بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ اسے سنیل کو چھوڑنا پڑا۔

اس کے جانے کے بعد حارث نے قریب کھڑے تیمور کو فوراً ان کے پیچھے جانے کا حکم دیا پھر خود پُرسوچ انداز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا اس نے جوگندر پال کو کہاں اور کب دیکھا تھا۔

ذہن پر خاصا زور دینے کے بعد اچانک اس کے اندر روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آگیا کہ جوگندر پال کو اس نے ایک نئے ماڈل کی سفید فیٹ کار میں سیٹھ عادل ترمذی کی کوٹھی سے نکلتے دیکھا تھا۔

''تو گویا یہ سیٹھ عادل ترمذی کا آدمی ہے۔'' حارث گومگو کے انداز میں بڑبڑایا کہ اس نے سنیل کی ضمانت کس کے ایما پر کرائی تھی؟ کیا سیٹھ عادل ترمذی کے کہنے پر؟ یا پھر سنیل کا جوگندر پال سے کوئی اپنا ذاتی تعلق تھا؟ اور سیٹھ عادل کا سرے سے اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو۔ ایسے ان گنت سوالات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔

یہ بات بھی اس کے لیے ایک عرصے سے باعث الجھن بنی ہوئی تھی کہ آخر سنیل کیوں اکثر و بیشتر سیٹھ عادل کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ کیا اس کا مقصد سیٹھ عادل سے ملاقات ہوتی تھی یا اس کی بیٹی غزالہ سے ملنا؟

مدثر مرڈر کیس اسے پُراسرار انداز میں الجھتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے قریب کھڑے تیمور سے تحکمانہ کہا کہ ملزم شکیل کو پیش کرے۔

ذرا دیر بعد شکیل اس کے سامنے تھا۔ حارث نے اس بار اس کے ساتھ نرم رویہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول مدثر کی کسی اور لڑکی سے بھی دوستی تھی۔''

''جی ہاں میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ وہ غزالہ کو دھوکا دے رہا تھا اور میں یہی بات غزالہ کو سمجھانا چاہتا تھا مگر وہ اسے میری رقابت کا شاخسانہ سمجھتی تھی پھر میں نے مدثر کو بھی...''

''اس لڑکی کا نام بتا سکتے ہو؟'' حارث نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''ستارہ نام تھا اس کا۔'' شکیل نے بتایا۔ یہ سن کر حارث کو صاف محسوس ہونے لگا کہ شکیل بے گناہ ہے۔ اگرچہ وہ قتل سے چند منٹ پہلے مدثر سے ملا ضرور تھا مگر قتل کی واردات کسی اور نے کی تھی کیونکہ شکیل کی یہ بات بہرحال درست ثابت ہوئی تھی کہ مقتول مدثر، ستارہ کو بھی چاہتا تھا اور غزالہ سے فلرٹ کر رہا تھا مگر کیوں؟

''ستارہ نامی وہ لڑکی یہاں آئی تھی۔'' حارث نے شکیل کو بتایا۔ ''وہ بے چین تھی کہ مدثر کے قاتل کا اب تک کیوں نہیں سراغ لگایا جاسکا۔ میں نے تمہارے بارے میں اسے بتایا تھا مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔'' بالآخر حارث کو شکیل کے سامنے سچی بات کہنا پڑی۔

شکیل بھی ستارہ کے آنے کے ذکر پر قدرے چونکا، وہ بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! اب تو آپ کو کافی حد تک یقین ہو جانا چاہیے تھا کہ میرا مقصد مدثر کو صرف سمجھانا تھا۔ قتل کرنا نہیں میں کبھی انتہائی قدم اٹھانے کا... سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں غزالہ سے سچی محبت کرتا ہوں اگر مدثر کو غزالہ چاہتی تھی تو میں ایسا ہرگز نہیں کہ غزالہ یا مدثر کا جانی دشمن بن جاتا بلکہ اگر مدثر واقعی غزالہ سے سچی محبت کرتا ہوتا تو میں خود ہی خاموشی سے دونوں کے راستے سے ہٹ جاتا لیکن مجھے قلق اس بات کا تھا کہ وہ غزالہ کو محبت کے نام پر دھوکا دے رہا تھا۔''

''کیوں...؟ وہ غزالہ کو دھوکا کیوں دے رہا تھا؟'' حارث نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ ایسا کرنے میں اس کا کیا مقصد تھا۔'' شکیل نے تذبذب سے لہجے میں کہا۔

''ایک بات بتاؤ مجھے شکیل، تمہارے خیال میں مدثر کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ کسی پر شبہ ہے تمہیں؟''

''یہی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے انسپکٹر صاحب کہ مدثر کا معاملہ کم از کم میری نظر میں اس قدر سنگین تو نہیں تھا کہ اس بے چارے کو قتل ہی کر دیا جاتا۔ یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا

ہے۔'' شکیل نے جواب دیا۔

معاً اردلی اندر داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔ ''سر کوئی غزالہ نامی خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔''

غزالہ کے نام پر انسپکٹر حارث بلکہ شکیل بھی چونکا تھا۔ حارث نے ایک نظر شکیل پر ڈالی لمحہ بھر کچھ سوچا پھر اردلی کو سر کی جنبش سے اثباتی جواب دیا۔

غزالہ اندر داخل ہوئی۔ شکیل اور غزالہ کی سب سے پہلے آنکھیں چار ہوئیں۔ شکیل کو ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر اس کے چہرے کا کرب اور آنکھوں میں اتری ہوئی ندامت و شرمندگی مزید گہری ہونے لگی جبکہ شکیل کی آنکھوں میں حسرت تیر رہی تھی۔

''بیٹھیں غزالہ صاحبہ۔'' حارث نے اس سے کہا۔

وہ آگے بڑھی اور حارث کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی پھر ایک دکھ بھری نگاہ شکیل پر ڈال کر حارث سے مخاطب ہوئی۔

''انسپکٹر صاحب! یہ بے گناہ ہے۔ اسے چھوڑ دیجیے۔ کیا میں اس کی ضمانت دے سکتی ہوں... پلیز؟'' اس کے کرب سے کپکپاتے لہجے میں دکھ بھری التجا تھی۔

حارث نے کہا۔ ''میں پہلے آپ سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہوں گا۔ میں دوسری بار آپ کی رہائش گاہ پر بھی گیا تھا مگر آپ نہیں ملی تھیں۔''

''جی پوچھیے۔'' غزالہ یہ کہہ کر ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

حارث نے سوال کیا۔ ''سنیل کو تو آپ جانتی ہیں اچھی طرح۔''

''جی۔''

''اور جہاں تک میرے علم میں یہ بات ہے کہ آپ کو اس روئے زمین پر جس شخص سے شدید نفرت ہے، وہ یہی شخص ہے؟''

''جی ہاں، وہ ہے ہی قابلِ نفرین آدمی۔'' غزالہ نے یہ بتاتے ہوئے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔

''تو پھر وہ آپ سے اکثر ملنے کیوں آتا ہے؟'' حارث نے جیسے دھماکا کیا۔

غزالہ بری طرح چونک پڑی، اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''کک... کیا... سس... سنیل مجھ سے ملنے آتا ہے؟''

''جی ہاں، غزالہ صاحبہ، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دوسری بار جب وہ آپ کی رہائش گاہ سے نکل رہا تھا تو ہم نے اس کا تعاقب کر کے اسے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ایک بات پر مجھے اس پر شبہ ہوا تھا مگر سنیل کو گرفتار کرنے کے فوراً بعد ایک جوگندر پال نامی شخص نے اس کی ضمانت کروا لی تھی۔ جوگندر پال آپ کے والد سیٹھ عادل ترمذی کے ہاں آتا جاتا دیکھا گیا ہے اور یقیناً آپ جوگندر پال کو بھی جانتی ہوں گی۔ میرا خیال ہے اتنی باتوں کے باوجود آپ جھوٹ نہیں بول سکتیں۔'' حارث اتنا کہہ کر خاموش ہوا اور جانچتی ہوئی نظریں... غزالہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ غزالہ کچھ پریشان اور ہراساں سی نظر آنے لگی۔ شکیل کے چہرے پر بھی الجھن آمیز تاثرات ابھر آئے تھے۔

''ان ساری باتوں کے تناظر میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ... کچھ بلکہ بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔'' انسپکٹر حارث نے پہلو بدل کر گویا اپنی بات مکمل کرنا چاہی تھی، اس کا لہجہ از حد سنجیدہ تھا۔

''مس غزالہ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں لیکن جانے کیوں آپ اس کا نام ظاہر کرنے سے کترا رہی ہیں۔ ممکن ہے قاتل نے آپ کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر آپ کو اب تک خاموش رہنے پر مجبور کر رکھا ہو یا پھر...''

اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ اسی وقت تیمور کی کال موصول ہوئی۔ کال اٹینڈ کرنے کے بعد حارث کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور شکیل اور غزالہ کو وہیں حیران و پریشان چھوڑ کر باہر نکلا اور اپنی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

تیمور نے کال کر کے حارث کو فوراً کالی گھاٹ پہنچنے کا کہا تھا۔ حارث وہاں پہنچا تو اسے بے چینی کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔

''سر! میں نے دونوں کا تعاقب کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سنیل ایک چوراہے پر اتر گیا تھا اور جوگندر پال آگے بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے سنیل ایک رکشے میں بیٹھ کر یہاں پہنچا اور سامنے والے گھر میں داخل ہوا ہے۔'' تیمور نے تفصیل بتائی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' حارث نے کہا پھر دونوں اس گھر کی طرف بڑھے۔ حارث نے سرکاری پستول نکال لیا اور دروازے پر زوردار لات رسید کر دی۔ دروازہ ٹوٹ کر گرا۔

اس وقت سنیل باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ بری طرح ٹھٹکا مگر دوسرے لمحے اکڑتا ہوا غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ پولیس گردی نہیں چلے گی انسپکٹر۔ میں ضمانت پر رہا ہو چکا ہوں۔''

حارث ...... غصے سے دانت پیس کر خون رنگ لہجے میں بولا۔ ''تیرے جیسے بدمعاشوں کے ساتھ پولیس گردی ہی ہونی چاہیے۔'' کہتے ہوئے حارث نے تیمور کو مخصوص اشارہ کیا۔ تیمور نے آگے بڑھ کر سنیل پر گن تان کر اسے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ انسپکٹر حارث کا انداز سو فی صد درست ثابت ہوا۔ سنیل کے نئے خفیہ ٹھکانے پر تھوڑی تلاشی کے بعد وہ مطلوبہ کیسٹ اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔

☆☆☆

ہیڈ کوارٹر... پہنچ کر اس نے کیسٹ چلا کے دیکھی اور اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ سنیل کو وہ ایک بار پھر ہتھکڑی لگا کے لاک اپ کر چکا تھا۔

سنیل کے قبضے سے برآمد ہونے والی کیسٹ دیکھنے کے بعد انسپکٹر حارث کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ مدثر کا قاتل ایک ایسا شخص بھی ہو سکتا تھا جو اکثر اس کی نظروں کے سامنے ہی رہتا تھا چنانچہ انسپکٹر حارث بیگ نے سنیل کو جکڑی ہوئی حالت میں یہ کیسٹ چلا کر دکھا دی تاکہ اب وہ اگلی پچھلی ساری تفصیل بلا کم و کاست پولیس کے سامنے بیان کر دے۔

سنیل بہرحال مدثر کا قاتل تھا نہ ہی اس جرم کا شریکِ کار تھا مگر اس کا جرم کچھ اور نوعیت کا تھا جس کی تفصیل وہ دھیرے دھیرے بیان کرنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

سنیل نے پہلے شکیل اور مدثر کو آپس میں لڑوایا اور یوں کسی حد تک وہ اپنی سازش میں کامیاب رہا لیکن جلد ہی اسے یہ احساس ہونے لگا کہ غزالہ اور مدثر کی دوستی سے شکیل کے خارج ہونے کے بعد غزالہ اور مدثر کی دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل رہی تھی تو سنیل نے غزالہ کا دل بھی مدثر سے خراب کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

سنیل ایک بلیک میلر بھی تھا، ساحلِ سمندر کے کنارے اٹکھیلیاں کرتے ینگ کپلز کی وہ خفیہ موویز بناتا تھا پھر اس کے ذریعے انہیں بلیک میل کر کے پیسے بٹورتا تھا۔ ورنہ دھمکی دیتا تھا کہ یہ ویڈیو کلپ وہ سوشل ویب سائٹ پر چلا دے گا۔

بہرطور وہ مدثر کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ اس اثنا میں شکیل اور مدثر کے درمیان اکثر کسی بات پر بحث و مباحثہ اور ہلکی پھلکی ہاتھا پائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ ٹوہ لینے پر سنیل کو معلوم ہوا کہ شکیل، مدثر پر غزالہ کو دھوکا، فریب، فلرٹ کرنے کا الزام لگایا کرتا تھا۔ سنیل نے جب باقاعدہ اس سلسلے میں ٹوہ لگائی تو اس نے بالآخر کھوج لگا لیا کہ شکیل کا مدثر پر غزالہ کو محبت کے نام پر دھوکا دینے کا الزام غلط نہ تھا۔ یہ درست تھا کہ مدثر کی دوستی ستارہ نامی لڑکی سے بھی تھی جو ایک معمولی نوکری کرتی تھی۔ مدثر درحقیقت اس سے محبت کرتا تھا۔

اب سنیل کے ہاتھ ترپ کا پتا لگ چکا تھا۔ اس نے کئی ایسے مقامات پر مدثر اور ستارہ کی خفیہ ملاقاتوں کی اپنے مووی کیمرے کے ذریعے عکس بندی کر لی جسے غزالہ کو دکھا کر وہ بڑی آسانی سے اس کو مدثر سے متنفر کر سکتا تھا اور یہی ہوا۔

اس نے مووی اور اسٹل فوٹو گراف غزالہ کو دکھا دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ مدثر درحقیقت غزالہ کو محبت کے جال میں پھانس کر اس سے شادی کے بعد اس کی ساری دولت و جائداد اپنے نام کروانے کے بعد غزالہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا کر ستارہ سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ وہ دونوں بڑے سکون و چین سے زندگی گزار سکیں۔

یہ سب جاننے اور دیکھنے کے بعد غزالہ کو مدثر سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ سنیل نے .... مووی سے اسٹل فوٹو بنا کر غزالہ کو دے دی تھیں کہ ثبوت کے طور پر وہ مدثر کا اصل چہرہ بے نقاب کر سکے۔

ایک موقع پر جب دونوں سا و تھ سی کے مقام پر پہنچے تو غزالہ نے مدثر کو آڑے ہاتھوں لیا اور سخت برا بھلا کہا مگر مدثر اس کی بات ماننے کو پھر بھی تیار نہیں تھا اور اسے شکیل کی سازش قرار دینے لگا مگر جب غزالہ نے سنیل سے حاصل کردہ ستارہ اور مدثر کی وہ تصاویر اسے دکھائیں تو مدثر کا چہرہ فق ہو گیا۔ جرم اس کی آنکھوں اور چہرے سے ظاہر تھا۔ اس دوران میں سنیل بھی جو اکثر ان دونوں کی ٹوہ میں آخری تماشا دیکھنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ یوں بھی اس کا اصل دھندا یہی تھا۔

گیلے پتھروں کے عقب سے وہ حسبِ معمول دونوں کی تلخ کلامی کی مووی بنانے میں مصروف تھا۔ ادھر مدثر اور غزالہ کی تلخ کلامی عروج پر پہنچ چکی تھی جب مدثر نے دیکھا

کہ غزالہ اس کا اصل چہرہ دیکھ چکی ہے تو ناکامی اور احساس شکست نے اسے شیطان بنا ڈالا۔ اس نے غزالہ کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔

غزالہ اس کا ایک اور بھیانک روپ دیکھ کر بیک وقت خوف اور نفرت کا شکار ہو گئی پھر ایک موقع پر غزالہ کے ہاتھوں ایک بڑا سا نکیلا پتھر آن لگا اور وہ اس نے بڑے زور سے مدثر کے سر پر دے مارا۔ ضرب شدید ثابت ہوئی، مدثر موقع پر ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

غزالہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ سنیل اس سارے سنسنی خیز منظر کی فلم اپنے کیمرے سے بنا چکا تھا۔ بعد میں اس نے غزالہ کو یہ فلم دکھا کر اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا اور اس سے اکثر ایک بڑی رقم ہتھیانے لگا۔

اس نے غزالہ کو یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ وہ اس فلم کی کیسٹ پولیس کے حوالے کر دے گا اور پولیس اسے یعنی غزالہ کو مدثر کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لے گی۔

غزالہ کو یہ بات اپنے باپ سیٹھ عادل ترمذی کو بتانا پڑی۔ اس نے سنیل سے ڈیل کرنا چاہی کہ وہ یہ کیسٹ ایک خطیر رقم کے عوض اس کے حوالے کر کے اس کی بیٹی کو بلیک میل کرنے کا یہ سارا کھیل ختم کر دے مگر مکار سنیل سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ویسے بھی ایک بڑی رقم اس سے ہتھیاتا رہتا تھا۔ اسے یہ سودا منظور نہ تھا۔

سیٹھ عادل نے اپنے آدمی جوگندر پال کے ذریعے سنیل کو موت کے گھاٹ اتارنے کی بھی کوشش کرنا چاہی تھی مگر سنیل بھی بڑا کائیاں تھا، کیسٹ وہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا تھا اور یہ بات وہ بھی جانتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب سنیل دوسری بار گرفتار ہوا تو سیٹھ عادل کو ہی اپنے آدمی جوگندر پال کے ذریعے ضمانت پر فوراً رہا کروانا پڑا... کہ کہیں پولیس سنیل سے اس کیسٹ کے بارے میں نہ اگلوا لے۔

حارث نے سوچا کہ اب مدثر کے قتل میں غزالہ کس حد تک قصوروار تھی کیونکہ انصاف کی رو سے دیکھا جاتا تو غزالہ نے اپنے تحفظ اپنی عزت بچانے کے لیے ہی مدافعتی قدم اٹھایا تھا۔ کسی باقاعدہ ہتھیار سے یا سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس نے مدثر کا قتل بہرحال نہیں کیا تھا جبکہ مقتول مدثر اپنا مجرم خود تھا۔

بہرحال حارث نے سب سے پہلے تو شکیل کو رہا کر دیا اور سنیل کو بلیک میلنگ کے جرم میں جیل میں ڈال دیا۔ سیٹھ عادل اور اس کی بیٹی تک یہ حقیقت پہنچی تو دونوں باپ بیٹی خوف زدہ ہو گئے۔

حارث نے اتنی رعایت ضرور برتی کہ قانونی تقاضا پورا کرتے ہوئے غزالہ پر عام سا چارج لگا کے اسے گرفتار کر لیا جبکہ اس کے باپ سیٹھ عادل کو کچھ قانونی گائیڈنس فراہم کر دیں۔

سیٹھ عادل نے انسپکٹر حارث کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً عمل کیا اور کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر کے اپنی بیٹی کا کیس لڑا اور سرِدست اسے ضمانت پر رہا کروا لیا۔

☆☆☆

''سوری شکیل، میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' شکیل نے ہولے سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''غزالہ کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ تم بہت پہلے مجھ پر بھروسا کر لیتیں؟''

''ہاں شکیل... مجھے اس بات کا قلق رہے گا ساری عمر۔ بھروسا کرنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے، وہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر اعتبار کرنے کا کیا فائدہ؟ تم نے میری خاطر بہت تکلیفیں اٹھائیں۔''

''تمہاری خاطر نہیں... تمہاری محبت کی خاطر۔'' شکیل نے محبت پاش نظروں اور دل کی گہرائیوں سے غزالہ کی ندامت بھری مگر دلکش آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ دونوں اس وقت ساؤتھ سی کے اسی لونگ اسپاٹ پر موجود تھے اور ڈوبتے سورج کا دلفریب نظارہ کر رہے تھے۔

''غزالہ! ویسے تمہاری بات صحیح ہے لیکن بھروسے کے ساتھ احساس شامل ہو جائے تو گزرے وقت کا زیاں رائگاں نہیں جاتا جس کا ثبوت ہم دونوں کی یہاں موجودگی ہے۔'' اس کی بات غزالہ کے ندامت بھرے چہرے پر شفق بن کے پھوٹی۔ ''غزالہ کیا ہم کل اس وقت یہاں دوبارہ آسکتے ہیں؟''

غزالہ کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ ابھری اور اس نے نگاہیں جھکا کر ہولے سے پوچھا۔ ''محبت کے ساتھ؟''

''نہیں بھروسے کے ساتھ۔'' شکیل نے کہا۔ غزالہ نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے دی۔

شرفروش

سلیم فاروقی

کھیل میں شمولیت کے بعد ہر فرد صرف کھلاڑی رہتا ہے... اس وقت کوئی رشتہ... بندھن اور ناتا مدِنظر نہیں رہتا... سوائے حریف کے... فراڈ اور جعل سازی کے فن میں یکتائی رکھنے والے کھلاڑیوں کا سنسنی خیز ٹکرائو... ایک پانسے کے بعد دوسرا پانسا... اور پھر تیسرا... تاش کے پتوں کی طرح بٹے ہوئے ذہنوں میں صرف جیت کا نشہ سوار تھا... کسی ایک کے حصے میں فتح تھی اور باقی مات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے... اچانک ہی ایک کھیل کے بعد دوسرا خونی کھیل شروع ہو گیا... تمام شہ سوار یکا یک فرش نشیں ہوتے چلے گئے... اور فرش نشیں کے حصے میں مسندِ نشینی کا منصب تفویض ہو گیا۔

لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتا سرورق...... ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر تھی

بورڈ پر رقم بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کھیلنے والے تین آدمی میدان چھوڑ چکے تھے لیکن ارشد اور حنیف اب تک ڈٹے ہوئے تھے۔ پتے میں نے بانٹے تھے اس لیے مجھے معلوم تھا کہ ارشد کے پاس چھوٹی سی ایک ٹریل ہے اور حنیف کے پاس راؤنڈ۔ میرے پاس بیگم کی ٹریل تھی اور وہ پتے ان دونوں سے بہرحال بڑے تھے۔

میں نے باقاعدہ شارپنگ سیکھی تھی اور میں اپنے فن میں اتنا ماہر تھا کہ دوسروں کو اپنی مرضی کے پتے بانٹ سکتا تھا۔

ارشد نے غور سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے مایوسی ہوئی ہوگی۔ میں ایسے موقع پر اپنا چہرہ بالکل سپاٹ رکھتا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کچھ نوٹ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”ایک اور چال۔“

حنیف نے الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ کسٹم میں افسر تھا اور دونوں ہاتھوں سے حرام کماتا تھا۔ اس نے بھی ایک چال چل دی۔ میں نے اس کے جواب میں ایک چال اور چل دی۔

”خرم صاحب!“ ارشد نے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس جوکر کی ٹریل آ گئی ہے؟“

ارشد ہمارے ساتھ پہلی دفعہ کھیل رہا تھا۔ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ارشد صاحب! اگر آپ کو میرے پتے دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شو کرالیں۔“

جواب میں ارشد مسکرایا اور چال کی رقم دگنی کر دی۔ ایک چال حنیف نے بھی چل دی۔

کھیل بہت لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کھیل ختم کرنے کے لیے چال کی رقم مزید دگنی کر دی۔ بورڈ چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھر گیا تھا۔

ارشد نے گھور کر مجھے دیکھا اور بورڈ پر نوٹ پھینک دیے۔ گویا اس نے ایک چال اور چل دی۔

حنیف نے جھنجلا کر اپنے پتے پھینک دیے۔

میں نے پھر ایک چال چل دی۔

اس مرتبہ ارشد بھی جھنجلا گیا اور اس نے مطلوبہ رقم

بورڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''شو کریں خرم صاحب۔''

میں نے ہنستے ہوئے اس کے سامنے اپنے پتے پھینکے اور بورڈ پر پڑی ہوئی رقم سمیٹنے لگا۔

''اتنی جلدی مت کریں خرم صاحب۔'' ارشد نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اپنے پتے میرے سامنے پھینک دیے۔ بادشاہ کی ٹریل میرا منہ چڑا رہی تھی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ کیسے ہوگیا؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ میں نے تو ارشد کو چھوٹے پتے دیے تھے۔ کیا مجھ سے بانٹنے میں غلطی ہوگئی تھی؟ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایسی زک پہنچی تھی۔

ارشد بہت مسرور انداز میں تمام نوٹ سمیٹ کر اپنے سامنے رکھ رہا تھا۔ وہ نوٹ سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''یار! نوٹوں کے بجائے چپس ہونا چاہئیں۔ اب اتنے نوٹ...''

''یہ کوئی باقاعدہ کیسینو نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہم چند دوست ہفتے کی رات کو یہاں مل بیٹھتے ہیں۔''

اسی وقت جینی چائے لے آئی، میں نے اس سے کہا۔

''جینی! تاش کی ایک نئی گڈی بھجوا دینا۔'' وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

وہ اکرم کا اسنیک بار اور ریسٹورنٹ تھا۔ وہ اکی کے نام سے مشہور تھا۔ جرائم پیشہ شخص تھا اور اپنے جرائم اور دو نمبر دھندوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے گلشن کے پوش علاقے میں یہ ریسٹورنٹ کھول لیا تھا۔ اس سے بھی اسے اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اکی کو میں نے قتل کے ایک کیس سے بچایا تھا، ویسے بھی اس کی مدد کرتا رہتا تھا اس لیے وہ میرا احسان مند تھا۔

ریسٹورنٹ کے اوپر ایک پورشن میں اکی خود رہتا تھا اور دوسرا پورشن اس نے جوئے کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہاں اعلیٰ سول و پولیس کے افسران، بزنس مین اور اسی قسم کے لوگ آتے تھے۔

جینی، اکی کی پارٹنر تھی لیکن لوگ اسے اکی کی بیوی سمجھتے تھے۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف تھے کہ جینی کا اکی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محض پارٹنر تھے۔

جینی تاش کی نئی گڈی لے آئی۔ پتے بانٹنے کی باری ارشد کی تھی۔ اس لیے اس نے گڈی کھولی اور اس میں سے تاش نکال کر انہیں اتنی مہارت سے پھینٹا کہ میں بھی اش اش کر اٹھا۔ وہ بھی شاید شارپر تھا۔ میں بہت توجہ سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتے بانٹے اور کھیل شروع ہوگیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھے بغیر سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔''

''خرم! میں جینی بول رہی ہوں... نہیں، میرا نام مت لینا۔ تم کسی بہانے سے باہر آؤ، تمہیں ایک ضروری بات بتانا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ...''

''پلیز، بحث مت کرو۔'' جینی نے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''میں ذرا واش روم تک جا رہا ہوں۔'' اپنے پتے احتیاط سے رکھنے کے بعد میں اٹھ گیا۔

جینی دوسرے کمرے میں بے چینی سے میری منتظر تھی۔ وہ چھتیس سینتیس سال کی پختہ عمر عورت تھی لیکن چہرہ اور جسم اب تک پُرکشش تھا۔ وہ چہرے سے پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''ہاں بولو جینی، ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی؟''

''میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے خرم کہ ارشد سے ہوشیار رہنا۔ مجھے ابھی ابھی اکی نے بتایا ہے کہ وہ جنگلر ہے۔''

''جنگلر ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، اکی نے اس سے کمیشن طے کیا ہے۔ جیتی ہوئی رقم کا چالیس فیصد اکی لے گا۔''

''مائی ڈیئر جینی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم یہ بات مجھے کیوں بتا رہی ہو؟''

''میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے، تم جانتے تو ہو کہ...''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اب جینی مجھ سے عشق بگھارنا شروع کر دے گی۔ وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ میں اس کی ان حرکتوں سے اتنا ہی چڑتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو ڈیئر! اب میں محتاط رہوں گا۔''

''اور سنو، پلیز یہاں کوئی ہنگامہ مت کرنا ورنہ...''

''تم فکر مت کرو، میں اسے ریسٹورنٹ سے باہر لے جا کر ماروں گا۔''

میں واپس اپنی سیٹ پر آ گیا اور پتے اٹھا لیے۔

میرے پاس زیادہ اچھے پتے نہیں تھے۔ دو بادشاہ اور ایک دکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے چہرے سے مایوسی ظاہر نہیں کی اور مسکرا کے ایک چال چل دی۔

دوسرے لوگوں نے ایک ایک کر کے اپنے پتے پھینک دیے۔

حنیف نے کہا۔ ''میرے لیے آج کا دن ہی خراب ہے۔''

اس کے برعکس ارشد نے چال دگنی کر دی۔ میں نے جھنجلا کر بورڈ پر رقم پھینکی اور ارشد سے کہا۔ ''شو۔''

ارشد نے فاتحانہ انداز میں پتے پھینکے اور بورڈ پر پھیلی ہوئی رقم سمیٹنے لگا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور جھپٹ کر گڈی اٹھالی۔

''گڈی واپس رکھ دیں خرم صاحب۔'' ارشد نے ناگواری سے کہا۔

میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پتے گنتا رہا۔ گڈی میں سے صرف چھ پتے باہر تھے۔ اب جوکر سمیت اس میں سینتالیس پتے ہونا چاہیے تھے۔ اس میں تینتالیس ہی پتے تھے۔

میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ارشد صاحب! میرا خیال ہے کہ تاش کی ایک گڈی میں چار بادشاہ ہوتے ہیں؟'' میں نے ارشد کو گھورا۔ ''پھر یہ پانچواں بادشاہ کہاں سے آیا؟''

''میں کیا جانوں؟'' ارشد نے شانے اچکائے۔

''اپنا کوٹ اتارو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے؟'' وہ بھی آپ سے تم پر آ گیا۔

اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنا کھیل چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

میں نے اچانک اٹھ کر ارشد کی ٹائی پکڑ لی اور اسے جھٹکا دے کر بولا۔ ''اپنا کوٹ اتارو۔''

جینی نے مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ میری نظریں ارشد کے ہاتھوں پر تھیں کہ وہ پتے فرش پر نہ گرا دے۔

میں نے اچانک خود ہی اس کا کوٹ اتار لیا۔ اس کی آستین میں سے دو پتے نکل کر فرش پر گر گئے۔ ارشد کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ میں نے اس کی ٹائی چھوڑ کر نہ صرف بورڈ پر پڑی ہوئی تمام رقم سمیٹی بلکہ ارشد کے سامنے نوٹوں کا جو ڈھیر تھا، وہ بھی سمیٹ لیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''یہاں اعلیٰ سوسائٹی کے معزز افراد اپنا دل بہلانے آتے ہیں۔ اس قسم کی بے ایمانی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''خرم پلیز۔'' جینی نے کہا۔ ''اسے معاف کر دو۔''

''ایک شرط پر۔'' میں نے کہا۔ ''یہ آئندہ کبھی مجھے یہاں نظر نہ آئے۔''

''اتنی بے عزتی کے بعد تو میں خود بھی یہاں آنا پسند نہیں کروں گا۔'' ارشد نے آہستہ سے کہا۔

میں نے وہ سب رقم جینی کے حوالے کی اور کہا میں یہ رقم بعد میں تم سے لے لوں گا پھر میں گاڑی کی چابیاں اٹھا کر

باہر نکل گیا لیکن میں اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی آدمی سے زیادہ رقم اس کی جیبوں میں ہوگی۔

میں اسنیک بار سے نکل کر ایک تاریک گوشے میں کھڑا ہوگیا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ارشد اسنیک بار کے دروازے سے نکل کر باہر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے جالیا اور بولا۔ ''جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو تم سے مزید حساب بے باق کرنا ہے۔''

''تم سب کچھ تو مجھ سے لے چکے ہو۔'' ارشد نے کچھ سرد لہجے میں کہا۔ ''اب مزید فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔''

اس کی بات پر میری کھوپڑی ایک مرتبہ پھر الٹ گئی اور میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے اپنی گردن چھڑانے کے لیے میرے پیٹ میں کہنی مارنا چاہی لیکن میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔

اچانک ایک فائر ہوا تو میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ میں نے ارشد کی ٹانگ گھسیٹ کر اسے بھی نیچے گرا لیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے مزید ساتھی بھی یہاں موجود ہیں۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا اور اچانک اپنا ریوالور نکال لیا۔ ''تم کس کے لیے کام کرتے ہو اور تمہارے کتنے ساتھی یہاں ہیں؟'' میں نے ریوالور کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کردیا۔ ''جلدی بولو ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''

''مم... میرا کوئی... ساتھی نہیں ہے۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔ ''یہ فائر کی آواز بھی میں نے ہی نکالی تھی۔''

''تم نے نکالی تھی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم مسخرے بھی ہو۔''

''میں ایک شعبدے باز ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اس قسم کے چند چٹکلے ہر وقت میری جیب میں رہتے ہیں۔''

پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی ٹھنڈی پھوار میرے چہرے سے ٹکرائی ہو۔ اچانک میرا ذہن شل ہوکر رہ گیا۔ میں ہوش میں تھا، سب کچھ نظر آرہا تھا لیکن ہاتھ پیر کام نہیں کررہے تھے۔ میں اگر زمین پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو اب تک زمین پر گر چکا ہوتا۔

ارشد اطمینان سے پلٹا لیکن کسی نے اسے جکڑ لیا۔ پھر تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے چہرے پر رسید کردیے۔ ارشد چکرا کر گرا تو میں نے دیکھا کہ اس پر حملہ کرنے والا اکی تھا۔

ارشد کے گرتے ہی وہ میری طرف آیا اور بولا۔

''خرم! تم ٹھیک تو ہو؟''

میں نے اسے جواب دینا چاہا لیکن زبان بھی اکڑ کر رہ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا جسم مفلوج ہوگیا ہو۔

''کریم، رؤف۔'' اکی نے اپنے ملازموں کو آواز دی۔

''خرم صاحب کو اٹھا کر اندر لے چلو۔ میں اس منحوس کو لے کر اندر آتا ہوں۔'' اس نے ارشد کی طرف اشارہ کیا۔

وہ منحوس بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ وقتی طور پر چکرا کر گر گیا تھا۔ اکی نے اچانک اپنی جیب سے پسٹل نکال لیا اور بولا۔ ''اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں گولیاں تیرے سینے میں اتار دوں گا۔ تو نے خرم کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

پھر مجھے اکی کے ملازمین اٹھا کر اندر لے جانے لگے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری توانائی لوٹ رہی ہے اور میرے حواس بحال ہورہے ہیں۔

میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ''میں... اب ٹھیک ہوں، مجھے نیچے اتار دو۔''

ان لوگوں نے مجھے نیچے اتار دیا۔ اب میرے ہاتھ پیر پہلے کی طرح کام کررہے تھے۔ میری توانائی بہت تیزی سے واپس آرہی تھی۔

''یہ معمولی سا ایک شعبدہ تھا۔'' ارشد نے کہا۔ ''میں خرم صاحب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ مجھے ضرور گولی مار دیتے۔''

اکی اسے لے کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں تھا۔ میں ایک ٹیبل پر جاکے بیٹھ گیا اور اکی سے گرما گرم کافی لانے کو کہا۔ پھر میں نے اکی سے کہا۔ ''اس شعبدے باز کو میرے پاس بھیج دو۔ اس نے واقعی مجھے متاثر کردیا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں نے اتنی بے بسی محسوس کی تھی۔''

ارشد میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس کے لیے بھی کافی منگوالی پھر میں ہنس کر بولا۔ ''یار! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ تم تو مجھے پیشہ ور شعبدے باز لگتے ہو؟''

''میں پیشہ ور شعبدے باز ہی ہوں۔'' ارشد نے کہا۔ ''میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شعبدے بازی کے کمالات دکھایا کرتا تھا۔ ایک دن غلطی سے ہوٹل کے منیجر کی

قیمتی گھڑی شعبدے کے دوران میرے ہاتھ سے ضائع ہو گئی۔ غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کھڑے کھڑے مجھے ہوٹل سے نکال دیا۔"

"آج کل تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "بس کہیں داؤ لگتا ہے تو شارپنگ کر لیتا ہوں۔ یوں ایک آدھ مہینا گزر جاتا ہے۔ میں نے بہت چھوٹی عمر سے شارپنگ سیکھ لی تھی۔"

"تم واقعی بہت اچھے شارپر ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔ "تمہارا... پتے پھینٹنے کا انداز ہی متاثر کن ہے۔"

"ویسے خرم صاحب، آپ بھی کم نہیں ہیں۔ آپ اگر شارپنگ نہ کرتے تو مجھے بھی پتے اپنی آستین میں چھپانے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"یار! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تمہیں کہیں نہ کہیں کام دلوا دوں گا، بس مجھ سے رابطے میں رہنا۔" میں نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور اس کا سیل نمبر لے لیا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ "ٹھہرو، میں نے تم سے ساری رقم چھین لی تھی، یہ کچھ پیسے رکھ لو۔"

میں نے جیب سے پرس نکالا تو وہ ہنس کر بولا۔ "خرم صاحب! آپ شاید بھول گئے کہ میں شعبدے باز ہوں اور شعبدے باز تو ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہی ہے۔ میں نے جیتی ہوئی رقم میں سے آدھی سے زیادہ اپنی جیبوں میں منتقل کر لی تھی۔"

"تم تو واقعی میں باکمال فنکار ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے الوداع کیا۔

میں نے سوچا کہ جینی سے رقم لے لوں، پھر خیال آیا کہ رات کے وقت اتنی رقم لے کر کیا کروں گا، کل دن میں دیکھوں گا۔" یہ سوچ کر میں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں ایک دوسرے درجے کے اخبار میں کرائم رپورٹر ہوں۔ میں کوئی نیک یا پارسا نہیں ہوں۔ دنیا کا ہر عیب مجھ میں ہے۔ میں جوا کھیلتا ہوں، شراب پیتا ہوں، پولیس اور اعلیٰ سول افسران کے ساتھ بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کو بلیک میل کرتا ہوں۔ ہاں، صرف ایک عیب نہیں ہے۔ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں حسن کو پسند نہیں کرتا۔ خوب صورت لڑکیوں سے میری دوستی بھی ہے۔ ان سے میں ہنسی مذاق بھی کرتا ہوں لیکن ایک فاصلے پر رہ کر۔

میرا خاندان خاصا معزز ہے۔ میرے بھائی اعلیٰ فوجی اور سول عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈیڈی انتہائی تعلیم یافتہ اور نفیس انسان ہیں۔ وہ ایک کالج میں پرنسپل تھے اور حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

انہوں نے مجھے ائرفورس میں بھیجنا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ بڑے بھائی نے چاہا کہ میں آرمی جوائن کر لوں لیکن مجھے آرمی کی قید و بند کی زندگی پسند نہیں تھی۔

میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کیا تو ڈیڈی نے چاہا کہ میں کسی کالج میں لیکچرار شپ کر لوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔

پھر گھر والوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ میں راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہتا۔ اس زمانے میں میری ملاقات آصف سے ہو گئی۔ وہ اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا پھر وہ لاہور چلا گیا اور وہیں سے ماس کمیونیکیشنز میں ایم اے کرنے کے بعد ایک کثیرالاشاعت اخبار میں ملازمت کر لی۔ اس کو دیکھ کر مجھے بھی کرائم رپورٹنگ کا شوق پیدا ہوا۔ پھر آصف ہی نے مجھے کرائم رپورٹنگ سکھائی اور ایک چھوٹے اخبار میں ملازمت بھی دلا دی۔

میں نے بہت محنت اور تندہی سے کام کیا تو ایک دوسرے اخبار نے مجھے دگنی تنخواہ کی پیشکش کی۔ میں نے وہ ملازمت قبول کر لی۔

اس وقت تک میں اپنا کام نہایت ایمان داری سے کرتا تھا۔ اب آصف سے بھی کم کم ملاقات ہوتی تھی کیونکہ وہ رپورٹنگ چھوڑ کر ڈیسک پر کام کر رہا تھا۔

میرے پاس پرانی سی ایک موٹر سائیکل تھی۔

ایک دن پریس کلب میں آصف سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "خرم! تم ابھی تک اسی کھٹارا موٹر سائیکل سے کام چلا رہے ہو۔ تم دو سال سے کرائم رپورٹنگ کر رہے ہو۔ اب تک تو تمہارے پاس جدید ماڈل کی بہترین گاڑی ہونی چاہیے تھی۔"

"یار! میرا اخبار مجھے صرف اتنی ہی تنخواہ دیتا ہے کہ اس میں موٹر سائیکل کا خرچ بھی بہ مشکل پورا ہو سکے۔"

میری بات پر آصف نے مجھے حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ "تو کیا یہ بھی میں تمہیں بتاؤں کہ کرائم رپورٹرز پیسا کیسے کماتے ہیں؟" پھر اس نے مجھے کھل کر بتایا کہ تم لوگوں کی کمزوریاں پکڑو اور انہیں بلیک میل کرو۔ سال بھر میں کروڑ پتی ہو جاؤ گے۔

میں نے اس کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیا اور اسی کھٹارا موٹر سائیکل پر گھومتا رہا۔

ایک دن میں نے شہر کے معروف بزنس مین رشیدالدین سے ملاقات کا وقت لیا۔ وہ خاصے نیک نام آدمی تھے لیکن مجھے ان کے خلاف کچھ ایسی خبریں ملی تھیں جو انہیں جیل بھی پہنچا سکتی تھیں۔ میں ذاتی طور پر انہیں اچھا انسان سمجھتا تھا اس لیے مجھے ان خبروں پر یقین نہ آیا اور میں نے ذاتی طور پر ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو پولیس کا ایک راشی افسر وہاں سے نکل رہا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے خلاف کئی خبریں بھی لگا چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ اُڑ گیا اور وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”خرم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

وہ مجھ سے یوں بھی خار کھاتا تھا۔ اس وقت تک اس کی کوئی بڑی کمزوری... میرے ہاتھ میں نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے انتہائی توہین آمیز لہجے میں بات کرتا تھا۔ میں خود بھی وردی اور قانون کا احترام کرتا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں رشیدالدین صاحب سے ملنے آیا ہوں۔“

”ان سے تمہیں کیا کام پڑ گیا؟“ اس نے پوچھا لیکن اب بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

”آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں پریشان تو نہیں ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”رشید صاحب اس وقت ایک میٹنگ میں مصروف ہیں۔“

”میں انتظار کرلوں گا۔“ میں نے کہا اور اندر کی طرف قدم بڑھایا۔

اچانک اندر سے فائر کی آواز سنائی دی تو میں چونک اٹھا۔ ایس پی تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اندر کا منظر خوش گوار ہرگز نہیں تھا۔ رشیدالدین صاحب صوفے پر ایک طرف لڑھکے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا اور کن پٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے خودکشی کرلی ہے۔

ایس پی مزید بوکھلا گیا۔ فائر کی آواز سن کر گھر کے جو ملازم وہاں آئے تھے، ایس پی نے ان سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور بولا۔ ”کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ رشید صاحب نے خودکشی کرلی ہے۔ میں ایمبولینس اور پولیس کے دوسرے عملے کو بلا رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور... فون کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت اس کی پشت میری طرف تھی۔ رشیدالدین صاحب کے بائیں ہاتھ میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ میں نے آنکھ بچا کر وہ کاغذ نکال لیا۔ اس وقت مجھے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ جائے واردات سے کوئی بھی چیز اٹھانا جرم ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے اس طرح میرے اخبار کو کوئی خبر مل جائے۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھ لیا۔

”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ ایس پی درشت لہجے میں بولا۔ ”چلو نکلو یہاں سے۔ اب تمہیں رشید صاحب سے ملاقات کے لیے اوپر جانا پڑے گا۔“

اس کے تضحیک آمیز رویے پر میری کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ مجھے یاد تھا کہ گزشتہ ہفتے اس نے شراب کی ایک بھٹی پر چھاپا مارا تھا۔ وہ خبر میں نے ہی اخبار کو دی تھی۔

میں نے بھنا کر کہا۔ ”اپنا لہجہ درست کریں ایس پی صاحب! میں جانتا ہوں کہ شراب کی بھٹی پر چھاپے سے آپ کو کتنا فائدہ ہوا ہے۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

”تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“ وہ چونک کر بولا۔

”جتنا میں اس بارے میں جانتا ہوں، کوئی بھی کرائم رپورٹر نہیں جانتا۔“ میں مسلسل بلف کر رہا تھا۔

”دیکھو خرم! اگر تم کچھ جانتے بھی ہو تو اسے اپنی ذات تک محدود رکھو۔“ اس کے لہجے میں رعونت کے بجائے اب خوشامد تھی۔

میں مزید شیر ہوگیا۔ ”کیوں! اس سے مجھے یا میرے اخبار کا کیا فائدہ ہوگا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اخبار کے فائدے کو چھوڑو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنے فائدے کی بات کرو۔“

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ”چلو اپنا فائدہ ہی سہی۔“ اس مرتبہ میں نے آپ جناب کا تکلف بھی چھوڑ دیا۔

”تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے کوئی دکان دار سودے بازی کرتا ہے۔

اسی وقت ایمبولینس اور دوسرا عملہ آ گیا۔

ایس پی نے مجھ سے کہا۔ ”ایسا کرو خرم! شام کو چھ بجے میرے آفس آجاؤ۔“

”اگر تمہیں بات کرنا ہے تو میرے آفس آؤ۔“ میں نے کہا۔ اس کے دفتر جانے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے بات نہ بنے اور وہ برہم ہو کے مجھے حوالات میں بند کر دے۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اس مرتبہ سرگوشی میں کہا کیونکہ متعلقہ پولیس اسٹیشن کا عملہ اندر آگیا تھا۔ ”میں شام کو سات بجے تک تمہارے آفس آجاؤں گا۔“ پھر وہ آنے والے پولیس اہلکاروں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی اپنے اخبار ٹیلی فون کر کے فوٹو گرافر کو بلا لیا۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں پریس کلب چلا گیا۔ میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ ایس پی میری بات پر اتنا ڈر کیوں گیا تھا؟ شاید میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔

پریس کلب پہنچ کر میں نے کافی منگوائی اور ایس پی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک مجھے اس کاغذ کا خیال آیا جو میں نے رشید الدین کے ہاتھ سے نکالا تھا۔ وہ فل اسکیل کاغذ تھا۔ جسے کئی تہیں کرنے کے بعد ہاتھ میں دبایا گیا تھا۔

میں نے اس کاغذ کی تحریر پڑھی تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ رشید الدین صاحب نے ان تمام جرائم کا اعتراف کیا تھا جن کے بارے میں مجھے شبہ تھا۔ آخر میں انہوں نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ ایس پی احسان نے ان جرائم کو چھپانے کے لیے مجھ سے پچاس لاکھ کا چیک لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سلسلہ رکے گا نہیں۔ بات میرے بیٹے تک پہنچی تو میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو کر آئندہ ماہ پاکستان لوٹنے والا ہے۔ پھر آج ایک پریس رپورٹر بھی مجھ سے ملنے کا وقت مانگ رہا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ بات پریس تک پہنچ گئی ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ میں اپنی جان خود لے رہا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس راشی پولیس افسر کو نہ چھوڑا جائے جس نے مجھ سے رشوت لی ہے۔

نیچے رشید الدین صاحب کے دستخط تھے۔ اس کے نیچے تاریخ اور وقت بھی لکھا ہوا تھا۔

وہ شاید ایس پی کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ ممکن ہے، وہ ایس پی بھی ان تمام غیر قانونی کاموں میں ان کا معاون ہو۔

شام کو ایس پی احسان واقعی میرے دفتر آگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پولیس کا کوئی افسر میرے پاس آیا تھا۔ میں نے چائے منگوانا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔

”وقت ضائع کرنے کے بجائے ڈائریکٹ بات کرو۔“ اس نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”پانچ لاکھ۔“ میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اگر معاملہ اہم نہ ہوا تو احسان ابھی بپھر جائے گا۔

”پانچ لاکھ؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”اتنی رقم تو میرے پاس نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ اس سے کہیں زیادہ رقم آپ کے پاس موجود ہے۔“

ایس پی نے طویل سانس لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں تمہیں پانچ لاکھ دوں گا۔“

”مجھے رقم کل صبح تک چاہیے، وہ بھی کیش۔“

”مل جائے گی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ میری زندگی کی پہلی بلیک میلنگ تھی جس سے میں راتوں رات لکھ پتی بن گیا تھا۔ میں نے احسان سے رشید الدین کے خط کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چیک کیش کرالے تو میں اس سے بات کروں۔ رشید الدین صاحب نے اتنا بڑا چیک اس کے نام ہی سے دیا ہوگا اور اس قسم کا چیک اگر بیریئر بھی ہو تو وصول کرنے والے کے قومی شناختی کارڈ کی کاپی بھی چیک کے ساتھ دینا پڑتی ہے۔

ایک ہفتے بعد میں نے ایس پی احسان سے دوبارہ رابطہ کیا اور اسے رشید الدین کے خط کے بارے میں بتایا۔

وہ بری طرح بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”تم جانتے ہو خرم، جائے واردات سے کوئی اہم ثبوت غائب کرنا بھی سنگین جرم ہے۔ میں اس کیس میں تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔“

”بھجوا دو۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”پھر رشید الدین صاحب کا وہ خط منظر عام پر آئے گا۔ تمہارے خلاف تحقیقات ہوں گی کہ تم نے پچاس لاکھ روپے ان سے کیوں لیے تھے۔ مجھے ان غیر قانونی سرگرمیوں کا بھی علم ہے جن کی وجہ سے رشید الدین کو خودکشی کرنا پڑی۔ ایس پی صاحب! اس پورے کیس میں کلیدی کردار آپ کا ہے۔ آپ ہی نے رشید الدین کو وہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا۔“ میں نے پھر اندھیرے میں تیر چلایا جو شاید نشانے پر بیٹھا کیونکہ احسان کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ اس نے شکستہ لہجے اور مری مری آواز میں پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم خود

بہت ذہین بلکہ شاطر ہو۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "فوری طور پر تو میں ان پچاس لاکھ میں اپنا حصہ چاہتا ہوں جو تم نے رشید الدین سے وصول کیے ہیں۔"

"کتنا حصہ؟" احسان نے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو ٹشو پیپر سے خشک کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہ فوری طور کا کیا مطلب ہے؟"

"مسٹر ایس پی! مجھے اس رقم میں سے ففٹی پرسنٹ چاہیے۔"

"وہاٹ؟" ایس پی بھنا کر بولا۔

"اس وقت ہم فائیو اسٹار ہوٹل کے ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اپنی آواز نیچی رکھیں۔ یہ پبلک پلیس ہے، تھانہ نہیں ہے۔ ففٹی پرسنٹ منظور نہیں تو میں چلتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں، ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہ خط اور دیگر تمام ثبوت میرے وکیل کے پاس موجود ہیں۔ میری موت کی صورت میں وہ تمام ثبوت میڈیا اور انتظامیہ کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ میری موت سے تمہیں فائدے کے بجائے نقصان ہوگا، اس لیے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"بیٹھ جاؤ، خرم!" ایس پی نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں ففٹی پرسنٹ دوں گا۔"

"اور وہ جو تم نے گھپلے کیے ہیں، ان میں بھی میرا حصہ نکلنا ہوگا۔"

یوں میں آہستہ آہستہ بلیک میلنگ کی راہ پر چل نکلا۔ میں بھی ایسی خبروں کی تلاش میں رہنے لگا جو پولیس اور سول افسران کی کمزوری بن سکیں۔

میری ان سرگرمیوں کی بھنک ڈیڈی کے کان میں پڑی تو انہوں نے مجھ پر شدید لعن طعن کی اور بہت دیر تک سمجھاتے رہے لیکن میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی۔

انہوں نے تنگ آ کر مجھے گھر سے نکال دیا اور چیخ کر بولے۔ "خرم! آج کے بعد میرے گھر میں قدم بھی مت رکھنا۔ میرے لیے تو مر گیا۔ تو حرام کماتا ہے، جوا بھی کھیلتا ہے اور شراب بھی پیتا ہے۔" ان کے لہجے میں نفرت تھی۔

میں نے غصے میں آ کر اسی وقت گھر چھوڑ دیا اور فوری طور پر ایک ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔

میں نے ایک راشی افسر سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ "مجھے فوری طور پر ایک گھر چاہیے۔" میں جانتا تھا کہ اس نے حال ہی میں گلشن اقبال میں ایک لگژری فلیٹ خریدا ہے۔

یوں میں اس کے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا اور اسے تسلی دی کہ جیسے ہی مجھے کوئی معقول مکان ملا، میں اس کا فلیٹ خالی کر دوں گا۔ نہ مجھے آج تک کوئی معقول مکان ملا تھا، نہ میں نے وہ فلیٹ خالی کیا تھا۔

☆☆☆

ارشد سے رخصت ہو کر میں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا، پھر سیل فون کی ٹارچ روشن کر کے گاڑی کا جائزہ لیا اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے کرائم رپورٹنگ کے دوران میں اتنے دشمن بنا لیے تھے کہ مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا ورنہ اب تک تو میں کب کا کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا۔

میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی اور روانہ ہو گیا۔ رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ میں ایف ٹی سی کے سامنے سے گزرتا ہوا سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف بڑھا اور شاہراہ قائدین پر آ گیا۔

اچانک مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ کوئی لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ "ہیلپ... ہیلپ!"

میں نے بے اختیار بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

دوسرے ہی لمحے بائیں جانب سے ایک لڑکی وحشت زدہ انداز میں دوڑتی ہوئی میری گاڑی کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو آدمی بھی تھے۔ ان میں سے ایک پختہ عمر اور گینڈے جیسے بدن کا آدمی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سر اس کے شانوں پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے جسم پر سوٹ تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ سوٹ پہنا ہے۔ دوسرا شخص جوان العمر اور دراز قد تھا۔ اس نے جینز اور لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ دونوں شکل ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔

ان دونوں نے انتہائی بے رحمی سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی گرفت سے پھسل کر میری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئی اور بولی۔ "پلیز، مجھے ان بدمعاشوں سے بچائیں۔"

"جا بھئی، تو اپنا کام کر۔" کوتاہ گردن بلغمی آواز میں بولا۔

"بکومت۔" میں دہاڑ کر بولا۔ "تم اس لڑکی کے

پیچھے کیوں پڑے ہو؟ چلو دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔'' یہ کہہ کر میں نے گاڑی سے اترنا چاہا۔

وہ دروازے کے سامنے جم گیا اور بولا۔ ''گاڑی سے اترنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہتے۔''

اسی وقت مجھے اس کے ہاتھ میں گن کی جھلک نظر آئی لیکن نیم اجالے میں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کون سی گن ہے۔ لڑکی کو نوجوان نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ خاصی حسین لڑکی تھی، جسم پر لباس بھی بہت قیمتی تھا لیکن مجھے اس کے خوب صورت چہرے پر وحشت نظر آرہی تھی۔ وہ ابھی تک ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے مصالحانہ لہجے میں کہا۔ ''تم اس وقت من مانی کرلو لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' میں نے گاڑی کا دروازہ بند کرلیا۔

لڑکی بری طرح چیخی۔ ''پلیز، مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔''

''موت سامنے ہو تو بڑے بڑوں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے۔ اس نے تو شاید ماؤزر کی شکل ہی پہلی دفعہ دیکھی ہے۔'' کوتاہ گردن کے لہجے میں تضحیک تھی۔ ''جاؤ بابو جاؤ، امی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

میں نے اچانک دروازہ کھولا اور پوری قوت سے گینڈے کے جسم سے ٹکرا دیا۔ اسے مجھ سے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ دروازہ خاصی قوت سے اس کے پیٹ اور گھٹنوں سے ٹکرایا تھا۔ اس کا ماؤزر جھٹکے سے دور جا پڑا۔ میں نے گینڈے پر جست لگائی اور اسے لیے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

نوجوان نے لڑکی کو چھوڑ کر مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں گینڈے کو چھوڑ کر قلابازی کھا گیا۔ نوجوان کی جولات میری پسلیوں میں لگتی، وہ زوردار انداز میں گینڈے کی کھوپڑی پر پڑی۔ موٹے کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ نوجوان مجھ پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے زمین پر لیٹے ہی لیٹے اپنے بغلی ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور بولا۔ ''بس، ختم کرو۔'' وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پسٹل کا دستہ مار کے نوجوان کو بھی ناک آؤٹ کر دیا۔

حیرت تو مجھے وہاں سے گزرنے والے لوگوں کی بے حسی پر تھی۔ ہمارے نزدیک سے کئی گاڑیاں گزری تھیں لیکن کسی نے بھی رکنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ شہر کے حالات ہی ایسے تھے لیکن ایسی بھی کیا بے حسی؟

ان کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں نے ان دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ٹھونسا اور اگنیشن سے چابی نکالنے کے بعد لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''تم کون ہو اور اتنی رات گئے کہاں جا رہی تھیں یا پھر یہ لوگ تمہیں گھر سے اغوا کر کے لائے ہیں؟''

''میں کالج کے فنکشن سے واپس آرہی تھی۔ واپسی میں میری گاڑی خراب ہو گئی۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی تھی کہ یہ دونوں آ گئے۔ پہلے تو ان لوگوں نے مجھے لفٹ کی آفر کی، پھر میرے انکار پر زبردستی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھانے لگے۔ اس کے بعد آپ یہاں پہنچ گئے۔''

لڑکی کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کس کالج میں پڑھتی ہو؟''

''میں سی بی ایم کی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلو، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم رہتی کہاں ہو؟''

''میں ڈیفنس میں رہتی ہوں لیکن آپ زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔ بس مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دیں جہاں سے کوئی سواری مل جائے۔''

''اور تمہاری گاڑی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ میں ڈرائیور سے منگوا لوں گی۔''

لڑکی مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ میں دنیا بھر کو چلانے کی کوشش کرتا تھا، وہ مجھ کو چلا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ سی بی ایم کالج کورنگی میں ہے۔ وہ ڈیفنس میں رہتی تھی تو شاہراہ قائدین ... پر کیا کر رہی تھی؟ کورنگی سے تو ڈیفنس بہت نزدیک تھا۔ وہاں سے یہ مشکل بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو ہوگی۔

''چلو، پھر میں تمہیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں جہاں سے ٹیکسی وغیرہ مل جائے۔ ویسے تمہاری گاڑی ہے کہاں؟ شاید میں اس کی خرابی دور کرسکوں۔ گاڑیوں کے بارے میں تھوڑا بہت تو میں بھی جانتا ہوں۔''

''رات بہت ہو گئی ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آپ زیادہ تکلیف نہ کریں۔''

میرا خیال ہے کہ کسی گاڑی کا وجود نہیں تھا۔ ورنہ وہ

یوں بوکھلا کر جواب نہ دیتی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اسے کوئی بھی سواری نہیں ملے گی۔ میں نے گاڑی کو پی ای سی ایچ کے قبرستان کے پاس سے ٹرن کیا اور دوبارہ شاہراہ فیصل پر آگیا۔

وہاں بھی اس وقت ہُو کا عالم تھا۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں لیکن ٹیکسی، رکشا کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

''تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''آپ نے ابھی تک نہ اپنا نام بتایا ہے، نہ میرا نام پوچھا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرا نام ماریہ ہے۔''

''میرا نام خرم ہے، خرم عظیم، میں ڈیلی نیوز ٹائم میں کرائم رپورٹر ہوں۔''

میرا نام سن کر لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

''تو آپ پریس رپورٹر ہیں؟ آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں۔''

''ارے بھئی، میں بالکل بھی خطرناک نہیں ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں خطرناک لوگوں کے لیے میں خطرناک ہوں۔''

میں نرسری کے اسٹاپ پر کھڑا تھا اور ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔

جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی ٹیکسی نہ آئی تو میں نے کہا۔ ''ماریہ! اب ٹیکسی کا خیال چھوڑ دو۔ میں تمہیں گھر لے چلتا ہوں۔ ویسے بھی اس وقت جرائم پیشہ ٹیکسی والے ہی ملیں گے۔''

اسی وقت ایک ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکی اور ٹیکسی ڈرائیور بونٹ کھول کر اس پر جھک گیا۔

میں نے ماریہ سے کہا۔ ''ایک ٹیکسی آئی تو ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی والا ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گے خان صاحب؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں ائرپورٹ جارہا ہوں صاحب۔ وہاں سے مجھے ایک سواری کو لینا ہے۔ آپ کدھر جائیں گے؟''

''مجھے ڈیفنس جانا ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف لوٹ گیا۔

وہاں پہنچ کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ ماریہ گاڑی میں موجود نہیں تھی۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ مجھے یکدم ہی شدید غصہ آنے لگا کہ آخر وہ لڑکی کیا چاہتی تھی اور اس حرکت کا مطلب کیا تھا؟ میں بھنا کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ پولیس کی ایک موبائل وین میرے پاس آکر رکی۔ اس میں سے دو کانسٹیبل اترے اور میری طرف بڑھے۔ ایک کانسٹیبل اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''اس وقت آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟''

''میں کسی کا انتظار کررہا ہوں۔''

''اوئے، کہیں واردات کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟'' دوسرا سپاہی طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں ویسے ہی بھنایا ہوا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''او یار، جاؤ اپنا کام کرو۔ ویسے بھی تم لوگ وارداتیوں کو پکڑتے کب ہو؟''

''بکواس کرتا ہے؟'' ایک کانسٹیبل بپھر کر بولا۔ ''نیچے اتر گاڑی سے۔''

میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور سامنے کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔ ''سامنے سے ہٹو ورنہ میں گاڑی چلا دوں گا۔''

سامنے سے ہٹنے کے بجائے اس نے اچانک مجھ پر رائفل سیدھی کرلی اور بولا۔ ''نیچے اتر۔ میں تیری طرم خانی نکالتا ہوں۔''

یہ صورتِ حال دیکھ کر دوسرے دو سپاہی بھی وہاں آگئے اور انہوں نے بغیر کسی پوچھ گچھ کے اپنی رائفلیں مجھ پر سیدھی کرلیں۔

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے بپھر کر پوچھا۔ ''تمہارا افسر کون ہے؟ بلاؤ اسے۔''

افسر ایک سب انسپکٹر تھا جو ابھی تک گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔

ہنگامی صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی گاڑی سے اتر آیا۔ اسے میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ وہ سب انسپکٹر لاکھانی تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ''خرم صاحب! آپ... اور...''

''اپنے آدمیوں کو سنبھالو لاکھانی ورنہ ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، تم ضرور لائن حاضر ہوجاؤ گے۔''

''اوئے، تم لوگ پہچانتے نہیں ہو خرم صاحب کو؟'' وہ دہاڑ کر اپنے ماتحتوں سے بولا۔ ''تم سب کی پیٹیاں اتروا

دیں گے۔"

ان لوگوں نے بھی شاید میرا نام سن رکھا تھا۔ رائفلیں ایک دم ان کے شانوں پر چلی گئیں اور ان میں سے ایک حوالدار خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "معاف کرنا صاحب! میں نے آپ کو اندھیرے میں بالکل نہیں پہچانا۔"

"چلو اوئے، سب گاڑی میں بیٹھو۔" لاکھانی پھر چیخا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خرم صاحب! ان سب کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

"تم سے تو کل میں پولیس اسٹیشن آکر بات کروں گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کل بارہ بجے تھانے میں موجود رہنا۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

میں اپنے فلیٹ پر پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں لفٹ سے اتر کر حسب عادت محتاط انداز میں فلیٹ کی طرف بڑھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے دو دفعہ میرے دشمن میرے ہی فلیٹ میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس دن میری حاضر دماغی کام آگئی تھی ورنہ میں آج زندہ نہ ہوتا۔

میں نے بے آواز انداز میں دروازے کا لاک کھولا اور اپنا پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر میں دروازہ کھول کر ایک دم نیچے بیٹھ گیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا، پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر ایک دم لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ دروازے سے ڈرائنگ روم تک ایک کوریڈور تھا پھر وہ انگریزی کے حرف "L" کی طرح دائیں جانب گھوم گیا تھا۔ میں نے باری باری کچن، باتھ روم، ٹیرس ہر جگہ کی تلاشی لی اور اطمینان کرنے کے بعد اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ کھانا میں اکی کے ریسٹورنٹ میں کھا چکا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی الماری سے ووڈکا کی ایک بوتل نکالی اور ایک لارج پیگ معدے میں اتار لیا۔

صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر ٹی وی پر نیوز بلیٹن دیکھ رہا تھا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج میں آفس کی چھٹی کرلوں۔ دو چار ضروری کام تھے، جو میرا اسسٹنٹ سعید بھی کر سکتا تھا۔

میں نے اسے ہدایات دینے کو سیل فون اٹھایا تو اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر علاقے کے ایس ایچ او بھٹی کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اسے صبح صبح میری کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید کوئی ملزم رات کو پولیس حراست میں مر گیا ہے یا پھر بھٹی کسی اور چکر میں پھنس گیا ہے۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو، کیا حال ہیں بھٹی؟ کیا پھر کسی مصیبت میں پھنس گئے؟"

"خرم صاحب! آپ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچیں۔" بھٹی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور مصیبت میں آپ پھنسنے والے ہیں، میں نہیں۔"

"اچھا مذاق ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں خرم صاحب۔" بھٹی کا لہجہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ "آپ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچیں۔"

"میں ابھی دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" اس کے لہجے پر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

پھر میں نے بہت عجلت میں تیاری کی اور پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھٹی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا پرابلم ہے؟ میں کیسی مصیبت میں پھنسنے والا ہوں؟"

"تم پر قتل اور اغوا کے الزامات ہیں۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

میں نے گھوم کے پیچھے دیکھا۔ علاقہ ایس ایس پی درانی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

بھٹی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایس ایس پی نے میرے ساتھ والی کرسی سنبھالی اور مجھ سے بولا۔ "کل رات تم دو اور تین بجے کے درمیان کہاں تھے؟"

"صاف صاف بات کرو درانی۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "پہیلیاں مت بجھواؤ۔"

"صاف بات سننا چاہتے ہو تو سنو۔" درانی نے کہا۔ "اے اے کے (AAK) گروپ آف کمپنیز کے سیلز منیجر اقبال نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ رات تم نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اسے لوٹنے کی کوشش کی۔ ان کی مزاحمت پر تم نے اسے اور اس کے ڈرائیور کو اتنی بری طرح مارا کہ ڈرائیور موقع پر ہی مر گیا۔ تم اور تمہارا ساتھی اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھے۔ پھر تم نے اس کی اسسٹنٹ ماریہ کو جبراً اپنی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے چلے گئے۔"

"کہانی میں دم ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ کہانی نہیں ہے بلکہ اے اے کے گروپ آف کمپنیز کے سیلز منیجر اقبال کی رپورٹ ہے۔" درانی نے کہا۔

وہ اندر سے بہت خوش تھا لیکن ظاہر نہیں کررہا تھا۔ دُرّانی سے بھی میں اب تک کئی لاکھ روپے اینٹھ چکا تھا۔ ''اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ کل دو اور تین بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟''

''میں کلفٹن کے اس ریسٹورنٹ میں تھا جہاں اکثر و بیشتر آپ بھی جاتے رہتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

دُرّانی کو جوئے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شراب اور شباب کا شوقین تھا اور جینی ان خدمات میں خوب طاق تھی۔

''پھر تم وہاں سے کب نکلے تھے؟''

''نکلتے ہوئے میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔ ہاں، میں شاہراہ قائدین پر پہنچا تو دو آدمی ایک لڑکی کو زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو مارا پیٹا ضرور تھا ورنہ وہ مجھے مار دیتے۔ پھر میں اس لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔''

''ویسے کہانی تو تمہاری بھی پرفیکٹ ہے۔'' دُرّانی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''اب وہ لڑکی کہاں ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ کیسے وہ لڑکی مجھے بھی ٹھل دے کر نکل گئی۔ میں نے اسے سب انسپکٹر لاکھانی اور اس کے سپاہیوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔

''اب تمہاری کہانی میں جھول آگیا ہے کہ وہ لڑکی...''

''دُرّانی صاحب! تم سمیت پولیس کا ہر افسر جانتا ہے کہ میں ڈکیتی اور اغوا جیسے گھٹیا کام نہیں کرتا ہوں۔ یہ کام کرنے کے لیے تم جیسے لوگ ہیں تو مجھے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے لڑکیوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ورنہ لڑکیاں تو اب بھی بہت ہیں اور میرے ایک اشارے پر آبھی سکتی ہیں۔''

''یہ بات ہم تو جانتے ہیں خرم لیکن عدالت کو کون یقین دلائے گا؟''

''عدالت؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے خلاف قتل اور اغوا کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ پولیس اب تک گرفتار کرنے کے لیے تمہارے گھر پہنچ چکی ہوگی۔''

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا لیکن میرے اعصاب بہت مضبوط تھے۔ میں فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ''پھر تم مجھے گرفتار کیوں نہیں کرلیتے؟'' میرے انداز میں تلخی تھی۔

''حالانکہ تم نے ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔'' دُرّانی نے کہا۔ ''لیکن ہم تمہیں دوست سمجھتے ہیں۔''

''اسی لیے تمہیں یہاں بلوالیا۔'' بھٹی نے کہا۔ ''ورنہ اب تک پولیس تمہیں گرفتار کرچکی ہوتی۔''

''ایسا کون سا پولیس والا پیدا ہوگیا جو مجھے گرفتار کرے گا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا خرم۔'' ایس ایس پی دُرّانی نے کہا۔ ''اس کیس میں تمہیں آئی جی صاحب تو کیا ہوم سیکریٹری بھی نہیں بچاسکتے۔ اس کیس کی ایف آئی آر خود اے اے کے گروپ کے سی ای او (CEO) عارف علی خان یعنی اے اے کے نے درج کروائی ہے۔ تم یقیناً عارف خان کو جانتے ہوگے؟''

میں عارف خان کو بہت اچھی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ بظاہر وہ بہت نیک نام آدمی تھا۔ کئی فلاحی ادارے اس کی سرپرستی میں چلتے تھے لیکن اس کا باطن اتنا ہی میلا تھا۔ وہ میری لسٹ پر تھا کہ اس کی کوئی کمزوری مع ٹھوس ثبوت کے میرے ہاتھ میں آئے تو میں اسے بھی شکار کرسکوں۔

میرے حلق سے یہ بات بھی ہضم نہیں ہورہی تھی کہ اپنی کمپنی کی ایک معمولی ملازمہ کی گمشدگی یا اغوا کی رپورٹ درج کرانے عارف خان جیسا ارب پتی شخص بہ نفس نفیس پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ ملک اور بیرونِ ملک اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کمپنی میں سات آٹھ ہزار افراد کا اسٹاف تو ہوگا۔ ان میں سیکڑوں لڑکیاں بھی ہوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ عارف خان اپنے اسٹاف کے ہر رکن کو پہچانتا بھی نہیں ہوگا۔

''کیا عارف خان صاحب اغوا کی رپورٹ درج کرانے خود پولیس اسٹیشن آئے تھے؟'' میں نے دُرّانی سے پوچھا۔

''ان فضول سوالات کے بجائے تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کرو۔'' دُرّانی نے کہا۔ ''عارف صاحب کو بھلا خود پولیس اسٹیشن آنے کی کیا ضرورت تھی، ان کا پی اے آیا تھا۔ عارف خان نے صرف ٹیلی فون پر آئی جی صاحب اور سیکریٹری داخلہ سے بات کی تھی۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ میرے خلاف خوب زبردست سازش تیار ہورہی ہے۔ اغوا اور قتل کے الزام میں پھنسا کر مجھے راستے سے ہٹایا جارہا تھا لیکن کیوں؟ عارف خان کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ میں تو آج تک اس سے ملا بھی نہیں تھا،

ہاں ٹی وی اور اخبارات میں اس کی تصویریں ضرور دیکھی تھیں۔ ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا تھا لیکن براہِ راست اس سے ملاقات نہیں تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو خرم؟'' درانی نے کہا۔ ''میں تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤ۔''

''نکل جاؤں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پھر زندگی بھر پولیس سے چھپتا پھروں؟'' میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر کہا۔ ''یہ کوئی کرپشن اور رشوت خوری کے الزامات نہیں ہیں بلکہ اغوا اور قتل جیسے سنگین جرائم کے الزامات ہیں۔''

''پھر یہیں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرو۔'' بھٹی نے کہا۔ ''اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ شہر کے کسی بھی تھانے میں تمہارے ساتھ بدترین سلوک ہوگا۔''

''اوکے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

''اور یہ یاد رکھنا کہ تم یہاں نہیں آئے تھے۔'' درانی نے کہا۔

ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

میں جاتے جاتے پلٹ آیا اور بولا۔ ''میں ذرا واش روم تک جاؤں گا۔''

میں جانتا تھا کہ واش روم تھانے کے عقبی حصے میں ہیں۔ میں سیدھا ادھر بڑھ گیا۔ وہ حصہ گویا اصل عمارت سے الگ تھلگ تھا۔ وہاں ایک طرف پانی کا نل لگا تھا۔ دائیں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں پولیس والے ''استراحت'' فرماتے تھے۔ الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں سوائے ایک پولیس والے کے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بھی ایک چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کا رخ بھی میری طرف نہیں تھا۔

عقبی دیوار بلند تھی لیکن اتنی بلند نہیں تھی کہ میں اسے پھلانگ نہ سکوں۔ میں نے ایک جست میں اچھل کر دیوار کی منگر کو پکڑ لیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کے سہارے اپنا جسم اوپر کھینچا اور پلک جھپکتے میں دیوار پھلانگ گیا۔ مجھے شبہ تھا کہ درانی اور بھٹی مجھے اتنی فراخ دلی سے فرار کا مشورہ دے رہے ہیں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ دونوں بھی کئی دفعہ مجھ سے زک اٹھا چکے تھے۔ اتنی آسانی سے مجھے کیسے نکلنے دے سکتے تھے۔

دوسری طرف کودنے کے بعد میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ سرے کی طرف بڑھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس اسٹیشن کے باہر تین موبائل وین کھڑی تھیں۔ وہاں بھی زیادہ رکنا خطرناک تھا کیونکہ درانی اور بھٹی میری طرف سے مشتبہ ہو کر پولیس والوں کو اس طرف بھیج سکتے تھے۔

میں کچھ دور تک تیزی سے چلتا رہا، پھر ایک گلی آتے ہی میں اس میں گھس گیا۔ اسے عبور کر کے دوسری طرف پہنچا۔ اسی وقت مجھے ایک رکشا مل گیا۔ میری گاڑی ابھی تک پولیس اسٹیشن کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے رکشا والے سے کلفٹن چلنے کو کہا۔ فوری طور پر اکی ہی کے پاس مجھے پُرسکون ہو کر سوچنے کا موقع مل سکتا تھا۔

اکی اس وقت سو رہا تھا۔ اس کا چوکیدار بھی مجھے جانتا تھا اور دوسرے ملازم بھی۔

چوکیدار نے کچھ کہے بغیر گیٹ کھول دیا اور مجھے سلام بھی کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی کہ میں اتنی صبح یہاں کیوں آیا ہوں؟ ریسٹورنٹ اس وقت بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زینہ اوپر کی منزل کی طرف جاتا تھا۔

میں زینہ چڑھنے لگا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ''کون ہے، ادھر کہاں جاتا ہے؟''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اکی ہی کا ایک ملازم تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے بولا۔ ''صاحب! آپ اس وقت یہاں؟''

''ہاں، مجھے اکی سے بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن صاحب تو ابھی سو رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''سو رہا ہے تو اسے جگا دو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ میرے ساتھ آیئے صاحب، میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے دروازے کا . . . قفل کھولا اور مجھے اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی اور بولا۔ ''صاحب ابھی آرہے ہیں۔ آپ چائے پئیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، تم مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔'' میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

مزید دس منٹ بعد مجھے اکی کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا خمار تھا اور ہونٹوں میں سلگتا ہوا

سگریٹ دبا ہوا تھا۔

''خرم صاحب! خیریت تو ہے؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے یار۔'' میں نے کہا اور اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اکی کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔

میں نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ ''اکی! اگر کوئی پرابلم ہے تو کوئی بات نہیں، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو خرم، میں گھٹیا اور کمینہ ضرور ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہوں۔ جب تک آپ کا دل چاہے یہاں رہیے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو اس مشکل سے کیسے نکالا جائے؟'' پھر اس نے آواز دے کر ملازم کو بلایا اور بولا۔ ''دیکھو بشارت! تم بھی سمجھ لو اور چوکیدار کو بھی سمجھا دو کہ یہاں کوئی نہیں آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' اس نے مستعدی سے کہا۔

''ہاں، ہمارے لیے کافی لے آؤ اور سگریٹ کے دو چار پیکٹ بھی لیتے آنا۔''

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اپنے ایک وکیل دوست ایڈووکیٹ نعیم سموں کا نمبر ملایا۔ میں جانتا تھا کہ سموں اس وقت کورٹ میں ہوگا یا کورٹ جانے والا ہوگا۔

دوسری ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔ ''خیریت ہے خرم؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

میں نے اسے بھی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''تمہیں فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' نعیم نے کہا۔

''میں فرار نہیں ہوا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا تھا تو پھر فرار کا کیا سوال؟''

''اب دُرانی اور بھٹی کا بیان کچھ اور ہوگا۔'' نعیم نے کہا۔ ''اس وقت تم کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے ایک دوست کے پاس ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ اس کیس میں کیا ہو سکتا ہے۔'' نعیم نے کہا۔ ''ایسا کرو، تم شام کو سات بجے تک میرے گھر آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''یار! تم وکیل سے ضمانت قبل از گرفتاری کی بات کرتے۔'' اکی نے کہا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے، قتل اور اغوا کے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہوتی ہے، ممکن ہے اور کوئی گنجائش ہو اگر ایسا ہوا تو نعیم سب سے پہلا کام یہی کرے گا۔''

اچانک مجھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر جینی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی شاید ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ اس دن مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ جینی بہت ہلکا پھلکا میک اپ کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا لیکن وہ مجھے پہلے سے زیادہ ترو تازہ اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو ہینڈسم۔'' جینی نے کہا۔ ''کیا مجھے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟'' پھر وہ میرا موڈ دیکھ کر بولی۔ ''تم اتنی صبح صبح کیسے؟''

''اکی سے ایک ضروری کام تھا۔'' میں نے اسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''جینی!'' اکی نے کہا۔ ''بشارت سے گیسٹ روم صاف کرا دو، خرم صاحب کچھ دن ہمارے مہمان رہیں گے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ یہ صرف ہمارے مہمان ہیں، دوسروں کے لیے یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔''

جینی کی آنکھیں چمکنے لگیں، وہ مسکرا کر بولی۔ ''وہ ہمارے گھر میں آئے...''

''جینی پلیز۔'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''غلط شعر تو میں پریشانی کی حالت میں بھی برداشت نہیں کروں گا۔''

میری بات پر جینی اور اکی دونوں ہنسنے لگے۔

''ہاں، میرے کمرے میں کمپیوٹر ضرور رکھوا دینا۔ یہاں انٹرنیٹ بھی ہوگا؟''

''آپ فکر مت کریں۔'' اکی نے کہا۔ ''سب کچھ ہو جائے گا۔''

جینی اچانک بولی۔ ''رات کو تمہارے جانے کے بعد اس جنگر کا ٹیلی فون آیا تھا۔''

''کون جنگر؟... اچھا وہ ارشد... اسے تو میں بھول ہی گیا تھا، کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ فلیش میں روز جتنا جیتوں گا، اس کا بیس فیصد میرا ہو گا۔''

''تم نے مجھے بتایا نہیں۔'' اکی نے کہا۔

''تو میں کون سا اسے ملازم رکھ رہی ہوں۔'' جینی نے کہا۔

''اسے ملازمت دے کر تم لوگ فائدے میں رہو گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''وہ تمہیں لاکھوں روپے روز کما

کردے گا۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''تم اسے ابھی بلالو۔ مجھے اس سے کام ہے۔ ویسے وہ بہت کام کا آدمی ہے۔''

''تم اسے خود ہی بلاؤ۔'' جینی نے کہا۔

اکی وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور ارشد کا نمبر ملا ہی رہا تھا کہ جینی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''کیا پرابلم ہے؟''

''کبھی دو باتیں مجھ سے بھی کرلیا کرو۔'' اس نے ایک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹایا۔

''جینی ڈیئر!'' میں نے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہوں۔''

''مجھے کچھ بتاؤ گے تو معلوم ہوگا نا؟''

''میں پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میری بات پر جینی بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ ''اس سال کا سب سے بڑا لطیفہ... تم پولیس سے چھپ رہے ہو، تم؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

جینی اٹھ کر میرے پاس آگئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''آئی ایم سوری ڈیئر! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ...''

اسی وقت باہر قدموں کی آہٹ گونجی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''جینی! شاید اکی آرہا ہے۔''

وہ بھی کچھ فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اکی کی قانونی بیوی نہیں تھی لیکن ان دونوں کے درمیان گہرا تعلق تھا۔

اکی کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''خرم صاحب! آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کرلیں۔ میں نے آپ کا کمرا تیار کرا دیا ہے۔ ہاں، الماری میں کپڑے بھی ہیں۔ میرے کپڑے آپ کو کچھ ڈھیلے ہوں گے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔''

☆☆☆

کمرے میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ سب سے زیادہ ضروری تو وہ لیپ ٹاپ تھا جو میز کے ساتھ رکھی ہوئی رائٹنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

میں نے پہلے تو ارشد کو ٹیلی فون کیا اور اس سے وہاں پہنچنے کو کہا پھر میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ''خرم صاحب! آپ کہاں ہیں؟''

''میں جہاں بھی ہوں، ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم بتاؤ، کوئی خاص خبر؟''

''پولیس نے پہلے آپ کے گھر پر چھاپا مارا، پھر وہ لوگ آفس بھی آگئے۔ ان لوگوں نے شاید ایڈیٹر صاحب کو اطلاع دے دی تھی کیونکہ وہ بھی آفس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے مجھے بھی بلا لیا تھا۔ پولیس والوں نے آپ کی الماری اور میز کی درازوں کی تلاشی لی اور کچھ کاغذات وہاں سے لے گئے۔''

''ان میں میری کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی، بس ایک یو ایس بی کام کی تھی، اس کا مجھے افسوس ہے۔''

''آپ کی یو ایس بی محفوظ ہے سر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں پولیس والوں سے پہلے آفس پہنچ گیا تھا۔ آپ کی الماری اور دراز کی چابیوں کا ایک سیٹ میرے پاس بھی ہے۔ میں نے سب سے پہلے دراز سے وہ یو ایس بی اور الماری سے کئی ڈی وی ڈیز نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لی تھیں۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہاں، میرا لیپ ٹاپ بھی تھا۔''

''میں نے آپ کے لیپ ٹاپ پر پاس ورڈ بھی لگا دیا تھا لیکن پولیس والے اسے کھول لیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیپ ٹاپ میں ایسی کوئی خاص چیز تھی بھی نہیں ورنہ میں اسے یوں آفس میں نہ چھوڑتا۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''میں تمہیں کچھ ضروری میلز بھیجوں گا۔ کوشش کرنا کہ میری بھیجی ہوئی خبریں شائع ہوسکیں۔ مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔ میں خود ہی تمہیں کال کرلوں گا کیونکہ یہ سم اب میں تبدیل کررہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اسی وقت بشارت نے آکر بتایا کہ کوئی ارشد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ مجھے پہلے سے ان کے بارے میں بتا نہ دیتیں تو میں انہیں اندر نہیں گھسنے دیتا۔''

''ٹھیک ہے، انہیں یہاں بھیج دو۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی، چہرے پر پژمردگی کے تاثرات تھے اور وہ اس ارشد سے بہت مختلف نظر آرہا تھا جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔

''کیسے ہو ارشد؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

"مجھے کئی دن سے شدید بخار ہے خرم صاحب۔" ارشد نے کہا۔ "کل رات کو میرا پرس بھی نہ جانے کیسے گر گیا۔ دوا تو دور کی بات ہے میں نے تو کل رات سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

میں نے بشارت کو بلایا اور اس سے کھانا لانے کو کہا۔ ارشد واقعی بھوکا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ میں نے اس کے لیے چائے بھی منگوالی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"ارشد! میں تم پر کس حد تک اعتبار کرسکتا ہوں؟"

"خرم صاحب! میں بہت برا آدمی ہوں۔" ارشد نے کہا۔ "لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ جب میں کسی کی برتری تسلیم کرلیتا ہوں تو پھر اسے کبھی دھوکا نہیں دیتا لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں بہت پرابلم میں ہوں اور اپنی یہ پرابلم کسی بے اعتبار آدمی کو بتا بھی نہیں سکتا۔"

"آپ اور پرابلم؟" ارشد نے حیرت سے کہا۔ "آپ سے ملاقات تو کل ہوئی تھی، میں غائبانہ طور پر تو آپ کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ نے پولیس کے بڑے بڑے افسران کو نکیل ڈال رکھی ہے۔ میں زندگی میں کسی آدمی سے مرعوب نہیں ہوا لیکن غائبانہ طور پر آپ سے مرعوب تھا۔ کل رات آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میرے ہاتھوں زخمی ہوجاتا۔ جب میڈم جینی نے آپ کا نام لے کر پکارا تو میں چونک اٹھا۔"

"ارشد! کل رات تک حالات واقعی میرے حق میں تھے لیکن اب نہیں ہیں۔"

"مجھے بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟" ارشد نے کہا۔

"میری گاڑی پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑی ہے۔ اس کے ایک خفیہ خانے میں میرے کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ اگر لاسکتے ہو تو وہ لے آؤ۔" میں نے اسے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اسی سال کا ماڈل ہے، بلیک ہنڈا ہے۔

"گاڑی لانی ہے یا صرف کاغذات لانے ہیں؟" اس نے اعتماد سے پوچھا۔

"گاڑی کو چھوڑو، وہ تو مجھے مل ہی جائے گی۔ تم فوری طور پر خاکی رنگ کا وہ لفافہ لاسکتے ہو تو لے آؤ۔"

میں نے اسے بتایا کہ پسنجر سیٹ کی پشت کو تین دفعہ اوپر کی طرف کھینچو گے تو وہ بچوں کے اسکول بیگ کی طرح کھل جائے گی۔ اس میں خاکی رنگ کے دو لفافے ہوں گے۔ وہ لفافے لے آؤ۔"

"یہ کام تو بہت آسان ہے خرم صاحب۔" ارشد مسکرا کر بولا۔

"ہاں لفافے لے کر یہاں مت آنا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں یہاں سے جانے والا ہوں۔ تم وہ لفافے نکالنے میں کامیاب ہوجاؤ تو مجھے کال کرلینا۔"

"ٹھیک ہے خرم صاحب۔" ارشد نے کہا۔ "لیکن آپ نے مجھ پر ابھی تک اعتبار نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کچھ دن یہیں رہیں گے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ارشد۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے اپنے وکیل کے پاس جانا ہے۔ وہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے اس لیے مجھے وہاں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ تم پر اعتبار نہ ہوتا تو تم سے اتنے اہم کاغذات نہ منگواتا۔"

"مجھے اس کے لیے تھوڑی بہت تیاری کرنا پڑے گی۔" ارشد نے کہا۔ "اگر..."

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنے پرس سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ اسے دے دیے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے سیل فون کے تمام نمبرز لیپ ٹاپ میں ٹرانسفر کیے اور سیل فون کی سم نکال لی۔ پولیس موبائل ٹریکنگ کے ذریعے میرا ٹھکانا معلوم کرسکتی تھی۔

اچانک بشارت بوکھلایا ہوا آیا اور بولا۔ "صاحب! باہر پولیس کی دو گاڑیاں آئی ہیں۔"

میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بشارت سے کہا۔ "اکی کہاں ہے، اسے فوراً میرے پاس بھیجو۔"

اس سے پہلے ہی اکی میرے پاس آگیا اور بولا۔ "خرم صاحب! آپ عقبی دروازے سے باہر نکل جائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہے۔"

اسی وقت عجلت میں جینی بھی وہاں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اس نے وہ بریف کیس مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں وہ رقم ہے جو تم نے کل میرے پاس رکھوائی تھی۔"

میں نے بریف کیس لیتے ہوئے اکی سے کہا۔ "وہ لیپ ٹاپ میرے کمرے سے ہٹادو اور پولیس والوں سے جھوٹ مت بولنا کہ خرم یہاں نہیں آیا تھا ورنہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ تم صرف یہ بتانا کہ خرم یہاں آیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے نکل گیا ہے۔ وہ تلاشی لینے پر اصرار

کریں تو انہیں روکنا مت۔"

"کسی نے تمہارے بارے میں مخبری کی ہے خرم۔" جینی نے کہا۔ "وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"اس پر بعد میں غور کروں گا۔" میں نے عقبی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا۔

اکی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ نیچے بھی دو تین کمرے تھے۔ وہ ریسٹورنٹ کا عقبی حصہ تھا۔ اس میں پرانا فرنیچر اور دوسرا کاٹھ کباڑ تھا۔

اکی نے بیرونی دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بولا۔ "ابھی تک اس طرف کوئی پولیس والا نہیں آیا ہے۔ یہاں سے نکل کر تم بائیں طرف جاؤ گے تو ایک چوڑی گلی آ جائے گی۔ وہ گلی آگے جا کر مین روڈ پر نکلے گی، جاؤ خدا حافظ۔"

میں پولیس کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا کہ وہ عقبی راستہ کھلا چھوڑ دے گی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے گلی میں جھانکا۔ وہاں دور دور تک سناٹا تھا۔ اس طرف لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔

میں دل کڑا کر کے باہر نکل گیا اور وہاں رکے بغیر تیزی سے بائیں طرف بڑھا۔

اسی وقت گلی کے نکڑ پر مجھے پولیس کی وردی کی جھلک دکھائی دی۔ میں تیزی سے چوڑی گلی میں داخل ہو گیا۔

گلی میں دائیں طرف ایک ادھ کھلا گیٹ تھا۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس گھر میں داخل ہو گیا اور گیٹ اندر سے بند کر دیا۔

اسی وقت مجھے گیٹ کے سامنے سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پرانی طرز کا بنگلا تھا۔ میرے سامنے وسیع و عریض لان تھا، پھر کافی فاصلے پر کار پورچ اور برآمدہ تھا۔ میں تیزی سے لان میں داخل ہوا اور نیم کے ایک گھنے درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اچانک کسی نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں دستک کے انداز ہی سے سمجھ گیا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں جس درخت کے نیچے کھڑا تھا، وہ خاصا گھنا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی ٹائی کھول کر بریف کیس اس میں باندھا اور پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔

دروازہ دوسری مرتبہ زیادہ قوت سے پیٹا گیا۔ دور سے کوئی نسوانی آواز آئی۔ "کون ہے؟" پھر اندر سے کوئی باہر کی طرف آیا۔ میں مزید گھنی شاخوں میں چھپ گیا۔ مجھے وہاں سے بنگلے کا مین گیٹ بھی نظر آ رہا تھا اور اس کا اقامتی حصہ بھی۔ اس طرف سے کوئی عورت مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تقریباً پینتالیس سال کی باوقار عورت تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، جسم پر قیمتی اونی شال تھی۔ وہ مین گیٹ کے پاس جا کر ایک مرتبہ پھر درشت لہجے میں بولی۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولیں، پولیس۔" باہر سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"پولیس؟" عورت نے ناگواری سے کہا۔ "پولیس کا یہاں کیا کام؟"

"آپ دروازہ تو کھولیں۔" اس مرتبہ باہر سے قدرے نرم لہجے میں کہا گیا۔

عورت نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا اور اطمینان کرنے کے بعد دروازہ کھول دیا۔

فوراً ہی پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی اندر آ گئے۔

"کیا بات ہے؟" عورت نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہم ایک مفرور ملزم کی تلاش میں ہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "وہ بہت خطرناک ملزم ہے میڈم! جیل سے فرار ہوا ہے۔" سب انسپکٹر نے مجھے جیل سے بھاگا ہوا مجرم بنا دیا۔ "ہمارا خیال ہے کہ وہ اس طرف آیا ہے۔"

"یہاں تو کئی دن سے کوئی نہیں آیا۔ میں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اس وقت وہ بھی آفس گئی ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔ میں آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔"

سب انسپکٹر کچھ سوچتا رہا، اس نے مین گیٹ اور اس کے اوپر لگی ہوئی مضبوط گرل کا جائزہ لیا۔ بنگلے کی باؤنڈری وال بھی بہت اونچی تھی اور اس پر خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے۔ گھر والوں کی مرضی کے بغیر باہر سے کوئی آدمی اندر داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"میں تلاشی تو نہیں لوں گا۔" سب انسپکٹر شاید اس عورت کی شخصیت اور اس کے پُراعتماد لہجے سے مرعوب ہو گیا تھا۔ "ہاں، آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ وہ بہت خطرناک مجرم ہے اور کئی لوگوں کو قتل کر چکا ہے۔" اس کم بخت نے مجھے خطرناک مجرم بنا دیا۔

"شکریہ آفیسر۔" خاتون نے کہا۔ "میں محتاط رہوں

گی۔''

پولیس والے واپس چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

خاتون نے مین گیٹ دوبارہ لاک کیا، چند لمحے وہاں ٹھہر کے اردگرد کا جائزہ لیا پھر دوبارہ اندر چلی گئی۔

میں درخت کی ایک نیکلی شاخ پر بہت تکلیف میں بیٹھا تھا۔ اگر پولیس والے دس پندرہ منٹ مزید رک جاتے تو شاید میں نیچے گر پڑتا۔

میں آہستہ آہستہ نیچے اترا، اپنے بالوں اور کپڑوں سے گرد اور نیم کے پتے جھاڑے۔ بریف کیس کے ہینڈل سے ٹائی کھول کے کوٹ کی جیب میں رکھی اور لان کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ وہاں میں قدرے محفوظ تھا لیکن جھاڑیاں اتنی گھنی نہیں تھیں کہ میں مکمل طور پر چھپ سکتا۔ کوئی اگر مجھے خاص طور پر تلاش کرتا ہوا اس طرف آتا تو میں اسے نظر آجاتا۔

میں نے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اپنا سانس درست کیا، پھر باہر جانے کے ارادے سے اٹھا۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس اب تک وہاں سے چلی گئی ہوگی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ پولیس اتنی جلدی وہاں پہنچ کیسے گئی؟ اس بات پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں تھا۔

بنگلے کی مالکن اندر جانے کے بعد ایک دفعہ بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے بنگلے میں وہ تنہا رہتی ہے۔ ابھی تک مجھے کوئی ملازم یا چوکیدار بھی نظر نہیں آیا تھا۔

''ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بنگلے کے بیرونی دروازے پر کوئی گاڑی آکر رکی۔ پولیس شاید ابھی گئی نہیں تھی' پھر کسی نے باہر سے مین گیٹ کھولا اور گاڑی اندر پورچ میں لانے کے بعد دوبارہ گیٹ بند کردیا۔

وہ شخص شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس تھا اور حلیے سے ملازم لگ رہا تھا۔

اس نے گاڑی سے کچھ شاپرز نکالے اور اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ وہی عورت ایک مرتبہ پھر برآمدے میں نکل آئی اور بولی۔ غفور! تم نے اتنی دیر کہاں لگادی؟''

''بیگم صاحب! کئی جگہ ٹریفک جام تھا۔ میں نے پہلے بی بی صاحبہ کو یونیورسٹی چھوڑا، پھر سودا خریدنے کے بعد آیا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یہ چوکیدار ابھی تک چھٹی سے واپس نہیں آیا۔ مجھ سے کہا تھا کہ صبح تک آجاؤں گا۔''

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس چلی گئی۔

غفور بھی سامان اٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور پنجوں کے بل جھکا جھکا چلتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے میں بنگلے سے باہر تھا۔ گیٹ بند کرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں تیزی سے مین روڈ کی طرف بڑھ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اب کہاں جاؤں؟ میں نے تو اس شہر میں اب تک دشمن ہی بنائے تھے۔ دوست تو محض چند تھے۔ دوستوں پر مجھے آصف کا خیال آیا۔ میں اپنا سیل فون آن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس سم کے ذریعے مجھے کھوج لیتی۔

میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس سے ملیر چلنے کو کہا۔

جب ٹیکسی ایف ٹی سی سے آگے گزر گئی تو میں نے سیل فون آن کردیا۔ ہماری پولیس کی کارکردگی ایسی بھی نہیں ہے کہ وہ فوری طور پر سم کے ذریعے لوکیشن معلوم کرسکے۔ میں تو حرکت میں تھا۔ میں نے آصف کا نمبر ملالیا۔

وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''خرم! تم کہاں ہو؟ میں تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہوں۔''

''یار! اس وقت تو میں بہت مصیبت میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پورے شہر کی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔''

''احمق ہو تم۔'' آصف نے کہا۔ ''تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس تو ...... بہت سے پولیس آفیسرز کی کمزوریاں ہیں۔ انہیں دھمکی دو کہ گرفتاری کی صورت میں تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی مارے جائیں گے۔ تم سب کچھ میڈیا کو بتادو گے۔ پھر دیکھنا، ہر پولیس آفیسر کی یہی کوشش ہوگی کہ تمہاری گرفتاری عمل میں نہ آئے۔''

''بہت اچھا مشورہ ہے یار! میری تو عقل ہی خبط ہوکر رہ گئی تھی۔ مجھے یہ سامنے کی بات کیوں نہ سوجھی۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کرکے سلسلہ منقطع کردیا اور ڈی آئی جی کرائمز کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کرلی۔ ''خرم! تم کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہوگیا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کردو۔''

''کھیل تو اب شروع ہوا ہے ڈی آئی جی صاحب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو کب کا خود کو قانون کے حوالے کردیتا۔ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کا خیال ہے۔ میں نے اگر میڈیا کے سامنے زبان کھول دی تو نہ صرف آپ کی ملازمت جائے گی بلکہ آپ کو سزا بھی ہوسکتی ہے۔''

ڈی آئی جی چند لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔
میں سمجھا کہ شاید لائن کٹ گئی ہے۔ وہ چند لمحے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم اب بھی مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟ ایک دفعہ تم پولیس کے ہاتھ آ گئے تو کسی کو تمہارا سراغ بھی نہیں ملے گا۔“
میں نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آپ کیا مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہیں؟ تمام ثبوت میرے وکیل کے پاس محفوظ ہیں۔ میری موت یا گمشدگی کی صورت میں وہ تمام ثبوت میڈیا کے حوالے کر دے گا۔“
”تم انتہائی خبیث اور کمینے آدمی ہو خرم۔“ ڈی آئی جی نے شاید دانت... پیستے ہوئے کہا تھا۔
”وہ تو میں ہوں لیکن آپ سے کم ہوں۔“ میں نے طنز سے کہا۔ ”اب پولیس کو میرا پیچھا کرنے سے روکیں یا پھر میں آئی جی صاحب سے رابطہ کروں؟“ یہ کہہ کر میں نے لائن ڈراپ کر دی۔
دوسری کال میں نے ایس ایس پی احسان کو کی۔ وہ میری آواز سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔
”زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے احسان صاحب! میں اگر ڈوبا تو کئی نام نہاد دیانت دار افسروں کو لے کر ڈوبوں گا۔ تم تو بہت بری طرح مارے جاؤ گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔“
”لیکن مجھ پر اوپر سے پریشر ہے۔“ احسان شکستہ لہجے میں بولا۔ ”عارف خان صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔“
”وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ بس تم یہ سوچو کہ میری گرفتاری کے بعد تمہارا کیا بنے گا؟“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے مزید تین چار رشوت خور افسران کو ٹیلی فون کیے اور مطمئن ہو کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔
میں جانتا تھا کہ اب مجھے پولیس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔
”ملیر میں کہاں جانا ہے صاحب؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔ اس وقت ہم اسٹار گیٹ کے پاس سے گزر رہے تھے۔
میں نے چونک کر ڈرائیور کو دیکھا پھر بولا۔ ”مجھے واپس کلفٹن لے چلو۔“
ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر ٹیکسی کا رخ پرانے ائرپورٹ کی طرف موڑ کے آگے سے یوٹرن لیا اور دوبارہ شاہراہ فیصل پر آ گیا۔
میں نے سیل فون دوبارہ نکالا اور راکی کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”خرم صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں؟“
”ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم بتاؤ، پولیس ابھی موجود ہے یا چلی گئی؟“
”بیس پچیس منٹ پہلے تک تو پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور تین سپاہی یہاں موجود تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے جانے کی دھمکی دے رہے تھے۔“
”پولیس کو کیسے معلوم ہوا کہ میں وہاں موجود تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”ان کے پاس آئی ٹی کے ماہرین ہیں خرم صاحب! ان لوگوں نے آپ کے سیل فون کی ٹریکنگ سے معلوم کر لیا کہ آپ کہاں ہیں۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اچانک سب انسپکٹر کو کسی افسر کی کال موصول ہوئی۔ وہ ”یس سر، یس سر“ کرتا رہا، پھر اپنے آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔“
”اب وہ وہاں آئے گا بھی نہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
”آپ ہیں کہاں؟“ راکی نے پوچھا۔
”میں ابھی آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ پریشان مت ہو۔ اب پولیس کا کوئی آدمی وہاں کا رخ بھی نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

”آپ نے تو کمال کر دیا خرم صاحب۔“ راکی ہنس کر بولا۔
میں ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچا تھا اور اس وقت اس کمرے میں بیٹھا تھا جو راکی نے مجھے دیا تھا۔
”میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ارشد نے آپ کے بارے میں پولیس کو بتایا ہے۔“ راکی نے کہا۔
”مجھے بھی یہ شک گزرا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
پھر میں نے سیل فون پر اپنے اسسٹنٹ سعید سے رابطہ کیا۔ ”ہاں سعید! کیا خبر ہے؟“
”ایڈیٹر صاحب بہت غصے میں ہیں۔“ سعید نے کہا۔ ”وہ کافی دیر آپ کا ٹیلی فون ملاتے رہے لیکن آپ کا سیل فون بند تھا۔“
”میں ان سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔ تم وہ یو ایس بی اور میرے دوسرے کاغذات لے کر پریس کلب آ جاؤ۔

میں وہاں سے لے لوں گا۔ مجھے اگر دیر ہو جائے تو تم وہ چیزیں ایک لفافے میں بند کرکے وہاں کے ویٹر اسلم کو دے دینا۔''

''آ... آپ... پریس کلب...''

''ہاں، میں پریس کلب آؤں گا۔'' میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

جینی نے کھانا تیار کرلیا تھا۔ میں نے بھی صبح صرف دو سلائس کھائے تھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں لمبی تان کر سو جاؤں لیکن یہ وقت سونے کا نہیں تھا۔

اچانک جینی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''ارشد کی کال ہے تمہارے لیے۔''

''بات کراؤ۔'' میں نے کہا۔

''خرم صاحب!'' ارشد کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے آپ کی گاڑی سے وہ لفافہ نکال لیا ہے۔ اب بتایئے آپ کو کہاں پہنچاؤں؟''

''تم یہیں آجاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عارف خان کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ وہ لڑکی ماریہ اچانک کہاں غائب ہوگئی۔ اس کے غائب ہونے سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ سب سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا۔ عارف خان کے ایک منیجر اقبال نے بھی میرے خلاف گواہی دی تھی۔ میں پہلے اسی سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد وہاں پہنچ گیا۔ پہلی نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور بالوں کا رنگ بھی براؤن ہوگیا تھا، آنکھوں پر بہترین فریم کا چشمہ تھا۔

اس نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے ایک نظر لفافے کے کاغذات پر ڈالی اور مطمئن ہوکر اسے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

پھر میں نے ارشد سے پوچھا۔ ''تم کوئی ہتھیار چلا سکتے ہو؟''

ارشد نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''میں پسٹل اور ریوالور چلا سکتا ہوں۔ کوئی بھاری ہتھیار آج تک نہیں چلایا۔''

''میں تمہیں کسی جنگ پر نہیں بھیج رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا نشانہ کیسا ہے؟''

''بس فائر کرلیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' میں نے کہا۔ ''(AAK) اے اے کے گروپ آف کمپنیز کے ایک منیجر اقبال سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

''پوچھ گچھ کہاں کریں گے؟'' ارشد نے پوچھا۔

''تمہارے پاس کوئی ٹھکانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ایک ٹھکانا ہے تو لیکن وہ بہت دور ہے۔'' ارشد نے کہا۔ ''ملیر کھوکھرا پار کے علاقے میں میرے ایک دوست کا مکان ہے۔ وہاں...''

''ٹھکانا تو یہاں بھی ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''میرے پاس دو فلیٹ ہیں اور دونوں آج کل خالی ہیں۔ ایک فلیٹ تو سی ویو کے علاقے میں ہے۔ وہاں ابھی زیادہ فلیٹ آباد نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے، وہ فلیٹ چلے گا لیکن تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

اس کے بنگلے سے پہلے میں باہر نکل گیا۔ ممکن ہے پولیس اب بھی وہاں کی نگرانی کررہی ہو۔

کچھ فاصلے پر ایک پیٹرول پمپ تھا۔ میں پیٹرول لینے کے بہانے وہاں کھڑا ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جینی اور ارشد بھی دوسری گاڑی میں وہاں پہنچ گئے۔

اے اے کے گروپ آف کمپنیز کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ کی ایک کثیرالمنزلہ بلڈنگ میں تھا۔ وہاں اقبال جیسے بیسیوں منیجر ہوں گے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اقبال کس شعبے میں ہے۔

بلڈنگ کے دروازے کے سامنے بے شمار گاڑیاں تھیں۔ وہاں تو گاڑی پارک کرنا بھی ایک عذاب تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ارشد کو اقبال کی تلاش میں آفس کے اندر بھیجوں کہ میری مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ بلڈنگ کے مرکزی دروازے سے اقبال نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ میں نے ارشد سے کہا۔ وہ جس آدمی نے براؤن پینٹ اور سفید شرٹ پہن رکھی ہے، وہی اقبال ہے۔

ارشد فوراً گاڑی سے اتر گیا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس نے جینی کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کردیا۔

میں نے دیکھا، ارشد اس سے کچھ بات کررہا تھا۔ اقبال نے ایک طرف اشارہ کیا، پھر جینی بھی وہاں پہنچ گئی اور ہنس ہنس کر اقبال سے باتیں کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اقبال کو میں نے ان دونوں کے ساتھ جینی کی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اقبال کو کچھ نظر نہ آرہا ہو۔ ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو میں نے بھی اپنی گاڑی ان کے پیچھے لگا دی۔

☆☆☆

وہ علاقہ ڈیفنس کے فیز 8 کا علاقہ تھا۔ وہاں ابھی آبادی بہت کم تھی۔ یوں بھی وہ علاقہ خاصا دور تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔

اقبال کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں اور وہ بار بار اپنی آنکھوں کو ٹشو پیپر سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب ارشد اس کا ہاتھ پکڑ کے اس غیر آباد کمپلیکس کی طرف بڑھا تو وہ تشویش سے بولا۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''فکر مت کرو۔'' ارشد نے کہا۔ ''یہاں بہت اچھا آئی اسپیشلسٹ بیٹھتا ہے۔ وہ مشکل سے ٹائم دیتا ہے لیکن نورین کا دوست ہے اس لیے تمہیں فوراً دیکھ لے گا۔''

''میری آنکھوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔'' اقبال نے پریشان ہو کر کہا۔

''ایسا ہوتا ہے۔'' ارشد نے کہا۔ ''ویسے آپ رہتے کہاں ہیں۔ اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر دیں تاکہ آپ کے گھر تو اطلاع کر دی جائے۔''

''گھر میں صرف میری والدہ ہیں۔ انہیں صرف یہ اطلاع دے دیں کہ میں دیر سے آؤں گا۔ میری آنکھوں کے بارے میں نہ بتائیے گا، وہ پریشان ہو جائیں گی۔''

وہاں ابھی تک لفٹ بھی نہیں لگی تھی۔ ہمیں سیڑھیوں ہی سے اوپر جانا پڑا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ وہ فلیٹ دوسرے ہی فلور پر تھا۔

اوپر پہنچ کر جینی نے دروازہ کھولا اور ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ وہ ڈرائنگ روم تھا۔ جینی ہم لوگوں کو بیڈ روم میں لے گئی۔ میری سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ اقبال کی آنکھوں کو اچانک کیا ہوا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اس میں بھی ارشد کے کسی شعبدے کا ہاتھ ہے۔

ارشد نے اقبال کو بیڈ پر لٹا دیا اور جیب سے چھوٹی سی ایک شیشی نکالی اور اقبال پر جھک گیا اور اس سے آنکھیں کھولنے کو کہا پھر اس نے باری باری اس کی آنکھوں میں اس محلول کے ڈراپ ڈال دیے۔

اقبال تکلیف کی شدت سے بری طرح چیخا۔ ارشد نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔ ''بس چند منٹ کی تکلیف ہے پھر تمہیں سب کچھ نظر آنے لگے گا۔''

چند منٹ بعد واقعی اقبال نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ ارشد اور جینی کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ... یہ... کسی ڈاکٹر کا کلینک تو نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''واقعی یہ ڈاکٹر کا کلینک نہیں ہے۔'' میں نے اس کی پشت سے کہا۔

اس نے چونک کے سر گھمایا اور مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا۔

پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ارشد نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بیٹھے رہو اقبال، ورنہ ایک مرتبہ پھر اندھے ہو جاؤ گے۔''

''تو... کیا... تم نے... مجھے...''

''ہاں۔'' ارشد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے ہی تمہیں وقتی طور پر اندھا کر دیا تھا۔''

''دیکھو اقبال!'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے جو کچھ پوچھوں، وہ سچ سچ بتانا۔ میرا وقت ضائع مت کرنا۔''

''م... مجھے... جو کچھ معلوم ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔'' اقبال نے کہا۔

''ماریہ کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''کون ماریہ؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اچانک اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''تم ماریہ کو بھول گئے؟''

''اچھا وہ... لڑکی جو...''

''ہاں، وہی لڑکی جسے تم لوگ اغوا کرنے کا ڈراما کر رہے تھے؟''

''مجھے... نہیں معلوم... وہ کہاں ہے؟'' اقبال نے کہا۔

میں نے اچانک اس کے بال پکڑ لیے اور اسے زوردار جھٹکا دیا۔ ''میں نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔'' میں نے اس کے چہرے پر دوسرا تھپڑ اتنی زور سے مارا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ ''ماریہ کہاں ہے؟'' میں نے پھر غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''اسے کیا معلوم کہ ماریہ کہاں ہے؟'' باہر سے ایک آواز آئی۔ میں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ لوگ نہ جانے کیسے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور اس نے تاریک شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ پریشانی

کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں پتلی نال والا نائن ایم ایم کا پسٹل بھی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو آدمی مزید اندر آگئے۔ ان کے چہرے بھی مفلر میں چھپے ہوئے تھے لیکن وہ بھی مسلح تھے۔

"میں بتاتا ہوں مار یہ کہاں ہے؟" داڑھی والے نے ہنس کر کہا۔ "بلکہ تمہیں بھی اس کے پاس لے چلتا ہوں۔" پھر وہ چیخ کر ارشد سے بولا۔ "نہیں، اپنے ہاتھ اوپر ہی رکھو ورنہ میں فائر کردوں گا۔"

ارشد نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

داڑھی والے نے آگے بڑھ کر اچانک ارشد کے سر پر پسٹل کے دستے سے وار کیا۔ وہ آگے پیچھے ڈولا پھر فرش پر گر گیا۔

"تم دونوں بھی اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔" اس نے مجھے اور جینی کو حکم دیا۔

ہم دونوں دیوار کی طرف گھوم گئے۔

"تم لوگ کیا سمجھتے تھے کہ ہم بالکل اُلّو کے پٹھے ہیں؟ جب تم نے اقبال کو اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا تو ہم نے تمہاری گاڑیوں کا پیچھا کیا تھا۔"

پھر اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن فرش تیزی سے میری طرف آیا یا میں فرش کی طرف گیا اور دھم سے فرش پر گر گیا۔ میں نے آخری آواز داڑھی والے کی سنی، وہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو باندھ دو۔

پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے ہوش آیا تو پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں، پھر آہستہ آہستہ ذہن سے دھند چھٹنے لگی اور مجھے یاد آگیا کہ میں جینی اور ارشد کے ساتھ ڈیفنس فیز آٹھ کے ایک فلیٹ میں موجود تھا۔ ہم وہاں اقبال کو لائے تھے پھر... پھر... وہاں کچھ لوگ آگئے تھے اور..."

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور مجھے ابھی تک چکر آرہے تھے۔ کمرے کا فرش ڈول رہا تھا۔ فضا میں مچھلی کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ پھر مجھے لہروں کا شور سنائی دیا اور کمرے کا فرش پھر بری طرح ڈولا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کسی بوٹ یا لانچ پر ہوں۔

میں نے گردن گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ارشد بھی بندھا پڑا تھا اور جینی بھی۔ وہ دونوں ابھی تک بے ہوش تھے۔

میرے سر میں بھی ٹیسیں... اٹھ رہی تھیں۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔

اچانک وہاں قدموں کی آہٹ گونجی لیکن میں آنکھیں موندیں لیٹا رہا پھر کوئی کرخت لہجے میں بولا۔ "اڑے یہ لوگ ابھی تک ٹن ہے۔ یہ مر تو نہیں گیا؟"

"اگر نادر نے زوردار ہاتھ مارا ہوگا تو مر بھی سکتا ہے۔"

"اگر یہ مر گیا تو باس... ہم لوگ کا بھی کھال کھینچ لے گا... ان کو دیکھو۔" پہلی آواز سنائی دی۔

سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ مجھے شدید سردی کا احساس ہو رہا تھا۔

"اڑے، ان لوگ کے منہ پر پانی ڈالو... انہیں ہوش میں لاؤ۔"

پانی کا نام سن کر ہی مجھے مزید سردی کا احساس ہوا، میں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

پھر مجھے جینی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی ہوش میں آرہی تھی۔

"یار! ہم لوگ ایسے مرنے والے نہیں ہیں۔" مجھے ارشد کی آواز سنائی دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی میرے بعد ہی ہوش میں آگیا تھا۔

"ان لوگ کو اوپر پہنچاؤ۔ یہاں تو مچھلی بھرا جائے گا۔" پہلے والے آدمی نے کہا۔

گویا وہ کوئی ماہی گیری کا ٹریلر تھا۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے جہازوں پر آچکا تھا۔ پولیس کے کئی افسران اس قسم کے جہازوں کے مالک تھے۔ وہ اکثر مجھے مچھلی کے شکار کے لیے ان جہازوں میں کھلے سمندر میں لے جاتے تھے۔ مقامی مچھیرے اسے "ہوڑا" کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے صرف میرے پیر کھولے اور انتہائی بے رحمی سے کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ سر میں اچانک دھمک سی ہوئی۔ چکر آیا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے اس کیبن سے باہر لے گئے اور لوہے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ انہوں نے مجھے ایک دوسرے کیبن میں پھینک دیا اور ایک مرتبہ پھر میرے پاؤں باندھ دیے۔

یہ کیبن مچھلی کے اس اسٹور روم سے قدرے بہتر تھا یہاں فرش پر دبیز قالین تھا، گو وہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ وہاں پرانا سا ایک صوفہ سیٹ اور چھوٹی میز موجود تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے کونے میں دو کرسیاں تھیں۔ تمام فرنیچر لوہے کا تھا اور کیبن میں فکس تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پہلے بھی اس لانچ میں

آ چکا ہوں لیکن کب اور کس کے ساتھ، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہاں ارشد اور جینی بھی آ گئے۔ جینی کی حالت تباہ تھی۔ وہ چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ ارشد نے البتہ خود کو سنبھال رکھا تھا۔

وہ لوگ ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے تو ارشد نے مجھ سے کہا۔ ''بس میں ایک موقع کا منتظر ہوں۔ وہ موقع ملتے ہی میں خود کو آزاد کرا لوں گا۔''

''ابھی ایسی کوئی حماقت نہ کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''اور آہستہ بولو۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔''

وہ لوگ واقعی ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ باہر سے اچانک تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تعداد میں کئی تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''کیا بڑا صاحب بھی اس ہوڑے پر آئے گا؟''

''بڑا صاحب اس ہوڑے پر کیوں آئے گا؟'' دوسرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی لانچ پر آئے گا۔''

''تو کیا ان لوگوں کو ادھر لے جانا پڑے گا؟'' تیسری آواز سنائی دی۔

''یہ تو جابر ہی بتائے گا۔'' پہلی آواز آئی۔

''یہاں ایک لڑکی اور ایک آدمی پہلے سے قید ہے۔'' دوسری آواز سنائی دی۔ بڑا صاحب ان لوگوں کو یہاں جمع کیوں کر رہا ہے؟''

اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ خاموش ہو گئے۔

''اڑے ان لوگوں کو کچھ کھانے کو بھی دیا؟'' شاید آنے والا بولا تھا۔ یہ آواز میں نے نیچے اسٹور روم میں بھی سنی تھی۔

''چائے ابھی تیار ہو رہا ہے جابر بھائی۔'' دوسرا آدمی بولا۔

''ابھی جلدی سے اس لانچ کا صفائی کر دو۔'' جابر نے کہا۔ ''بڑا صاحب ادھر ہی آئے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ایک شخص چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا اور ہمیں اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ چائے بدمزہ اور بسکٹ نمی سے نرم پڑ گئے تھے۔ میں نے ایک بسکٹ کھا کر مزید کھانے سے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں عجیب سی چہل پہل شروع ہو گئی۔ کوئی چیخ کر بولا۔ ''بڑا صاحب آ رہا ہے۔''

چند منٹ بعد باوقار اور بارعب سا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید براق شلوار سوٹ پر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا اور سیاہ بال کن پٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے۔ وہ عارف خان تھا۔ ملک کا معروف صنعت کار۔ میں نے اسے تصویروں میں دیکھا تھا لیکن وہ حقیقت میں زیادہ باوقار اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی مزید اندر آئے تھے۔ وہ دونوں رائفلوں سے مسلح تھے۔ عارف خان نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا، پھر بولا۔ ''تم دونوں میں خرم کون ہے؟''

ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ اس کی نظر جینی پر پڑی تو جم کر رہ گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کی خوب صورت اور دمکتی ہوئی جلد دکھائی دے رہی تھی۔

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے کیوں گھور رہے ہو، میں تو خرم ہونے سے رہی۔''

''میں ہوں خرم۔'' میں نے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ ہونا ہے، ہو جائے۔

''تم نے پولیس کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے؟'' وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

''صرف پولیس ہی کو نہیں بلکہ ان میں آپ جیسے کئی بڑے بزنس مین اور صنعت کار بھی شامل ہیں۔''

''آج میں تمہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا نہ ہوگا بانس، نہ بجے گی بانسری۔''

''لیکن میں نے تمہیں تو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں تو تمہیں ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں ہوں۔''

''تم نے نہ جانتے ہوئے بھی مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔'' وہ نفرت سے بولا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ آج یا کل میری بھی کوئی کمزوری تمہارے ہاتھ آ جاتی اور میں بھی دوسروں کی طرح بلیک میل ہونے لگتا لیکن مجھے بلیک میل ہونا قطعی پسند نہیں ہے۔''

''تم تو بہت نیک نام ہو۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ شہر میں دو اسپتال، کئی اسکول اور کئی فلاحی ادارے چلا رہے ہو۔''

''تو اتنا سیدھا تو نہیں جتنا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔'' عارف خان کو اچانک غصہ آ گیا۔ اسے نہ جانے میری کون سی بات بری لگ گئی تھی۔

''تیری کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دے۔'' عارف خان نے درشت لہجے میں کہا۔

''یار! تمہارا انداز تو بالکل گئے وقتوں کے بادشاہوں

والا ہے۔'' میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''میری آخری خواہش تو یہ ہے کہ تو مجھے چھوڑ دے۔'' میں نے بھی اسی کے لہجے میں اور الفاظ میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تیری کوئی آخری خواہش ہی نہیں ہے۔''

''اچھا، یہ ہی بتا دو کہ تمہاری مجھ سے دشمنی کیا ہے؟ ماریہ کون ہے اور وہ کہاں ہے اور تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟''

''ہاں، یہ تمام باتیں میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔'' عارف خان نے کہا۔ مرنے سے پہلے سب کچھ جاننا تیرا حق بھی ہے۔'' پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''جابر! ماریہ اور اس پولیس افسر کو یہاں لے کر آؤ۔''

''پولیس افسر؟'' میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ ''تو اس کی قید میں کوئی پولیس افسر بھی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد جابر اور اس کا آدمی ماریہ اور ایک شخص کو دھکیلتے ہوئے وہاں لے آئے۔ اس پولیس افسر کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ کرائم برانچ کے ایس ایس پی سلطان احمد صاحب تھے۔ پورے پولیس کے محکمے میں وہ واحد افسر تھے جن کی میں دل سے عزت کرتا تھا۔ مجھے آج تک ان کے خلاف کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملا تھا۔ پولیس کے دوسرے افسران ان سے بیزار تھے۔ وہ خود کھاتے تھے، نہ دوسروں کو مالِ حرام کھانے دیتے تھے اس لیے ہر جگہ سے ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ گزشتہ تین سال سے کرائم برانچ میں تھے۔

وہ دراز قد اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ ہاتھ پیر مضبوط تھے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس وقت تو وہ خود اپنی ہی پرچھائیں لگ رہے تھے۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کے مانند ہو گیا تھا۔ چہرے کی شادابی ختم ہو گئی تھی لیکن آنکھوں میں اب بھی وہی چمک تھی۔

ماریہ کا حال بھی تباہ تھا۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جس لباس میں وہ مجھے ملی تھی۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کا تاثر نمودار ہوا۔ ایس ایس پی سلطان نے پہلے نفرت سے عارف خان کو دیکھا، پھر زیادہ حقارت سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ''تم جیسے لوگ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔''

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

''خرم! تمہیں رشید الدین یاد ہے؟'' عارف خان نے کہا۔ ''تم نے شاید اس کے کیس پر مزید محنت نہیں کی ورنہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس سے میں بھی کام لے رہا تھا۔ تم صرف پولیس کے ایک ایس ایس پی کو بلیک میل کر کے مطمئن ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رشید الدین کے بارے میں مزید چھان بین کرو گے اور تم مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔''

''تم نے صرف اس مفروضے کی بنیاد پر میرے خلاف اتنی بڑی سازش کر دی۔''

''یہ میرا مفروضہ نہیں ہے۔'' عارف خان نے کہا۔ ''ابھی تو رشید الدین کا کیس چل رہا ہے تم کسی بھی وقت اس میں دخل اندازی کر سکتے تھے۔ تاجر برادری کے بہت سے لوگ بھی اس بارے میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتے تھے اور پولیس کے کچھ افسران بھی ان سے معلومات حاصل کرتے تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ سر اٹھانے سے پہلے ہی سانپ کا سر کچل دینا چاہیے۔''

''ماریہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ماریہ میرے دفتر میں کام کرتی ہے۔ غریب گھرانے کی ضرورت مند لڑکی ہے اس لیے اسے اس پلان کا حصہ بنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اسے میں نے بھاری انعام کا لالچ دیا تھا لیکن اس بے چاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے آدمی اسے وہاں سے غائب کر دیں گے۔ یہ موقع تم نے خود دیا تھا۔ تم اگر اسے تنہا گاڑی میں نہ چھوڑتے تو میرے آدمی کسی دوسرے طریقے سے ماریہ کو لے جانے کی کوشش کرتے۔''

''اور وہ آدمی جو مارا گیا ہے.....؟''

''وہ بھی میرا ایک ڈرائیور تھا۔ اسے بھی میرے ہی آدمیوں نے ہلاک کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہاری بے چینی ختم ہو گئی ہو گی۔ یہ لانچ تم لوگوں کو کھلے سمندر میں لے جائے گی پھر تم سب کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہاری لاشیں منٹوں میں مچھلیاں کھا جائیں گی۔ میں یہ کام اپنے آدمیوں کے سپرد کر دیتا لیکن اس ایس ایس پی کو میں خود مارنا چاہتا ہوں۔ اس کم بخت نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے کئی قیمتی آدمیوں کو ہلاک کرایا اور کئی کو جیل میں پہنچا دیا۔'' پھر اس نے جابر سے کہا۔ ''انجن اسٹارٹ کرو اور لانچ کو کھلے سمندر میں لے چلو۔''

''تم جانتے ہو کہ میری موت کے بعد بہت سے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے۔ خاص طور پر پولیس کے کئی افسران تو اپنی ملازمت سے جائیں گے اور جیل کی ہوا

کھائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میری طرف سے سب جہنم میں جائیں۔'' عارف خان بپھر کر بولا۔

اس وقت لانچ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جابر کے آدمیوں نے لنگر اٹھا لیا۔ لانچ آہستہ آہستہ کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔

اچانک ارشد زور زور سے کراہنے لگا۔ میرے ساتھ ساتھ عارف خان اور جینی نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' عارف خان نے پوچھا۔ ''تم تو مرنے سے پہلے ہی مرے جا رہے ہو۔''

''میں کالے کوّے کھا کے اترا ہوں کمینے آدمی۔'' ارشد نے کہا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ عارف خان کچھ سمجھ سکتا، اس نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور عارف خان کے سر پر پہنچ گیا پھر جھٹکے سے اس کا ریوالور نکال لیا اور اس کی نال عارف خان کے سر پر رکھ کر بولا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت کرنا، نہ آواز نکالنا ورنہ...'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' ارشد نے ڈپٹ کر کہا۔

عارف خان لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور کیبن کی دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

ارشد نے بہت پھرتی سے میرے ہاتھ کھولے، پھر ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا اور خود ایس پی کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹ میں ہم... آزاد ہو گئے۔ اب دوسرا مرحلہ لانچ پر موجود دوسرے لوگوں سے نمٹنے کا تھا۔ میں نے عارف خان کو دوبارہ اسی جگہ بٹھا دیا اور اس سے کہا کہ جابر کو آواز دے کر یہاں بلائے، صرف آواز دینا، کچھ اور کہو گے تو ارشد تمہاری کھوپڑی میں گولی اتار دے گا۔

میں نے دیکھا ہے کہ جتنا بڑا مجرم ہوتا ہے، اتنا ہی بزدل ہوتا ہے۔ عارف خان بھی اس وقت کسی بھک منگے کی طرح سہا ہوا تھا۔ اس نے جابر کو آواز دی تو میں کیبن کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جابر خان جونہی اندر داخل ہوا، میں نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے پلٹ کر اپنے شانے سے لٹکی ہوئی رائفل اتارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر پوری قوت سے گھٹنا مار دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا لیکن آدمی جاندار تھا اس لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

میں نے جھپٹ کر اس کے شانے پر لٹکی ہوئی خودکار رائفل اتار لی۔ وہ روسی ساختہ ہلکی پھلکی رائفل تھی۔ جسے بار بار لوڈ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں چند لمحے کے لیے اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اچانک وہ جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس چھینا جھپٹی میں ٹریگر دب گیا اور گولی جابر کا جبڑا توڑتی ہوئی سر کی طرف گھس گئی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے فرش پر گر پڑا اور بری طرح تڑپنے لگا۔

فائر کی آواز سن کر جابر کے دو ساتھی بھاگتے ہوئے وہاں آئے۔ ارشد نے انہیں گن پوائنٹ پر لے لیا پھر وہی رسیاں ان دونوں کو باندھنے کے کام آئیں جن سے ان لوگوں نے ہمیں باندھا تھا۔

''اس لانچ پر اور کتنے آدمی ہیں؟'' ایس ایس پی سلطان نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ہاتھ پیر کھلتے ہی اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی اور وہ ایک دم پولیس افسر بن گیا تھا۔

''یہاں ایک آدمی اور ہے صاحب۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''وہ انجن روم میں ہے۔''

''ریوالور مجھے دو۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں ارشد سے کہا۔

ارشد نے میری طرف دیکھا، میں نے اشارے سے ریوالور اسے دینے کو کہا۔

سلطان، ارشد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ارشد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا وہی شاید انجن کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ارشد نے اس کے بھی ہاتھ پاؤں باندھے اور ایک طرف ڈال دیا۔

''سلطان صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لانچ کے انجن کو کنٹرول کر رہے ہیں اور لانچ کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ارشد نے جواب دیا۔

ہمیں بندرگاہ سے نکلے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اس لیے واپسی کا سفر بھی مختصر تھا۔

سلطان صاحب نے ٹیلی فون کر کے پولیس کو وہیں طلب کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے بولے۔ ''یہ عارف نہ صرف ہتھیاروں کی اسمگلنگ کرتا ہے بلکہ ملک میں ہنگامے کرانے کے لیے مختلف تنظیموں کو فنڈنگ بھی کرتا ہے۔''

''لیکن یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ پاکستان کا دشمن ہے، مسلمانوں کا دشمن ہے۔''

"لیکن کیوں؟" میرے ذہن میں اب بہت سے سوالات تھے۔

"اس لیے کہ یہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ یہ بھارت کا ایجنٹ ہے اور نہ جانے کتنے برس سے یہاں سرگرم ہے۔ میں گزشتہ دو سال سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دو سال کی عرق ریزی کے بعد میرے ہاتھ بہت سے ٹھوس ثبوت لگ گئے۔ اسے بھی سن گن مل گئی۔ اس نے مجھے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے ہی میں اغوا کرا لیا۔ یہ تو مجھے کبھی کا مار دیتا لیکن اسے ان ثبوتوں کی فکر تھی جو میرے قبضے میں تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں اس کے ان گوداموں سے بھی واقف ہوں جہاں... بظاہر ایکسپورٹ کے لیے چینی کی بوریاں اور اون کی گانٹھیں رکھی جاتی ہیں لیکن اصل میں وہ ہتھیاروں اور بارودی مواد رکھنے کے ٹھکانے ہیں۔"

"آپ سے اگلوانے کے لیے تو اس نے بہت تشدد کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تشدد؟" سلطان صاحب کا چہرہ غصے سے مسخ ہو گیا۔ "اس نے تو میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی اور بیٹی کو قتل کر دیا تھا، اس کے باوجود میں نے زبان نہیں کھولی۔ اس نے مجھ پر ظلم کی انتہا کر دی لیکن میری زبان کھلوانے میں کامیاب نہ ہوا۔"

ان کی باتیں سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ایک طرف سلطان صاحب جیسے محب وطن افسر تھے اور دوسری طرف مجھ جیسے ابن الوقت اور رشوت خور، مجھے اپنی ذات سے گھن آنے لگی۔ میں نے خلوص دل سے کہا۔ "سلطان صاحب! آج تک میں نے لوگوں کو بلیک میل کر کے برائی کا ساتھ دیا ہے لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب کوئی دشمن ہمارے ملک میں نقب لگانے کی کوشش کرے گا تو میں پوری قوت سے اسے روکوں گا، قانون کے ہاتھ مضبوط کروں گا۔"

"یہ وعدہ تم مجھ سے نہیں بلکہ خود سے کرو خرم۔" سلطان صاحب نے کہا۔ "تم بلا کے ذہین آدمی ہو۔ عارف خان... بلکہ ارجن سیواس کو بھی اندازہ تھا کہ تم اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس کی حقیقت تک پہنچ جاؤ گے۔"

"ارجن سیواس؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ارجن سیواس! اس کا اصل نام عارف خان نہیں بلکہ ارجن سیواس ہے۔ رشید الدین کو بھی اس کی اصلیت کا علم ہو گیا تھا، ان سے کچھ لغزشیں ہو گئی تھیں۔ عارف خان نے انہیں ایس پی احسان کے ذریعے بلیک میل کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں خودکشی کرنا پڑی۔"

اسی وقت پولیس کے چاق چوبند کمانڈوز وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سلطان صاحب کو سیلوٹ کیا اور ارجن، اس کے آدمیوں اور جابر کی لاش کو اٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ نہ جانے ان میں کتنے مسلمان تھے اور کتنے ہندو۔

☆☆☆

دوسرے دن کا اخبار ارجن سیواس کی گرفتاری کی خبروں اور اس کے بارے میں دیگر حقائق سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ٹی وی چینل پر یہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اسے میرا کارنامہ سمجھا جا رہا تھا۔ صبح سے اب تک کئی ٹی وی چینلز اور اخبارات میرا انٹرویو کر چکے تھے۔ میرے اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے ایک بہت بڑے میڈیا گروپ کی طرف سے بھی مجھے چیف کرائم رپورٹر کی بھی آفر تھی۔

ماریہ ابھی تک پولیس کی تحویل میں تھی۔ ارشد اور جینی بھی غائب تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں یہی سمجھا کہ پھر کوئی پریس رپورٹر انٹرویو کے لیے آیا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو ارشد کے ساتھ وہاں جینی اور ماریہ کھڑی تھیں۔

ماریہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بولی۔ "مجھے معاف کر دیں۔ میری وجہ سے آپ کو بہت اذیت اٹھانا پڑی ہے۔ مجھے اس کی سزا بھی مل گئی ہے۔ میری گمشدگی کے صدمے نے میری ماں کی جان لے لی۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے خرم صاحب۔"

"معافی کیسی ماریہ؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہاری وجہ سے تو اتنا بڑا مجرم پکڑا گیا ہے اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہارا کوئی نہیں ہے؟ اللہ تو موجود ہے نا۔"

"اور میں بھی تو ہوں۔" ارشد نے کہا۔

"تم... یعنی... تم..." میں نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

جینی نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور نظریں چرا لیں۔

شام کو ڈیڈی اور میرے بھائی میرے پاس آئے اور مجھے بہت اصرار کر کے گھر واپس لے گئے۔

زندگی اچانک ہی خوب صورت ہو گئی اور دنیا میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔